تحقیق وتخریج کے ساتھ اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

سیرۃ امام الانبیاء ﷺ

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ ۔ ڈسکہ

تحقیق وتخریج کے ساتھ اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

سیرۃ امام الانبیاء ﷺ

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

سیرۃ امام الانبیاء ﷺ

تالیف: فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

حرفِ سپاس و تشکر

اس کتاب کی طباعت واشاعت کے سلسلہ میں ہمارے ساتھ (الدوحہ۔ قطر) سے

محترم جناب ریاض مہتاب خان

(رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً وغفر لہ وادخلہ الفردوس الأعلیٰ)

کے اہل خانہ حفظہم اللہ نے اپنے مرحوم کے ایصال ثواب کیلئے تعاون کیا ہے۔

فجزاھم اللہ خیراً فی الدنیا والآخرۃ

لہٰذا ہم اسے تجارتی وکاروباری نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ محض دعوتی وتبلیغی انداز سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

ابو عدنان محمد منیر قمر۔ الخبر (سعودی عرب)

اشاعت ________ 2020ء

کمپوزنگ ________ عدنان قمر و نبیلہ قمر و حسان قمر حفظہم اللہ

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت

ریحان چیمہ، ڈسکہ

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

حصہ 2

سیرت امام الانبیاء ﷺ تذکارِ صحابہ ومناقبِ اہل بیت رضی اللہ عنہم کے حوالے سے

ابتدائیہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ، وَ نَسْتَعِينُهٗ، وَ نَسْتَغْفِرُهٗ، وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه وَ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ. أَمَّا بَعْدُ:

اس کتاب کو میں نے حرفاً حرفاً پڑھا ہے جو مولانا محمد منیر قمر صاحب مترجم شرعی کورٹ اُمّ القیوین۔متحدہ عرب امارات (حال شرعی کورٹ الخبر ،سعودی عرب) کی ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو متحدہ عرب امارات کی ریاست اُمّ القیوین کے ریڈیو اسٹیشن کی اُردو سروس سے سیرت النبی ﷺ کے عنوان سے کی گئی تھیں جنھیں بعد میں اکٹھا کر کے کتابی شکل دی گئی ہے۔

سیرت النبی ﷺ کا موضوع اتنا وسیع وجامع ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور قیامت تک مسلمان اس پاکیزہ وبابرکت موضوع پر لکھتے ہی رہیں گے۔ کیوں کہ ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ سیرتِ رسول ﷺ پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھ یا پڑھ کر سعادتِ دارین حاصل کرے۔

میں اپنے فاضل دوست مولانا محمد منیر قمر صاحب حفظہ اللہ کا مشکور وممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے سیرت النبی ﷺ کے پروگرام کو ترتیب دینے کے لیے بندۂ عاجز کا انتخاب کیا اور پروگرام کا مسوّدہ لکھنے اور اسے کتابی شکل میں ڈھالنے کے لیے مجھے دیا۔ جَزَاهُ اللّٰهُ خَيْرًا.

میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ پروگراموں کی ترتیب میں ربط برقرار رہے۔ ہاں اگر کسی جگہ میں نے تکرار کو ضروری ومفید سمجھا تو برقرار رکھا۔ اب اگر کسی جگہ تکرار یا کلام کے ربط وترتیب میں کمزوری نظر آئے تو وہ بندے کی طرف سے ہوگی۔

اس کتاب میں اصل محنت تو مولانا قمر صاحب کی ہے، کیوں کہ یہ کتاب انھی کی تقاریر ہیں۔ میں نے تو صرف تھوڑا بہت ترتیب کا کام کیا ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ کتاب

قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

قارئین سے التماس ہے کہ اپنی نیک دعاؤں میں قمر صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اس عمل کو خالص اپنے لیے بنا کر شرفِ قبولیّت سے نوازے اور آخرت میں ہمارے اور تمام قارئین کے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین ثم آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَىٰ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَىٰ آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ.

حافظ ارشاد الحق

رکن اسلامک مشن دبئی

(متحدہ عرب امارات)

۷؍رجب ۱۴۱۰ھ

۳؍فروری ۱۹۹۰ء

تمہید

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ، وَ نَسْتَعِينُهٗ، وَ نَسْتَغْفِرُهٗ، وَ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه وَ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ. أَمَّا بَعْدُ:

قارئینِ کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبیِ آخر الزماں ﷺ تک (بعض متکلم فیہا روایات کی رو سے) کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، جو سب اپنی اپنی جگہ بڑی قدر ومنزلت والے اور مقربینِ الٰہی تھے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ جس پیغمبر کا نام لیں، پڑھیں یا ذکر سُنیں تو پورے احترام سے نام لیں، پڑھیں اور سُنیں، اور ساتھ ہی ''علیہ السلام'' بھی کہیں۔ اور جب حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ کا ذاتی اسمِ گرامی یا صفاتی نام آئے تو ''عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ'' یا ''صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ'' ضرور کہیں، کیوں کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ٥٦) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی آپ پر درود وسلام بھیجا کرو۔''

اور خود نبیِ اکرم ﷺ نے اس کی تائید فرمائی ہے اور حدیث شریف میں تو یہاں تک آتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا:

«رَغِمَ أَنْفُ عَبْدٍ أَوْ بَعُدَ (مَنْ) ذُكِرْتَ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْكَ، فَقُلْتُ: آمِيْن»[1]

---

[1] رواه الحاكم، و قال: صحيح الإسناد، و رواه ابن خزيمة كما في الترغيب و الترغيب للمنذري (٤/ ٢٢٠، ٢٢١) ←

''وہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو جس کے سامنے آپ (ﷺ) کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ (ﷺ) پر درود نہ بھیجے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: میں نے اس پر آمین کہا۔''

ایمان کے چھے ارکان ہیں:

۱۔ اللہ پر ایمان لانا۔

۲۔ فرشتوں پر ایمان لانا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آسمانی کتابوں پر ایمان لانا۔

۴۔ اللہ کے رسولوں علیہم السلام پر ایمان لانا۔

۵۔ اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان لانا۔

۶۔ حیاتِ اُخروی پر ایمان لانا۔

معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے من جانب اللہ ہونے کا پختہ عقیدہ رکھنا بھی جزوِ ایمان ہے۔ رہا معاملہ اتّباع کا، تو وہ ہم پر صرف حضرت محمد ﷺ ہی کی فرض ہے جن کی بعثت سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں۔ ایسے ہی یہ بھی نہایت ضروری اور جزوِ ایمان ہے کہ ہم ان کے مابین نبی ہونے کی حیثیت سے کوئی تفریق نہ کریں، جیسا کہ سورۃ البقرہ کی آخری سے پہلی آیت (۲۸۵) میں اللہ تعالیٰ نے اصولِ ایمان کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ ایمان کی زبان سے کہلوایا ہے:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾

''ہم اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔''

ایسے ہی سورت آل عمران (آیت: ۸۴) میں حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، انبیائے آلِ یعقوب اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام، اور بالاجمال تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا اور ایمان لانے کی کیفیّت سکھلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ کہیں:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾

''ہم ان تمام [انبیاء علیہم السلام کی نبوت] میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔''

← و قال الأعظمي في تحقيق صحيح ابنِ خزيمة (۳/ ۱۹۲): إسنادهٗ جيّد، و قال البنّا في الفتح الرباني (۹/ ۲۳۰): أخرجه الإمام أحمد والترمذي و الحاكم.

البتہ خود اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض انبیاء و رسل علیہم السلام کو بعض دیگر پر کچھ درجۂ فضیلت و بزرگی عطا فرمایا ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک کے تیسرے پارے کی پہلی آیت (سورۃ البقرہ کی آیت ۲۵۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾

''ان سب رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اُن میں سے کوئی ایسا تھا جس سے اللہ تعالیٰ خود ہم کلام ہوا، کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے درجے دیے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں، اور جبرائیلِ امین سے اس کی تائید و مدد کی۔''

اس سلسلۂ انبیاء علیہم السلام میں سے اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ فضیلت وعظمت، قدر و منزلت اور شرف و رفعت امام الانبیاء خاتم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو عطا فرمائی۔ نبیِ اکرم ﷺ کی سیرت کے صرف اس ایک پہلو پر کہ آپ ﷺ کے خصائص کیا تھے جو آپ ﷺ کو دیگر انبیاء علیہم السلام سے ممتاز کرتے اور دلائلِ نبوت کیا کیا ہیں؟ اہلِ علم نے اس موضوع پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں جن میں اس موضوع کا بڑی حد تک حق ادا کر دیا ہے جن میں ''الخصائص الکبریٰ''، امام سیوطی، ''دلائل النبوۃ'' امام بیہقی، ''دلائل النبوۃ'' امام ابونعیم اور ''دلائل النبوۃ'' امام ابن قتیبہ صاحبِ ''غریب الحدیث و مختلف الحدیث'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آیندہ صفحات میں ہم سیرت النبی ﷺ، تذکارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور مناقب اہلِ بیت رضی اللہ عنہم پر پیش کیے گئے اپنے ریڈیو پروگرام کی متعلقہ اقساط کو کتابی صورت میں ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ہم اپنے فاضل دوست جناب مولانا حافظ ارشاد الحق صاحب حفظہ اللہ (فاضل مدینہ یونیورسٹی، مقیم الذید، شارجہ) کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمارے مسوّدہ اور اضافوں کی ترتیب و تدوین کی ذمے داری بطریقِ احسن سرانجام دی۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَآءِ فِی الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.

اس کتاب کے کئی اِڈیشن شائع ہو چکے ہیں جن میں سے دوسرا اِڈیشن مہتاب خان رحمہ اللہ کے لیے صدقہ جاریہ کے طور پر ان کے بیٹے ریاض مہتاب خان (دوحہ، قطر) کے خرچ پر شائع ہوا تھا۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى. بحمد اللہ زیرِ نظر اِڈیشن بھی ہمارے عزیز جناب جمشید ریاض خان حفظہ اللہ کی ترغیب

سے محترم جناب ریاض مہتاب خان ۔رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحمَةً وَاسِعة وَغَفَرَ لَهٖ وَادْخَلَهُ الْفِرْدَوْسَ الْاَعْلَىٰ۔ کے اہلِ خانہ حفظہم اللہ نے اپنے مرحوم کے کے لیے بطور صدقہ جاریہ شائع کروایا ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ فَی الدَّارَیْنِ خَیْراً.

زیرِنظر طبعِ جدید میں ہم نے بکثرت تخریجات وتحقیقات اور دیگر اضافے بھی کیے ہیں خاص طور پر اس کے حصہ دوم (تذکارِ صحابہ رضی اللہ عنہم و مناقبِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم) میں کئی اضافے کیے ہیں جس کی کمی کی طرف مفسرِ قرآن و پاسبانِ صحابہ رضی اللہ عنہم حافظ صلاح الدین رحمہ اللہ نے اپنے تبصرے میں اشارہ فرمایا تھا۔

اور آخر میں ہم اپنے عزیزان: عدنان قمر، نبیلہ قمر اور حسّان قمر (سلمهم اللّٰه) کے بھی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ کی۔ وَفَّقَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی لِكُلِّ خَیْرٍ.

اس کتاب کے ایک اِڈیشن میں پروف ریڈنگ کی کمی کی وجہ سے بہت زیادہ طباعتی اور بعض دیگر غلطیاں رہ گئی تھیں جن کی طرف ہمارے ایک مخلص عزیز شیخ عبدالمجید محمد حسین بلتستانی مدنی (کراچی) نے نہ صرف توجہ دلائی بلکہ تصحیح اغلاط والا وہ نسخہ ہی ہمیں بھیج دیا جسے ہم نے موجودہ پروف ریڈنگ کے وقت اپنے پیشِ نظر رکھا۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءَ فِيُ الدُّنْیَا وَالْآخِرَة.

اللہ تعالیٰ ہمارے اس عمل کو شرفِ قبولیّت سے نوازے اور نبیِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیّبہ کے ان اوراق کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے رشد و ہدایت اور بالیدگیِ ایمان کا ذریعہ بنائے۔ آمین

وَالسَّلَامُ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ.

ابو عدنان محمد منیر قمر ابن حاجی نواب الدین غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ

متحدہ عرب امارات،[1] ترجمان شریعت کورٹ ام القیوین

(حال، شریعت کورٹ الخبر، سعودی عرب)

۷۔۷۔۱۴۴۰ھ = ۲۔۳۔۲۰۲۰ء

[1] راقم ۱۴۱۵ھ سے سعودی عرب منتقل ہو چکا ہے۔ (ابو عدنان)

تبصرہ جات

ماہنامہ ''البدر'' ساہیوال (جلد: ۳، شمارہ: ۱۲، دسمبر ۱۹۹۳ء)

تبصرہ نگار: حافظ صلاح الدین یوسف صاحب

یہ کتاب مولانا محمد منیر قمؔر صاحب کی تحریر کردہ ہے جس کی ترتیب وتبییض کا کام حافظ ارشاد الحق صاحب نے کیا ہے۔

اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ سیرت النبی ﷺ کا۔ دوسرا حصہ نبیِ کریم ﷺ کے فیض یافتگان، یعنی شمعِ رسالت کے پروانے صحابۂ کرام اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہم کے حالات کا۔ اِس کتاب میں بھی فاضل مصنّف نے روایات کی صحت وتحقیق کا خصوصی اہتمام کیا ہے، بالخصوص سیرت سے متعلقہ حصہ اوّل میں، جس کی وجہ سے یہ کتاب بھی سیرت کی دوسری کتابوں سے ممتاز ہوگئی ہے۔ صحتِ روایات کے التزام واہتمام کی وجہ ہی سے بہت سے مشہور واقعات بالخصوص ولادتِ نبوی ﷺ وغیرہ سے متعلقہ اس میں بار نہیں پاسکے۔

بہرحال یہ کتاب بھی نہایت مفید اور عوام وخواص کے مطالعہ کے لائق ہے۔

''صراطِ مستقیم'' برمنگھم (جلد۱۳، شمارہ: ۱۱۔۱۲مئی، جون ۱۹۹۳ء)

تبصرہ نگار: مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی۔ ایم اے عربی و اسلامیات
ایم، او، ایل نائب امیر المرکزیہ (برطانیہ) سب ایڈیٹر ماہنامہ ''صراطِ مستقیم''، برمنگھم

سیرتِ طیبہ بڑا مبارک، مقدّس اور نازک موضوع ہے۔ بڑے خوش قسمت ہیں وہ اصحاب جو اس پر قلم اُٹھا کر اپنے آپ کو سیرت نگاروں کی صف میں شامل کر لیتے ہیں۔ سیرت نگاری پر قلم چلانے والے آنحضرت ﷺ کی شان میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ جس ہستی کی تعریف میں قرآن نازل ہو، دوسرا کیا اضافہ کرسکتا ہے۔

بقول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ ؎

مَا اَنْ مَدَحْتُ مُحَمَّداً بِمَقَالَتِيْ وَلٰكِنْ مَدَحْتُ مَقَالَتِيْ بِمُحَمَّدٍ

''میں نے حضرت محمد ﷺ کی شان میں مقالہ لکھ کر آپ ﷺ کی شان میں تو کوئی اضافہ نہیں کیا، البتہ نبی ﷺ کے ذکرِ جمیل کی وجہ سے میرے مقالے کی شان ضرور دوبالا ہوگئی ہے۔''

یہ موضوع نازک اس لیے ہے کہ جس ذاتِ گرامی کے حالات و واقعات تحریر کرنے ہیں، کہیں ان کی شانِ اقدس میں گستاخی نہ ہوجائے۔ اگر تھوڑا سا بھی ایسا شائبہ پایا گیا تو تمام اعمال ضائع ہوجائیں گے۔ اس میں بڑا پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ اس ہستی کے آگے بڑے بڑے بھی دَم نہیں مار سکتے ؎

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنید و با یزید اینجا

سیرت نگاری میں کئی اصحاب نے اپنی ہمّت اور استطاعت کے مطابق خامہ فرسائی کی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو چھان مارا، آپ ﷺ کی خلوت اور جلوت کے قیمتی موتی اکٹھے کیے اور اِس بحرِ بیکراں میں بڑے بڑے سیرت نگاروں نے اپنے قلم کے گھوڑے دوڑائے، مگر انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا۔

اردو زبان میں بھی سیرت کی کئی مشہور کتب ہیں جن میں سرِفہرست ''سیرۃ النبی ﷺ''، ''رحمۃ للّعالمین''، ''سیرتِ طیبہ''، ''الرحیق المختوم'' اور ''ہادیِ دو عالم'' ہیں۔

مولانا محمد منیر قمر بڑے مشہور اور فاضل عالمِ دین ہیں جو کئی کتب کے مصنّف ہیں۔ ام القیوین شرعی کورٹ کے ترجمان ہیں۔ ''سیرت امام الانبیاء ﷺ'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب دراصل متحدہ عرب امارات کی ریاست ام القیوین کے ریڈیو اسٹیشن کی اردو سروس کی گئی ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو مولانا نے سیرۃ النبی ﷺ کے موضوع پر کی تھیں۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں آنحضرت ﷺ کی بشارت دیگر کتب میں، عربوں کے حالات، بچپنِ رسول ﷺ، امینِ کعبہ، بعثتِ نبوی ﷺ، ہجرتِ رسول ﷺ، غزوات اور تجہیز و تکفینِ رسول ﷺ جیسے موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں مقامِ صحابہ، مناقبِ اہل بیت، خلفائے اربعہ، امّہات المومنین، بناتِ رسول رضی اللہ عنہم اور تعدّدِ ازواج جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مؤلّف نے سیرۃ النبی ﷺ کے وسیع وعریض موضوع کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے اور تمام واقعات و حالات اختصار کے ساتھ اس میں سمو دیے ہیں۔ سلفی انداز اور خیالات سے کتاب لکھی گئی ہے اور اس کا انداز مناظرانہ ہے۔ بریلوی اور شیعہ حضرات کے عقائد اور ان کے سوالات کا پوسٹ مارٹم بھی کیا گیا ہے۔ مؤلّف نے انھیں تفصیل سے بیان کیا ہے جس وجہ سے واقعات و حالات میں تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ کتاب پڑھ کر اس میں ''رحمۃ للّعالمین'' کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اصحاب جو اختصار کے ساتھ سیرۃ النبی ﷺ پر کسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، یہ ان کے لیے نایاب تحفہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلّف کی محنت و کاوش کو قبول و منظور فرمائے اور انھیں مزید لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ثناء اللہ سیالکوٹی ایم۔اے

ہفت روزہ ''اہلحدیث'' لاہور (جلد: ۲۴ شمارہ: ۵، ۲۹/جنوری ۱۹۹۳ء)

تبصرہ نگار: بشیر انصاری صاحب۔ ایم۔اے

مولانا محمد منیر قمر کی شخصیّت دینی، علمی اور اجتماعی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ ایک عرصے سے دعوت وارشاد کا فریضہ بطریقِ احسن سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے نامور فرزند ہیں۔ طالب علمی کے دَور سے ہی ان کے مضامین اعلیٰ جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنّف، مؤلّف اور مترجم ہیں۔ ان میں سے: آئینہ نبوت، رمضان المبارک: روحانی تربیّت کا مہینہ، کشف الشبہات، مناسکِ حج وعمرہ، دعوۃ الیٰ اللہ، وجوبِ عمل بالسنّۃ، قبولیتِ عمل کی شرائط، سوئے حرم (حج وعمرہ اور قربانی کے مسائل) نماز مسنون اور درآمد شدہ گوشت کی شرعی حیثیت بہت اہم ہیں۔

زیرِنظر کتاب مولانا محمد منیر قمر (مترجم شرعی کورٹ ام القیوین) کی اُن تقاریر کا مجموعہ ہے جو ام القیوین ریڈیو اسٹیشن کی اردو سروس سے سیرۃ النبی ﷺ کے عنوان سے نشر کی گئی تھیں، جنھیں بعد میں اکٹھا کرکے کتابی شکل دی گئی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب وتبییض میں حافظ ارشاد الحق صاحب (فاضل مدینہ یونیورسٹی۔ مقیم الذید) نے بھی بڑی محنت وکاوش صرف کی ہے۔

یہ کتاب دوحصوں پر مشتمل ہے جس میں رنگارنگ کے بیسیوں عنوانات پر علمی جواہرات بکھرے ہوئے ہیں۔

حصہ اول میں رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے پہلے کے حالات سے لے کر آپ ﷺ کی وفات، غسل اور تکفین وتدفین تک سیرت کے تمام پہلو اختصار کے ساتھ آگئے ہیں۔ دوسرے حصے میں تذکارِ صحابہ ومناقبِ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ بھی بڑا مدلّل، تحقیقی اور علمی انداز کا حامل ہے۔

سیرت النبی ﷺ کے موضوع کی وسعت اور جامعیّت کا اندازہ لگانا ہی بڑا مشکل ہے، کیوں کہ اس موضوع پر ہر زبان میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہر مصنّف نے اپنے اپنے انداز میں گلدستۂ سیرت میں گل بوٹے سجائے ہیں اور دارین کی سعادتیں سمیٹی ہیں۔ مولانا محمد منیر قمؔر صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انھوں نے تقریر کے محدود وقت کے باوجود ہر عنوان پر قارئین کو خاصہ مواد مہیّا کیا ہے۔ بحمد اللہ ان کا سلسلۂ تصنیف و تالیف رو بہ ترقی ہے۔ جن دوست و احباب نے کتاب کی ترتیب و اشاعت میں حصہ لیا ہے انہیں اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے اور قارئینِ کرام کو اس پر عمل کی توفیق بخشے۔ آمین

ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (جلد: ۴۴، شمارہ: ۵۲۔ ۲۵/ دسمبر ۱۹۹۲ء)

تبصرہ نگار: جناب علیم ناصری صاحب ایم۔اے

مولانا محمد منیر قمؔر ایک طویل عرصے سے ام القیوین [عرب امارات] میں شرعی کورٹ کے ترجمان ہیں۔ وہ ہمارے جواں سال علماء میں ایک مقام رکھتے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ شرعی عدالت میں ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہیں بلکہ وہاں ریڈیو عرب امارات سے دینی امور کے سلسلے میں ان کی تقاریر بھی نشر ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی ان کی انہی تقاریر کا مجموعہ ہے جو انھوں نے سیرتِ طیّبہ کے مختلف پہلوؤں پر فرمائی تھیں۔ مولانا موصوف سرتاپا صالح الفکر شخص ہیں اور انھوں نے سیرت کے جملہ پہلوؤں کو قرآنِ پاک اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں تالیف فرمایا ہے۔ کتاب کی خصوصیّت یہ ہے کہ دَورِ حاضر میں بعض غالی حضرات نے سیرتِ طیّبہ کے بعض پہلوؤں پر غیر ثقہ روایتوں اور وضعی حدیثوں سے حاشیہ آرائی کی ہے مثلاً: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ، لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَ فْلَاكَ.

معراج النبی ﷺ، اور میلاد النبی ﷺ کی روایات، نور و بشر، مُختارِ کل کا عقیدہ، علم غیب، حاضر و ناظر، وفات یا وصال اور بعض غیر ثقہ معجزے وغیرہ کی غلط روایات رائج ہیں۔ مولانا قمؔر نے ان

مضامین پر موقع بہ موقع کتاب وسنّت کی روشنی میں محاکمہ کیا ہے اور حقائق سے پَردہ کشائی کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ولادت اور بعثت سے قبل عرب کی عام معاشرتی، مذہبی اور سیاسی بے راہ روی پر بھی مدلّل قلم فرسائی کی گئی ہے جس سے فکر وفہم کے دریچے واہوتے ہیں اور ایّامِ جاہلیّت سے آنحضرت ﷺ کی وفات تک کے تمام مراحل بالترتیب بیان ہوتے چلے گئے ہیں۔ اس حادثۂ فاجعہ پر کتاب کا پہلا حصہ تمام ہوتا ہے جو ۴۰۰ صفحہ تک محیط ہے۔ اس کے بعد حصہ دوم کا سلسلہ چلتا ہے جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب ہیں اور بعض دینی مسائل بھی جو ہماری زندگیوں میں راہنمائی کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان محترم شخصیّات میں خلفائے اربعہ، امّہات المومنین، بنات الرسول ﷺ شامل ہیں۔ نیز عیسائی مستشرقین کے بعض اعتراضات کے جوابات بھی اس حصے میں مندرج ہیں۔

غرض یہ کتاب سیرت الرسول ﷺ کے موضوع پر نہایت مدلّل اور مرتّب کتاب ہے جس کا ظاہر بھی دیدہ زیب اور باطن بھی دلکشا اور نظر افروز ہے۔ مکتبہ کتاب وسنّت ریحان چیمہ اس کی طباعت کے بہترین اہتمام پر مبارک باد کا مستحق ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مولانا منیر قمؔر کی حسنات میں شمار کرکے فوز وفلاحِ آخرت کا سبب بنائے۔ آمین

ماہنامہ مجلّہ ''تعلیم الاسلام'' ماموں کانجن (جلد: ٦ شمارہ: ٦، فروری ۱۹۹۳ء)

تبصرہ نگار: جناب ابو الریاض سلفی صاحب

سیرۃ النبی ﷺ ایک ایسا سدا بہار پھول ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ یہ بات شک وشبہے سے بالا ہے کہ دنیا بھر کے مصلحین، جرنیلوں، فاتحین، سیاسیین اور انقلابی انسانوں کی سوانحی عمریاں جو کسی بھی زبان میں لکھی گئی ہیں، ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور نبی اکرم ﷺ کے سوانح حیات دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں تو نبی اقدس ﷺ کا پلڑا بھاری ہوگا۔ عربی میں آنحضرت ﷺ

کی سیرت پاک پر بے شمار اور قیمتی کتابیں موجود ہیں۔ اردو میں ''رحمۃٌ للّعالمین'' علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کو جو اولیّت حاصل ہے ان کے مقام کو کوئی نہیں پہنچا ہے۔

''سیرۃ النبی ﷺ'' مصنّفہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ اردو میں اعلیٰ پائے کی کتاب ہے۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی ''الرحیق المختوم'' نے بھی سیرت کے موضوع پر عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ ''محبوبِ خدا'' مصنّفہ چوہدری فضل حق مرحوم بھی علم و ادب کا مرقّع ہے۔

ہمارے فاضل دوست مولانا محمد منیر قمؔر نے بھی [جو ام القیوین کے شرعی کورٹ میں ترجمان ہیں] ''سیرۃ امام الانبیاء ﷺ'' مرتّب کر کے سیرت نگاروں میں اپنا نام درج کرانے کی سعادت حاصل کر لی ہے۔

مولانا محمد منیر قمؔر نے گمنامی کی صفوں سے اُٹھ کر اپنی محنت اور علمی خدمات کی بدولت نہایت اچھی شہرت حاصل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں لکھنے پڑھنے کی بہترین صلاحیّتیں عطا فرمائی ہیں۔ وہ ہمیشہ لکھتے پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ مولانا منیر قمؔر متحدہ عرب امارات اُم القیوین کے ریڈیو اسٹیشن سے سیرۃ النبی ﷺ اور فضائلِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے موضوع پر اردو میں تقریریں نشر کرتے رہے ہیں۔ یہ کتاب بھی دراصل ان کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں دو سَو ستّر عنوان قائم کر کے سیرۃ النبی ﷺ کی جامعیّت کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ مولانا منیر قمؔر نے کتاب پر خاصی محنت کی ہے اور آخر میں چھے صفحوں پر مراجع و مصادر بھی لکھ دیے ہیں۔ کتاب کی ترتیب و تبییض میں مدینہ یونیورسٹی کے فاضل حافظ ارشاد الحق نے ان کا خوب ہاتھ بٹایا ہے۔ اردو میں اس کی طباعت و کتابت اور پوری پروف ریڈنگ میں مولانا سید محمد اسلم سلیؔم ترمذی نے اپنی ذمّے داریاں بطریقِ احسن انجام دی ہیں۔

کتاب بڑے سائز کے چھے سَو صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت اور کاغذ نہایت عُمدہ ہے۔ خوبصورت جلد پانچ رنگ جاذبِ نظر ٹائٹل اس کی اہمیّت کو دوبالا کرتا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ اسے مکتبہ کتاب و سنّت ریحان چیمہ تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ نے شائع کیا ہے۔

مجلّہ ''الدعوۃ'' لاہور (جلد:۴، شمارہ:۳، مارچ ۱۹۹۳ء)

تبصرہ نگار: مدیرِاعلیٰ (مولانا امیرحمزہ)

مولانا محمد منیر قمر گلف کی ایک ریاست ''ام القیوین'' میں ایک عرصے سے دعوت وتبلیغ میں مصروف ہیں۔ وہاں وہ اردو دان طبقے کے لیے ریڈیو پر دعوتی درس بھی دیتے ہیں۔ زیرِنظر کتاب دراصل ان کے انہی دعوتی دروس اور تقاریر پر مشتمل ہے جو سیرت النبی ﷺ پر ہیں۔ چھے سوصفحات کی اس کتاب میں ''صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم'' کے فضائل بھی ہیں۔عقائد کی اصلاح کی جانب بھی خصوصی توجّہ دی گئی ہے اور بدعات کا ردّ بھی دلائل کے ساتھ موجود ہے۔

''سیرۃ امام الانبیاء ﷺ پر تبصرہ''

تبصرہ نگار: **شیخ محمد اقبال لاسی**

اسلامک سنٹر بی بلاک۔ نارتھ ناظم آباد کراچی [پاکستان]

میرے محترم! کل ہی کی بات ہے کہ مجھے آپ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ''سیرۃ امام الانبیاء ﷺ'' مل چکی ہے۔ یہ کتاب چونکہ کل رات ملی ہے اس لیے میں اس سے کوئی استفادہ نہیں کرسکا، لیکن فہرستِ مضامین دیکھ چکا ہوں۔آپ نے بڑی محنت سے کام لیا۔خصوصاً عیسائی اور دیگر مغربی مؤرّخین ومفکّرین کی آراء کو نہ صرف پیش کرنے میں بلکہ ان کی تحریروں میں پائے جانے والے بے جا تعصّبات اور سقم کو بھی ظاہر کیاہے اور ان کے اعتراضات کا تجزیہ بھی فرمایا ہے۔اس کے علاوہ برِّصغیر پاک و ہند کے علمائے کرام کے نزدیک پچھلی تقریباً پون صدی سے اُٹھے ہوئے مسائل جن میں سے اکثر و بیشتر کا رُخ رسولناونبیّنا حضرت محمد ﷺ کی طرف ہے تو آپ نے ان مسائل میں سے

بالخصوص نور و بشر، علم غیب، مُختارِ کُل اور عید میلاد النبی ﷺ کی شرعی حیثیت اور مروجہ انداز پر بحث کی ہے۔ میں نے چونکہ ان مباحث کو جُستہ جُستہ دیکھا ہے، بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اپنے علمی ذوق اور سابقہ عادتِ شریفہ، جو ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال کو پسند کرتے ہیں، برقرار رکھا ہوگا اور مسائل کے صرف بیان تک ہی نہیں بلکہ ان دقیق و تحقیقی اور علمی مسائل کا جو میرے نزدیک زیادہ تر ''روحانی'' ہیں، بہترین انداز سے حل کیا ہوگا.

آپ کا مخلص

شیخ محمد اقبال لاسی۔ کراچی

مؤرخہ ۴ر دسمبر ۱۹۹۲ء

ہفت روزہ ''اہلحدیث'' لاہور (جلد: ۳۵، شمارہ: ۲۹، ۱۴ر اگست ۲۰۰۴ء)

تبصرہ نگار: محمد بلال حمّاد

تالیف: الشیخ محمد منیر قمر حفظہ اللہ ⊙ ترتیب: حافظ ارشاد الحق

سیرتِ طیّبہ ایک ایسا پاکیزہ اور روح پرور عنوان ہے کہ جس کا ہر عنوان محبت وعقیدت اور ایمان وسلامتی والا ہے۔ رسولِ پاک ﷺ سے والہانہ محبت، آپ ﷺ کی کامل اطاعت اور اسوۂ رسول ﷺ کی صحیح اتباع ہی نجات اور کامیابی کا راستہ ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''سیرتِ امام الانبیاء ﷺ'' دراصل تقاریر ولیکچرز کا ایک مجموعہ ہے جو فاضل مؤلّف نے متحدہ عرب امارات میں اپنے قیام کے دوران وہاں کی ریاست ام القیوین کے ریڈیو کی اردو سروس میں سیرتِ طیّبہ کے مقدّس عنوان پر دیے تھے۔ ان کی موجودہ ترتیب کا کام حافظ ارشاد الحق (فاضل مدینہ یونیورسٹی) نے سرانجام دیا ہے۔ اس کتاب میں بائبل کے عہدِ قدیم وجدید اور دیگر حوالوں سے نبیِ اکرم ﷺ کے بارے میں پیش گوئیوں کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی

ولادتِ با سعادت سے پہلے عربوں کی مختلف حالتوں کا بیان اور پھر قبل از نبوت کے احوال وواقعات کے ساتھ ساتھ نبیِ کریم ﷺ کی نبوت و رسالت کی دل آویزیوں کا تذکرہ بھی ہے۔ مکی دور اور ہجرت کے واقعات کو بھی قلمبند کیا گیا ہے۔ اس دوران نبیِ کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں مسلمانوں میں پائے جانے والے غلو (عالم الغیب، نور و بشر یا آپ ﷺ کو مختارِ کُل سمجھنا وغیرہ) اور عید میلاد کی شرعی حقیقت کو بھی واضح کیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں نبیِ اکرم ﷺ کی وفات تک کی سیرتِ طیّبہ کا حسین و دلآویز تذکرہ ہے۔ جبکہ دوسرے حصے میں بناتِ رسول اللہ رضی اللہ عنہن (قرآن و سنّت اور شیعہ کتب کے حوالے سے) خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم و دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن کا ایمان افروز بیان بھی ہے۔ اس طرح کتاب انتہائی مفید اور ایمان و نور کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے۔ اسے پڑھیں، دوسروں کو پڑھائیں، اس سے سیرتِ طیّبہ اور سنّتِ مطہرہ کی روشنی مزید پھیلے گی اور شرک و کفر، بدعت و نفاق اور بداخلاقی و بے راہ روی کی تاریکی کافور ہوگی۔ اِنْ شآءَ اللّٰہ.

حصہ 1
سیرت
امام الانبیاء ﷺ

سیرت امام الانبیاء ﷺ قبل از ولادت

میثاقِ انبیاء علیہم السلام

عام طور پر اساطینِ علم و فکر، اصحابِ قوت وسلطنت، ملوک و امراء، ریفارمرز یا مصلحین و مجدّ دین، دانشمندوں اور سیاستدانوں میں سے کسی بھی بڑی شخصیّت کا سوانحی خاکہ تیار کرنا ہوتو اس کا آغاز اس کی ولادت سے کیا جاتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ اس کی مساعی اور کارناموں کو اُجاگر کرنے کے لیے اس زمانے کی اخلاقی و سیاسی حالت ذکر کر دی جاتی ہے۔لیکن انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت اور حیاتِ طیّبہ کا معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کا آغاز آپ ﷺ کی ولادتِ با سعادت سے نہیں ہوتا۔ کیوں کہ آپ ﷺ تو اپنی ولادت سے پہلے ہی مشہور و معروف ہو چکے تھے۔ تو آیئے پہلے سیرت النبی ﷺ کے اِس جزوِ اول یعنی ''سیرت قبل از ولادت'' کا مختصر مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ نبی ﷺ اپنی ولادت سے بھی پہلے کب سے اور کس طرح مشہور ومعروف تھے؟!

اس سلسلے میں ہمیں تاریخِ انسانیّت یا تاریخِ عالَم کے اوراق کھنگالنے کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی اپنی نازل کردہ کتابوں سے ہی کافی موادمل جاتا ہے۔ رسولِ رحمت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جن خصائص و فضائل سے نوازا تھا، ان میں سے ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام سے یہ عہد و پیمان لیا تھا کہ آپ سب میں سے جس کسی کے عہدِ رسالت و نبوت میں میرا رسول ﷺ مبعوث ہوجائے تو آپ کا فرض ہے کہ ان پر ایمان لائیں، ان کی اتباع کریں اور ان کی مدد و نصرت میں لگ جائیں۔ اور اگر کسی کی زندگی میں یہ واقعہ رونما نہ ہوا تو اپنی امّت کو اِسی بات کی وصیّت کر کے جائیں۔[1]

اس عہد و پیمان کا ذکر سورت آل عمران (آیت:۸۱۔۸۲) میں یوں مذکور ہے:

[1] مختصر تفسير ابنِ كثير للرفاعي (٤/ ٢٣٠)

﴿ وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ۝ فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴾

''اور جب اللہ نے سب نبیوں سے پختہ عہد لیا کہ میں کتاب وحکمت میں سے جو کچھ تمھیں دوں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری عہد قبول کیا؟ انھوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو گواہ رہو اور تمھارے ساتھ میں بھی گواہوں سے ہوں۔ پھر جو اس کے بعد پھر جائے تو یہی لوگ نا فرمان ہیں۔''

اس آیت میں اہلِ کتاب کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم آنحضرت ﷺ پر ایمان نہ لاکر اس عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمھارے انبیاء علیہم السلام اور ان کے ذریعے تم سے لیا گیا ہے۔ اب بتاؤ کہ تمھارے فاسق ہونے میں کوئی شک وشبہ ہوسکتا ہے؟[1]

حضرت علی اور ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہم اس آیتِ میثاق کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس آیت میں رسول سے مراد نبیِ اکرم ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے آپ ﷺ کے بارے میں عہد لیا تھا کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی تائید ونصرت کریں، ورنہ اپنی امّت کو اس بات کی وصیّت کر کے جائیں۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی مشہورِ عالم تفسیر میں اسی قول کو اولیّت دی ہے۔ جبکہ دوسرا قول حضرت طاؤس، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ میثاق اس لیے لیا گیا تھا کہ تمام انبیاء علیہم السلام آپس میں ایک دوسرے کی تائید ونُصرت کریں گے۔ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے یکے بعد

[1] تفسیر کبیر للرازي بحواله فوائد سلفیه المسمّیٰ باشرف الحواشي آیت مذکوره بالا.

دیگرے دونوں تفسیریں ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان دونوں میں کوئی تناقض و تعارض نہیں ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ نبیِ رحمت ﷺ اللہ تعالیٰ کے علم میں ازل ہی سے نبی تھے۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء علیہم السلام میں آپ ﷺ معروف تھے۔ (اس موضوع سے متعلقہ احادیث اگلے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں)

دعائے خلیل علیہ السلام۔ نویدِ مسیحا علیہ السلام

سورۃ البقرہ (آیت: ۱۲۶ تا ۱۲۹) میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے تعمیرِ کعبہ کا واقعہ بالتفصیل ذکر فرمایا ہے، یہاں تک کہ جب یہ دونوں باپ بیٹا خلیل و ذبیح علیہما السلام تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی:

﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ﴾

''اے میرے رب! اس شہرِ مکہ کو امن والا بنادے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔''

اس کے بعد والی دعا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی اپنے والدِ گرامی کے ساتھ دعا میں شامل ہوگئے اور فرمایا:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴾

''اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا دے اور ہماری اولاد میں سے ایسی امّت پیدا فرما جو تیری فرمانبردار ہو۔''

پھر دعا کے آخر میں فرمایا:

﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾

''اے ہمارے رب! اُن میں ایک رسول بھیج جو انہی میں سے ہو۔ ان کے سامنے تیری آیات بیان کرے۔ انھیں کتاب وحکمت سکھلائے اور انھیں [شرک و بدعت] سے پاک

---

[1] مختصر ابن كثير للرفاعي (١/ ٢٨٧)

کرے۔ بے شک تو غالب وحکمت والا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں جس رسول کا ذکر ہے، تمام مفسّرین کے نزدیک اس سے مراد رسولُ اللہ ﷺ ہیں، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجمعہ (آیت:۲) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾

''اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے اُن ناخواندہ لوگوں میں ایک رسُول کو مبعوث فرمایا جو اُن ہی میں سے تھے۔''[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ ساری دعائیں مِن وعَن قبول ہوئیں۔ مکہ مکرّمہ کو اللہ تعالیٰ نے بلد امین یعنی امن وآشتی والا شہر بنایا اور اہلِ مکہ ہی میں سے نبیِ اکرم ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

نبیِ اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے تقریباً چھے سو برس پہلے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عہدِ نبوت تھا تو انھوں نے اپنی امّت کو اُسی وقت ایک نبی و رسول کی آمد کی بشارت دی اور معاملہ بالکل مبہم نہیں چھوڑا، بلکہ صفات کے طور پر نبیِ اکرم ﷺ کے دو ذاتی ناموں [محمد واحمد] میں سے ایک نام احمد ذکر بھی کیا۔ ﷺ۔ جیسا کہ سورۃ الصّف (آیت: ٦) میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ﴾

''اور یاد کرو مریم کے بیٹے کی وہ بات جو انھوں نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، اس تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد (ﷺ) ہوگا۔''

یہ رسولُ اللہ ﷺ کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صریح پیشین گوئی کا ذکر ہے جو انبیائے بنی اسرائیل میں سے آخری نبی تھے۔

---

[1] مختصر ابن كثير للرفاعي (١/ ١١٠)

نبی اکرم ﷺ کی کنیت اور اسمائے گرامی:

جہاں تک آپ ﷺ کے اس نام کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

《اِنَّ لِیْ اَسْمَاءً ....أَنَا مُحَمّدٌ، أَنَا أَحْمَدُ》

''میرے کئی نام ہیں۔ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں۔''

ان دونوں ناموں میں سے پہلا نام آپ کے دادا نے رکھا اور دوسرا نام آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے رکھا تھا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے، اور صحیح مسلم، ترمذی، نسائی، دارمی اور مسند ابو داود طیالسی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[1]

نبی مکرم ﷺ کی کنیت اپنے پہلوٹھے لختِ جگر قاسم کے نام سے ''ابو القاسم'' تھی، جس کا ذکر "صحيح البخاري مع الفتح" (١٠/ ٥٧١) اور "صحيح مسلم" مع شرح النووي (١٤٧/ ١١٢) اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے چند ناموں کا تذکرہ تو خود فرمایا ہے، جیسے: احمد، الحاشر، الماحی، العاقب، المقفی، نبی الرحمہ، نبی التوبہ، خاتم النبیین، نبی الملاحم یا نبی الملحمہ۔[2]

ان اسمائے گرامی کی طرح ہی آپ ﷺ کے کئی دیگر صفاتی اسمائے گرامی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے واضح طور پر ذکر ہونے والے آپ ﷺ کے اسمائے گرامی کو جمع کیا ہے جن کی مجموعی تعداد سڑسٹھ (٦٧) تک پہنچ گئی ہے۔[3]

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ ﷺ کے سب اوصاف میں سے ایک ایک کا نام لیا جائے تو ان کی تعداد دوسو سے بھی متجاوز ہوجائے گی۔[4] حافظ سخاوی رحمہ اللہ نے آپ ﷺ کے سب ناموں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ ان کی تعداد چار سوتیس کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے اور انھوں نے ذکر کیا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ مجھ سے پہلے کسی نے اس طرح ان ناموں کو جمع اور مرتّب کیا ہو۔[5]

---

[1] بحواله صحيح الجامع الصغير للألباني (٢١٨٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٣٢) صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٥/ ١٠٤ـ ١٠٥) المستدرك للحاكم (٤/ ٢٧٣ـ ٢٧٤) مسند الطيالسي (٢/ ٨٥) مسند أحمد (٥/ ١٠٤ـ ١٠٥) مسند البزار، رقم الحديث (٢٣٧٨)

[3] عارضة الأحوذي شرح جامع الترمذي (١٠/ ٢٨١)

[4] زاد المعاد لابن القيّم (١/ ٨٨)

[5] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: القول البديع في الصلاة على الحبيب الشفيع (ص: ٨٠ـ ٨٣) ←

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آپ ﷺ کے نام سے اسی بشارت کا ذکر کرتے ہوئے نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَنَا دَعْوَةُ اِبْرَاهِيْمَ وَبَشَارَةُ عِيْسَىٰ وَ رُؤْيَا أُمِّيْ» [1]

''میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کا خواب ہوں۔''

مولانا حالی نے اس حدیث کا ترجمہ اس مصرعہ میں کیا ہے ؎

دعائے خلیل علیہ السلام اور نویدِ مسیحا علیہ السلام

یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں شرح السنۃ کے حوالے سے یوں مذکور ہے:

«اِنِّيْ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْتُوْبٌ: خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَاِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِيْ طِيْنَتِهٖ، وَسَأُخْبِرُكُمْ بِأَوَّلِ أَمْرِيْ، دَعْوَةُ اِبْرَاهِيْمَ وَ بشَارَةُ عِيْسٰى وَرُؤْيَا أُمِّيَ الَّتِيْ رَأَتْ حِيْنَ وَضَعَتْنِيْ وَقَدْ خَرَجَ لَهَا نُوْرٌ أَضَاءَ لَهَا مِنْهُ قُصُوْرُ الشَّامِ» [2]

''میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس وقت سے خاتم النبیین لکھا ہوں جبکہ آدم علیہ السلام کا ابھی خمیر تیّار ہوا تھا۔ میں تمھیں اپنے ابتدائے امر کی خبر بھی دوں گا۔ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ کا وہ خواب ہوں جو انھوں نے مجھے جنم دیتے وقت دیکھا۔ ان کے لیے ایک نور نکلا جس سے اُن کے سامنے شام کے محلات روشن ہو گئے۔''

اسی موضوع کی بعض دیگر روایات بھی ہیں جن کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ آپ ﷺ علمِ الٰہی میں ازل سے ہی نبی تھے۔ البتہ بعض غالی لوگوں نے جو یہ مفہوم نکالا ہے کہ آپ ﷺ کی تخلیق سب سے پہلے ہوئی، یہ عقیدہ سراسر غلط اور خلافِ ارشادِ نبوی ﷺ ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

← بحواله تخريج و تعليق فرقه ناجيه مولانا حكيم محمد اشرف سندهو از حفيد المؤلّف مولانا حافظ عبد الرؤف صاحب. تخريج نمبر ٦.

[1] مسند أحمد (٤/ ٢١٧) عن أبي أمامه رضي الله عنه، ابنِ حبّان و صحّحه، (موارد الظمآن: ٢٠٩٣) المستدرك للحاكم (٢/ ٤١٨) عن العرباض بن سارية رضي الله عنه وصحّحه و صحّحه الألباني في مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٥٧٥٩)

[2] معجم الطبراني الكبير، دلائل النبوة لأبي نعيم. مجمع الزوائد (٨/ ٢٣٣) صحيح الجامع (٢٢٤) و حسنه.

«أَوَّلُ مَا خُلِقَ الْقَلَمُ، وَقَالَ: اُكْتُبْ. قَالَ: رَبِّی! وَ مَا اَكْتُبُ؟ قَالَ: اُكْتُبْ مَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ»

''سب سے پہلے قلم پیدا کی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے [اس قلم کو] فرمایا: لکھ، تو قلم نے کہا: اے میرے رب! میں کیا لکھوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے [سب کچھ] لکھ دے۔''

امّ الکتاب میں تو آپ ﷺ کا نبیِ آخر الزماں ہونا مرقوم تھا جو وجودِ علمی ہے نہ کہ وجودِ خَلقی، اور وجودِ علمی کے اعتبار سے تو تمام مخلوقات بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، کیوں کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّ اللّٰهَ عَلِمَ الْاَشْيَاءَ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَ الْاَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ عَامٍ»[1]

''زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو تمام چیزوں کا علم تھا۔''

بعض دیگر وہ روایات جو آپ ﷺ کے علمِ الٰہی میں ازل سے نبی ہونے پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہیں:

1- «عَنْ مَيْسَرَةَ الْفَجْرِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَتٰى كُنْتَ نَبِيًّا؟ [وَفِيْ لَفْظٍ: مَتَىٰ كُتِبْتَ؟] قَالَ: وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ»[2]

''حضرت میسرہ الفجر سے مروی ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کب سے نبی ہیں؟ [اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کب سے نبی لکھے گئے ہیں؟] تو رسولُ اللہ ﷺ نے فرمایا: [میں علمِ الٰہی میں اُس وقت سے نبی ہوں] جب آدم علیہ السلام کی تخلیق ہو رہی تھی۔''

2- «عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَتٰى وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةَ؟ قَالَ: وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَ الْجَسَدِ»[3]

[1] حاشیه مختصر ابنِ کثیر (١/ ١١١) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: "محمد ﷺ أفضل الخلق... للعلامة محمد نسيب الرفاعي"

[2] مسند أحمد (٥/ ٥٩) والحاكم (٢/ ٦٠٧۔ ٦٠٩) و صحّحه و قال الهيثمي (٨/ ٢٢٣): رواه أحمد و الطبراني، و رجاله رجال الصحيح.

[3] سنن الترمذي (٩/ ٣٦) وصحّحه، و المستدرك للحاكم (٢/ ٦٠٩) وصحّحه الألباني في مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٥٧٥٨)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ کے لیے کب نبوت واجب ہوگئی؟ [یعنی آپ کب سے نبی ہیں؟] تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابھی آدم علیہ السلام کا خمیر تیار ہو رہا تھا۔''

3- « عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَقِيقٍ عَنْ رَجُلٍ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَتٰى جُعِلْتَ نَبِيًّا؟ قَالَ: وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَ الْجَسَدِ »[1]

''حضرت عبد اللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی [صحابی رضی اللہ عنہم] نے کہا کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کب نبی بنائے گئے تھے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جبکہ آدم علیہ السلام ابھی جسم و روح کی درمیانی کیفیت میں تھے۔''

ان تمام روایات کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ آپ ﷺ علمِ الٰہی میں اس وقت بھی نبی تھے جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کی ابھی تخلیق ہو رہی تھی۔

اہلِ کتاب کے یہاں آپ ﷺ کا ذکرِ جمیل قرآنِ مجید کی روشنی میں

ہمارے نبی ﷺ صدیوں پیشتر ہی معروف ہو چکے تھے اور اہلِ کتاب کو اس کے بارے میں علم تھا کہ آپ ﷺ کہاں مبعوث ہوں گے؟ کہاں ہجرت کریں گے؟ یہاں تک کہ نہ صرف آپ ﷺ کے بلکہ آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوصاف بھی کتبِ سابقہ میں موجود تھے۔ قرآنِ کریم کے کئی مقامات پر اس بات کا تذکرہ ہے۔ مثلاً سورۃ البقرہ (آیت: ۸۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾

''اور جب اللہ کی طرف سے ایک کتاب [قرآن کریم] اُن کے پاس آئی جو تصدیق کرتی

[1] مسند أحمد (٤/ ٦٦، ٥/ ٣٧٩) و قال الهيثمي في مجمع الزوائد (٨/ ٢٢٣): رجالهٗ رجال الصحيح.

ہے اُس کتاب [تورات] کی جو اُن کے پاس تھی۔ اور اس سے پہلے وہ کافروں کے مقابلے میں اس کی مدد مانگا کرتے تھے۔ اور جب وہ چیز آ گئی جس کو پہچان چکے تو اس کا انکار کرنے لگے۔ کافروں پر اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہے۔''

تفسیر ابن کثیر اور تفسیر طبری میں لکھا ہے:

''نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودی لوگ جب عرب مشرکین سے مغلوب ہوتے تو وہ دعا کیا کرتے تھے کہ نبیِ آخر الزمان ﷺ جلد ظاہر ہوں، تا کہ ہم ان کے ساتھ مل کر ان کافروں پر غلبہ حاصل کریں۔''[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر فتح القدیر میں اس آیت کے تحت لکھا ہے:

''یہودی لوگ کہا کرتے تھے: عنقریب نبیِ آخر الزمان ظاہر ہوں گے اور ہم ان کے ساتھ مل کر تم پر غالب آئیں گے۔ چنانچہ حضرت عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ قبائلِ عرب میں ہم سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق کوئی نہ جانتا تھا۔ یہ اس لیے کہ ہم یہودیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ اہلِ کتاب اور ہم بُت پرست تھے۔ وہ جب ہم سے مغلوب ہوتے تو کہتے کہ ایک نبی کی بعثت ہونے والی ہے اور اس کا زمانہ آ پہنچا ہے۔ اس کے ساتھ مل کر ہم تمھیں عاد اور ارم کی طرح قتل کر دیں گے۔ جب رسول ﷺ کی بعثت ہوئی تو ہم نے آپ ﷺ کی پیروی اختیار کر لی اور وہ (یہودی) منکر ہو گئے۔''[2]

معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب کے یہاں آپ ﷺ اس حد تک معروف تھے کہ روز مرہ کی زندگی میں بھی وہ آپ ﷺ کی آمد و بعثت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ نیز سورۃ البقرہ (آیت: ۱۴۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾

---

[1] تفسیر ابنِ کثیر (۱/ ۱۲٤) طبع حلبی مصر، و مختصر تفسیر طبری (ص: ۱۵) طبع مصر.

[2] تفسیر ابن جریر و فتح القدیر بحوالہ فوائد سلفیہ لأستاذي محمد عبدہ الفلاح.

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ آپ کو ایسے جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو، اور ان میں سے ایک فرقہ جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے۔''

یہاں ایک فرقہ اس لیے کہا گیا ہے کیوں کہ ان میں سے کچھ لوگ نبی ﷺ پر ایمان لے آئے اور مسلمان ہوگئے تھے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں۔[1]

نیز سورۃ الاعراف (آیت: ۱۵۷) میں ارشادِ ربّانی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾

''یہ [رحمت کے مستحق] وہ لوگ ہیں جو اس اَن پڑھ نبی [محمد] کی پیروی کرتے ہیں جن کا ذکر وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔''

محقّقینِ بائبل نے دلائل و شواہد کے ساتھ ثابت کر رکھا ہے کہ عہدِ قدیم اور عہدِ جدید میں، یا تورات و انجیل میں زبردست تحریف واقع ہوئی ہے۔ اور اس بات کا انکار تو خود اہلِ کتاب بھی نہیں کر سکتے، کیوں کہ ان کے یہاں تحریف جائز سمجھی جاتی ہے، جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا [اِڈیشن ۱۹۴۶ء] کے مضمون ''بائبل'' کا مصنّف لکھتا ہے:

''اناجیل میں ایسے نمایاں تغیرات دانستہ کیے گئے ہیں، مثلاً بعض پوری پوری عبارتوں کو کسی دوسرے ماخذ سے لے کر کتاب میں شامل کر دینا ... یہ تغیرات صریحاً کچھ ایسے لوگوں نے بالقصد کیے ہیں جنھیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا اور وہ اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا زیادہ مفید بنانے کے لیے اس میں اپنی طرف سے اس مواد کا اضافہ کر دیں ....بہت سے اضافے دوسری صدی میں ہوگئے تھے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا؟''[2]

اور ہنری واسکٹ نے اپنی تفسیر کی جلد اوّل میں آگسٹائن کا یہ قول نقل کیا ہے:

''یہودیوں نے عبرانی نسخے میں طوفان سے پہلے اور بعد والے اکابر کے زمانوں میں،

---

[1] تفسير قرطبي و ابن كثير كما في أشرف الحواشي.

[2] تفهيم القرآن (٥/ ٤٦٤)

یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک اس میں تحریف کی۔ انھوں نے یہ کام دین مسیح کے عناد اور یونانی ترجمے کو غیر معتبر بنانے کے لیے کیا۔ اور قدیم مسیحی بھی اسی طرح کہتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ یہودیوں نے ۱۳۰ء میں تورات میں تحریف کی۔"[1]

ان کے یہاں تحریف جائز و مستحسن سمجھی جاتی تھی اور ان کے احبار و رہبان زمانۂ قدیم سے یہ شغل کرتے آئے ہیں۔ مگر ان تمام تحریفات کے باوجود بھی تورات و انجیل میں آج تک بیسیوں مقامات ایسے ہیں۔ جن میں کہیں صراحت کے ساتھ اور کہیں اشارات میں نبی ﷺ کے بارے میں بشارتیں مذکور ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا ذکرِ جمیل
حدیث شریف کی روشنی میں

ہم نے قرآنِ کریم کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ اپنی ولادت و بعثت سے قبل ہی اہلِ کتاب کے یہاں معروف تھے۔ ایسے ہی کتبِ حدیث و سیرت میں بھی کئی دلائل موجود ہیں کہ آپ ﷺ کے اس جہانِ رنگ و بو کو سعادت بخشنے سے پہلے بھی یہود و نصاریٰ اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کا ذکرِ جمیل پڑھا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کے بعد دنیا کی سب سے صحیح اور معتبر کتاب بخاری شریف [کتاب البیوع: ۲۱۲۵ و کتاب التفسیر] کو دیکھیں، جس میں ایک حدیث ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے جب تورات میں مذکور نبی ﷺ کے اوصاف کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

"أَجَلْ، وَاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمَوْصُوْفٌ فِيْ التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَاتِهٖ فِيْ الْقُرْآنِ"

''ہاں بخدا قرآن پاک میں آپ ﷺ کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، اُن میں سے بعض اوصاف خود تورات میں بھی موجود ہیں۔''

---

[1] محمد نبي الإسلام في التورات و الإنجيل (ص: ۸۵ و ۹۲۔ ۹۷) لمحمد عزّت طحطاوی مصری۔ اس موضوع پر مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: یروشلم کی تاریخ طبع ۱۸۳۲ء بیان علماء قرن ثانی ص: ۶۵ و ۸۶ از کتاب محمد نبی الاسلام [۷] اظہار الحق، تالیف: شیخ رحمت اللہ کیرانوی، مجلد اوّل کامل۔

جیسا کہ قرآن پاک سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۵) میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴾

''اے پیغمبر! ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا اور [مسلمانوں کو] جنت کی خوشخبری دینے والا اور [کافروں کو خدا کے عذاب سے] ڈرانے والا [بنایا ہے]۔''

تورات میں ان الفاظ پر مستزاد بھی ہے جو بخاری شریف میں یوں ہے:

« وَحِرْزاً لِّلْأُمِّيِّيْنَ، أَنْتَ عَبْدِيْ وَ رَسُوْلِيْ، وَسَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ، لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَلَا سَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ وَ يَغْفِرُ، وَلَنْ يَقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ، بِأَنْ يَّقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه، يُفْتَحُ بِهَا أَعْيُنٌ عُمْيٌ وَ آذَانٌ صُمٌّ وَ قُلُوْبٌ غُلْفٌ »[1]

''آپ (ﷺ) ان ناخواندہ لوگوں کی پناہ گاہ ہیں۔ آپ (ﷺ) میرے بندے اور رسول ہیں اور میں نے آپ کا نام متوکّل رکھا ہے۔ آپ (ﷺ) نہ تو بدخو اور سخت دل ہیں، اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے ہیں۔ آپ (ﷺ) نہ تو کسی بُرائی کا جواب بُرائی سے دینے والے ہیں، بلکہ عفو و درگزر کرنے اور بخش دینے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ (ﷺ) کی روح کو اس وقت تک قبض نہیں کرے گا جب تک کہ آپ (ﷺ) کے ہاتھوں کج رَو ملت کو سیدھا نہ کرلے اور وہ یہ کلمہ نہ پکارنے لگیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ اور جب تک اس کلمہ سے اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور غافل دلوں کو نہ کھول دے۔''

یہ بخاری شریف کے حوالے سے تورات کے الفاظ کا ترجمہ ہے جو کتنی وضاحت سے نبیِ اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی پر صادق آتا ہے۔ نیز مسند احمد، طبرانی کبیر اور مسند بزار میں حضرت سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ سے بسندِ صحیح مروی ہے کہ انھیں عموریّہ [مدینۃ القدس] کے ایک اہلِ کتاب [عیسائی] عالم نے نصیحت کرتے ہوئے کہا:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢٥۔ ٤٨٣٨)

"قَدْ أَظَلَّكَ زَمَانُ نَبِيٍّ وَ هُوَ مَبْعُوثٌ بِدِيْنِ اِبْرَاهِيْمَ، يَخْرُجُ بِأَرْضِ الْعَرَبِ، وَ مَهَاجِرُهٗ اِلٰى أَرْضٍ بَيْنَ حَرَّتَيْنِ بَيْنَهُمَا نَخْلٌ بِهٖ عَلَامَاتٌ لَا تُخْفٰى، يَأْكُلُ الْهَدِيَّةَ وَ لَا يَأْكُلُ الصَّدَقَةَ، بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ، فَاِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَلْحَقَ بِتِلْكَ الْبِلَادِ فَافْعَلْ" [1]

"تجھے ایسے زمانے نے آلیا ہے جس میں ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے۔ جو دینِ ابراہیمی لے کر آئے گا، جو عرب کی سرزمین پر ظہور فرمائے گا۔ اس کا دارِ ہجرت ایسی سرزمین ہوگی جو دو حرّوں کے مابین ہے اور ان دونوں کے مابین نخلستان بھی ہے۔ اس کے پاس ایسی علامتیں ہوں گی جو چھپی نہ رہیں گی۔ وہ ہدیہ کھالے گا، مگر صدقہ و زکات نہیں کھائے گا۔ اس کے دونوں کندھوں کے درمیان مہرِ نبوت ہوگی۔ اگر تم اس سرزمین تک پہنچ سکو تو ضرور پہنچ جاؤ۔"

آپ ﷺ کا دارِ ہجرت مدینہ منورہ ہے اور وہ واقعی نخلستان کے ساتھ ساتھ دو حَروں کے مابین ہی ہے۔ ان دونوں حَروں کے نام یہ ہیں:

۱۔ حرہ واقم۔ مشرقی جانب۔

۲۔ حرہ وبرہ۔ مغربی جانب۔

حرہ سے مراد: جلے ہوئے سیاہ رنگ کے پتھروں کی زمین ہے۔ [2]

نبیِ کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی آل و اولاد ہدیہ کھایا کرتے تھے اور صدقہ و زکوۃ نہیں کھایا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے مابین مہرِ نبوت بھی تھی۔ ان امور سے معلوم ہوا کہ عموریہ والے عیسائی عالم نے جو نشانیاں بتائی تھیں وہ سب آپ ﷺ میں موجود تھیں اور اُس نے یقیناً اپنی کتاب میں پڑھی ہوں گی جو کتبِ سابقہ میں آپ ﷺ کے بارے میں مذکور تھیں۔

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٤١) بأسانيد. الطبراني في الكبير (٦/ ٢٧٢۔ ٢٧٧، رقم ٦٠٦٥) مجمع الزوائد (٩/ ٣٣٦) الرحمة المهداة للدكتور خليل إبراهيم ملّا خاطر (ص: ١٤) طبع مدينه منورة.

[2] فقه السنّة محمد عاصم الحداد (٢/ ٥٥٩ حاشيه)

ثعلبہ بن ہلال کی شہادت:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ابو مالک ثعلبہ بن ہلال سے پوچھا جو احبارِ یہود میں سے تھا کہ مجھے تورات میں مذکور نبی ﷺ کی صفات بتا تو اس نے کہا کہ نبی ہارون علیہ السلام کی تورات جس میں کوئی تغیر و تبدّل واقع نہیں ہوا، اس میں آپ ﷺ کی صفات یوں مذکور تھیں:

"أَحْمَدُ مِنْ وَلَدِ اِسْمَاعِيْلَ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ وَهُوَ آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ، وَهُوَ النَّبِيُّ الْعَرَبِيُّ الَّذِیْ يَأْتِي بِدِيْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَام الْحَنِيْفِ، يَأْتزِرُ عَلٰى وَسَطِهِ وَيَغْسِلُ أَطْرَافَهُ، فِيْ عَيْنَيْهِ حُمْرَةٌ، وَ بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَتْمُ النُّبُوَّةِ، لَيْسَ بِالْقَصِيْرِ وَ لَا بِالطَّوِيْلِ، يَلْبَسُ الشَّمْلَةَ وَ يَجْتَزِئُ بِالْبُغْلَةِ وَ يَرْكَبُ الْحِمَارَ وَ يَمْشِيْ فِيْ الْأَسْوَاقِ، سَيْفُهُ عَلٰى عَاتِقِهِ لَا يُبَالِيْ مِنْ لَقِيَ مِنَ النَّاسِ، مَعَهُ صَلٰوةٌ لَوْكَانَتْ فِيْ قَوْمِ نُوْحٍ مَا أُهْلِكُوْا بِالطُّوْفَانِ، وَلَوْكَانَ فِيْ عَادٍ مَا أُهْلِكُوْا بِالرِّيْحِ، وَلَوْ كَانَ فِيْ ثَمُوْدَ مَا أُهْلِكُوْا بِالصَّيْحَةِ. يُوْلَدُ بِمَكَّةَ وَهُوَ أُمِّيٌّ لَا يَكْتُبُ وَلَا يَقْرَأُ الْمَكْتُوْبَ وَهُوَ الْحَمَّادُ يَحْمَدُ اللّٰهَ شِدَّةً وَّ رَخَاءً، سُلْطَانُهُ بِالشَّامِ، وَ صَاحِبُهُ مِنَ الْمَلَا ئِكَةِ جِبْرِيْلُ، يَلْقٰى مِنْ قَوْمِهِ أَذىً شَدِيْداً ثُمَّ يُدَالُ عَلَيْهِمْ [يَعْنِى تَكُوْنُ لَهُ الدَّوْلَةُ] فَيَحْصِدُهُمْ حَصْداً، تَكُوْنُ الْوَاقِعَاتُ بِيَثْرِبَ مِنْهَا عَلَيْهِ وَمِنْهُ عَلَيْهَا، ثُمَّ لَهُ الْعَاقِبَةُ، مَعَهُ قَوْمٌ هُمْ أَسْرَعُ اِلَى الْمَوْتِ مِنَ الْمَاءِ مِنْ رَأْسِ الْجَبَلِ اِلٰى أَسْفَلِهِ، صُدُوْرُهُمْ أَنَاجِيْلُهُمْ وَ قُرْبَانُهُمْ دِمَاءُ هُمْ، لُيُوْثُ النَّهَارِ رُهْبَانُ اللَّيْلِ، يُرْعِبُ عَدُوَّهُ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ يُبَاشِرُ الْقِتَالَ بِنَفْسِهِ، ثُمَّ يَخْرُجُ وَ يَحْكُمُ لَا شُرَطٌ مَعَهُ وَ لَا حَرَسٌ، اَللّٰهُ يَحْرُسُهُ"[1]

''آپ ﷺ کا نام احمد [ہوگا جو] اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے [اللہ تعالیٰ کی طرف سے] آخری نبی ہوں گے۔ آپ ﷺ وہ آخری نبی ہوں گے جو دینِ ابراہیم (علیہ السلام) یعنی دینِ حنیف لے کر آئیں گے۔ آپ ﷺ اپنی کمر مبارک پر اپنی چادر باندھتے ہوں

[1] رواه الواقدي، محمد نبي الإسلام في التوراة و الإنجيل والقرآن (ص: ٧) و في مقدمة الكتاب بقلم الدكتور محمد طيّب النّجار (ص: ٥)

گے اور اپنے ہاتھ پاؤں دھوتے ہوں گے۔ آپ ﷺ کی آنکھوں میں لال ڈورے ہوں گے اور دونوں کندھوں مبارک کے درمیان مہرِ نبوت ہوگی نہ چھوٹے قد کے ہوں گے اور نہ ہی بڑے قد کے [یعنی درمیانے قد کے ہوں گے] آپ ﷺ شملہ پہنیں گے اور خچّر و گدھے پر سواری کرتے ہوں گے اور بازاروں میں [پیدل] چلتے ہوں گے۔ آپ ﷺ کی تلوار آپ ﷺ کے کندھے مبارک پر ہوگی۔ لوگوں سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچے گی، مگر اُس کی کوئی پروانہیں کریں گے۔ آپ ﷺ کے ساتھ ایک ایسی نماز ہوگی اگر وہ قومِ نوح علیہ السلام کے ساتھ ہوتی تو وہ طوفان کے ذریعے ہلاک نہ کیے جاتے۔ اور اگر وہ نماز قومِ عاد کے پاس ہوتی تو وہ سخت ہوا کے ساتھ ہلاک نہ کیے جاتے۔ اگر وہ نماز قومِ ثمود کے پاس ہوتی تو وہ بھی چیخ [سخت تیز آواز] کے ساتھ ہلاک نہ کیے جاتے۔ آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں ہوں گے اور امّی ہوں گے جو نہ لکھتے ہوں گے اور نہ ہی خط پڑھتے ہوں گے۔ آپ ﷺ حمّاد ہوں گے جو شدّت و رخاء (تنگی و کشایش) میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کریں گے۔ آپ ﷺ کی حکومت شام [عرب] میں ہوگی۔ فرشتوں میں سے جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے ساتھی ہوں گے۔ آپ ﷺ کو اپنی قوم سے سخت تکالیف و ایذائیں پہنچیں گی۔ پھر آپ ﷺ اپنی قوم پر غالب آئیں گے اور انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹیں گے۔ آپ ﷺ کے واقعات [جنگیں] یثرب [مدینہ] میں ہوں گے۔ بعض واقعات آپ ﷺ کے حق میں ہوں گے اور بعض آپ ﷺ کے خلاف ہوں گے۔ پھر انجامِ کار فتح آپ ﷺ کو ہوگی۔ آپ ﷺ کے ساتھ ایسی قوم ہوگی جو موت کی طرف پہاڑ کی چوٹی سے پانی گرنے کی رفتار سے بھی زیادہ تیز دوڑے گی۔ ان کے سینے قرآن ہوں گے اور وہ خود اپنی جانوں [نفسوں] کی قربانیاں دیں گے۔ دن کو میدانِ کارزار کے شیر اور راتوں کے زندہ دار ہوں گے۔ آپ ﷺ کا اپنے دشمن پر ایک ماہ کی مسافت سے رعب طاری ہوجائے گا۔ آپ ﷺ بنفسِ نفیس جہاد کریں گے۔ پھر جب فارغ ہوں گے تو فیصلے [حکومت] کریں گے۔ آپ ﷺ کا کوئی باڈی گارڈ [محافظ] نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ کی حفاظت اللہ تعالیٰ ہی فرمائیں گے۔''

ایسے ہی شاہِ حبشہ نجاشی رضی اللہ عنہ نے جب مہاجرینِ حبشہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے دربار میں بلایا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سُنیں تو اس نے کہا:

”مَرْحَباً بِكُمْ وَ بِمَنْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِهٖ، أَشْهَدُ أَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ أَنَّهٗ الَّذِيْ نَجِدُهٗ فِيْ الْإِنْجِيْلِ وَ أَنَّهٗ الَّذِيْ بَشَّرَ بِهٖ عِيْسَىٰ ابْنُ مَرْيَمَ“[1]

”مرحباً تم کو اور اس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے دی تھی۔“

اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک نبی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نبی کی ایسی صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامّل نہ ہوا کہ محمد ﷺ ہی وہ نبی ہیں۔[2]

نبی ﷺ کی عظمت کا اندازہ تو اسی بات سے ہوجاتا ہے کہ نہ صرف آپ ﷺ کا بلکہ آپ ﷺ کی اُمت کا ذکر بھی پہلے ہی کتابوں میں آچکا تھا۔ مثلاً مسند احمد، بزار اور طبرانی کبیر و اوسط کی روایت میں ہے:

«عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ: يَا عِيْسَىٰ اِنِّيْ بَاعِثٌ مِنْ بَعْدِكَ أُمَّةً، اِنْ أَصَابَهُمْ مَا يُحِبُّوْنَ حَمِدُوْا وَ شَكَرُوْا، وَ اِنْ أَصَابَهُمْ مَا يَكْرَهُوْنَ اِحْتَسَبُوْا وَ صَبَرُوْا، وَ لَا حِلْمَ وَ لَا عِلْمَ، قَالَ: يَارَبِّ، كَيْفَ هٰذَا وَ لَا حِلْمٌ وَ لَا عِلْمٌ؟ قَالَ: أُعْطِيْهِمْ مِنْ حِلْمِيْ وَ عِلْمِيْ»[3]

---

[1] مسند أحمد عن ابنِ مسعود، جعفر و أم سلمه رضی اللہ عنہم.

[2] تفهيم القرآن (٥/ ٤٦٦)

[3] مسند أحمد (٦/ ٤٥٠) مجمع الزوائد (١٠/ ٦٧) وقال: رجاله رجال الصحيح الا اثنين وهما ثقات. زاد المعاد (١/ ٤٦)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''بے شک اللہ عزوجل [حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو] فرماتے ہیں: اے عیسیٰ علیہ السلام! یقیناً میں تیرے بعد ایک [ایسی] امّت بھیجنے والا ہوں، اگر انھیں وہ چیز ملے جسے وہ پسند کرتے ہوں [یعنی آسایش و فراخی] تو وہ حمد و شکر کریں گے اور اگر انھیں وہ چیز پہنچے جسے وہ ناپسند کرتے ہوں [یعنی کوئی تکلیف یا مصیبت] تو وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب طلب کرتے ہوئے صبر کریں گے۔ نہ عِلم نہ حِلم۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے میرے پروردگار! ان کے لیے نہ عِلم نہ حِلم کیسے ہوگا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں انھیں اپنے حلم و علم سے نوازوں گا۔''

نیز صحیح ابن حبان و مسند بزار کی ایک حدیث میں ہے:

« عَنِ الْفَلَتَانِ بْنِ عَاصِمٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ فِي الْمَجْلِسِ فَشَخُصَ بَصَرُهٗ اِلٰى رَجُلٍ فِيْ الْمَسْجِدِ يَمْشِيْ فَقَالَ: أَيَا فُلَانُ! قَالَ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَا يُنَازِعُهُ الْكَلَامُ اِلَّا قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، قَالَ لَهٗ: أَتَشْهَدُ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: أَتَقْرَأُ التَّوْرَاةَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: وَ الْاِنْجِيْلَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ وَ الْقُرْآنَ؟ قَالَ: وَ الَّذِىْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ أَشَاءُ لَقَرَأْتُهٗ. ثُمَّ نَاشَدَهٗ هَلْ تَجِدُنِيْ فِيْ التَّوْرَاةِ وَ الْاِنْجِيْلِ؟ قَالَ: نَجِدُ مِثْلَكَ وَ مِثْلَ مَخْرَجِكَ وَ مِثْلَ هَيْئَتِكَ، فَكُنَّا نَرْجُو أَنْ يَّكُوْنَ فِيْنَا، فَلَمَّا خَرَجْتَ خِفْنَا أَنْ تَكُوْنَ أَنْتَ هُوَ، فَنَظَرْنَا فَاِذَا أَنْتَ لَسْتَ هُوَ، قَالَ: وَ لِمَا ذٰلِكَ؟ قَالَ: مَعَهٗ مِنْ أُمَّتِهٖ سَبْعُوْنَ أَلْفاً لَيْسَ عَلَيْهِمْ حِسَابٌ وَ لَا عَذَابٌ، وَ اِنَّمَا مَعَكَ نَفَرٌ يَسِيْرٌ، فَقَالَ: وَ الَّذِىْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَأَنَا هُوَ، وَ اِنَّهُمْ لَأُمَّتِيْ، وَاِنَّهُمْ لَأَكْثَرُ مِنْ سَبْعِيْنَ أَلْفاً وَ سَبْعِيْنَ أَلْفاً وَ سَبْعِيْنَ أَلْفاً »[1]

---

[1] صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٥٨٠) طبراني (١٨/ ٣٣٢) والصحيح المسند للوادعي (١٠٧٤) و حسنه، مجمع الزوائد ١٠٠/ ٤١٠) و قال: رجاله ثقات من أحد الطريقين، مسند البزار، رقم الحديث (٣٧٠٠) صحيح موارد الظمآن للألباني (١٧٦٥) و صححه.

''حضرت فلتان بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی نگاہیں ایک مجلس میں ایک شخص پر جم گئیں جو مسجد میں چل رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اُسے فرمایا: اے فلاں! تو اُس نے لبّیک یا رسول اللہ! [اے اللہ کے رسول ﷺ! میں حاضر ہوں] کہا۔ اور اُسے آپ ﷺ کو یا رسول اللہ کہنے کے سوا کوئی چارۂ کلام ہی نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو اس بات کی شہادت دیتا [اقرار کرتا] ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ تو اُس شخص نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو تورات پڑھتا ہے؟ اُس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تو انجیل پڑھتا ہے؟ اُس نے کہا: ہاں، پھر آپ ﷺ نے اُس سے پوچھا: کیا تو قرآنِ پاک کی تلاوت بھی کرتا ہے؟ تو اُس نے کہا: اگر میں چاہتا تو [اس قرآنِ پاک] کی تلاوت بھی کر لیتا۔ پھر آپ ﷺ نے اُسے قسم دلوائی [اور پوچھا کہ] کیا تو مجھے [یعنی میرا ذکر] تورات و انجیل میں پاتا ہے؟ تو اُس نے کہا: ہم آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے شہرِ مکہ کی مثال پاتے ہیں اور آپ ﷺ کی ہیئت کی مثال بھی پاتے ہیں۔ پس ہمیں اُمید تھی کہ وہ [نبی] ہم میں سے ہوگا۔ جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو ہمیں خدشہ [ڈر] ہوا کہ وہ [نبی جس کی صفات تورات و انجیل میں مذکور ہم پاتے ہیں] آپ ﷺ ہی ہیں۔ پھر جب ہم نے [غور سے] دیکھا تو وہ [نبی] آپ ﷺ نہیں ہیں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں میں وہ [نبی] نہیں ہوں؟ اُس شخص نے کہا: اس لیے کہ اُس [نبی] کی امّت میں سے ستّر ہزار لوگ تو ایسے ہوں گے جن کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہوگا۔ یعنی بغیر حساب جنّت میں داخل ہوں گے جبکہ آپ کے ساتھ تو صرف چند لوگ ہی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں ہی وہ [نبی] ہوں [جس کا ذکر تم تورات و انجیل میں پاتے ہو] اور یقیناً میری امّت میں سے ستّر ہزار اور ستّر ہزار اور ستّر ہزار وہ ستّر ہزار سے کئی مرتبہ زیادہ ہوں گے [جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں جائیں گے]۔''

بائبل کے عہدِ قدیم یا تورات میں ذِکرِ رسول ﷺ

اسلامی کتب کے حوالوں سے جائزہ پیش کیا جا چکا ہے کہ نبیِ آخر الزمان ﷺ کا ذکرِ جمیل آپ ﷺ کی ولادت و بعثت سے بھی صدیوں پہلے بنی اسرائیل کی کتابوں میں مذکور ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ اقوامِ یہود و نصاریٰ میں معروف تھے۔مگر ایک غیر مسلم یہ سُن کر کہہ سکتا ہے کہ ہم جب ان کتابوں کو سرے سے جانتے اور مانتے ہی نہیں تو ہمیں یہ کیسے یقین آئے کہ واقعی آپ ﷺ کا ذکرِ خیر سابقہ کتابوں میں موجود تھا؟

اِسی طرح ایک مسلمان بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ غیر مسلموں کو ہماری کتابوں کے حوالے دینے سے کیا حاصل؟ انھیں ان کے اپنے مذہب کی کتابوں کے حوالے ہی سے قائل کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کی آمد کا ذکر خود تمھاری کتابوں میں بھی موجود تھا اور تحریفات وتغیرات کے باوجود اب تک بھی باقی ہے۔ لہٰذا آیئے پہلے بنی اسرائیل کی قومِ یہود کی کتابوں کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان میں کہاں کہاں اور کیا کیا بشارتیں نبیِ رحمت ﷺ کے بارے میں مذکور ہیں۔

کتبِ بنی اسرائیل کے مجموعہ ''بائبل'' کا تقریباً نصفِ اوّل کتبِ یہود پر مشتمل ہے جس کو مجموعی طور پر ''عہدِ قدیم'' کہا جاسکتا ہے۔اس کے تین حصے ہیں:

1- پہلا حصہ ہے: اسفارِ قدیم، جس کی چار قسمیں ہیں:

ا۔ پہلی قسم ہے کتبِ موسیٰ علیہ السلام یا تورات۔ یہ عہدِ قدیم کے پانچ اسفار: سفرِ تکوین یا پیدایش، سفرِ خروج، سفرِ تثنیہ یا استثناء، سفرِ لاویّین یا احبار اور سفرِ عدد پر مشتمل ہے۔

۲۔ دوسری قسم ہے اسفارِ تاریخیہ، جس میں بارہ اسفار ہیں۔ انہی میں ایک سفرِ یوشع علیہ السلام بھی ہے۔

۳۔ تیسری قسم ہے اسفارِ منظومہ۔ اس میں پانچ اسفار ہیں جن میں سفرِ ایوب علیہ السلام، سفرِ داود علیہ السلام اور سفرِ سلیمان علیہ السلام بھی شامل ہیں۔

۴۔ چوتھی قسم ہے اسفارِ انبیاء علیہم السلام جو سترہ اسفار پر مشتمل ہے جن میں سفرِ اشعیا علیہ السلام، سفرِ یونس علیہ السلام اور سفرِ زکریا علیہ السلام بھی شامل ہیں۔

2- عہدِ قدیم کا دوسرا حصہ سفرِ یہودیّت، سفرِ بنیامین، سفرِ یسوع علیہ السلام اور کتبِ مقابیین پر مشتمل ہے

جنھیں احبارِ یہود نے عوام الناس سے مخفی رکھنے کی غرض سے عہدِ قدیم میں داخل ہی نہیں کیا۔ اگرچہ سفرِ بنیامین علیہ السلام کے سوا یہ سب ان کے ہاں نہایت معتمد اسفار ہیں۔

3- عہدِ قدیم کا تیسرا حصہ عقیدہ و شریعت اور تاریخِ مقدّس کے موضوعات پر مشتمل ۶۳ اسفار کا مجموعہ ہے جو اصل فریسی فرقۂ یہود کے احبار و فقہاء کی تالیفات ہیں اور اِسی مجموعے کا نام ''تلمود'' ہے۔[1]

یہود کی کتابوں میں سے اسفارِ عہدِ قدیم یا تورات کے دو اجزاء سفرِ تکوین یا پیدائش اور سفرِ تثنیہ یا استثناء کے متعدد مقامات پر نبیِ رحمۃٌ للعالمین ﷺ کا ذکر اور آپ ﷺ کی آمد کے بارے میں بشارتیں موجود ہیں۔ ایسے ہی اسفارِ منظومہ میں سے سفرِ مزامیر میں بھی آپ ﷺ کا ذکرِ جمیل موجود ہے۔ اِسی طرح اسفارِ انبیاء میں سے سفرِ اشعیاء، سفرِ میخا، سفرِ حبقوق، سفرِ حجی اور سفرِ ملاخی میں بھی بالتصریح اور بالتلمیح آپ ﷺ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ان میں سے کئی مقامات پر نہ صرف نبیِ اکرم ﷺ بلکہ ساتھ ہی آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف بھی مذکور ہیں، جن سے سورۃ الفتح کی آخری آیت:

﴿سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ﴾

کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔

چند بشارتیں:

بائبل کے عہدِ قدیم یا تورات اور اس کی ملحقہ کتب میں ہمارے رسولِ مقبول ﷺ کا ذکرِ جمیل موجود ہے۔ آپ ﷺ کے تذکرے پر مشتمل وہ بشارتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان سب کا پیش کرنا تو کوئی ضروری نہیں اور باعثِ طوالت بھی ہے، البتہ ان میں سے چند عبارتوں کا باحوالہ ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

ا۔ سفرِ استثناء: باب ۱۸، آیات ۱۵ تا ۱۹ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے نبی ﷺ کے بارے میں خوش خبری دی اور فرمایا:

''خداوند تیرا خدا تیرے لیے، تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے

[1] محمد نبي الإسلام في التوراة و الإنجيل (ص: ٩٠۔ ٩١) طبع مصر. إظهار الحق (١/ ٩٠۔ ٩٦) طبع قطر.

میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا، یہ تیری [یعنی بنی اسرائیل کی] اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حواَب [پہاڑ] پر کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ کا ہی نظارہ ہو، تا کہ میں مر ہی نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے انھیں کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔''[1]

یہ تورات کی صریح پیشین گوئی ہے جو حضرت محمد ﷺ کے سوا کسی پر چسپاں نہیں ہوتی۔ اور خود قرآنِ پاک نے سورۃ النجم (آیت: ۳۔۴) میں اس کی تصدیق ان الفاظ میں کر دی:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾

''اور [نبی] اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کرتے بلکہ اُن کی جو بات ہے وہ وحی ہے جو اُن کی طرف بھیجی جاتی ہے۔''

نیز تورات کے اِسی سفرِ استثناء کے باب: ۳۳ میں ہے:

''اللہ تعالیٰ نے فاران سے اپنے نور کو روشن کیا اور اس کے ساتھ دس ہزار قدسی بھی آئے۔''

ایک نومسلم فاضل شیخ عبداللہ ترجمان [سابق عیسائی] نے ایک کتاب ''تحفه الأريب في الرد علىٰ أهل الصليب'' لکھی ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے:

''جبلِ فاران سے مراد مکہ اور وادیٔ حجاز ہے، کیوں کہ شاہانِ عمالقہ میں سے ایک بادشاہ کا نام فاران تھا اور زمین تقسیم کرتے وقت یہ علاقہ اس کے حصے میں آیا تھا۔ لہٰذا اسی کے نام پر اس جگہ کا یہ نام معروف ہوا۔''[2]

---

[1] تفهيم القرآن (٥/ ٤٥٩) رحمةٌ للعالمين قاضی سليمان منصور پوری (١/ ٩٦۔ ٩٧ حاشيه) محمد في الكتاب المقدّس پروفيشر عبدالاحد داود سابق بشپ (ص: ٣١ طبع قطر آية واحدة)

[2] محمد نبي الإسلام (ص: ٤۔ ٥)

''اب آپ فاران کے متعلق بحث کرنے والی تمام تاریخوں کو پڑھ ڈالیں۔ آپ کو مذکورہ بالا آیتِ تورات کا مصداق فتح مکہ کے سوا دوسرا کوئی واقعہ نظر نہیں آئے گا، اس وقت آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں دس ہزار قدسی نفوس صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔''[1]

نیز سفرِ تکوین یا پیدایش (باب: ۲۱، آیت: ۱۷ تا ۱۹) میں ایک عبرانی جملے کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ہاجر! [یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ] کھڑی ہو جاؤ اور اپنے اس بچے کو اٹھا لو، اور اسے سنبھال کر حفاظت سے رکھو، بے شک اِسی سے محمد اور ان کی اولاد پیدا ہوگی جو آسمان کے ستاروں کی طرح ہوں گے۔''[2]

سفرِ حبقوق (باب: ۳، آیت: ۳) میں نبی ﷺ کا اسمِ گرامی ''محمد'' [ﷺ] دو مرتبہ آیا ہے اور آپ کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں:

''وہ اہلِ زمین کے ساتھ برّی و بحری محاذوں پر جہاد کریں گے اور آپ ﷺ جبلِ فاران سے نمودار ہوں گے۔''[3]

ایسے ہی سفرِ تکوین یا پیدایش کے سات مقامات، سفرِ استثناء کے دو مقامات، سفرِ مزامیر کے دو مقامات، اشعیاء کے چودہ مقامات، میخا، حبقوق اور حجی کے ایک ایک اور سفرِ ملاخی کے دو مقامات پر ایسی بشارتیں موجود ہیں جن میں نبیِ اسلام ﷺ کا ذکرِ جمیل موجود ہے۔

سفرِ ملاخی (باب: ۵، آیت: ۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''میں روزِ قیامت سے پہلے پہلے ایک نبی ایلیاء بھیجوں گا۔''

جبکہ ایلیاء اور احمد دونوں کا عدد ایک ہی ۵۳ ہے۔ محمد نبی الاسلام (ص: ۲۷) اور تفہیم القرآن (۵/ ۴۶۱) میں کلمہ ایلیاء کے بعد قوسین میں [حضرت الیاس علیہ السلام] لکھا ہوا ہے، جبکہ مؤلف ''محمد نبی الاسلام'' نے لفظوں کے عددوں پر بکثرت اعتماد کرنے والی یہود کی عادت کے پیشِ نظر ثابت کیا ہے کہ ایلیاء سے مراد ''احمد'' ہیں، کیوں کہ دونوں کا عدد ۵۳ ہے۔

---

[1] محمد في الكتاب المقدّس (ص: ٣٤) خاتم النّبيّين، محمد أبو زهره (١٥/ ٩٣) معالم النور عبّاس محمود عقاد.

[2] محمد نبی الإسلام (ص: ٧) محمد عزّت طهطاوی.

[3] محمد نبي الإسلام (ص: ٢٥) محمد عزّت طهطاوی.

بائبل کا عہدِ جدید یا انجیل اور اس کی ملحقہ کتابیں

بائبل کے عہدِ قدیم یا تورات اور اس کی ملحقہ کتابوں کی طرح ہی عہدِ جدید یا انجیل اور اس کی ملحقہ کتابوں میں بھی نبی ﷺ کے بارے میں بکثرت بشارتیں موجود ہیں۔ تورات کی طرح ہی انجیل بھی کسی ایک کتاب کا نام نہیں، بلکہ اس کے ضمن میں بھی بیسیوں نام آتے ہیں اور اس بات پر تعجّب کی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تو ایک تورات اور ایک انجیل نازل فرمائی تھی، مگر اتنی ساری توراتیں اور انجیلیں کیسے ہوگئیں۔ یہی چیز دراصل ان کے تحریف شدہ ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب شُدہ انجیلوں کی تعداد ستّر تھی۔ بعض عیسائی مؤلّفین نے تو ایک سو تک ان کی تعداد لکھی ہے، پھر ۳۲۵ء میں اہلِ انجیل کا ایک عالمگیر اجتماع ہوا۔ جس میں اڑتالیس ہزار عیسائی علماء جمع ہوئے۔ انھوں نے کسی ایک رائے پر متفق ہونے کے بجائے بے شمار اختلافات کی ایک خلیج پیدا کر دی اور بالآخر اس وقت کے شاہ قسطنطین نے ۳۱۸ پادری اور بشپ منتخب کیے جو اسی کی طرح الوہیتِ مسیح علیہ السلام کے قائل تھے۔ انھوں نے پھر جو قرار دادیں پاس کیں ان میں سے یہ بھی تھیں:

1. ایک قرار داد الوہیتِ مسیح علیہ السلام کے اثبات اور عقیدۂ تثلیث کے اقرار پر مبنی تھی۔
2. دوسری ایک قرار داد میں حضرت مسیح علیہ السلام کو انسان سمجھنے والے کو کافر قرار دیا گیا۔
3. بشپ اریوس کو کافر قرار دے کر اسے دھتکار دیا گیا۔ جبکہ یہ شخص اسکندریہ [مصر] کے کنیسہ کا پادری تھا اور وہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ مسیح علیہ السلام بشر و مخلوق ہیں، نہ کہ الٰہ یا ابنُ اللہ۔
4. ایک قرار داد میں یہ پاس کیا گیا کہ ہر وہ کتاب جو اُلوہیتِ مسیح علیہ السلام کے عقیدے کے خلاف مواد پر مبنی ہو اسے جلا دیا جائے۔ یا کم از کم اس کے مطالعہ کو حرام قرار دیا گیا۔

اسی ضمن میں عیسائیوں کے اہلِ توحید فرقوں کی معتبر کتابیں بھی آ گئیں جو بشریتِ مسیح علیہ السلام اور ان کے فقط رسول ہونے کا پتا دیتی تھیں۔ انھی سے انجیل برنا باس بھی تھی۔[1]

نیز اہلِ انجیل کے ۳۲۵ء میں منعقدہ اجتماع میں یہ طے پایا:

[1] محمد نبي الإسلام في التوراة و الإنجيل و القرآن (ص: ۷۷)

صرف اناجیلِ اربعہ یعنی انجیلِ متّٰی، انجیلِ مرقس، انجیلِ لوقا، اور انجیلِ یوحنّا، اور ان چار انجیلوں کے ساتھ ساتھ پطرس کی طرف منسوب انجیلِ صَبوہ کو کتبِ مقدسہ قرار دیا جائے اور باقی تمام انجیلوں کو ضائع کر دیا جائے۔ جبکہ اس زمانے تک یہ پانچوں انجیلیں انتہائی غیر معروف تھیں۔ بس بات صرف اتنی تھیں کہ ان میں کچھ ایسا مواد موجود تھا جو الوہیتِ مسیح علیہ السلام، اور ایسے بعض دیگر فاسد و باطل عقائد پر مبنی تھا، لہٰذا انھیں مقدس قرار دے دیا گیا۔

خود یہ پانچوں انجیلیں بھی تحریف اور تغیر و تبدّل سے نہ بچ سکیں جس کا اعتراف مسیحی عالم ہارون نے اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۲۲ء کی جلد چہارم قسمِ ثانی اور بابِ دوم میں، اور لارڈنر نے اپنی تفسیر کی جلد پنجم میں اور بعض دیگر عیسائی اہلِ علم نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ پروٹسٹنٹ عقیدے کے مشہور کرسچن عالم پارکز کے حوالے سے ایک جرمن عیسائی لکھتا ہے:

''عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کی عبارتوں میں تیس ہزار مقامات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جب کہ ان کے بشپ مَل کا کہنا ہے کہ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ایک لاکھ پچاس ہزار عبارتوں میں اختلاف ملتا ہے''

۳۲۵ء میں ہونے والے نیقیہ کونسل کے عالمگیر اجتماع کے بعد عہدِ جدید میں جو کتب و رسائل شامل کیے گئے۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں بیس کتابیں ہیں۔ جن میں مروّجہ اناجیلِ اربعہ بھی ہیں۔ اور دوسری قسم میں سات کتب و رسائل شامل ہیں۔ پھر ۳۶۴ء میں سات اور ۳۹۷ء میں پانچ مزید کتابیں عہدِ جدید میں شامل کر دی گئیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ سو سال بعد جب پروٹسٹنٹ فرقے کا ظہور ہوا تو انھوں نے ان کتابوں میں سے سات مکمل کتب اور ایک کتاب کے بعض ابواب کو ردّ کر دیا۔

آج عیسائیوں کے پاس موجودہ اناجیلِ اربعہ میں بھی تمام تحریفات کے باوجود کئی مقامات پر ایسے واضح اشارات موجود ہیں جن میں ہمارے نبیِ اکرم ﷺ کی بعثت کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ ایسے ہی ایک انجیل برناباس ہے جسے اگر کوئی بھی شخص تعصّب کی عینک اتار کر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور دوسری چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کرے گا کہ یہ ان چاروں سے بدرجہا

---

[1] محمد نبي الإسلام (ص: ۸۱ تا ۸۸) اظهار الحق (۱/ ۹۷، ۱۰۰) طبع مصر.

بہتر ہے اور اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات دوسری انجیلوں کی نسبت زیادہ واضح، مفصّل اور مؤثّر طریقے سے بیان ہوئی ہیں۔ اس انجیل میں بھی آپ ﷺ کا بکثرت ذکر موجود ہے۔

انجیل برناباس عیسائیوں کے یہاں غیر معتبر کیوں ہے؟

اناجیلِ اربعہ کی نسبت سب سے زیادہ بشارتیں اور نبی مکرم ﷺ کا ذکرِ جمیل انجیل برناباس میں ہے اور وہ ہے بھی صحیح ترین انجیل، کیوں کہ عیسائیوں کے یہاں جو چار انجیلیں معتبر مانی جاتی ہیں ان میں سے کسی ایک کا مؤلف بھی ایسا نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صحابی ہو اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ''ان کی اناجیل میں درج معلومات انھوں نے کسی صحابی یا حواری سے سُنی ہوں، اور نہ ہی کوئی سند یا حوالہ ہے۔''

اس کے برعکس انجیل برناباس کے مصنّف کہتے ہیں:

''میں مسیح علیہ السلام کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں۔ شروع سے آخر تک مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہا ہوں، اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سُنے اقوال اس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔''

یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں کہتے ہیں:

''دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیح علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دُنیا کے سامنے لانا تیری ذمہ داری ہے۔''

اس انجیل برناباس میں توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفاتِ باری تعالیٰ، عبادات کی رُوح اور اخلاقِ فاضلہ کے مضامین بڑے ہی پرزور اور مدلّل و مفصّل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان، طرزِ بیان، طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر تھوڑا سا بھی آشنا ہو تو اس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اناجیلِ اربعہ کی نسبت انجیل برناباس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی اصلی شان میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مگر مسیحی لٹریچر میں جہاں کہیں اس انجیل کا ذکر آتا ہے اسے یہ کہہ کر ردّ کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس کی طرف

منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر بول دیا گیا ہے کہ اس میں کئی جگہ بصراحت نبی ﷺ کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔

۱۔ اوّل تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہوسکتی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اگر مسلمان کی تصنیف کردہ ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہوتی۔ مگر یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمۂ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔ امام طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابن حزم اور دیگر مسلم مصنّفین جو مسیحی لٹریچر پر وسیع معلومات رکھنے والے تھے، ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برناباس کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں پائی جانے والی کتابوں کی بہترین فہرستیں مثلاً ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں۔ وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برناباس کا نام تک نہیں لیا ہے۔

۳۔ اس دعوے کے جھوٹ ہونے کی تیسری اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی پیدائش سے بھی ۷۵ سال پہلے پوپ گلاسیس اوّل کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کن کتابوں کی فہرست مرتّب کی گئی تھی، اور ایک پاپائی فتوے کے ذریعے سے جن کا پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا تھا، ان میں انجیل برناباس بھی شامل تھی۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت کونسا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی؟ یہ بات تو خود عیسائی علماء نے تسلیم کی ہے کہ شام، اسپین، مصر وغیرہ ممالک کے ابتدائی کلیسا میں ایک مدت تک برناباس کی انجیل رائج رہی ہے، مگر چھٹی صدی میں آکر اسے ممنوع قرار دیا گیا۔[1]

اس انجیل کو ردّ کرنے اور ممنوع قرار دینے کا سبب دراصل اس کے سوا کوئی نہیں کہ اس میں عیسائیوں کی موجودہ بدعقیدگی کے خلاف اور نبیِ اکرم ﷺ کے حق میں بکثرت مواد موجود تھا۔

---

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: تفہیم القرآن (۵/ ۴۵۹ تا ۴۷۰) محمد نبی الإسلام في التوراة و الانجیل و القرآن (ص: ۴۳ تا ۴۷)

موجودہ اناجیل میں نبی اقدس ﷺ کے متعلق بشارتیں

نبیِ اکرم ﷺ کی بعثت کے بارے عیسائیوں کے ہاں معتبر مانی جانے والی اناجیلِ اربعہ اور انجیل کے صحیح ترین نسخہ ''انجیل برناباس'' میں بشارتیں موجود ہیں، مثلاً انجیلِ یوحنّا اس بات پر گواہ ہے:

''مسیح علیہ السلام کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصوں کے منتظر تھے، ایک مسیح علیہ السلام، دوسرے ایلیاء [یعنی حضرت الیاس علیہ السلام کی آمدِ ثانی]، اور تیسرے وہ [جس کی خبر تورات میں دی گئی تھی]۔''

اس انجیل کے باب اوّل (آیات: ۱۹ تا ۵۲) میں ہے:

''اور یوحنّا [حضرت یحییٰ علیہ السلام] کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا۔ بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا: پھر تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔ انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح علیہ السلام ہے، نہ ایلیاء علیہ السلام، نہ وہ نبی، تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟''

یہ الفاظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت ایلیاء علیہ السلام کے علاوہ ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے اور وہ یوحنّا [حضرت یحییٰ علیہ السلام] نہ تھے۔ [بلکہ وہ نبیِ منتظر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہی تھے]۔

اسی انجیل یوحنّا کے باب: ۱۴، ۱۵، ۱۶ میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بعد آنے والے نبی کی خبر دی ہے جس کے متعلق وہ کہتے ہیں:

''وہ دنیا کا سردار [سرورِ عالم] ہوگا، ابد تک رہے گا، یعنی اس کی شریعت قیامت تک کے لیے ہوگی۔ وہ سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا اور خود ان کی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی دے گا۔''

ان تینوں ابواب میں ''رُوح القدس'' اور ''سچائی کی رُوح'' وغیرہ الفاظ شامل کرکے [اہلِ

کتاب کی طرف سے] مدّعا کو خبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، مگر اس کے باوجود اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی ہے وہ کوئی رُوح نہیں بلکہ انسان ہوں گے۔ انجیل یوحنّا کے باب ۱۳۶ کی آیات ۷ تا ۲۱ کے مابین یہ چیز بالصراحت موجود ہے کہ وہ نبی ''بشری جسم والے'' ہوں گے۔[1] اور یہ کہ وہ ایک خاص شخص ہے جس کی تعلیم عالمگیر، ہمہ گیر اور قیامت تک رہنے والی ہوگی۔[2]

نیز انجیلِ متّی (باب: ۱۱، آیت: ۱۴) میں ہے:

''اگر تم اتباع کرنا چاہتے ہو تو اس ایلیاء کی اتباع کرنا۔ جو اپنی بعثت و رسالت کے وقت آئیں گے۔ جس کے سُننے کے لیے دو کان ہیں وہ اچھی طرح یہ بات سُن لے۔''

یہاں ایلیاء کی بشارت دی گئی ہے جبکہ یہ لفظ اپنے اعداد کے لحاظ سے نبیِ اکرم ﷺ کے اسمِ مبارک ''احمد'' کے برابر ہے۔[3]

نیز انجیلِ مرقس (باب: ۱، آیت: ۷) میں ہے:

''وہ [یوحنّا] بالتکرار کہا کرتے تھے کہ میرے بعد [نبی] آنے والا ہے جو مجھ سے زیادہ قوی ہوگا۔''

اس آیت میں تحریف کر کے اہلِ کتاب نے یہ لکھ دیا ہے: ''انہی دنوں یسوع علیہ السلام آ گئے۔''

حالانکہ یوحنّا کی بشارت یہ ہے:

''وہ قوی نبی میرے بعد آئے گا۔ جبکہ یسوع علیہ السلام ان کے ہمعصر تھے۔''

لہٰذا یہ واضح اشارہ ہے کہ وہ قوی نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ ہی ہوسکتے ہیں۔ ایسے ہی انجیلِ لوقا (باب: ۲۰، آیت: ۱۶) میں بھی آپ ﷺ کے متعلق بشارت موجود ہے۔ الغرض عیسائیوں کے ہاں معتبر مانی جانے والی اناجیلِ اربعہ میں سے انجیلِ متّی کے تین مقامات، انجیلِ مرقس کے دو مقامات،

---

[1] محمد نبی الإسلام (ص: ٦١)

[2] تفهيم القرآن (٥/ ٦٤ـ ٤٦١) محمد نبي الإسلام (ص: ٣٥ تا ٤٠) خاتم النبيّين محمد ابو زهره (١/ ٩٧) طبع حکومتِ قطر.

[3] محمد نبی الإسلام (ص: ٢٧، ٢٨، ٣١)

انجیلِ لوقا کے ایک مقام اور انجیلِ یوحنّا کے چار مقامات پر نبیِ اکرم ﷺ کے بارے میں بشارتیں موجود ہیں، جبکہ انجیلِ برناباس کے دو چار نہیں بلکہ چالیس مقامات پر ہمارے نبیِ رحمت ﷺ کے بارے میں بشارات پائی جاتی ہیں۔

ان تمام بشارتوں کی نصوص محمد عزّت طہطاوی نے اپنی کتاب ''نبی الاسلام'' (ص: ۳۱ تا ۶۷) میں نقل کی ہیں۔ جبکہ انجیلِ یوحنّا کی مذکورۃ الصدر نصوص کے علاوہ انجیلِ برناباس کی متعدد بشارتیں ''تفہیم القرآن'' (۵/ ۱۷۴۔۲۷۴) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''الوفا باحوال المصطفیٰ'' (۱/ ۶۷ تا ۱۲۵) میں ابن قتیبہ کے حوالے سے تورات وانجیل کی بکثرت بشارتیں ذکر کی ہیں۔ آپ کو ان نصوص کے مطالعہ کے دوران میں کہیں یونانی زبان کا لفظ فارقلیط یا برقلیطُس اور کہیں سریانی زبان کا لفظ مُنْحَمَنّا ملے گا۔ ایسے ہی عبرانی کا لفظ ایلیاء بھی ہے۔ یہ دراصل ایک ہی ذاتِ گرامی [محمد واحمد] ﷺ کے گرد گھومتے ہیں اور ان کا معنیٰ بھی وہی ہے جو لفظِ محمد واحمد کا ہے۔[1]

ہندوؤں کی کتب میں بشارات

یہود ونصاریٰ کی کتب کی طرح ہندوؤں کے یہاں مقدّس مانی جانے والی مذہبی کتب میں بھی نبی ﷺ کے بارے میں بشارات مذکور ہیں۔ چنانچہ کراچی کے ایک مجلّہ ''ندائے دین'' نے اپنی ماہ نومبر ۱۹۷۸ء کی خصوصی اشاعت ''سیرت نمبر'' میں الحاج بشیر الدین پنڈت صاحب کا ایک مضمون شائع کیا تھا جسے بعد میں صدّیقی ٹرسٹ کراچی والوں نے اپنے سلسلۂ اشاعت نمبر ۱۸۰۴ کے تحت ایک پمفلٹ کی شکل میں چھاپ کر تقسیم کیا ہے۔[2]

اس مضمون میں موصوف نے پہلے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں [ویدوں، اُپ نشدوں اور پرانوں] کا تعارف کروایا ہے اور ویدوں میں سے [منوجی] اتھرووید کو آخری وید بتایا ہے اور لکھا ہے:

> ''اس کا زمانۂ تالیف سوامی دیانند جی کے بقول تو ایک ارب اکتیس کروڑ برس ہے۔ لیکن عصرِ حاضر کے محقّقین انھیں چار ہزار سال پرانا بتاتے ہیں، جبکہ یہی زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔''

---

[1] تفهيم القرآن (٥/ ٤٦٥) نقلًا عن سيرت ابن هشام (١/ ٢٤٨)

[2] اس ٹرسٹ نے ہمارے بعض رسائل بھی شائع کیے ہیں۔ وللّٰه الحمد.

آگے پرانوں اور ویدوں کو ہمعصر اور ویدوں کو پرانوں کے مصدِّق قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''جن پرانوں کے وید مصدِّق ہیں چونکہ انہی میں حضور نبیِ کریم ﷺ کے متعلق بشارتیں ہیں اس لیے بعض لوگ یہ عذر پیش کر دیتے ہیں کہ یہ نقلی ہیں، اصل غائب ہوگئے ہیں۔ یہ عذر غلط ہے، اس لیے کہ پران ہندوؤں میں ویدوں کے مقابلے میں زیادہ زیرِ استعمال ہیں۔ تعجّب یہ ہے کہ پران جو شروع زمانہ سے آج تک بکثرت پڑھے جاتے ہیں وہ تو گم ہوگئے، مگر وید جن کو بہت کم لوگ پڑھتے اور جانتے ہیں وہ باقی رہ گئے؟ اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ پرانوں میں پیش گوئیاں بعد میں شامل کی گئیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو آج ہندوستان کے کسی گوشے میں کوئی نہ کوئی پران تو کسی برہمن کے گھر سے ایسا دیکھنے کو ملتا جو پیش گوئیوں سے خالی ہوتا۔''

پھر آگے سام وید (پھاٹک: ۲، رشی: ٦، منتر: ۸) کے حوالے سے نبی ﷺ کے بارے میں بشارت ذکر کی ہے اور آگے چل کر مزید بشارات بھی نقل کی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

1- سام وید میں آنحضرت ﷺ کا ذکر:

ترجمہ: ''احمد نے اپنے رب سے پُر حکمت شریعت کو حاصل کیا۔ میں سورج کی طرح روشن ہو رہا ہوں۔ یعنی میں [رشی وتسہ کنو] اس بشارت کو دیکھتے وقت آفتابِ رسالت کے نور سے منور ہو رہا ہوں۔''

قرآن شریف اس منتر کے راز کو اس طرح کھولتا ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿45﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾ [الأحزاب: ٤٥۔ ٤٦]

''اے نبی! ہم نے تجھے شاہد، مبشّر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور تو اللہ کی طرف سے اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا سورج ہے۔''

تشریح: روشنی دو طرح کی ہوتی ہے اجرامِ فلکی کی، ایک وہ اجرام جو بذاتِ خود روشن ہیں جیسے سورج، دوسرے وہ اجرام جو اس سے روشن ہوتے ہیں۔ جیسے رات کے وقت چاند، ستارے سورج کی

روشنی کی گواہی دیتے ہیں۔ اس لیے رشی وتسہ کا یہ کہنا کہ میں سورج کی مانند روشن ہوں، درحقیقت سراجاً منیراً کے لیے ایک گواہی ہے۔ اور وہ ''سراجاً منیراً'' احمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

2- اتھروید کے کنتاپ سوکت میں بشارات:

اتھروید تینوں ویدوں کے مجموعے کا نام ہے، اس میں رگوید کی رچائیں [محامد] سام وید کے گانے اور یجروید کی عبادت کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مہلک امراض سے شفا، جنگ میں فتح ونصرت کے نسخے اور بہشت و دوزخ کے تفصیلی بیانات بھی ہیں۔ اس لیے اس وید کو برہم وید [علمِ الٰہی] کہا جاتا ہے۔ جس طرح بائبل کا ماخذ الواحِ بابل ہیں، اسی طرح ویدوں کی اندرونی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ اتھروید صحیفۂ ابراہیم علیہ السلام کی بڑی حد تک نقل ہے۔ رگوید کا ۱/۵ حصہ بائبل کی طرح بابل کے صحائف سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بابل اور مصر کے بادشاہوں کی جنگوں کا حال بھی ہے۔[1]

اتھروید کے بیسویں باب کے کچھ سوکت کنتاپ سوکت کہلاتے ہیں۔ ان کو طویل یگیوں اور قربانیوں میں ۱۷ پجاری بڑے اہتمام سے پڑھا کرتے تھے اور یہ ہر سال ہوا کرتا ہے۔ گویا ایک طرح سے انھیں یاد رکھنے کے لیے ہندو قوم کو توجّہ دلائی جاتی ہے۔

کنتاپ کے معنیٰ ہیں: پیٹ کی پوشیدہ گلٹیاں۔ یہ نام ان مَنتروں کا غالبًا اس لیے رکھا گیا کہ ان کا راز آیندہ زمانے میں ظاہر ہونے والا ہے۔ یہ راز نافِ زمین [مکہ] سے تعلق رکھتا ہے۔ مکہ کی زمین کو اُمّ القریٰ [نافِ زمین] الہامی کتب میں بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہیں سب سے پہلے اللہ کا گھر بنا اور نسلِ انسانی کو یہیں سے روحانی غذا ملنا شروع ہوئی۔

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ﴾

[آل عمران: ٩٦]

قرآن شریف میں مکہ کے دو نام ہیں۔ ایک بکہ، دوسرا مکہ۔ بکہ کے معنیٰ ہیں: بطن [پیٹ زیرِ ناف] اور مکہ کے معنیٰ ہیں: پستان۔ انسان کو اپنی ماں سے غذا دو جگہ سے ملتی ہے، یعنی پیٹ [رِحم مادر] سے اور چھاتیوں سے۔ اِسی طرح نسلِ انسانی کی ابتدائی پرورش [کنتاب] [پوشیدہ گلٹیاں۔ رحمِ مارد]

[1] تفصیل کے لیے ڈاکٹر پران ناتھ پروفیسر بنارس ہندو یونیورسٹی کا مضمون دیکھیں جو ٹائمز آف انڈیا کے جولائی و اگست ۱۹۳۵ء میں چھپا ہے۔

یعنی بطنِ مکہ سے شروع ہوئی۔ مگر جب بچہ رحمِ مادر سے مکمل ہو کر باہر آ گیا، یعنی وسیع دنیا میں قدم رکھا، تو یہی گلٹیاں چھاتی میں دودھ بن گئیں۔ اِسی طرح انسان کی پرورش کا سامان اب مکہ میں یا ماں کی چھاتیوں میں ہے۔ کنتاپ سوکتوں کو لوگ اب تک معمّہ یا پہیلیاں سمجھتے رہے۔ چنانچہ پروفیسر پنڈت راجا رام، پروفیسر میکولر بلوم فیلڈ وغیرہ نے ایسا ہی سمجھا۔ لیکن یہ گلٹیاں اب واضح ہو چکی ہیں۔

3- کنتاپ سوکت کا پہلا منتر اسمِ مبارک آنحضرت ﷺ:

ترجمہ: ''اے لوگو! یہ [بشارت] احترام سے سنو۔ محمد تعریف کیا جائے گا۔ ساٹھ ہزار اور نوے دشمنوں میں اس ہجرت کرنے والے [امن پھیلانے والے کو] ہم [حفاظت میں] لیتے ہیں۔''

تشریح: نراشنسہ یعنی لوگوں میں تعریف کیا گیا۔ کُورم یعنی امن پھیلانے والا یا مہاجر شیلسٹی سہسر مکہ کی آبادی اس وقت ساٹھ ستّر ہزار تھی جیسا کہ ابنِ اثیر [الکامل فی التاریخ] وغیرہ نے لکھا ہے۔

واضح اسمِ گرامی:

ترجمہ: ''اس نے ماح رشی کو سَو [۱۰۰] دینار، دس [۱۰] تسبیحیں، تین سَو [۳۰۰] گھوڑے، اور دس ہزار [۱۰۰۰۰] گائیں دیں۔''[1]

تشریح: ما یعنی مہا بمعنیٰ بہت زیادہ۔ مح یعنی تعریف کیا گیا۔ عروتام یعنی عربی گھوڑے۔

مطلب: پیش گوئیاں بالعموم استعارات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس منتر میں سَو [۱۰۰] طلائی دینار وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جنھوں نے مکہ کے پُرفتن دَور میں مکہ سے حبشہ کو ہجرت کی۔ سرجہ یعنی گلدستہ تسبیح، سردار [گوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۴ منتر ۲ میں سرجہ بمعنی سہرہ] عشرہ مبشرہ مراد ہیں۔ عروہ بمعنیٰ تیز رَو یا عربی گھوڑے۔ ان سے مراد اصحابِ بدر ہیں جو تین سَو تیرہ [۳۱۳] تھے۔ گو کا ماہ گم یعنی جنگ کے لیے نکلنا [رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۳۳ منتر ٦] گائے کو رعب و جلال اور ہلاکت کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ [رگوید منڈل ۵ سوکت ۵٦ منتر ۳]۔ گائے صلح و اتفاق و اتحاد کی علامت بھی ہے۔ [رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۱۲ منتر ۳]۔

---

[1] مترجمہ پنڈت کھیم کرن و پروفیسر راجا رام۔

ان تشریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھی گائے کی طرح مقدّس اور رحم ومحبت کے مجسّمہ ہیں، اور اِندر دیوتا کی طرح بارعب اور خوفناک بھی ہیں۔ اس تضاد کی پہیلی کو قرآن شریف نے اِس طرح حل فرمایا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: ٢٩]

’’محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں۔‘‘

مکہ کی فتح کے وقت ٹھیک دس ہزار کی قدوسی جماعت آپ ﷺ کے ساتھ تھی۔

مذکورہ بالا منتر میں حسبِ ذیل باتیں قابلِ غور ہیں:

1- اس منتر میں حضرت محمد ﷺ کا صفاتی نام جو ذاتی نام سے بھی کسی قدر مشابہ ہے، موجود ہے۔

2- آپ ﷺ کو رشی یا پیغمبر بتایا گیا ہے۔

3- آپ ﷺ کو خالص سونے کے طلائی دینار یعنی السابقون الاوّلون صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دیے جانے کا ذکر ہے۔

4- عشرہ مبشّرہ یعنی با اقبال جنت کے دس گلدستوں کا عطیّہ۔

5- عابد، زاہد، عالم، جنگجو ۳۱۳ تاریخی اصحابِ بدر کا ذکر۔

6- فتح مکہ کے وقت دس ہزار قدسیوں کی جماعت کا ذکر۔

دنیا کی تاریخی روشنی میں یہ ساری خوبیاں اور نشانات صرف آنخضرت ﷺ کے سوانح حیات میں ملتی ہیں۔ اور یہ نشانیاں ٹھیک اِسی ترتیب کے ساتھ ہیں جیسی کہ بعد کو تاریخی وجود میں آئیں۔ دنیا کے کسی رشی یا پیغمبر کے ساتھ بجُز آنخضرت ﷺ کے ان کی تطبیق نہیں کی جا سکتی۔

4- جنگِ احزاب کا مفصّل ذکر:

اتھروید (کانڈ ۲۰، سوکت ۲۱، منتر ۶) حسبِ ذیل ہے:

ترجمہ: ’’اے صادقوں کے رب! تجھے ان سرور دینے والوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں اور مستانہ ترانوں سے دشمن کی جنگ میں مسرور کیا کہ جب حمد کرنے والے نیز عبادت

کرنے والے کے لیے تو نے دس ہزار دشمنوں کو بغیر مقابلہ شکست خوردہ کر دیا۔''

معنیٰ: برتر بتے شو بمعنیٰ صادقوں کے رب۔ امدَ ن بمعنیٰ مسرور کیا۔ اور سنسٹر یاتے ان بہادرانہ کاموں سے۔ سوماسہ یعنی مستانہ ترانوں نے۔ ورِتر بمعنیٰ دشمن کا رَدِے بمعنیٰ حمد کرنے والے کے لیے۔ ورہشمتے بمعنیٰ عبادت کرنے والے کے لیے۔ اپرتی بمعنیٰ بغیر مڈبھیڑ۔ فی ورہتہ یعنی تو نے شکست خوردہ کر دیا۔ ہتیشو یعنی جنگ میں۔

تشریح: ویدمنتر میں اللہ تعالیٰ کو ست پتی یعنی صادقین کی تربیّت کرنے والا بتایا ہے۔ صادقین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صفت ہے، چنانچہ ان کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ [الأحزاب: ٢٣]

ویدمنتر میں دوسری نشانی یہ ہے: ''سرور دینے والوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں اور ترانوں سے اللہ کو راضی کر دیا۔'' اس کا نقشہ قرآن پاک میں یوں کھینچا گیا ہے:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۚ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا﴾ [الأحزاب: ٢٢]

''جب مومنوں نے دشمن کے لشکر کو دیکھا۔ انھوں نے کہا یہ وہ ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے کیا تھا [اس نظارہ نے] ان کے ایمان نیز تسلیم و رضا کی ایمانی قوّت کو زیادہ کر دیا۔''

تیسری نشانی دس ہزار کے لشکرِ عظیم کو جو تین ہزار کے مقابل تھا اور ہر طرح سے بڑھ چڑھ کر تھا شکست خوردہ بتایا۔ قرآن شریف میں یہ آیت جنگِ احزاب کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے نازل ہو چکی تھے: ﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ﴾ [صٓ: ١١]

چوتھی نشانی اسمِ احمد کا ذکر۔ کاروے یعنی حمد کرنے والے یعنی احمد۔ پروفیسر گرفتھ نے اس کا یہ ترجمہ اور پروفیسر پنڈت راجا رام نے ستوتا یعنی حمد کرنے والا کیا ہے۔ یہ صفاتی نام ہے جو اس جنگ کا ہیرو ہے۔ وہ حمد کرنے والا بھی ہے اور سپہ سالار بھی۔

حمد کرنے والے کی دوسری صفت لفظ برہشتمے ہے۔ جس کے معنی ہیں مقدّس گھاس، جو دیدی

[آتش کدہ] کے کناروں پر بچھائی جاتی ہے۔ استعارہ مقدّس گھاس والا سے مراد عبادت گزار ہوتی ہے۔ دوسرے معنیٰ اس کے روشن اور نورانی شخص کے بھی ہیں۔ یعنی احمد نہ صرف اللہ کی حمد کرنے والے ہیں بلکہ عین میدانِ جنگ میں اللہ کی عبادت کرنے والے بھی ہیں۔ یہ وید منتر کی پانچویں نشانی ہے۔ آخری نشانی ہے: دشمن کا بغیر مقابلہ کیے فرار ہوجانا۔ اس کی وجہ اس سوکت کے منتر ۱ تا ۵، منتر ۷ اور ۸ میں بیان کی ہے۔ ان منتروں میں خطاب ہے اِندر دیوتا سے۔ جو تند و تیز ہوا کا رفیق اور رعد و کڑک کا دیوتا ہے۔ اس جنگ میں دشمن تند ہوا اور کڑک سے ڈر کر یا اِندر دیوتا سے خوف کھا کر بھاگ گیا۔ چنانچہ وید کے اپنے الفاظ ہیں:

''تونے اے اِندر! دس ہزار دشمنوں کو بغیر مڈھ بھیڑ کے شکست خوردہ کر دیا۔''

دشمن کی ہزیمت واقعی ایک حیرت انگیز امر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ دراصل مسلمانوں کے ساتھ نہیں تھا بلکہ اِسی خالقِ فطرت کے ساتھ تھا جس کے ایک ادنیٰ غلام تُند ہوا، جھکّڑ اور رعد و کڑک سے دشمن خوف زدہ ہو کر فرار ہوگیا۔ قرآنِ کریم نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا﴾ [الأحزاب: ۹]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم پر لشکر آپہنچے۔ سو ہم نے ان پر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو بھیجا جنھیں تم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور اللہ اُسے جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔''

جنگِ احزاب صداقتِ اسلام کا کھلا معجزہ ہے۔[1]

---

[1] نشریہ نمبر ۱۰۸٤، از صدیقی ٹرسٹ کراچی.

باب 2

سیرت امام الانبیاء ﷺ بعد از ولادت و قبل از بعثت

شبِ ظلمت، ولادت و بعثتِ نبوی کے وقت دنیا کی مذہبی، اخلاقی اور سیاسی حالت

ایک اجمالی خاکہ:

پچھلے صفحات میں بڑے اختصار کے ساتھ ہم نے نبیِ اکرم ﷺ کی سیرت کا خاص وہ پہلو یعنی سیرت قبل از ولادت پیش کیا ہے جو عام انسانوں کی سوانح حیات میں نہیں پایا جاتا۔ آیندہ ہمیں سیرتِ رحمۃٌ للعالمین ﷺ کے دوسرے باب یعنی سیرت بعد از ولادت کی طرف پیش قدمی کرنا ہے جو اپنی وسعتوں اور پہنائیوں کے اعتبار سے ایک بحرِ بے کنار ہے، اورعربوں میں مثل مشہور ہے:

''تُعْرَفُ الْأَشْيَاءُ بِأَضْدَادِهَا'' ''ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔''

اور بقول سیّد سلیمان ندوی رحمہ اللہ:

''اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت امس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شبِ تار ہی میں ہوتی ہے۔ اور فضا جس قدر تاریک ہو بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہہ نہیں کہ اصلاحی تحریک کی وقعت وعظمت جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اُس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی جس کے لیے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی۔''

لہٰذا آیئے! پہلے نبیِ اکرم ﷺ کی ولادت و بعثت اورظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدّنی و سیاسی اور مذہبی و اخلاقی حالت کا جائزہ لیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ''تاریخ شاہد ہے کہ اُس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارض تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، کیوں کہ تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا۔

توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرّہ ذرّہ محروم تھا۔مصر، یونان، روم وغیرہ ممالک میں سورج، چاند اور ستاروں کی خدائی تھی، انہی کے معبد تھے اور انہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ ہر جگہ پتھر، مورتیوں، مٹی کی صورتوں اور سونے، چاندی و جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

آپ سوچیں گے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام اور مصلحین کی تعلیمات کیا ہوئیں؟ جی ہاں یہ سچ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چھے سو برس پہلے تزکیۂ نفس کے کچھ درس دیے تھے، مگر مدّت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے بھی پیشتر ہدایت ونجات کی ایک شمع روشن کی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغِ طور بھی جل کر گُل ہوگیا تھا۔

ہر قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا۔حرص وطمع اور کُشت وخون کی گرم بازاری تھی۔نفسِ انسان کی ملکوتی طاقت، سفلی جذبات کے سامنے پامال ہوچکی تھی۔ عدل و راستی اور پاک بازی و پارسائی کی خوشبو انسان کے جامۂ خاکی سے اڑ چکی تھی۔ توحید اور خدا پرستی کا نور دیوی دیوتاؤں، ولیوں شہیدوں اور ستاروں یا مجسّموں کی پرستش کی عالمگیر تاریکی میں چُھپ گیا تھا۔

غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی مصلحِ عالم، معلّمِ اخلاق، داعیِ حق اور بنی نوعِ انسان کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور عرصۂ دراز سے پراگندہ ومنتشر ہوچکنے والے شیرازۂ انسانیت کو پھر سے منظّم کردے، اور روحانیّت اور خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو ازسرِ نو پر بہار کردے، اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر سے مطلعِ انوار بنادے۔“[1]

یہ اس شبِ ظلمت کی داستان یا اس عہد کے مذہبی حالات کا سَرسری و اجمالی خاکہ ہے جس عہد میں ہمارے رسولِ مقبول ﷺ کی ولادت وبعثت ہوئی۔

---

[1] سیرت النبی ﷺ از شبلی نعمانی وسلیمان ندوی (۲۰۹/۴۔۲۱۱)

بوقتِ ولادت دنیا کی سیاسی واخلاقی اَبتری

نبیِ اکرم ﷺ کی ولادت و بعثت یا طلوعِ صبحِ سعادت کے وقت اس روئے زمین کی اہم طاقتیں دوہی تھیں: فارس اور روم۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا، اور سلطنتِ روم کا مذہب عیسائیت تھا جو یورپ و ایشیا اور افریقہ کے تینوں برِّ اعظموں کو گھیرے ہوئے تھا۔

مذہبی حیثیّت سے دو اور قومیں یہود اور ہنود بھی تھیں جن میں سے ہر ایک کا اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ تھا۔ دیارِ عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس ہی تھی جس کے تمدّن کا ستارہ ایک زمانے میں اوجِ کمال پر تھا، مگر عہدِ بعثت سے سَو ڈیڑھ سَو سال پہلے سے ساسانی شان وشوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سا رہ گیا تھا۔ مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خون ریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا۔

مذہبی واخلاقی اعتبار سے ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی۔ اسی کا اثر ہے کہ ایرانی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے اور اخلاقی انحلال وپستی کا یہ عالَم تھا کہ باپ کا بیٹی اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیّت میں لے لینا کوئی غیر معمولی بات نہ تھا۔[1]

کس قدر مقامِ حیرت ہے کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا تھا اور پھر اسے قتل کر ڈالا۔ یہ اخلاق باختگی دیر تک جاری رہی۔[2]

سنن ابو داود (۲/ ۲۶) میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعلِ شنیع سے روکا جائے۔ اہلِ فارس کی بدعقیدگی یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ سلاطین و امراء درجہ بدرجہ رعایا کے دیوتا والٰہ بنے ہوئے تھے اور انھیں سجدے کیے جاتے تھے۔[3]

آغازِ اسلام کے وقت دوسری بڑی سلطنت روم تھی جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب

---

[1] تاریخ غرر اخبار الفرس للثعالبی (ص: ۲۷) طبع پیرس بحوالہ سیرت النبی ﷺ.
[2] مؤرخوں کی تاریخ عالم (۸/۸۴) البدایة والنهایة (۲/ ۵۷۵)
[3] تاریخ غرر اخبار الفرس، ثعالبی (ص: ۵۰۰)

سے بڑی سلطنت تھی اور رومۃ الکبریٰ کہلاتی تھی، مگر اب روم کی قبائے سلطنت بھی ایران سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی بلکہ چھٹی صدی عیسوی کے خاتمے پر یعنی خاتم النبیّین ﷺ کی ولادت کے چند سال بعد روم اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ چکا تھا۔''تاریخ زوال و انحطاطِ سلطنتِ روم'' کے مصنّف گبن کے بقول:

''اس کی حالت بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی جس کے سائے میں ایک وقت تمام اقوامِ عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں۔ اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا اور کُل کاروبار بند ہوگئے تھے۔ وہ بازار و تماشہ گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی، اب ویران و سنسان پڑی تھیں۔''[1]

اس عام سیاسی و اخلاقی زوال وانحطاط کی طرح ہی رومن چرچ کی مذہبی حالت بھی بہت پتلی ہوچکی تھی اور ان پر ضعیف الاعتقادی، قبر پرستی اور شرک و بدعات نے یلغار کردی ہوئی تھی۔ ان امور کا اعتراف خود عیسائی مصنّفین و مؤرخین نے بھی کیا ہے جن کی تفصیلات گبن کی ''تاریخِ زوال وانحطاطِ روم'' جلد اول و سوم، ڈریپر (یہ ایک امریکی مصنّف ہے جس کا پورا نام ہے: John William Draper اور اس کی کتاب کا نام یہ ہے: Conflict between religion and science) کی ''تاریخِ معرکہ آرائی مذہب و سائنس'' اور جارج سیل کے انگلش ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایسی ہی سیاسی، مذہبی اور اخلاقی ابتری وانار کی یہود و ہنود میں پائی جاتی تھی جس پر کتبِ تاریخِ یہود اور آر، سی، دَت کی کتاب ''ہندوستانِ قدیم'' (جلد سوم) شاہد ہیں۔[2]

طلوعِ صبحِ سَعادت کے وقت عربوں کی مذہبی حالت

ولادت و بعثتِ رسول ﷺ کے وقت دنیا کی مختلف قوموں کے سیاسی، مذہبی اور اخلاقی حالات کا سرسری جائزہ تو پیش کیا جا چکا ہے۔ اب ذرا ایک نظر اس قومِ عرب کے حالات پر بھی ڈال لیں جس کے افقِ نبوت سے صبحِ سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

---

[1] تاریخ زوال و انحطاطِ سلطنتِ روم (۳/۲/۳۷) بحوالہ سیرت النبی ﷺ علامہ سلیمان ندوی (۴/۲۱۹۔۲۲۰)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: سیرت النبی ﷺ (۴/۲۱۱۔۲۴۱)

مذہبی طور پر یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم کا اثر تھا کہ قدیم عرب زمانۂ دراز سے صرف معبودِ واحد اللہ تعالیٰ ہی پر اعتقاد رکھتے آرہے تھے، لیکن رفتہ رفتہ دینِ حنیفی کی تعلیمات ماند پڑنے لگیں اور ان میں شرک بال و پَر نکالنے لگا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کو معبودِ اکبر قرار دے کر دیگر بے شمار چھوٹے چھوٹے الٰہ بھی بنا ڈالے تھے۔ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ دنیا کے کاروبار اور روز مرّہ کی ضرورتیں انہی چھوٹے الٰہوں سے پوری ہوتی ہیں اور کام اکثر انہی سے پڑتا ہے، لہٰذا وہ انہی کی پرستش کرنے لگے اور انہی سے حاجتیں طلب کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ تو زمین و آسمان بنا کر ان کے نزدیک گویا بیکار سا ہو چکا تھا۔ (نعوذ باللہ)

اس شرکِ اکبر کے علاوہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا کرتے تھے جس کا تذکرہ سورۃ النجم (آیات: ۲۱۔۲۲ اور ۲۷) میں موجود ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴾

''جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے ہیں۔''

اس نظریے پر نقد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ [النجم: ۲۱۔ ۲۲]

''تمھارے تو لڑکے ہوں اور اللہ کی لڑکیاں، یہ تو کوئی اچھی تقسیم نہیں۔''

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دینے کے بعد [عرب] ان کی الوہیّت کے قائل بھی ہو گئے تھے، جیسا کہ سورت آل عمران (آیت: ۸۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ﴾

''اور نہ اللہ تمھیں اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو رب ٹھہراؤ۔''[1]

وہ لوگ فرشتوں کی عبادت و پرستش کرتے اور انھیں اپنے پرستاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی سمجھتے تھے۔ جیسا کہ سورۃ النجم (آیت: ۲۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا ﴾

''اور آسمان میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش (اللہ کی اجازت کے بغیر) کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔''

---

[1] اسی بات کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیں: سورۃ الزخرف و الصافات۔

فرشتوں کی طرح وہ جنوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے رشتے دار سمجھتے تھے، جیسا کہ سُورۃ الصّٰفٰت (آیت: ۱۵۸) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ﴾

''اور مشرکوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی۔''

اور وہ جنوں کو اللہ تعالیٰ کی الوہیّت و قدرت میں شریک سمجھتے تھے، چنانچہ سورۃ الانعام (آیت: ۱۰۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾

''انھوں نے جنوں کو اللہ کا شریک بنایا حالانکہ وہ اس کی کی مخلوق ہیں۔ اور جانے بغیر اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔''

وہ [قومِ عرب] اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے اور ان سے مرادیں مانگا کرتے تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا اپنا اور ہر کام کے لیے الگ الگ معبود تھا۔ گھر گھر بت خانے بنے ہوئے تھے۔ ان کے ان معبود انِ باطلہ میں سے سب سے بڑا ''ہُبَل'' تھا، اور اس کے بعد منات، لات اور عُزّیٰ تھے۔ ایسے ہی قرآن پاک کی سورت نوح میں کچھ اور بتوں کا بھی ذکر آیا ہے جو یغوث، یعوق، نسر، ود، سواع اور بعل کے ناموں سے پائے جاتے تھے۔

جبکہ بخاری شریف، باب فتح مکہ میں مذکور ہے: ''کعبہ شریف اور اس کے اطراف میں تین سَو ساٹھ [۳۶۰] بُت تھے۔'' بعض عرب تو قبائل چاند، سورج اور ستاروں کی پوجا بھی کیا کرتے تھے۔

عربوں میں بُت پرستی کی ابتدا

عربوں میں بُت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ بنی خزاعہ کا ایک شخص عَمر و بن لحیّ بنو جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولّی بن گیا۔ ایک دفعہ وہ بلقاء گیا تو وہاں کے لوگوں کو بُت پرست دیکھ کر بُت پرستی کی طرف مائل ہوگیا اور وہیں سے ایک بُت [ہُبَل] لا کر کعبہ میں نصب کر دیا۔ چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا، اس لیے تمام عرب نے بُت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بُت خانے بن گئے۔[1]

[1] سیرت النبی ﷺ (۴/۲۴۷) سیرت ابن ہشام (۱/۷۷)

اس عَمر و بن لحیّ کے بارے میں صحیح بخاری میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«رَأَيْتُ عَمْرَو بْنَ لُحَيّ بْنِ قَمْعَةَ بْنِ خِنْدِفَ يَجُرُّ قُصْبَتَهُ فِي النَّارِ»[1]

''میں نے عَمر و بن لحیّ بن قمعہ بن خِندِف کو جہنم میں اپنی انتڑیاں (پھیپھڑوں کی نالی) گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔''

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے:

''میں نے نبی ﷺ کو اکثم بن جون خزاعی سے یہ کہتے ہوئے سُنا: اے اکثم! میں نے عَمر و بن لحیّ کو جہنم میں اپنی انتڑیاں گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے، وہ تیرے بہت ہی زیادہ مشابہ ہے۔ اکثم نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا یہ مشابہت میرے لیے ضرر رساں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، تو مؤمن ہے اور وہ کافر تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے دینِ ابراہیم و اسماعیل [علیہما السلام] کو بدلا اور بُت نصب کیے۔ بحیرہ سائبہ، وصیلہ اور حامی جیسے مشرکانہ تصوّرات کو جنم دیا۔''[2]

عربوں میں کہانت بڑے زوروں پر تھی اور کہانت پیشہ لوگ بھی بڑے مقبول تھے۔ کاہنوں اور نجومیوں کی دکانیں خوب چمکی ہوئی تھیں۔ شگون لینے کے لیے پرندے اُڑانے اور پانسے نکالنے کا رواج عام تھا۔ اوہام پرستی کا یہ عالَم تھا کہ سانپ کو نہیں مارتے تھے اور سمجھتے تھے کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آکر بدلہ لیتا ہے، جیسا کہ ابو داود شریف [۲/ ۳۲۶ مجتبائی] میں ان کے اس وہم کا ذکر موجود ہے۔ ان کے جملہ باطل عقائد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اگر کوئی شخص مظلومیّت میں مارا جائے تو اس کے سَر سے اُلّو نکلتا ہے جو ''ہائے خون ہائے خون'' کہہ کر اس وقت تک چیخ پکار کرتا رہتا ہے جب تک کہ اس کے قاتل سے بدلہ نہ لے لیا جائے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٦/ ٥٤٧) طبع دار الإفتاء.

[2] فتح الباري (٦/ ٥٤٩) سيرت ابن هشام (١/ ٧٦)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: سیرت النبی ﷺ (۴/ ۴۱-۲۴۲) رحمۃ لّلعالمین (۱/ ۳۰-۳۱)

طلوعِ صبحِ سعادت کے وقت عربوں کی اخلاقی حالت

پچھلی سطور میں ہم نے ولادت وبعثتِ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عربوں کی مذہبی حالت کا ذکر کیا ہے۔ جہاں مذہبی طور پر ان لوگوں میں انتہائی ضُعف پیدا ہو چکا تھا اور وہ تمام انواع و اقسامِ شرک میں مبتلا تھے، وہیں ان کی اخلاقی پستی اور انحطاط بھی انتہا کو پہنچ چکا تھا، یہاں تک کہ ذرا ذرا سی بات پر لڑمرنا اور مختلف خاندانوں اور قبائل میں جنگ چھڑ جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ایک ایک لڑائی برسوں جاری رہتی۔ میدانی نیشا پوری نے اپنی کتاب ''الامثال'' میں ایک سَو بتّیس لڑائیوں کے نام اور وقائع لکھے ہیں۔ یہ وہ لڑائیاں ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس سال پہلے سے لے کر ظہورِ اسلام تک ہوئیں۔ بکر وتغلب اور اوس وخزرج کی خونریز لڑائیاں معروف ہیں۔ ایک لڑائی گھڑ دوڑ میں صرف قواعد کی خلاف ورزی سے شروع ہوئی اور چالیس برس تک قائم رہی۔

ام الخبائث شراب کا اس قدر رواج تھا کہ یہ ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی اور تجارت شراب فروشی کی مترادف بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے رواج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے اڑھائی سَو نام ہیں۔ علامہ فیروزی آبادی نے خاص شراب کے ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ یہ مرض ان میں اس قدر رچ بس چکا تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے سورۃ البقرۃ (آیت: ۲۱۹) سورۃ النساء (آیت: ۴۳) اور سورۃ المائدہ (آیت: ۹۰) میں اس کی حرمت کا حکم بتدریج نازل کیا اور تیسری مرتبہ اسے صریحاً حرام قرار دیا۔

شراب نوشی کے ساتھ ہی ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج تھا۔ امام رازی ''تفسیر کبیر'' (۳۳۱/۲) میں لکھتے ہیں:

> ''قمار و جوا کی محفلوں میں شریک نہ ہونا قومی عار سمجھا جاتا تھا۔ شرکت نہ کرنے والوں کو بخیل خیال کیا جاتا اور انھیں ''برم'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے، ان سے شادی بیاہ عار سمجھی جاتی تھی اور انتہا یہ کہ مال و دولت ختم ہوجانے کے بعد وہ بیوی بچوں پر بازی لگا دیتے تھے۔ چالیس سال تک لڑی جانے والی عبس و ذبیان کی جنگ گھڑ دَوڑ کی قمار بازی ہی کا نتیجہ تھی۔ ان لوگوں میں سودخوری بھی عام تھی۔ لوٹ مار،

راہزنی اور ڈاکے تو اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے اور فخریہ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔''

اقتصادی تنگدستی کی وجہ سے بدوؤں حتیٰ کہ عورتوں میں بھی چوری کی عادت پائی جاتی تھی، جیسا کہ بنی مخزوم کی ایک عورت کی چوری کا واقعہ معروف ہے جس کی سفارش کے لیے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بھیجا گیا تو اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

«لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا»[1]

''اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباري" (۱۲/ ۷۷) میں کلبی کے حوالے سے لکھا ہے:

''خود قریش کے کئی لوگ بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔ انھوں نے خانہ کعبہ کے خزانے سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا۔''

مروج الذہب میں مسعودی نے لکھا ہے کہ اہلِ فارس شروع شروع میں کعبہ کے لیے مال و جواہر کے ہدیے بھیجا کرتے تھے۔ ساسان بن مالک نے سونے کے دو ہرن، زروجواہر اور تلواریں ہدیہ بھیجی تھیں۔[2]

ابن قتیبہ نے کتاب المعارف میں لکھا ہے:

''اس چوری کرنے کے سلسلے میں خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔''

دن رات کی لوٹ مار اور کُشت وخون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو چکے تھے۔ زندہ اونٹ کی کوہان اور دُنبے کی چکّی (چکتی) کاٹ کر کباب لگاتے اور زندہ جانوروں کو باندھ کر تیراندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں مقتولین کی ناک کان کاٹ دیتے۔ عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں اور یہ منّت مانی جاتی کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

اسی طرح زناکاری اور فسق و فجور عام تھے اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کیے جاتے تھے۔ اِمرؤ القیس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور دیگر عورتوں کے ساتھ جو بے حیائیاں کیں، خود

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳٤۷۵)

[2] مروج الذهب (۱/ ۲۰۵) بحواله الرحیق المختوم (ص: ۳۳)

اس نے اپنے قصیدۂ لامیہ میں مفصّل وفخریہ ذکر کی ہیں۔ فاحشہ عورتیں اپنے گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتیں۔ بڑے بڑے رؤساء بھی اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرتے اور ان کی کمائی کھاتے تھے جیسا کہ مسلم شریف میں عبد اللہ بن ابیّ رئیس المنافقین کا واقعہ موجود ہے کہ وہ اپنی دو لونڈیوں میکہ اور امیمہ کو زنا کاری پر مجبور کیا کرتا تھا جس پر سورۃ النور (آیت: ۳۳) نازل ہوئی جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ﴾ ''اور تم اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔''

ان میں نکاح کے کئی ایسے طریقے مروّج تھے جو انتہائی حیا سوز تھے۔ شرم وحیا نام کو نہ تھی۔ ننگے کھلے عام نہا لیا کرتے تھے۔[1] وہ قضائے حاجت کے وقت پردہ نہیں کیا کرتے تھے۔[2] وہ کھلی مجلسوں میں اپنی بیویوں سے صحبت کے تمام واقعات بیان کر دیا کرتے تھے۔[3]

حد تو یہ ہے کہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ وہ لوگ مردوزن دونوں ہی ننگے ہوکر بیت اللہ شریف کا طواف کیا کرتے تھے۔[4] سوتیلی ماں پر وراثتاً قبضہ کر کے اسے بیوی بنا لیتے اور نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ آٹھ آٹھ، دس دس شادیاں کر لیتے تھے۔[5] دو حقیقی بہنوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں نکاح کر لیتے تھے اور مجموعی حیثیت سے عورت کو بدترین مخلوق اور عار سمجھتے تھے۔

سورۃ النحل (آیت: ۵۸۔ ۵۹) میں مذکور ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿58﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ دن بھر کالا رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، اس خوش خبری کی برائی کی

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (..........)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (..........)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (..........)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (..........)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (..........)

وجہ سے جو اسے دی گئی۔ آیا اسے ذلت کے باوجود رکھ لے، یا اسے مٹی میں دبا دے۔ سن لو! برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''

اور پھر پیدا ہوتے ہی لڑکیوں کو زندہ درگور کردینے کی رسم چل پڑی۔ سورۃ التکویر کی آیات: ﴿وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ کی تفسیر میں امام ابن جریر و ابن کثیر نے لکھا ہے:

''ایک آدمی نے دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر آپ ﷺ کے سامنے ذکر کیا کہ میں نے اپنے ان ہاتھوں سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں۔''

مزید برآں ان میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ حشرات الارض، چھپکلی، جما ہوا خون، مُردار جانور غرض ہر چیز کھا جاتے تھے۔[1]

سیاسی حالت

نبیِ اکرم ﷺ کی ولادت یا طلوعِ صبحِ سعادت کے وقت تمام دنیا کی مذہبی وسیاسی اور خاص طور پر عربوں کی دینی و اخلاقی حالت آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اس موضوع کی صرف ایک چیز باقی ہے کہ اس وقت عربوں کی سیاسی حالت کیا تھی؟

اس سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ اس مغلوبِ نفس اور غلامِ حرص و ہویٰ قوم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو عوام کو اکٹھا کر کے حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکتا۔ صرف ایک شخص اپنے قبیلے کا برائے نام حکمران ہوتا تھا۔ اس کے باوجود بھی ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتا اور اپنے آپ کو کسی کے فیصلے کا پابند نہیں سمجھتا تھا۔ دوسرے ممالک سے بدلہ لینے کے لیے صرف ایک ''رسمِ محالفہ'' قائم تھی جس میں اس بات کی قسم اٹھائی جاتی تھی کہ ہم ہر معاملے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

مکہ مکرمہ کی بالائی جانب پہاڑوں کی گود میں خوشگوار فضا والے شہر طائف کے قریب سوقِ عکاظ کے نام سے ایک منڈی لگا کرتی تھی۔ اس موقع پر بہادر لوگ اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے۔ شاعر و انشا پرداز اپنے اپنے ادبی شہ پارے پیش کیا کرتے تھے۔ جانوروں کی نمائش ہوتی اور تجارتی لین دین

---

[1] أسباب النزول للسيوطي، آیت: ﴿وَحُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: سیرت النبی ﷺ (۴/۹۱۔۲۶۱) رحمۃ للعالمین (۱/۳۰۔۳۱)

کے امور اور بعض دیگر معاملات پر بھی غور کیا جاتا تھا۔ [آپ اسے ان کی پارلیمینٹ کی اینوئل میٹنگ کہہ لیں یا کوئی اور نام دے لیں]۔

خاندانِ ضجعم کا آخری سردار زیاد بن ہبولہ تھا۔ غسّانیوں نے اسے کمزور دیکھ کر ملکِ یمن سے آکر اس علاقے پر تسلّط جمالیا۔ قبا کو دار الحکومت بنایا اور ملکِ عرب پر باقاعدہ حکومت کی نبیاد رکھی۔ پھر سلطنتِ روم کو خوش رکھنے کی خاطر کسی حد تک دینِ عیسوی کے زیرِ اثر آ گئے۔

غسّانیوں کے اس فعل سے جہاں عیسائیت کو کافی تقویت ملی، وہیں شام و فلسطین کے ہزارہا مغرور یہودی بھی یہاں آکر آباد ہونے لگے۔ جنوبی عرب میں بھی ایک حکومت قائم تھی مگر مذہبی اختلاف کی وجہ سے نہایت ضعیف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حبشہ و فارس کی فوجیں آئے دن وہاں آکر تباہی مچاتی رہتی تھیں۔ اس وقت فارس یا ایران کا حکمران نوشیرواں اور روم کا فرمانروا ہرقل تھا۔ پروفیسر سیڈیو اپنی کتاب تاریخ العرب میں لکھتا ہے:

''ملکِ عرب کے جنوب پر سلطنتِ حبش، مشرقی حصے پر فارس اور شمالی اقطاع پر روما کی مشرقی شاخ قسطنطنیہ کا قبضہ تھا۔''[1]

ارضِ عرب کے انتہائی جنوب میں سمندر کے کنارے پر آباد یمن پر حبشہ کا ایک جنرل ابرہہ قابض تھا۔ وہی ابرہہ جس نے خانہ کعبہ کی عزّت و شرف سے بوکھلا کر مسلمانوں کی توجّہ ادھر سے ہٹانے کے لیے یمن میں ایک گرجا تعمیر کروایا، مگر عرب لوگ بُت پرستی چھوڑ کر عیسائیّت کی طرف مائل نہ ہوئے تو اُس نے زیارتِ کعبہ کے لیے جانے سے حکماً منع کر دیا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''البداية و النهاية'' میں امام سہیلی اور ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے:

''اس حکم سے عربوں کی آتشِ غضب بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ بنی کنانہ کے ایک بدُو نے گرجے میں چپکے سے غلاظت ڈال دی۔ ابرہہ کو معلوم تھا کہ یہ جرأت کسی عرب کی ہی ہوسکتی ہے، لہٰذا اس نے غضب ناک ہوکر کعبہ شریف کے گرانے کے ناپاک ارادوں سے

[1] تاريخ العرب (ص: ٤٠) بحواله رحمةٌ للعالمين (ص: ٣٠)

مکہ معظّمہ پر لشکر کشی کی۔ قریب پہنچ کر اہلِ مکہ کے مویشیوں کو پکڑنا شروع کر دیا اور عبدالمطّلب، جو ان دنوں قریش کے سردار اور کعبہ کے متولّی تھے، ان کے بھی ایک سَو اونٹ پکڑ لیے۔ وہ جب اونٹ چھڑانے کے لیے خود ابرہہ کے پاس گئے تو اس نے کہا کہ میں تو تمھارے کعبہ کو گرانے آیا ہوں اور تمھیں اپنے اونٹوں کی فکر دامنگیر ہے۔ اس وقت عبدالمطّلب نے یہ تاریخی جملہ کہا:

"اِنِّيْ أَنَا رَبُّ الْاِبِلِ، وَاِنَّ لِلْبَيْتِ رَبّاً سَيَمْنَعُهٗ"

"میں اونٹوں کا مالک ہوں، وہ مجھے لوٹا دو۔ یقیناً اس گھر [کعبہ] کا بھی ایک رب ہے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔"[1]

ربِّ کائنات نے اپنے گھر کی کس طرح حفاظت کی؟ دشمنانِ کعبہ کے ارادوں کو خاک میں ملا کر انھیں کس طرح برباد کیا؟ اس کا ذکر تیسویں پارے کی سورۃ الفیل میں موجود ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴾

"(اے پیغمبر ﷺ!) کیا تو نے (اس واقعے پر) نظر نہیں کی، تیرے مالک نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا (سلوک) کیا؟ کیا اس نے ان کی ساری تدبیر خاک میں نہیں ملا دی؟ اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے۔ وہ ان پر کھنکریاں کی پتھریاں مارتے تھے۔ پھر ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔"

الغرض عربوں کے ان ابتر سیاسی حالات میں، واقعۂ فیل کے پچاس دن بعد نبی رحمۃٌ لّلعالمین ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان عربوں اور پورے عالمِ انسانیت کی راہنمائی کے لیے منتخب فرمایا۔

---

[1] البدایۃ و النہایۃ (۱/ ۲/ ۱۷۰ تا ۱۷۲)

آفتابِ نبوت کے لیے ملکِ عرب ہی کا انتخاب کیوں ہوا؟

ملکِ عرب اتنے گئے گزرے لوگوں کا خطہ تھا کہ مذہبی، اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے وہ پستی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا، جیسا کہ کتبِ تاریخ و سیرت کے حوالے سے ہم نے ذکر کیا ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ ان حالات میں نبی رحمت ﷺ کو مبعوث فرمانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس ملک کا انتخاب ہی کیوں کیا؟

اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی سورۃ الانعام (آیت: ۱۲۴) میں دیا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾

''اللہ تعالیٰ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ملکِ عرب کا انتخاب کرنے اور اسے خلعتِ رسالت ﷺ سے سرفراز کرنے میں جو حکمتِ الٰہی کارفرما ہے اسے بہتر تو وہی جانتا ہے، البتہ عقلی نقطۂ نظر سے بھی یہ انتخاب نہایت موزوں اور مفید تھا کیوں کہ ہم جب ملکِ عرب کو کرۂ ارض کے نقشے پر دیکھیں تو اس کے محلِ وقوع سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے برِّ اعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسط میں جگہ دی ہے اور وہ خشکی و تری کے راستوں سے دنیا کو اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ سے ملا کر ایک کر رہا ہے۔ لہٰذا اگر تمام دنیا کی ہدایت کے لیے کسی جگہ پر کوئی مرکزِ واحد قائم کرنا ہو اور اس کے لیے جگہ کا انتخاب کرنا چاہیں تو ملکِ عرب ہی اس کے لیے موزوں ہے۔ خصوصاً اس زمانے پر نظر کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب افریقہ، یورپ اور ایشیا کی تینوں بڑی سلطنتوں کا تعلق عرب سے تھا تو وہاں کی آواز ان برِّ اعظموں میں بہت جلد پہنچ جانے کے ذرائع بخوبی موجود تھے۔

قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ربُّ العالمین نے اسی لیے نبیِ اکرم ﷺ کو عرب میں پیدا فرمایا، اور ان کو بتدریج قوم، ملک اور عالَم کی ہدایت کا کام سپرد فرمایا۔ علمِ جغرافیہ کی رو سے جب ہم کرۂ ارضی پر آباد دنیا کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوب میں زیادہ سے زیادہ چالیس (۴۰) درجے عرض بلد اور شمال میں زیادہ سے زیادہ اسّی (۸۰) درجے تک آبادی ہے۔ دونوں کا مجموعہ ایک سَو بیس (۱۲۰) اور نصف ساٹھ (۶۰) ہوا۔ جب ساٹھ کو

اسّی درجے شمالی سے تفریق کریں، تب بیس (۲۰) رہ جاتے ہیں۔ اور جب ساٹھ میں سے چالیس درجے جنوبی کو تفریق کر دیں تو بھی بیس درجے شمالی رہ جاتے ہیں۔ اور مکہ معظّمہ ساڑھے اکّیس درجہ پر آباد ہے۔ اس لیے کل کرۂ ارضی میں یہی وسط ہونے کا درجہ رکھتا ہے۔

''یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ مکہ کا نام کتبِ لغت میں سُرّۃ الارض [نافِ زمین] ہے۔ اور انسان کے جسم میں ناف بھی ٹھیک وسط میں نہیں ہوتی بلکہ تقریباً وسط میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرض بلد میں مکہ وسطِ حقیقی کے قریب تر واقع ہے، صرف ڈیڑھ درجہ کا جو تفاوت ہے وہ اسی لیے ہے کہ مکہ نافِ زمیں ثابت ہو۔

''اب یوں سمجھیں کہ ملکِ عرب پندرہ سے پینتیس درجہ ہائے عرض بلد شمالی پر واقع ہے اور انہی خطوط کے اندر دنیا کی تمام مشہور نسلیں اس طرح مقیم ہیں کہ مشرق میں آریہ و منگول اور مغرب میں حبشی ہامائٹ [نسلِ عام] اور [امریکہ کے اصل باشندے] رَیڈ انڈیز۔ اور جب کُل قوموں میں تبلیغ کا پہنچانا مدِ نظر ہو تو عرب ہی اس کا مرکز قرار دیا جاسکتا ہے۔ شاید اس لیے قرآن مجید کی سورۃ البقرۃ (آیت: ۱۴۳) میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''اور اسی طرح تو ہم نے تم کو درمیانی امّت بنایا تا کہ قوموں کے سامنے تم اللہ تعالیٰ کی شہادت ادا کرو۔ اور رسول تمھارے سامنے اللہ تعالیٰ کی شہادت ادا کریں۔''[1]

زمین کے وسط میں آباد ہونے ہی کی وجہ سے عرب مجاہدینِ سلام ایک طرف عراق سے ہوتے ہوئے ایران، ترکستان، سیستان، کابل اور ہندوستان تک پہنچ گئے تو دوسری طرف شام سے ہوتے ہوئے مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے۔ بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائرِ افریقہ، حبشہ، زنجبار۔ پھر اُدھر جزائرِ ہند، جاوا، سماٹرہ اور چین تک ان کا گزر ہوا۔ دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا۔

---

[1] رحمۃ للّعالمین (۱/۳۰۔۳۱)

یہ تمام مواقع اس لیے میسّر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوتِ اسلامی کے لیے مناسب مرکز تھا اور اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیرِ فرمان تھی، ان دونوں کے زور کو ایک ساتھ توڑنے کے لیے ملکِ عرب کے سِوا دنیا میں دوسری کوئی جگہ موزوں نہ تھی۔[1]

عطائے خلعتِ نبوّت کے لیے قومِ عرب ہی کیوں؟

نبیِ رحمت ﷺ کی ولادت کے زمانے میں قومِ عرب ہر قسم کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی برائیوں میں مبتلا ہوچکی تھی تو سوال یہ ہے: تب پھر عطائے خلعتِ نبوّت کے لیے اِسی قوم کا انتخاب کیوں کیا گیا؟

اس کا پہلا جواب تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام (آیت: ۱۲۵) میں دیا ہے:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾

''اللہ تعالیٰ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔''

البتہ عقلی نقطۂ نظر سے بھی قومِ عرب کا انتخاب ہی مفید اور موزوں تھا، کیوں کہ تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود ان میں کچھ ایسی خصوصیّات بھی تھیں جو دنیا کی تمام قوموں میں سے انھی کے ساتھ مخصوص تھیں اور غالبًا ان کی انھی فطری و طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلّاقِ فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور انھیں اپنے اس خلعتِ خاص سے نوازا۔ ان خصوصیّات میں سے نمایاں ترین یہ ہیں:

1. سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے۔ اہلِ عرب کو اپنے حسب ونسب کی حفاظت کا جو خیال و لحاظ تھا اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ حسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ اپنے باپ دادوں کا نسب نامہ یاد رکھنا وہ اپنا خاندانی فرض سمجھتے تھے۔ ہر قبیلے میں کچھ ماہرینِ انساب موجود ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلۂ نسب معلوم ہوسکتا ہے۔ ان کی اس صفتِ خاص کا

---

[1] سیرت النبی ﷺ (۳۰۱/۴) ''فقہ السیرۃ'' ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی [دمشق] نے (ص: ۳۷ تا ۴۲) پر بھی تفصیلاً بیان کیا ہے۔

خود نصارائے مغرب اور یہود نے بھی اعتراف کیا ہے۔ یہ اعترافات ریورنڈ ماسٹر کے ۱۸۴۴ء کے لکھے ہوئے عرب کے تاریخی جغرافیہ، ۱۸۲۲ء میں طبع ہونے والے جارج سیل کے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدّمہ (۱/ ۲۵) پر، قدیم یہودی مؤرّخ یوسیفوس کا اعترافِ صحتِ نسبِ عرب، اور دورِ حاضر کے ایک یہودی فاضل کی کتاب "تاريخ اليهود في بلاد العرب" (ص: ۷۵۔ ۷٦) پر دیکھے جاسکتے ہیں، جن کی قدرے تفصیل ''سیرت النبی ﷺ'' (۲۹۲/۴۔۲۹۳) پر بھی موجود ہے۔

سیّد سلیمان ندوی رحمہ اللہ ہی نے اپنی دوسری کتاب ''ارض القرآن'' (جلد اوّل، ص: ۱۰۷۔ ۱۱٦) پر مدلّل بحث کی اور علمائے مغرب کے تمام اقوال جمع کردیے ہیں۔

نسب بجائے خود تو کوئی فخر کی چیز نہیں، اسی لیے پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا ہے لیکن دعائے خلیل علیہ السلام کے پورا ہونے اور اس کے لیے نبیِ اکرم ﷺ کے اصلی وحقیقی مصداق بننے کے لیے نسلِ ابراہیم علیہ السلام کی صحیح النسبی ضروری تھی۔ یہودِ بنی اسرائیل بھی اگرچہ اولادِ ابراہیم علیہ السلام تھے مگر دوسری قوموں کے اختلاط اور کوئی خاص وطن نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مِٹ گئیں اور صحتِ نسب کا شرف صرف عربوں کے ساتھ مخصوص ہوگیا۔

2 دوسری خاص صفت یہ تھی کہ وہ اگرچہ ہر چہار سُو سے مختلف مذاہب سے ٹکرا رہے تھے جیسا کہ مجوسیّت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی۔ یہودیّت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی۔ عیسائیّت یمن سے لے کر شام تک پھیلی ہوئی تھی اور بعض افراد وقبائل برائے نام عیسائی بھی بن چکے تھے، مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر تھا۔[1]

غرض دوسرا کوئی مذہب بھی حقیقی طور پر انھیں فتح نہ کرسکا۔ ان کے نیک طبع اور دیندار لوگ اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی کے پیرو کہلواتے تھے۔ یہ سب اس لیے ہورہا تھا کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے ذریعے دینِ ابراہیمی کی دعوت وتجدید کا دروازہ کھلا رہے۔

3 تیسرا خاص وصف یہ تھا کہ عرب اور خصوصاً شمالی عرب ہمیشہ آزاد رہا۔ انھوں نے کبھی کسی کی

---

[1] سیرت النبی ﷺ (۲۹۴/۴۔۲۹۵)

غلامی قبول نہیں کی۔ بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و زبر کر دیا، مگر عرب کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔

یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں حکومت کی۔ مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے۔ سکندر اور اس کے بعد والے رومی سپہ سالاروں نے جب بھی ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے انھیں ہمیشہ شکست دی۔

ملکِ عرب دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتوں یعنی ایران و روم کی سرحد پر واقع تھا، مگر وہ دونوں اپنی حرص و آرزو کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہے۔ گستاخ عیسائی حبشیوں [ابرہہ اور اس کے لشکر] نے فتحِ یمن کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظّمہ پر چڑھائی کر دی مگر قدرتِ الٰہی نے انھیں تباہ کر دیا۔ قدرت کی طرف سے یہ اہتمام اس لیے ہو رہا تھا کہ کوئی جابرانہ قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے۔ ان کی روحِ آزادی برقرار اور فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے، تاکہ یہ مخفی خزانہ دینِ اسلام کی حکومت کے قیام و بقا میں کارآمد ہو۔

4 اُن میں چوتھی صفت یہ تھی کہ وہ جس طرح خارجی اثرات سے پاک تھے ایسے ہی صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے محرّف و فاسد کتابی علم سے بھی نا آشنا تھے۔ وہ امّی تھے تاکہ ایک امّی معلّم کی زبانی تعلیم قبول کرنے کے لیے ہر طرح تیار رہیں۔

5 پانچواں وصف یہ کہ عرب قوم دیگر اقوامِ عالَم کے وسط میں آباد تھی اور خیر الامم بننے کے لیے جن اخلاقی خوبیوں کی ضرورت تھی، وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ مثلاً:

6 وہ حد سے زیادہ بہادر تھے کہ قیصر و کسریٰ کو انھوں نے ایک ساتھ چیلنج کر دیا۔

7 وہ پُر جوش و پُر عزم تھے۔ انھوں نے توحید کا علم لیے بحر و بر اور دشت و جبل تو کیا تمام ارکانِ عالَم کو اپنے عزمِ راسخ سے متزلزل کر دیا۔ انہی کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

دشت تو دشت رہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

8 وہ حق گو تھے، جو بات دل میں ہوتی وہی زبان پر لاتے۔

9 وہ اگرچہ ظاہری نوشت وخواند سے عاری تھے، مگر فطرت کے عطیۂ عقل و دانش سے بہرہ ور تھے۔

10 وہ ذہین اور قوّی الحافظہ تھے۔

11 فیاض اور مہمان نواز تھے۔

12 خود دار اور مساوات پسند تھے۔

13 صرف گفتار ہی کے نہیں بلکہ وہ کردار کے بھی غازی تھے۔ اگر مگر، قیل و قال، خیال آرائی، تخیّل پسندی، نظریہ بازی اور نکتہ آفرینی کے قائل نہیں، بلکہ وہ سراسر عملی لوگ تھے۔

ان تمام طبعی وفطری اوصاف و اخلاق کو دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ وہ قوم آخری دین کے لیے ازل ہی سے منتخب ہو چکی تھی۔ [1]

---

[1] سیرت النبی ﷺ (۴/۲۹۲۔۳۰۱)

نبیِ رحمت ﷺ کا نسب نامہ

﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴾

نبیِ اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت اور بعد والے حالات شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے نسبِ اطہر کو مختصر طور پر اپنے قارئین کے سامنے رکھ دیا جائے۔ آپ ﷺ کے شجرۂ نسب کے تین حصے ہیں:

1 پہلا حصہ آنحضرت ﷺ سے لے کر آپ ﷺ کے اکیسویں پُشت کے دادا عدنان تک ہے جو یہ ہے:

''محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب (جن کا نام عامر اور لقب شیبہ تھا) بن ہاشم (جن کا نام عَمرو تھا) بن عبدمناف (جن کا نام مغیرہ تھا) بن قصیؒ (جن کا نام زید تھا) بن کلاب بن مرّہ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر (انہی کا لقب قریش تھا اور قبیلہ قریش کا نام انہی کی طرف منسوب ہے) بن مالک بن النضر (جن کا نام قیس تھا) بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ (جن کا نام عامر تھا) بن الیاس بن مُضر بن نزار بن معد بن عدنان۔''

اس قدر نسب کے بارے میں تمام اہلِ تاریخ و سیرت اور ماہرینِ انساب کا کلی اتفاق ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے ''الاستیعاب'' میں لکھا ہے:

''هَذَا مَا لَمْ يَخْتَلِفْ فِيهِ أَحَدٌ مِّنَ النَّاسِ'' [1]

''اس قدر نسب پر کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

بلکہ اس سلسلے میں خود صحیح بخاری شریف کے باب مبعث النبی ﷺ میں ایک حدیث وارد ہے۔ نیز حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بیہقی سے نقل کرتے ہوئے ''البداية و النهاية'' (۲/ ۲۵۵) میں ایک

[1] بحوالہ رحمۃ للعالمین (۲/ ۲۱)

روایت نقل کی ہے، جس میں مذکور ہے:

''ایک مرتبہ نبیِ اکرم ﷺ نے برسرِ منبر اپنا نسب نامہ عدنان تک پہنچایا۔ عدنان کے لیے یہی شرف کیا کم ہے کہ نبی ﷺ کا شجرۂ مقدسہ ان تک متفق علیہ ہے اور اکیسویں نسل کے پوتے نے ان کا رتبہ بلند کر دیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

كَمْ مِّنْ أَبٍ قَدْ عَلَا بِابْنٍ ذَوِيْ شَرَفٍ
كَمَا عَلَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ عَدْنَانُ[1]

''کتنے باپ ایسے ہیں کہ اپنے کسی بیٹے کی وجہ سے بلند مقام پا جاتے ہیں جیسا کہ رسولُ اللہ ﷺ کی وجہ سے عدنان کو عالی مقام مل گیا۔''

2 نبی ﷺ کے نسبِ مبارک کا دوسرا حصہ آپ ﷺ کے بائیسویں پُشت کے دادا اَدّ سے شروع ہوکر ساٹھویں پُشت کے دادا قیدار تک پہنچتا ہے۔

محدّثینِ کرام کے یہاں جو صحتِ روایت کا معیار ہے اس کے پیشِ نظر انھوں نے اس حصے کو بیان نہیں کیا، بلکہ ایک روایت «كَذِبَ النَّسَّابُوْنَ مَا فَوْقَ عَدْنَان»[2] ''عدنان سے اوپر والے حصے میں اہلِ نسب نے سچ نہیں کہا۔'' کے پیشِ نظر اس حصے کو بیان کرنا ہی جائز قرار نہیں دیا۔ البتہ بعض اہلِ علم نے اس روایت کے معیارِ صحت پر پورے نہ اترنے کے پیشِ نظر اس حصے کو بیان کرنا بھی جائز قرار دیا ہے جن میں سے ابنِ اسحاق، ابنِ جریر اور امام بخاری رحمہ اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[3] امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں عدنان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نام گنوائے ہیں۔[4]

حضرت علامہ قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے طبری، طبقات ابن سعد، البدایہ ابن کثیر، الفصل ابن حزم اور تورات کے حوالوں سے بڑی تحقیقِ دقیق کے بعد اس حصے کے ناموں کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

---

1. شرح الشفاء لملا علی قاری (١/ ٤٧٦)
2. بحوالہ رحمۃ للعالمین (٢/٢٢)
3. سبائك الذهب للسويدى (ص: ١٩) بحواله قاضى منصور پورى (٢/ ٢٢)
4. سیرت النبی ﷺ (١/١٦٠)

''ادّ (دادا) بن ہمیسع بن سلامان بن عوص بن بوز بن قموال بن ابیّ بن عوام بن ناشد بن حزا بن بلداس بن یدلاف بن طابخ بن جاحم بن ناحش بن ماخی بن عیفی بن عبقر بن عبید بن الدعا بن حمدان بن سَنبر بن یثربی بن یحزن بن ملیحن بن ارعوے بن عیضی بن دیشان بن عیصر بن اقناد بن ایہام بن مقصر بن ناحث بن زارح بن سمی بن مزّی بن عوض بن عرام بن قیدار۔''[1]

3 نبی ﷺ کے نسب نامۂ گرامی کا تیسرا حصہ نبی ﷺ کے اکسٹھویں پشت کے دادا حضرت اسماعیل ذبیح علیہ السلام بن حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سے شروع ہوکر اسّیویں (۸۰) پُشت پر جاکر ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچ جاتا ہے۔[2] اس حصے کے ناموں اور ان کی عمروں کی تفصیلات تورات میں موجود ہیں جن کی تفصیلات کچھ یوں ہیں:

''اسماعیل ذبیح علیہ السلام بن ابراہیم خلیل علیہ السلام بن آزر (تارہ) بن ناحور بن سروج بن رعو بن فالج بن عابر بن ارفکشاد بن سام بن نوح علیہ السلام بن لامک بن متوشالح بن اُخنوخ (ادریس علیہ السلام) بن یارو بن مہلل ئیل بن قینان بن آنوش بن شیث علیہ السلام بن آدم علیہ السلام۔''[3]

اس شجرۂ نسب کے افراد کی طہارت و پاکیزگی کے بارے میں بخاری و مسلم، ترمذی اور دیگر کتبِ حدیث میں بکثرت ارشاداتِ نبوی ﷺ وارد ہیں کہ یہ سب لوگ پاک دامن اور نہایت اصحابِ عصمت و عفت تھے، جیسا کہ بخاری شریف، مسند احمد، طبقات ابن سعد اور ابن عساکر میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ آدَمَ قَرْناً فَقَرْناً حَتّٰى بُعِثْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْ كُنْتُ فِيْهِ »[4]

---

[1] رحمۃ للعالمین (۲/ ۲۸ تا ۳۰)

[2] رحمۃ للعالمین (۲/ ۲۱ تا ۳۱) الرحیق المختوم (ص: ۵۵۔ ۵۶) ابنِ ہشام مع الروض للسہیلی (۱/ ۴۳ تا ۸۸)

[3] رحمۃ للعالمین (۲/ ۳۱)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٥٧) مسند أحمد، رقم الحديث (٨٨٥٧) بتخريج الأرناؤوط. البداية والنهاية (٢/ ٢٥٦) شرح الشفاء ملا على قارى (١/ ٤٧٥) صحيح الجامع الصغير، رقم الحديث (٢٨٣٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٠٩)

''میں بنی آدم کے زمانوں سے بہترین زمانے میں زمانہ بزمانہ مبعوث کیا گیا ہوں، یہاں تک کہ اس زمانے میں مبعوث ہوا ہوں جس میں مَیں ہوں۔''

صحیح مسلم اور ترمذی شریف میں ہے:

«اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَىٰ مِنْ وَلَدِ اِبْرَاهِيْمَ اِسْمَاعِيْلَ، وَ اصْطَفَىٰ مِنْ بَنِيْ اِسْمَاعِيْلَ كِنَانَةَ، وَاصْطَفَىٰ مِنْ كِنَانَةَ قُرَيْشاً، وَاصْطَفَىٰ مِنْ قُرَيْشٍ بَنِيْ هَاشِمٍ، وَ اصْطَفَانِيْ مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ»[1]

''اللہ تعالیٰ نے اولادِ ابراہیم علیہ السلام میں سے اسماعیل علیہ السلام کو منتخب کیا اور بنی اسماعیل علیہ السلام میں سے بنی کنانہ کو چنا اور بنی کنانہ میں سے بنی قریش کا انتخاب کیا اور قریش میں سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب کیا۔''

امام احمد، ابن حبان، بیہقی، ابنِ عدي، ابنِ عساکر، ابونعیم، ابن جریر اور حاکم وغیرہ نے ملتے جلتے الفاظ کی متعدد روایات بیان کی ہیں، جبکہ بیہقی کے الفاظ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّ اللّٰهَ أَخْرَجَنِيْ مِنَ النِّكَاحِ وَلَمْ يُخْرِجْنِيْ مِنَ السِّفَاحِ»[2]

''اللہ تعالیٰ نے مجھے (نسل درنسل) جائز نکاح سے پیدا فرمایا ہے اور اس نے میری تخلیق زنا سے (کسی نسل میں بھی) نہیں کی۔''

ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے امام بیہقی رحمہ اللہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

''وَهَذِهِ الرِّوَايَاتُ و اِنْ كَانَ فِيْ رُوَاتِهَا مَنْ لَّا يُحْتَجُّ بِهٖ فَبَعْضُهَا لَيُؤَكِّدُ بَعْضاً، وَ مَعْنىٰ جَمِيْعِهَا يَرْجِعُ اِلىٰ حَدِيْثِ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ. وَاللّٰهُ أَعْلَمُ''[3]

''ان تمام روایات میں اگرچہ بعض رواۃ ایسے بھی ہیں جو قابلِ حجت نہیں، مگر ان

---

[1] مختصر مسلم عن واثله بن الأسقع (١٥٢٣) البداية والنهاية (٢/ ٢٥٦) شرح الشفاء (١/ ٤٧٧) سنن الترمذي (١٠/ ٧٤، ٧٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧١٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٢)

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٠٣) و حسّنهٗ، البداية و النهاية (٢/ ٢٥٥) شرح الشفاء ملا على قارى (١/ ٤٧٢)

[3] البداية و النهاية (٢/ ٢٥٧)

روایات میں سے بعض روایات بعض دیگر کی تاکید وتقویت کا باعث ہیں اور ان تمام کا معنیٰ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ (یعنی اصل مرجع وہ صحیح مسلم وترمذی شریف والی حدیث ہی ہے) واللہ اعلم۔''

ہاشم بن عبد مناف:

نبیِ اکرم ﷺ کے شجرۂ نسب میں جو نام آئے ہیں، ان میں سے آپ ﷺ کے آباء و اجداد حضرت آدم، شیث، ادریس، نوح، ابراہیم، اسماعیل علیہم السلام، اور ان کے بعد عدنان، کنانہ، فہر الملقب بقریش، عبد مناف، ہاشم، عبد المطلب، عبد اللہ اور کئی دیگر حضرات بڑے مشہور ہیں جن کے تفصیلی حالات تاریخ وسیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں، مگر اختصار کے پیشِ نظر ہم صرف ہاشم اور بعد والوں کے حالات کا سرسری تذکرہ کریں گے، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ کا خاندانِ ہاشمی انھی بزرگوار کی طرف منسوب ہے۔

نبی ﷺ کے پردادا کا نام عَمرو اور لقب عَمرو العلا اور ہاشم تھا۔ یہ اپنے باپ عبد مناف کی وفات کے بعد اپنے قبیلے کے سردار منتخب ہوئے۔ ان کا لقب ہاشم اس طرح معروف ہوا کہ ایک دفعہ تجارت کے سلسلے میں شام گئے ہوئے تھے تو انھیں اطلاع پہنچی کہ مکہ میں قحط سالی کی وجہ سے آٹا کمیاب ہوگیا ہے تو انھوں نے شام سے واپسی پر تمام اونٹوں پر روٹیاں اور آٹا لاد لیا اور مکہ پہنچ کر لوگوں کی دعوتِ عام کردی۔ گوشت وشوربے میں روٹیوں کے ٹکڑے چورہ بنا کر ڈال دیے اور یہ ثرید تمام اہلِ مکہ کو کھلایا۔ چونکہ عربی زبان میں ٹکڑے اور چورہ کرنے کو ''ہشم'' کہا جاتا ہے، اس لیے ان کا نام ''ہاشم'' یعنی چورہ بنا کر کھلانے والا مشہور ہوگیا۔[1]

اس واقعے کے بعد ہر سال موسمِ حج میں حجّاجِ بیت اللہ اور زوّارِ کعبہ کی دعوت کیا کرتے اور یہی کھانا ثرید کھلایا کرتے تھے۔ طبقات ابن سعد میں سردارِ قوم ہاشم کی زیرکی و دانشمندی کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے خط کتابت کرکے قیصر سے یہ خصوصی فرمان حاصل کرلیا ہوا تھا کہ قریش کا مالِ تجارت بغیر کسی ٹیکس کے شام میں داخل ہوتا رہے۔[2] نیز شاہ حبشہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان

---

[1] الرحيق المختوم (ص: ٥٦) سيرت ابن هشام (١/ ١٣٧)

[2] طبقات ابن سعد (١/ ٤٥) بحواله رحمةٌ للعالمين (٢/ ٦٩)

حاصل کرلیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ انگوریہ (انقرہ)، جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر اور قیصر کا پایہ تخت تھا، وہاں جب تجّارِ قریش جاتے تو خود قیصر نہایت عزّت و احترام سے ان کا خیر مقدم کیا کرتا تھا۔[1]

ان کے چار لڑکے ابوصیفی، اسد، فضلہ اور جدِّ رسول ﷺ عبدالمطلب تھے۔ پانچ لڑکیاں رقیہ، شفاء، ضعیفہ، خالدہ اور حنّہ تھیں۔ ان ہاشم کی ایک پوتی رقیہ بنت ابی صیفی تھیں جنھوں نے نبی ﷺ کی شان میں اشعار بھی کہے تھے جن میں سے قاضی منصور پوری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب رحمۃ للعالمین (۲/ ۶۹) میں یہ دو شعر نقل کیے ہیں:

۱۔ مَـــنًّا مِّنَ اللّٰهِ بِالْمَیْمُونِ طَائِرُهٗ
وَ خَیْرُ مَنْ بُشِّرَتْ بِهٖ مُضَرُ

''آپ کی ذات نعمتِ الٰہی ہے اور آپ ﷺ بابرکت ہیں۔ قبیلۂ مضر کو جو بشارت دی گئی وہ آپ ہی ہیں۔''

۲۔ مُبَارَكُ الْأَمْرِ يُسْتَسْقَىٰ الْغَمَامُ بِهٖ
مَا فِي الْأَنَامِ لَهٗ عَدْلٌ وَلَا خَطَرٌ

''آپ ﷺ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کے ذریعے بارشیں طلب کی جاتی ہیں اور اس کائنات میں آپ کا ہمسر دوسرا کوئی نہیں۔''

معروف سیرت نگار ابن ہشام لکھتے ہیں کہ ''ہاشم'' ایک مرتبہ تجارت کی غرض سے شام گئے اور جاتے ہوئے جب مدینہ منورہ میں رُکے تو وہاں بنی نجّار کے ایک فرد کی بیٹی سلمٰی بنت عَمرو سے شادی کرلی۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرے اور پھر شام روانہ ہوگئے۔ اسی سفر میں سرزمین فلسطین میں غزّہ کے مقام پر وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں اس نئی مدنی بیوی سے (۴۹۷ء میں) لڑکا عطا فرمایا جس کے سر میں پیدائشی طور پر ہی کچھ سفید بال تھے جو بڑھاپے کی علامت شمار کیے جاتے ہیں۔ چونکہ بوڑھے کو عربی میں شیبہ کہا جاتا ہے، لہٰذا ان کا نام ہی شیبہ رکھ دیا گیا۔[2]

بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے:

---

[1] سیرت النبی ﷺ (۱/ ۱۶۵-۱۶۶)

[2] ابنِ هشام (۱/ ۱۳۷) الرحيق المختوم (ص: ٥٦)

''ان کا نام تو عامر تھا مگر ان سفید بالوں کی وجہ سے یا عمر دراز پانے کی نیک فال لینے کے لیے ان کا لقب شیبہ رکھ دیا۔ ان کی والدہ نے مدینہ ہی میں اپنے والدین کے گھر ان کی پرورش کی اور مکہ مکرمہ میں ان کے خاندان والوں کو کوئی خبر نہ ہوئی۔''[1]

یہ شیبہ ہی نبیِ اکرم ﷺ کے حقیقی دادا عبد المطلب ہیں۔

عبد المطلب بن ہاشم:

نبیِ اکرم ﷺ کے پردادا ہاشم بن عبد مناف کی وفات کے بعد حجاج کی خدمت و میزبانی اور کھانے پینے کے انتظامات کا شرف ان کے بھائی مطلب بن عبد مناف کے حصے میں آیا۔ وہ اپنی قوم میں بڑے معزز تھے۔ ان کی سخاوت و بزرگی کی وجہ سے قریش کے لوگ انھیں ''فیاض'' کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

انھیں جب معلوم ہوا کہ میرے بھائی ہاشم کا ایک لڑکا شیبہ اپنے ننھیال کے یہاں مدینہ منورہ میں ہے تو وہ انھیں لینے کے لیے گئے۔ اپنے بھائی کی اس آخری نشانی کو دیکھا تو آبدیدہ ہو گئے اور انھیں گلے سے لگالیا۔ پھر جب اس کی ماں سے اُسے ساتھ بھیجنے کا کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ مطلب نے کہا کہ میں اسے اس کے باپ کے گھر اور اللہ کے حرم مکہ المکرّمۃ لیجانا چاہتا ہوں، تو وہ رضا مند ہوگئیں۔ مطلب جب اپنے بھتیجے کو اپنے اُونٹ پر سوار کیے مکہ پہنچے تو لوگوں نے کہا:

'' هٰذَا عَبْدُ الْمُطَّلَبِ فَقَالَ: وَيَحُكُمْ! هٰذَا ابْنُ أَخِيْ هَاشِمٍ''

''یہ مطلب کا غلام ہے، اُنھوں نے کہا: تمھارا بھلا ہو، یہ تو میرے بھائی ہاشم کا بیٹا ہے۔''

مگر وہ اسی نام سے مشہور ہوگئے۔ پھر انھیں اپنی اولاد کی طرح بڑے ناز ونعمت سے پالا، یہاں تک کہ وہ جوان ہو گئے اور جب مطلب نے وفات پائی تو عبد المطلب ان کے قائم مقام سردارِ قریش اور کعبہ کے متولّی ہوئے۔[2]

مگر اپنے چچا کی تربیت و پرورش اور احسان مندی کے اظہار کے لیے عُمر بھر عبد المطلب یعنی

---

[1] الرحيق المختوم (ص: ٥٦)

[2] سيرت ابن هشام (١/ ٣٨ـ ١٣٧) الرحيق المختوم (ص: ٥٧) زرقاني (١/ ٨٥) بحوالہ سیرت النبی ﷺ.

''مطلب کا غلام'' ہی کہلاتے رہے۔

قریش انھیں شیبۃ الحمد، فیاض، مطعم، طیر السماء اور سیدِ قریش کہا کرتے تھے۔ یہی عبد المطلب ہیں جنھوں نے ہمارے نبی ﷺ کا نام رکھا۔ آٹھ برس تک آپ ﷺ کی پرورش کی۔ انھیں کی سرداری کے زمانے میں ہاتھی والوں کا واقعہ رونما ہوا تھا۔ ان کے فضائل میں یہ بھی ہے کہ چاہِ زمزم بنی جرہم کے عَمرو بن حارث نے بند کر دیا تھا اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے کسی کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ یہ کنواں کہاں ہے؟ اُسے عبد المطلب ہی نے دوبارہ نکالا تھا۔ سیرت ابن ہشام وغیرہ میں لکھا ہے:

> ''عبد المطلب متواتر تین راتیں یہ خواب دیکھتے رہے کہ کنواں نکالو۔ پھر خواب ہی میں انھیں چاہِ زمزم کی جگہ بھی دکھائی گئی۔ عبد المطلب اور ان کے فرزندِ اکبر حارث نے اس جگہ کنواں کھودنا شروع کر دیا۔ تین دن کی کھدائی کے بعد ان کو بنو جرہم کی مدفونہ اشیاء سونے کے دو ہرن، تلواریں اور زرہیں ملنے لگیں تو قریش کے لوگ جو اب تک عبدالمطلب کے اس فعل کو لغو وعبث ہی سمجھتے تھے، مگر مدفونہ اشیاء کی برآمدگی نے انھیں بھی یاد کرا دیا تو وہ درخواستیں کرنے لگے کہ اس شرف میں ہمیں بھی شریک کیا جائے۔ مگر عبدالمطلب نے کسی کو اپنے ساتھ شامل کرنا پسند نہ کیا۔''

جب ہر طرف سے ان پر دباؤ بڑھنے لگا تو اس وقت انھوں نے یہ منّت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دس لڑکے عطا کیے جو جوان ہو کر میرے دست و بازو بن گئے تو میں ان میں سے ایک خانہ کعبہ کے پاس اللہ کے نام پر ذبح کروں گا۔ تا آخر چاہ کی کھدائی باپ، بیٹا دونوں ہی نے کی۔ یہ زمزم جس سے آج لاکھوں مسلمان سیراب ہو رہے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے فرزندِ خلیل علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے ظاہر فرمایا تھا۔ یہ چاہِ زمزم نبی مکرم ﷺ کے دادا عبد المطلب کی بھی یادگار ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا گنے یہی بات ان شعروں میں کہی ہے:

۱۔ نَحْنُ حَفَرْنَا لِلْحَجِيجِ زَمْزَمَ
سُقْيَا الْخَلِيلِ وَ ابْنِهِ الْمُكَرَّمِ

۲۔ جِبْرِيلُ الَّذِيُ لَمْ يُذَمَّمُ
شِفَاءُ سُقْمٍ وَ طَعَامُ مُطْعَمِ

''ہم نے چاہِ زمزم کھودا جو اوّلاً حضرت خلیل علیہ السلام اور ان کے لختِ جگر حضرتِ اسماعیل کے لیے نکالا گیا تھا۔ جبریل علیہ السلام (نے اس کی نشاندہی کی) جن کی کسی نے مذمّت نہیں کی۔ وہ آبِ زمزم بیماری سے شفا اور ذریعۂ غذا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے عبدالمطلب کو کثیر الاولاد بنایا تھا۔ ان کے صحیح روایت کے مطابق بارہ بیٹے اور چھے بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں سات اسلامی تاریخ میں اسلام یا کُفر کی خصوصیّت سے بہت مشہور ہیں جو حارث، زبیر، ابو طالب، ابولہب، حمزہ، عبّاس اور نبی ﷺ کے والد ماجد عبد اللہ ہیں۔ جبکہ ان کی چھے بیٹیاں ام حکیم، برّہ، عاتکہ، اروی، امیمہ، اور صفیّہ تھیں۔ یہ سب نبیِ اکرم ﷺ کی پھوپھیاں تھیں۔ عبدالمطّلب نے ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے سالِ ولادت کا اندازہ ۴۹۷ء ہے اور سالِ وفات کا اندازہ ۵۷۹ء کیا گیا ہے۔[2]

عبداللہ والد رسول اللہ ﷺ اور قربانی کا واقعہ

نبیِ ہاشمی و عربی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے والدِ گرامی عبد اللہ بن عبد المطّلب اپنے باپ کے سب سے لاڈلے، محبوب اور منظورِ نظر تھے اور وہ سب سے بڑھ کر خوبصورت، خوب سیرت اور عفّت مآب بھی تھے۔ ان کے والد عبد المطّلب پر چاہِ زمزم کی کھدائی کے وقت جب قریش کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا تھا، تو اس موقع پر انھوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دس بیٹے عطا کیے جو میرے سامنے جوان ہو کر میرے دست و بازو بن گئے تو ان میں سے ایک کی اللہ تعالیٰ کے نام پر خانہ کعبہ کے قریب قربانی کروں گا۔

جب ان کی دعا پوری ہوگئی اور دس لڑکے جوان ہو کر معاون بن گئے تو انھوں نے منّت کو پورا کرنے کا ارادہ کیا۔ اپنے لڑکوں کو بات بتائی تو ان سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ان میں سے قربان کس کو کیا جائے؟ اسے حل کرنے کے لیے قرعہ اندازی کی گئی تو قرعہ والدِ رسول ﷺ کے نام نکل آیا۔ انھوں نے بھی اپنے جدِّ امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح برضا و رغبت باپ کی خوشنودی

---

[1] مختصر سیرت الرسول ﷺ، شیخ محمد بن عبدالوہاب (ص: ۴۶)
[2] پروفیسر سیڈیو کی تاریخ العرب، بحوالہ رحمۃ للعالمین (۱/ ۷۰ تا ۷۲)

اور رضائے الٰہی کے لیے قربان ہونا منظور کر لیا تو باپ نے ایک مرتبہ پھر سنّتِ ابراہیمی علیہ السلام کو زندہ کر دیا۔ چُھری اور بیٹے کو ساتھ لے کر خانہ کعبہ کی طرف چل دیے۔ عبد اللہ کی بہنیں رونے لگیں۔

رؤسائے قریش نے جب یہ دلدوز منظر دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے عبد المطلب کو روکا۔ اپنے برادرِ شفیق کو قربانی سے بچانے کے لیے ابو طالب نے چند اشعار کہے جن میں زیرِ لب اپنا مدّعا بیان کیا۔ خاص طور پر عبد اللہ کے ننھیال بنو مخزوم میں سے ان کے ایک ماموں مغیرہ نے سخت مزاحمت کی اور کہا کہ آپ اپنی نذر کا کفارہ ادا کریں۔ اس کے لیے جتنے مال کی ضرورت پڑے گی وہ ہم آپ کو مہیّا کریں گے۔ اس نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر عبد المطّلب نے لوگوں سے کہا کہ اگر تم سب یہی چاہتے ہو تو پھر مجھے بھی کوئی راستہ بتاؤ کہ میں اپنی نذر کا کیا کروں؟ تو رؤسائے قریش نے مشورہ دیا کہ مدینہ کے قریب خیبر کے مقام پر ایک کاہنہ رہتی ہے اس کے پاس چلے جاؤ اور وہ جو فیصلہ کرے اس پر عمل کر لینا۔ وہ وہاں گئے، سارا ماجرا کہہ سنایا تو اس نے کہا کہ عبد اللہ اور دس اونٹوں پر قرعہ اندازی کرو۔ اتفاق یہ کہ اس قرعہ اندازی میں بھی عبد اللہ ہی کا نام نکلا۔ اس نے کہا: دس اونٹ اور بڑھاؤ اور قرعہ اندازی کرو۔ اسی طرح دس دس کر کے بڑھاتے گئے۔ مگر نوے اونٹ ہو جانے تک ہر مرتبہ عبد اللہ ہی کا نام نکلا۔ پھر جب سو اونٹ ہو گئے تو اونٹوں پر نکل آیا۔

سیرت ابنِ ہشام میں لکھا ہے: قرعہ جب سو اونٹوں پر نکل آیا تو قریش نے کہا:

”قَدُ انْتَهَىٰ رِضَاءُ رَبِّكَ يَا عَبْدَ الْمُطَّلِبِ!“

”اے عبد المطّلب! تیرے رب کی رضا پوری ہوگئی۔“

تو انھوں نے کہا:

”لَا وَاللّٰهِ حَتّٰى اَضْرِبَ عَلَيْهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ“

”بخدا مجھے اس وقت تک اطمینان نہیں ہوگا جب تک کہ میں سو اونٹوں اور عبد اللہ پر تین مرتبہ قرعہ اندازی نہ کرلوں۔“

پھر یکے بعد دیگرے تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور تینوں مرتبہ ہی قرعہ اونٹوں پر نکلا تو عبد المطلب نے اپنے بیٹے کے فدیہ اور نذر کے بدلے میں سو اونٹ قربان کر دیے۔

اس واقعے سے قبل انسانی دیت یا خون بہا دس اونٹ تھے، لیکن اس کے بعد سو اونٹ ہو گئے

اور اسلام نے بھی اس مقدار کو قائم رکھا، گویا عبد المطلب کے خلوص اور والدِ رسول ﷺ کی اطاعتِ پدری کا یہ نتیجہ نکلا کہ انسان کی قدر و قیمت میں دس گُنا اضافہ ہوگیا ہے اور قتل کی وارداتوں میں بھی نمایاں کمی واقع ہوگئی۔ اس طرح یہ واقعہ نہ صرف ملکِ عرب بلکہ عالمِ انسانیت کے لیے باعثِ برکت ہوگیا۔ اور کیونکر نہ ہوتا، جس کے فرزندِ جلیل کو رحمۃٌ للعالمین بننا تھا، اس کے آبائے کرام کا بھی بنی نوعِ انسان کے لیے ایسا ہی محسن ہونا ضروری تھا۔

خلیل و اسماعیل علیہما السلام اور عبد اللہ اور عبد المطلب نے خلوص اور وفا کی جو بے نظیر مثالیں قائم کی تھیں انھیں ایک متکلم فیہ روایت میں نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں یادگار بنا دیا، اور فرمایا:

«اَنَا ابْنُ الذَّبِيْحَيْنِ»[1]

''میں دو قُربان ہونے والے [یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور عبد اللہ] کا بیٹا ہوں۔''

علّامہ زرقانی نے حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما سے ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک اعرابی نے نبیِ اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''يَا ابْنَ الذَّبِيْحَيْنِ'' ''اے دو ذبیحوں کے بیٹے۔'' یہ سن کر نبیِ اکرم ﷺ مسکرائے اور اس کی بات پر نکیر نہیں فرمائی۔[2] البتہ: «اَنَا ابْنُ الذَّبِيْحَيْنِ» کے الفاظ والی حدیثِ نبوی ﷺ کو امام البانی نے ان الفاظ سے بے اصل قرار کر دیا ہے۔[3]

والدینِ رسُول ﷺ کی شادی

رئیسِ قریش عبد المطلب کے حسین اور محبوب فرزند اور نبیِ ہاشمی ﷺ کے والدِ گرامی عبد اللہ جب سو اُونٹوں کی دیت کے عوض قربانی سے بچ گئے تو ان کے والد کو ان کی شادی کی فکر دامن گیر ہوگئی، اس وقت قبائلِ قریش میں سے بنی زہرہ حسب و نسب کے اعتبار سے بڑا معزز خاندان تھا اور اس خاندان کے سردار وہب بن عبد مناف تھے جو اپنے خاندان کے سردار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی

---

[1] تهذيب سيرت ابن هشام عبد السلام، هارون (ص: ٣٣ تا ٣٥) الرحيق المختوم (ص: ٦٠) رحمة للعالمين (٢/ ٩١۔ ٩٢) سيرت النبي ﷺ (١/ ١٦٧) و مختصر سيرت الرسول شيخ الإسلام محمد بن عبد الوهاب (ص: ٤٦)

[2] مختصر المقاصد للزرقاني (ص: ١١) وقال: صحيح.

[3] سلسلة الأحاديث الضعيفة، رقم الحديث (٣٣١، ١٦٧٧)

شرافت میں بھی معروف تھے۔ ان کی بیٹی سیّدہ آمنہ بنت وہب اپنی شرافت و نجابت اور عفت وعصمت کے لحاظ سے قریش کے تمام خاندانوں میں ممتاز مقام رکھتی تھیں اور اپنے چچا وہب بن عبد مناف کے یہاں پرورش پا رہی تھیں۔ یہ وہب بھی اپنے بھائی کی طرح ہی قوم کے معزز ومطاع تھے۔ عبد المطلب ان کے پاس گئے اور سیّدہ آمنہ سے اپنے بیٹے عبد اللہ کے نکاح کا پیغام دیا جسے انھوں نے بخوشی قبول کرلیا۔ اس طرح نبیِ اکرم ﷺ کے گرامی قدر والدین کی شادی ہوگئی۔

اس وقت دستور تھا کہ شادی کے بعد دُلہا تین دن تک اپنے سُسرال والوں کے گھر میں رہتا۔ یہ بھی حسبِ دستور تین دن سُسرال میں رہے اور پھر گھر چلے گئے۔

علامہ منصور پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''سیّدہ آمنہ نکاح کے پہلے ہی ہفتے میں [امانتدارِ جسدِ محمدی] ہوگئیں۔ نکاح کے چند ماہ بعد عبداللہ بن عبد المطلب تجارت کے لیے شام چلے گئے۔ واپسی پر مدینہ منورہ میں اس لیے رُک گئے کہ اپنے والد کے حُکم کے مطابق وہاں سے کچھ کھجوروں کا سودا کریں۔ قیام مدینہ کے دوران میں وہ بیمار ہوگئے۔ قافلہ کے دیگر افراد نے جب ان کی بیماری کی خبر مکہ پہنچ کر ان کے والد کو دی تو وہ بے قرار ہوگئے۔ فوراً اپنے بڑے فرزند حارث کو خبر گیری کے لیے بھیجا، مگر وہ مدینہ پہنچے تو پتا چلا کہ عبداللہ وفات پا گئے ہیں اور انھیں دارِ نابغہ جعدی میں دفن کردیا گیا ہے۔ ان کی وفات کے وقت نبی ﷺ ابھی شکمِ مادر میں ہی امانت تھے۔ جب عبداللہ کی وفات کی خبر مکہ مکرمہ پہنچی تو شکمِ طاہر میں اپنے شوہر کی امانت لیے عالمِ شباب میں ہی بیوہ ہوجانے والی سیّدہ آمنہ نے رنج وغم کے عالم میں بے اختیار چند اشعار پر مشتمل مرثیہ کہا جسے ابنِ سعد نے طبقات [۱/۶۲] میں یوں نقل کیا ہے۔ فرمایا:

۱۔ عَفَا جَانِبَ الْبَطْحَاءِ مِن ابْنِ هَاشِمٍ
وَجَاوَرَ لَحْداً خَارِجاً فِي الْغَمَاغِمِ

''ہاشم کا ایک فرزند بطحا کی جانب جا کر چُھپ گیا۔ وہ لحد میں بہادروں کی بانگ وخروش کے ساتھ جا سویا۔''

۲۔ دَعَتْهُ الْمَنَايَا دَعْوَةً فَاَجَابَهَا
وَمَا تَرَكَتْ فِی النَّاسِ مِثْلَ ابْنِ هَاشِمِ

''موت نے اُسے پکارا اور وہ چلا گیا۔ افسوس کہ موت نے اس ابن ہاشم کا کوئی ہم مثل بھی دُنیا میں نہیں چھوڑا۔''

۳۔ عَشِيَّةً رَاحُوا يَحْمِلُوْنَ سَرِيْرَهٗ
تُعَاوِرُهٗ اَصْحَابُهٗ فِی التَّرَاحُمِ

''اس کے دوست شام کے وقت اس کی لاش اُٹھا کر چلے اور ازراہِ محبت وہ اپنے کاندھے بدلتے اور اس کے اوصاف بیان کرتے تھے۔''

٤۔ فَاِنْ يَّكُ غَالَتْهُ الْمَنَايَا وَرَيْبُهَا
فَقَدْ كَانَ مِعْطَاءً كَثِيْرَ التَّرَاحُم

''خواہ موت نے اسے ہم سے دور ہی کر دیا ہے، مگر اس میں تو شک نہیں کہ وہ بڑا سخی اور غریبوں کا ہم درد تھا۔''

وفات کے وقت ان کی عُمر صرف پچیس [۲۵] سال تھی۔ صحیح مسلم اور کتبِ تاریخ وسیرت میں لکھا ہے:

''سَرورِ عالم ﷺ کے والد نے جو کل ترکہ چھوڑا وہ پانچ اونٹوں، کچھ بکریوں اور ایک حبشی کنیز پر مشتمل تھا جن کا نام برکہ اور کنیت اُمِّ ایمن تھی جو آپ ﷺ کی دایہ تھیں۔ آپ ﷺ ان کی بہت عزّت کیا کرتے تھے اور انھیں ''أُمِّیْ بَعْدَ أُمِّیْ'' کہا کرتے کہ ''میری حقیقی ماں کے بعد یہ میری ماں ہیں۔''

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جن سے نبی اکرم ﷺ بہت محبت کیا کرتے تھے وہ انھیں کے بیٹے تھے۔ صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہما اپنے اپنے دَورِ خلافت میں اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کے لیے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔[1]

---

[1] الرحيق المختوم (ص:٦١) رحمۃ للعالمین (٩٢/٢) سیرت النبی (١/ ١٦٨)

اب یہاں اپنے قارئین کی دلچسپی اور افادے کے لیے ریاست پٹیالہ کے سیشن جج حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمہ اللہ کی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' (۲/ ۲۰ تا ۳۱) کو من وعن نقل کر رہے ہیں جن میں نبیِ اکرم ﷺ کے شجرۂ نسب کے بارے میں بڑی تفصیلات اور مفید معلومات مذکور ہیں۔

شجرۂ طیبہ

شجرۂ مبارکہ کو تین حصوں میں پیش کیا جاتا ہے:

پہلا حصہ:

شجرۂ طیبہ کا پہلا حصہ نبیِ کریم ﷺ سے عدنان تک ہے۔ اس کی بابت حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ المعروف بابن عبدالبر العمری القرطبی (ولادت ۳۶۸ ھ) نے کتاب الاستیعاب میں تحریر کیا ہے:

''هَذَا مَا لَمْ يَخْتَلِفْ فِيهِ أَحَدٌ مِّنَ النَّاسِ''

''اس شجرے میں کسی ایک کا بھی اختلاف نہیں ہے۔''

آبائے کرام کے ساتھ میں نے تلاش کی کہ امہات العظام کے مبارک نام بھی مل جائیں تو بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ عبد اللہ سے لے کر عدنان تک برابر سب کے نام مل گئے اور مزید برآں یہ بھی ہوا کہ ان امہات کے آباء اور قبائل کا پتا بھی لگ گیا۔ مثلاً: نبی ﷺ کی والدہ ماجدہ کا نام ملا تو سیدہ آمنہ کے والد کا نام مع ان کے سلسلۂ نسب کے اور ان کی والدہ کا نام مع ان کے سلسلۂ نسب کے مل گیا۔ اس تمام سلسلے پر نظر ڈالو، شاید دنیا میں کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کا بھی سلسلۂ خاندانی اس وضاحت کے ساتھ اوراقِ تاریخ میں دستیاب نہ ہوسکے گا۔ پھر ہر ایک سلسلے میں نسب کی رفعت وشان پر نظر ڈالو کہ ددھیال اور ننھیال، اور ننھیال در ننھیال کی ددھیال میں بھی کسی ایک جگہ وہن یا خمود نہیں ملے گا۔ یہ شرف صرف اسی کو حاصل ہوسکتا ہے جسے ازل الآزال میں قدرتِ ربانیہ نے عالمین پر ممتاز فرمایا اور آدم علیہ السلام سے لے کر ذاتِ گرامی تک ہر ایک نسل کی حفاظت خود فرمائی ہے۔

امّہات العظام اور ان کے ددھیال کے اسماء میں میرا ماخذ ''تاریخ کبیر طبری''، ''طبقات ابن سعد'' اور کسی قدر ''الکامل فی التاریخ لابن اثیر'' ہیں۔

دوسرا حصہ:

نسب نامہ گرامی کا حصہ دوم وہ ہے جو معد بن عدنان سے اُوپر آتا ہے۔ مُحد ثین رحمہ اللہ اس حصے کا اندراج اس تفصیل کے ساتھ، جیسا کہ ہم ذیل میں تحریر کریں گے، اپنی کتابوں میں نہیں کرتے، کیوں کہ ان کے اُصولوں کے مطابق جو صحیح روایات کے متعلق اُنھوں نے اختیار فرمائے ہیں، اس حصے کا روایت کرنا دشوار ہے۔ ان بزرگواروں کا یہ نہایت وَرع وتقویٰ ہے۔ بایں ہمہ جُملہ محدّثین اس سلسلے کے خاص خاص مشاہیر کے آٹھ نو نام لے کر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ نسبِ گرامی حضرت اسماعیل علیہ السلام تک مُنتہیٰ ہوجاتا ہے۔ یہ طریق کہ سلسلۂ نسب میں خاص خاص مشاہیر کا نام لے کر اختصار سے کام لیا جائے، بنی اسرائیل میں بھی مُروّج تھا۔ انجیلِ متّٰی کو دیکھو، وہ لکھتے ہیں:

''یسوع مسیح ابن داود ابن ابراہام کا نسب نامہ، یہ ظاہر ہے کہ متّٰی نے مسیح اور داود علیہما السلام کے درمیان ۲۶ پشتیں، اور داود و ابراہیم علیہما السلام میں ۱۲ پشتیں دانستہ اختصار کے لیے چھوڑ دی ہیں۔''

حصہ دوم کے شاملِ کتاب کرنے کی جراَت مجھے اس لیے ہوئی کہ "كَذَبَ النَّسَّابُوْنَ مَا فَوْقَ عَدْنَان" کا قطعی صحت تک پہنچ جانا مجھ پر مخفی رہا اور میں نے دیکھا کہ اکثر علماء نے، جو تاریخ اور حدیث میں امام تسلیم ہوئے ہیں، اس حصے کو بیان کیا ہے۔ ''سبائک الذهب للسويدي'' (ص: ۱۹) میں ہے:

"قَدِ اخْتُلِفَ فِيْ كرَاهَةِ رَفْعِ النَّسَبِ مِنْ عَدْنَانَ اِلٰى آدَمَ فَذَهَبَ ابْنُ اِسْحَاقَ وَ ابْنُ جَرِيْرٍ وَ غَيْرُهٗ اِلٰى جَوَازِهٖ، وَ عَلَيْهِ الْبُخَارِيُّ وَ غَيْرُهٗ مِنْ الْعُلَمَاءِ"

''عدنان سے اوپر حضرت آدم علیہ السلام تک نسب بیان کرنے کی کراہت میں اختلاف ہے۔ امام ابن اسحاق اور ابن جریر کے نزدیک جائز ہے۔ امام بخاری وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے۔''

کتاب ''رحلة الشافعی''، مصنفہ جلال الدین السیوطی میں امام شافعی رحمہ اللہ اور ہارون الرشید کے مکالمے کے ذکر میں ہے:

"فَقَالَ لِيْ: بَيِّنْ لِيْ عَنْ نَفْسِكَ؟ قَالَ الشَّافِعِيُّ: فَاَلْقَيْتُ حَتّٰى اَلْحَقْتُ آدَمَ علیہ السلام بِالطِّيْنِ"

''ہارون الرشید نے کہا: تم اپنی بات بتاؤ؟ میں نے اپنا نسب بیان کرنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے جا ملایا۔''

ان حوالجات کے بعد میں نے اس حصے کا لکھنا ترک کر دینے سے بہتر سمجھا۔ میں نے اوّل اوّل یہ حصہ ڈاکٹر سر سیّد احمد خان غفر اللہ لہٗ کی کتاب ''خطباتِ احمدیہ'' میں دیکھا تھا۔ سر سیّد رحمہ اللہ نے اس جگہ کسی کا پتا نہیں لکھا۔ انھوں نے ارمیا کاتب برخیا علیہ السلام اور الجیرا کے نسب نامہ کا ذکر فرمایا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ سر سیّد یہ باتیں کہاں سے لکھ رہے ہیں؟ مِن بعد مجھے تاریخ ابو الفداء (ابن کثیر) میں ارمیا اور الجیرا کا مذکور ملا اور پھر امام طبری کی کتاب میں ایک روایت کلبی کی ملی جس کی بابت امام طبری نے لکھا ہے:

''یہ روایت ارمیا کے نسب نامے کے موافق ہے۔ صرف کہیں کہیں اختلافِ اَلسنہ کی وجہ سے اختلافِ لہجہ کا فرق پڑ گیا ہے۔ دوسری روایت خود امام طبری کی ہے جسے انھوں نے ایک عرب نسب دان سے لیا ہے۔''

پھر مجھے امام ابن سعد کی کتاب طبقات الکبیر میں بھی یہی حصہ مل گیا۔ مجھے ان کتابوں سے مطابقت کرنے کے بعد سر سیّد کے نسب نامے میں لکھے ہوئے چند نام: عدنان دوم، ادو دوم، الیسع، ہمیسع دوم، سلامان دوم، ثابت، حمل، معداول نہیں ملے۔ معلوم نہیں ان کا سر سیّد نے کس کتاب کے حوالے سے اضافہ فرمایا ہے۔ میں نے وہی نام لکھے ہیں جو بالاتفاق متعدد روایات میں بیان ہوئے ہیں۔

تیسرا حصہ:

١. نسب نامۂ گرامی کا حصہ سوم جو حضرت اسماعیل علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت ابو البشر آدم علیہ السلام تک منتہیٰ ہوتا ہے، توراتِ موجودہ سے لیا گیا ہے۔ اسماء کے اعراب عربی زبان کی تورات متشکّل سے لیے گئے ہیں۔

٢. ہر نام کے سامنے سنینِ عمر درج ہیں۔ یہ بھی تورات سے لیے گئے ہیں جو غالباً صحیح ہیں، لیکن توراۃ میں یہ بھی ہے کہ فلاں عمر میں فلاں شخص کے پسر پیدا ہوا ہے۔ اس میں کئی اشکال ہیں مثلاً: مندرجہ ذیل بیاناتِ تورات پر غور کرو:

1. حضرت آدم علیہ السلام ۱۳۰ برس کے تھے جب ان کے یہاں شیث علیہ السلام پیدا ہوئے۔ (۵/۳) پیدایش
2. حضرت شیث علیہ السلام ۱۵۰ برس کے تھے کہ ان سے انوس پیدا ہوا۔ (۵/۶) پیدایش
3. انوس ۹۰ برس کا تھا کہ اس سے قینان پیدا ہوا۔ (۵/۹) پیدایش
4. قینان ۷۰ برس کا تھا کہ اس سے محلل ایل پیدا ہوا۔ (۵/۱۲) پیدایش
5. محلل ایل ۶۵ برس کا تھا کہ اس سے یارو پیدا ہوا۔ (۵/۱۵) پیدایش
6. یارو ۱۶۲ برس کا تھا کہ اس سے حنوک پیدا ہوا۔ (۵/۱۸) پیدایش
7. حنوک ۶۵ برس کا تھا کہ اس سے متوسلح پیدا ہوا۔ (۵/۲۱) پیدائش
8. متوسلح ۱۸۷ برس کا تھا کہ اس سے لِمک پیدا ہوا۔ (۵/۲۱) پیدایش
9. لِمک ۵۰۲ برس کا تھا کہ اس سے حضرت نوح علیہ السلام پیدا ہوئے۔ (۵/۲۸) پیدایش
10. حضرت نوح علیہ السلام ۵۰۲ برس کے تھے کہ ان سے سم پیدا ہوا۔[1]
11. سم ۱۰۰ برس کا تھا کہ اس سے طوفان کے ۲ برس بعد ارفکسد پیدا ہوا۔
12. ارفکسد ۳۵ برس کا تھا کہ اس سے عیر پیدا ہوا۔
13. عیر ۳۴ برس کا تھا کہ اس سے فلج پیدا ہوا۔
14. فلج ۳۰ برس کا تھا کہ اس سے رعو پیدا ہوا۔
15. رعو ۳۲ برس کا تھا کہ اس سے سروج پیدا ہوا۔
16. سروج ۳۰ برس کا تھا کہ اس سے نحور پیدا ہوا۔
17. نحور ۲۹ برس کا تھا کہ اس سے تارہ (آزر) پیدا ہوا۔
18. تارہ ۷۰ برس کا تھا کہ اس سے ابرام پیدا ہوا۔

اگر ہم اس حساب کو صحیح قرار دیں تو لازم آتا ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھا ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر نوح علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے ۸۸ سال کی ہوگئی ہو اور حضرت

[1] یہ عبارت کہ حضرت نوح علیہ السلام ۵۰۲ سال کے تھے کہ ان سے سم پیدا ہوا، کتاب پیدایش میں نہیں ہے۔ مگر کتاب پیدایش میں یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ۶۰۰ سال کے تھے جب طوفان آیا۔ نیز یہ فقرہ ہے کہ سم طوفان کے دو سال بعد ۱۰۰ برس کا تھا، جب ارفکسد پیدا ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ حضرت نوح ۵۰۲ سال کے تھے جب سم پیدا ہوا۔

نوح علیہ السلام کی زندگی میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر دو سال کی ہو۔ حساب کرو کہ حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے بعد ساڑھے تین سو برس تک زندہ رہے۔ (۹/۲۸)

پیدائش اور طوفان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش کا زمانہ ۲۶۲ + ۸۶ = ۳۴۸ برس کا ہے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے باپ کی ۸۶ سال کی عمر میں پیدا ہوئے۔ حالانکہ ان امور کا کوئی عالم اہلِ کتاب قائل نہیں۔ اس لیے مجھے اس حساب کی صحت میں شک رہا۔ بعد ازاں تاریخ ابو الفداء (ابن کثیر) میں سے اسی مقام کے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے تعجب آمیز مسرت ہوئی کہ یہ فاضل مؤرّخ بھی اس خیال میں میرے ساتھ متفق ہے۔ مزید اطمینان کا موجب یہ ہوا کہ امام ابو محمد علی ابن احمد بن حزم الظاہری (المتوفیٰ ۴۵۶ ھ) نے بھی کتاب ''الفصل'' میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔

الغرض حصہ سوم کے نام تو صحیح ہیں، البتہ دیگر معلومات بعض جگہ مشکوک ہیں۔ چونکہ نسب نامہ میں صحتِ اسماء ہی زیادہ تر درکار ہوتی ہے، اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ نسب نامۂ گرامی کا یہ حصہ بھی بالکل صحیح ہے۔ ان ضروری تمہیدات کے بعد شجرۂ مبارکہ درج کیا جاتا ہے:

﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾

لنبینا محمد رّسول الله خاتم النبیین ﷺ

حصہ اول:

نمبر شمار	آبائہ الکرام	اُمہاتہ العظام	اُمہات کے دُدھیال اور ننھیال
1	عبداللہ	آمنہ	أب: وہب بن عبدمناف بن زہرہ بن کلاب (دیکھو سلسلہ: ۶ آبائے نبوی) أم: برّہ بنت عبد العزیٰ بن عبدالدار بن قصیّ (دیکھو سلسلہ: ۵ آبائے نبوی)
2	عبدالمطلب	فاطمہ	أب: عمر بن عائذ بن عمران بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ۔ (دیکھو سلسلہ: ۷ آبائے نبوی) أم: صخرہ (۱) بنت عبد بن عمران بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ۔ (دیکھو سلسلہ: ۷ آبائے بنوی)

3	ہاشم	سلمٰی	اَب: عمرو بن زید بن لبید بن خداش بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار (تیم اللہ) بن ثعلبہ خزرجی۔ اُم: عمیرہ (۲) بنت صخر بن حبیب ابن الحارث بن ثعلبہ بن مازن بن النجار ساکن مدینہ۔
4	عبد مناف	عاتکہ	اَب: مرہ بن ہلال بن فالج بن زکوان بن ثعلبہ بن بشہ بن سلیم بن منصور۔ (از نسل سلسلہ: ۱۷ آبائے نبوی) اُم: مادیّہ (عرف صفیہ) (۳) بنت حوزہ بن عمرو بن صعصعہ بن معاویہ بن بکر بن ہوازن۔ (ایضاً)
5	قصی	حُبّی	اَب: خلیل بن حبشیّہ بن سلول بن کعب بن عمرو بن ربیعہ (وہوالخزاعی) اُم: ہند (۱) بنت عامر بن النضر بن عمرو بن عامر (من الخزاعہ)
6	کلاب	فاطمہ	اَب: سعد بن سیل (حیر) بن عوف بن عامر الحاوٰ (کان اول من بنی جدارالکعبہ فقیل ۴عمامار) از دشنوہ اُم: ظریفیہ (۲) بنت قیس بن امیّہ ذی الراسین جشیم بن کنانہ بن عمرو بن القین بن فہم بن عمرو بن قیس بن عیلان بن الیاس۔ (دیکھو سلسلہ: ۱۷ آبائے نبوی)
7	مرّہ	ہند	اَب: سریر بن ثعلپہ بن الحارث بن مالک۔ (دیکھو سلسلہ: ۱۲ آبائے نبوی) اُم: امامہ (۳) بنت عبد مناۃ بن کنانہ۔ (دیکھو سلسلہ: ۱۴ آبائے بنوی)

8	کعب	مخشیہ	اَب: شیبان بن محارب بن فہر۔ (دیکھوسلسلہ: ۱۱ آبائے نبوی) اُم: وشیہ (۴) بنت وائل بن قاسط بن ہنب بن اقصٰی بن صمعی بن جدیلہ۔
9	لؤیّ	ماویۃ	اَب: کعب بن القین (ہو النعمان) بن حسیر بن شیع اللہ بن اسد بن وبرہ بن تغلب بن حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعہ۔ اُم: عاتکہ بنت کاہل بن عذرہ۔
10	غالب	عاتکہ	اَب: یخلد بن النضر بن کنانہ (دیکھوسلسلہ: ۱۳ آبائے نبوی) اُم: انیسہ (۵) بنت شیبان بن ثعلب بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل۔
11	فہر الملقب بقریش	لیلٰی	اَب: حارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ۔ (دیکھوسلسلہ: ۱۶ آبائے نبوی) اُم: سلمٰی (۱) بنت طانجہ بن الیاس۔ (دیکھوسلسلہ: ۱۶ آبائے نبوی شجرہ ہذا)
12	مالک	جندلہ	اَب: عامر بن الحارث بن مضاض بن زید بن مالک جرہمی۔ اُم: ہند بنت الطلیم بن مالک بن الحارث جرہمی
13	نضر	عِکرِشہ	اَب: عدنان (حارث) بن عمرو بن قیس بن عیلان بن مضر۔ (دیکھوسلسلہ: ۱۷ آبائے نبوی) اُم:

14	کنانہ	برّہ	اَب: مرّہ بن اُدّ بن طانجہ (اخت تمیم بن مرّ) (طانجہ برادر مدرکہ) (دیکھوسلسلہ:۱۶ آبائے نبوی) اُم:
15	خزیمہ	عوانہ۔ ہند	اَب: سعد بن قیس بن عیلان بن الیاس۔ (دیکھوسلسلہ: ۱۷ آبائے نبوی) اُم: وعد بنت الیاس۔ (ایضاً)
16	مدرکہ	سلمیٰ	اَب: اسلم بن الحاف بن قضاعہ۔ اُم:
17	الیاس	لیلیٰ (خندف)	اَب: حلوان بن عمران بن الحاف بن قضاعہ۔ اُم: ضریہ بنت ربیعہ بن نزار (دیکھوسلسلہ:۱۹ آبائے نبوی)
18	مضر	رباب	اَب: حَیدہ بن معد۔ (سلسلہ: ۲۰ آبائے نبوی) اُم:
19	نزار	سودہ	اَب: عک بن الریث بن عدنان (دیکھوسلسلہ:۱۶) اُم:
20	معد	معانہ	اَب: جوشم بن جلہمہ بن عمر بن برّہ بن جرہم۔ اُم: سلمیٰ بنت الحارث بن مالک بن غنم (جرہم)
21	عدنان	مہدد	اَب: لہم بن حلجب بن جدیس بن جاتر بن ارم اُم:

① صخرہ کی ماں کا نام تخمر بنت عبد بن قصی۔ نانی کا نام سلمیٰ بنت عامرہ بن عمیرہ بن ودیعہ ابن الحارث بن فہر۔ پرنانی کا نام عاتکہ بنت عبداللہ بن وائکہ بن ظِرب تھا۔

② عمیرہ کی ماں کا نام سلمی بنت عبدالاشہل اور نانی کا نام اثیلہ بنت رعورا تھا۔

③ مادیّہ کی ماں کا نام رتاش بنت الاسحم اور نانی کا نام کبشہ بنت الرافقی تھا۔

④ ہند کی ماں کا نام لیلیٰ بنت مازن (من خزامۃ) تھا۔

5. ظریفیّہ کی ماں کا نام صخرہ بنت عامر تھا۔
6. امامہ کی ماں کا نام ہند بنت دودان بن اسد خزیمہ ہے۔
7. وشیہ کی ماں کا نام مادیہ بنت صبیعہ بن ربیعہ بن نزار ہے۔
8. انیسہ کی ماں کا نام تماخر بنت الحارث اور نانی کا نام رہم بنت کاہل ہے۔
9. سلمٰی کی ماں کا نام عاتکہ بنت الاسد اور نانی کا نام زینب بنت ربیعہ ہے۔

حصّہ دوم:

نسب نامہ تا حضرت اسماعیل علیہ السلام

نمبر شمار	بروایت طبری[1]	بروایت ابن سعد	توضیحات جو امام طبری نے اپنے راوی سے یہ الفاظ لکھ کر روایت کی ہیں
			وأخبرنی بعض النساب أنه وَجد طائفةً من العلماء العرب قد حفظت لِمعدٍّ أربعين أباً بالعربية إلى إسماعيل واحتجّت لقولهم ذٰلك بأشعار العرب وأنه قابلَ بما قالوا من ذٰلك أهل الكتاب فوجد العدد متفقاً واللفظ مختلفاً وأملىٰ ذَلك عليّ فكتبتُه عنه. (جلد ثانی: ص ۱۹۳)
22	ادو	اُدو	
23	ہمیُسع	ہَمَیْسَعْ	
24	سلامان	سلامان	ہمیدع اور شاحب بھی اسی کو کہتے ہیں۔
25	عوص	عوص	منجر اور نبیت بھی اسی کو کہتے ہیں۔
26	بوز	بوز	اسکو ثعلبہ بھی کہتے ہیں اور قبیلۂ ثعلبہ اسی کی جانب منسوب ہے۔
27	قموال	قموال	اس کو یوزا اور عشر الغناء بھی کہتے ہیں، رسم عشرہ عرب میں اس نے نکالی

۱۔ حدثنی الحارث قال حدثنا محمد بن سعد قال حدثنا هشام بن محمد قال وكان رجل من أهل تَدْمُر يكنّى أبا يعقوب من مسلمة بني إسرائيل قد قرأ من كتبهم وعلم علمًا فذكر أن بروخا بن ناريا كاتب إرميا أثبت نسب معد بن عدنان عنده ووضعه في كتبه وأنه معروف عند أحبار أهل الكتاب مثبت في اسفارهم وهو مقارب لهذه الأسماء ما روى عن الكلبي محمد ابن السائب اذكره من بعده ولعل خلاف ما بينهم من قبل اللغة لأن هذه الأسماء مترجمه من العبرانيه. (طبری ج۲ ص۱۹۳ مطبوعه دار الفكر بيروت)

28	اُبیّ	اُبیّ	اس کو سعد رجب بھی کہتے ہیں، رسم رجبیہ اس نے نکالی۔
29	عوام	عَوامَ	قموال اور بریخ الناحب بھی اسی کو کہتے ہیں: "كان في زمن سليمان علیہ السلام"
30	ناشد	ناشد	محلم ذوالعین اسی کا لقب ہے۔
31	حزا	حزا	ہوالعوام۔
32	بلداس	بلداس	اسے محتمل بھی کہتے ہیں۔
33	یدلاف	تدلاف	رائمہ اسی کا لقب ہے۔
34	طانخ	طانخ	اسی کو طاہب بھی کہتے ہیں، عیقان اسی کا لقب ہے۔
35	جاحم	جاحم	اس کا لقب علتہ ہے۔
36	ناحش	ناحش	اس کا لقب علتہ ہے۔
37	ماخی	ماخی	اس کو اہل عرب الظریب خاطم النّار کہا کرتے تھے۔
38	عیفی	عیفی	اس کو عافی اور عبقر ابوالجن کہتے ہیں، جنتِ عبقر اسی کی جانب منسوب ہے۔
39	عبقر	عبقر	اس کو ابراہیم جامع الشمل کہتے ہیں، یہ لقب جامع الشمل اس لیے ہوا کہ اس کے عہد میں امنِ کامل تھا، راستے بے خطر جاری تھے۔
40	عبید	عبید	اس کو اسماعیل ذوالمطانخ کہتے، ذوالمطانخ اس لیے کہتے ہیں کہ مسافروں کے لیے سارے ملک میں ضیافت خانے مقرر کیے گئے۔
41	الدعا	الدعا	اس کو تیرن الطعان کہتے ہیں، پہلا شخص ہے جس نے نیزہ کا جنگ میں استعمال کیا۔
42	حمدان	حمدان	اسی کو اسماعیل ذوالاعوج کہتے ہیں، اعوج اس کے گھوڑے کا نام تھا، اب اعوج نسلِ اسپاں اسی کی جانب منسوب ہے۔
43	سَنبُرَ	سنبر	اسے بشمین اور مطعم فی المحل بھی کہتے ہیں، اس کے محل میں ہر شخص کے لیے کھانا تیار رہتا تھا۔
44	یثربی	یثربی	یثرم اور طمع بھی اسی کا لقب ہے۔

45	یحزن	نحزن	نحزن نام اور تسور لقب ہے۔
46	یلحن	یلجن	یلحن نام اور عنود لقب ہے۔
47	ارعوے	ارعوے	رعوبے نام اور دعدع لقب ہے۔
48	عیضی	عیضی	عاقر لقب ہے۔
49	ذیشان	ذیشان	لقب ان کا الزاعیہ ہے
50	عیصر	عِیصَرُ	اسی کو عاصر اور نیر وان ذو الاندیہ کہا جاتا ہے، اسی کے عہد میں نبیت اور جادان فرزندان قادرد میں جنگ ہوئی۔
51	اقناد	اقناد	اقناد نام۔ ایاہمہ لقب ہے۔
52	ایہام	ابہام	یہامی نام اور دوس القلق اور اجمل الخلق لقب ہیں۔
53	مقصر	مقصی	مقاصری نام اور حصن اور نزال لقب ہے۔
54	ناحث	ناحث	
55	زارح	زارح	قمیر لقب ہے۔
56	سمّی	شمّی	سما نام اور المحشر لقب ہے۔
57	مزّی	مَزّی	ہرمز بھی اسی کو کہتے ہیں۔
58	عوض	عوص	اس کا لقب ثمر اور صفی بھی ہے۔
59	عرام	عَرّام	
60	قیدار	قیدار[1]	

حصہ سوم:

نمبر شمار	نام	عُمر
61	اسماعیل علیہ السلام	۱۳۷ سال عُمر پائی
62	ابراہیم علیہ السلام	۱۷۵ سال

۱۔ قیدار کی بیوی کا نام عاضرہ تھا جو قبیلہ جرہم سے تھیں۔

63	تارہ (آزر)	۲۰۵سال
64	ناحور	۱۵۹سال
65	سروج	۲۳۲سال
66	رعو	۲۳۹سال
67	فالج	۲۳۹سال
68	عابر	۴۶۰سال
69	ارفکشاد	۴۳۸سال
70	سام	۶۰۲سال
71	نوح علیہ السلام	۹۵۰سال
72	لامک	۷۷۷سال
73	متوشائح	۹۶۹سال
74	اخنون (حضرت ادریس علیہ السلام)	۳۶۵سال
75	یارو	۹۶۲سال
76	ملہل ایل	۸۹۵سال
77	قینان	۹۱۰سال
78	آنوش	۹۰۵سال
79	حضرت شیث علیہ السلام	۹۱۳سال
80	حضرت آدم علیہ السلام	۹۳۰ سال

تعدادِ ایّام قیامِ نبوی ﷺ بعالمِ دنیوی

دِن ۲۲۳۳۰

گھنٹے .... ۶[1]

---

(1) گھنٹے ۲۲۳۳۱ ویں دن کے ہیں۔

ولادتِ مبارک

عیسائیوں کے ایسٹر سے ۲۳ ویں دن اور یہودیوں کی عید الفصح سے ۲۵ ویں دن ہوئی تھی۔ اس میں یومِ وفات بھی شامل ہے۔

تعدادِ ایّامِ تبلیغِ رسالت ونبوت

۸۱۵۶ دن

۵۷۱ء میں اِیسٹر کا اتوار ۱۶ صفر مطابق ۲۹/۳۱ مارچ ۵۷۱ء کو تھا۔

۴۳۳۱ مطابق ۵۷۱ء میں یہود کی عید الفصح پنجشنبہ ۱۳ صفر مطابق ۱۸/۲۶ مارچ کو تھی۔[1]

نقشہ
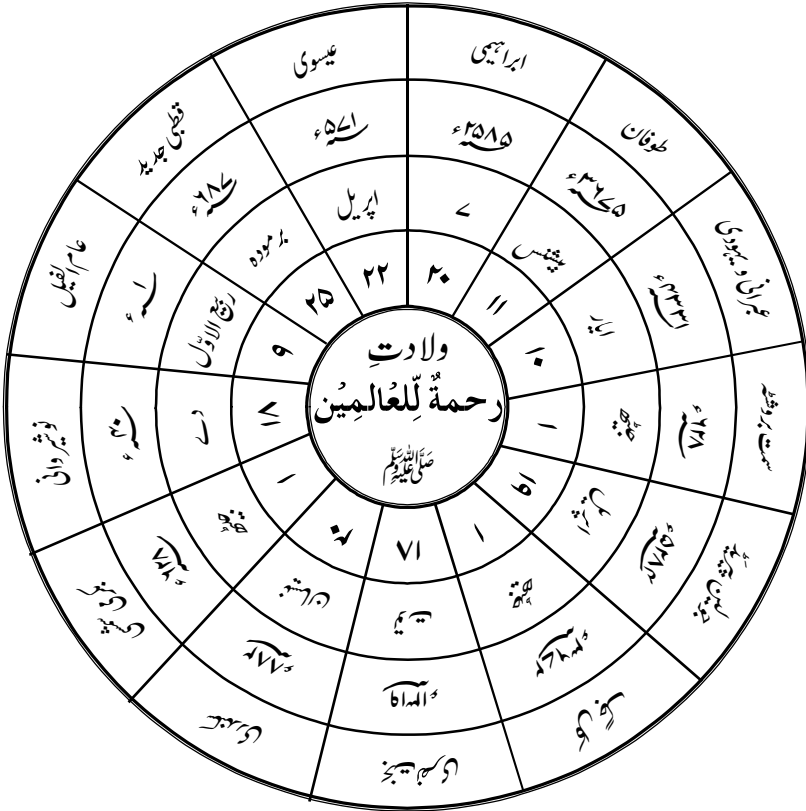
① ماخوذ از ''رحمۃ للعالمین'' قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ

ظہورِ قُدسی
یا
نبیِ اکرم ﷺ کی صحیح تاریخِ ولادتِ باسعادت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعدارض وسماء کے روحانی تعلق اور رشتۂ وحی کو منقطع ہوئے کم وبیش چھے سو سال گزر چکے تھے۔ پوری دُنیا بالعموم اور ملک وقومِ عرب بالخصوص کچھ اس طرح کے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی انحطاط سے دوچار تھی کہ پورا عالمِ انسانیت ہی گھٹاٹوپ اندھیروں میں گھِر چکا تھا۔ انسان کا ضمیر مُرجھا چکا تھا۔ تاریکیوں نے ہر پہلو سے بنی آدم کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور روشنی کی کوئی کرن دُور دُور تک نظر نہیں آتی تھی۔

خالقِ کائنات، مالکِ ارض وسماء کو اپنی اس مخلوقِ انسانی کے حال پر ترس آ گیا۔ رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور اس نے بھٹکی ہُوئی انسانیت کی راہنمائی کے لیے اولادِ ابراہیم خلیل اور نسلِ اسماعیل ذبیح علیہ السلام سے نبی آخرالزّمان رحمۃٌ لِلّعالمین ﷺ کو پیدا فرمایا۔

آپ ﷺ کی ولادت کے اُس یومِ سعید کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''چمنستانِ دَہر میں بار ہا روح پروَر بہاریں آچکی ہیں۔ چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ لیکن آج (۹/ربیع الاوّل) کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِکہن سال دَہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے۔ سیّارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخِ کُہن مدّت ہائے دراز سے اسی صبحِ جان نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدّت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، اَبروباد کی تردستیاں، عالمِ قُدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یُوسف، معجز طرازیِ موسیٰ،

جان نوازیِ مسیح (علیہ السلام) سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں قدر شاہِ کونین (ﷺ) کے دربار میں کام آئیں گے۔"

آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِفرخ فال ہے۔ اربابِ سِیَر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں:

"آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے۔ آتش کدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے ساوہ خشک ہوگیا۔"[1]

آگے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم اور اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتشکدۂ کفر، آزرکدۂ گمراہی سرد ہوکر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اُڑنے لگی۔ بُت کدے خاک میں مِل گئے۔ شیرازۂ مجوسیّت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اُٹھا۔ چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی۔ آفتابِ ہدایت کی شُعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاقِ انسانی کا آئینہ پَر توِقُدس سے چمک اُٹھا۔ (یعنی) یتیمِ عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شاہِ کونین، عالَمِ قدس سے عالَمِ مکان میں تشریف فرمائے عزّت واجلال ہُوئے۔"[2]

یہ تحقیق ہم آگے چل کر پیش کر رہے ہیں کہ ہئیت دانوں، مورخوں اور سیرت نگاروں نے صحیح ترین تاریخِ ولادت ۹ ربیع الاوّل ۱ عام الفیل ۲۰ اپریل ۵۷۱ء بروز پیر کو ہی صحیح قرار دیا ہے۔ ترمذی شریف میں قیس رضی اللہ عنہ بن مخرمہ کے الفاظ ہیں:

«وُلِدْتُّ اَنَا وَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَامَ الْفِیْلِ»

---

[1] یاد رہے کہ یہ ارہاصاتِ نبّوت دلائل النبوّۃ میں امام بیہقی نے اور طبقات (۶۳/۱) میں ابنِ سعد وغیرہ نے ذکر کیے ہیں۔ مگر علامہ محمد الغزالی نے اپنی کتاب "فقہ السیر ۃ" میں ان تعبیرات کو غلط قرار دیا ہے۔ (فقه السيره بتخريج الألباني، ص: ٦١)

[2] سیرت النّبی ﷺ علامہ شبلی (۱۷۰/۱ تا ۱۷۱)

’’میں اور رسول اللہ ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔‘‘

اسی روایت میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قباث رضی اللہ عنہ بن اشیم سے پوچھا:

«اَنْتَ اَکْبَرُ أَمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ» ’’تم بڑے یا رسول اللہ ﷺ ؟‘‘

تو انھوں نے کمالِ اَدب سے جواب دیا:

«رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَکْبَرُ مِنِّیْ وَاَنَا اَقْدَمُ مِنْهُ فِی الْمِیْلَادِ»[1]

’’مجھ سے بڑے تو رسول اللہ ﷺ ہی ہیں البتہ میں آپ ﷺ سے پہلے پیدا ہوا تھا۔‘‘

آپ ﷺ کی ولادت کے بعد سیّدہ آمنہ نے آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کو پیغامِ مسّرت بھیجا۔ وہ خوشی خوشی گھر آئے۔ اپنے عُنفوانِ شباب میں داغِ مفارقت دے جانے والے بیٹے کی نشانی کو گود میں لیا اور خانہ کعبہ میں لے گئے۔ وہاں دُعا مانگی اور واپس لائے۔ دادا ہی نے اپنے اس دُرِّ یتیم کا نام محمد رکھا۔ ’’سیرت ابن ہشام رحمہ اللہ‘‘ (۱/ ۱۵۹۔۱۶۰) میں لکھا ہے:

آپ ﷺ کے دادا نے آپ ﷺ کی ولادت کے ساتویں دن آپ ﷺ کا حسبِ دستور ختنہ کیا اور ساتویں دن ہی آپ ﷺ کا نام بھی رکھا۔[2]

یہ بات جو عام مشہور ہے کہ نبی ﷺ مختون پیدا ہوئے تھے، اس کے بارے میں علامہ ابن قیّم رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

وہ حدیث صحیح نہیں بلکہ ابن الجوزی نے اسے موضوعات (من گھڑت روایات) میں بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں کوئی بھی حدیث صحیح ثابت نہیں اور یہ کوئی خاصۂ رسُول بھی نہیں، کیوں کہ کتنے ہی اور لوگ بھی مختون پیدا ہو چکے ہیں۔[3]

ایسے ہی اور بھی بہت سے امور مثلاً: حملِ آمنہ، شبِ ولادتِ رسُول ﷺ میں ارہاصات وخوارق کتبِ تاریخ وسیرت میں بیان کیے گئے ہیں جن میں سے کچھ غلو کا نتیجہ ہیں تو کچھ رواۃ کے تساہلِ قبول کا۔ کچھ روایات ضعیف ہیں اور کئی موضوع ہیں۔ اسی لیے ہم نے اِن میں سے کچھ نقل نہیں کیا۔ کیوں کہ جب صحاح وحسان میں کفایت ہے تو ضِعاف وموضوعات کی کیا حاجت؟

---

[1] سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (۱۰/ ۸۸ تا ۸۹، رقم الحديث: ۳۶۹۸) طبع مدنی.

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: زاد المعاد، ۱/ ۸۱) تحقيق الأرناؤوط.

[3] فقه السيرة للغزالي (ص: ۶۱)

عِید میلاد کے نام سے کی جانے والی یہ خُوشیاں ولادَت پر ہیں یا وفات پر؟!

عید میلاد النّبی ﷺ منانے یا نہ منانے کے مسئلے سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت با سعادت کب ہوئی؟ اور آپ ﷺ نے کس دن وفات پائی؟ تاکہ کہیں غلطی سے آپ ﷺ کی وفات پر خوشیاں منانے کا نادانستہ جُرم نہ کرتے رہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات تو تمام مورخین اور سیرت نگاروں میں متفق علیہ ہے کہ آپ ﷺ کی ولادتِ با سعادت کا دن پیر ہے اور اصحابِ تاریخ و سِیَر پر ہی بس نہیں، خود نبیِ اکرم ﷺ کی ایک صحیح حدیث مسلم شریف میں موجود ہے۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سے پیر کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«ذٰلِکَ یَوْمٌ وُلِدْتُّ فِیْہِ یَوْمٌ بُعِثْتُ اَوْ اُنْزِلَ عَلَيَّ فِیْہِ»[1]

''یہ وہ دن ہے جس میں مَیں پیدا ہوا، اور اسی دن میں معبُوث ہوا یا مجھ پر وحی نازل کی گئی۔''

ایک متکلم فیہ سند والی روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"وُلِدَ النَّبِیُّ ﷺ یَوْمَ الْإِثْنَیْنِ وَ اسْتُنْبِیَٔ یَوْمَ الِاثْنَیْنِ وَ تُوُفِّیَ یَوْمَ الْإِثْنَیْنِ وَ خَرَجَ مُھَاجِراً مِنْ مَکَّۃَ اِلٰی الْمَدِیْنَۃِ یَوْمَ الْإِثْنَیْنِ وَقَدِمَ الْمَدِیْنَۃَ یَوْمَ الِاثْنَیْنِ وَ رَفَعَ الْحَجَرَ یَوْمَ الْإِثْنَیْنِ"

''نبیِ اکرم ﷺ پیر کے دن پیدا ہوئے اور پیر کے دن نبوّت کا اعلان کیا۔ اور پیر کے دن ہی وفات پائی اور پیر کے دن نبیِ اکرم ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کے لیے روانہ ہوئے اور پیر کے دن مدینہ منورہ پہنچے اور پیر کے دن حجرِ اسود کو اٹھایا۔''

امام ہیثمی نے "مجمع الزوائد" میں اسے مسند امام احمد اور "الطبراني في الکبیر" کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے کہ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"فَتَحَ بَدْرًا یَوْمَ الْإِثْنَیْنِ، وَنَزَلَتْ سُوْرَۃُ الْمَائِدَۃ یَوْمَ الِاثْنَیْنِ ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ﴾"

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۶۲) عن أبي قتادہ.

''فتح بدر بھی پیر کو حاصل ہوئی اور سورۃ المائدہ بھی پیر ہی کو نازل ہوئی جس (آیت: ۳) میں اللہ نے فرمایا ہے: ''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا ہے۔''

لیکن اس روایت کی سند میں ابن لہیعہ ہے اور وہ ضعیف ہے، کیوں کہ اس نے اس حدیث میں اپنے سماع کی صراحت نہیں کی بلکہ عَنْ سے روایت بیان کی ہے جبکہ دوسرے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔[1]

رہا معاملہ تاریخِ ولادت کا، تو اس کے بارے میں خود آپ ﷺ سے تو کوئی روایت نہیں ملتی۔ البتہ سیرت ابن اسحاق کی ایک روایت سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے جس سال کہ ہاتھی والے ابرہہ اور اس کے لشکر نے بیت اللہ شریف پر حملہ کیا اور غضبِ الٰہی کا شکار ہوئے تھے۔ وہ روایت یوں ہے: قیس بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

'' وُلِدْتُّ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَامَ الْفِيْلِ ''[2]

''میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی سال عام الفیل میں پیدا ہوئے۔''

امام سہیلی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

''ہاتھی ماہِ محرم میں مکہ آیا تھا اور آپ ﷺ اس واقعے کے پچاس دن بعد پیدا ہوئے تھے۔''

امام سہیلی رحمہ اللہ اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کے بقول جمہور اہلِ علم کا مسلک یہی ہے۔[3]

مشہور مفسر اور مورّخ کبیر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ "البداية و النهاية" میں لکھا ہے کہ جمہور اہلِ علم کا مسلک یہ ہے کہ آپ ﷺ ماہِ ربیع الاوّل میں پیدا ہوئے لیکن یہ کہ آپ ﷺ اس ماہ کے اوّل، آخر، وسط یا کس تاریخ کو پیدا ہوئے؟ اس کے بارے میں مورّخین اور سیرت نگاروں کے بکثرت اقوال نقل کیے ہیں۔ کسی نے دو ربیع الاوّل کہا ہے، کسی نے آٹھ، کسی نے دس، کسی نے بارہ، کسی نے سترہ، کسی نے اٹھارہ اور بعض نے بائیس ربیع الاوّل کہا ہے۔ ان سب میں سے راجح قول دو ہیں: ایک بارہ ربیع الاوّل کا اور دوسرا آٹھ ربیع الاوّل کا۔ صاحبِ البدایہ نے آٹھ ہی کو راجح قرار دیا ہے جو امام حمیدی نے ابن حزم سے نقل کیا ہے اور کئی دیگر ائمہ نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔[4]

---

[1] انظر: الفتح الربّاني للعلامة أحمد عبد الرحمٰن البنّا (٢٠/ ١٨٩)

[2] ابن إسحاق بسند جيّد كذا قاله البنا في الفتح الربّاني (٢٠/ ١٩٠)

[3] الفتح الربّاني للبنّا (٢٠/ ١٩٠)

[4] البداية والنهاية لابن كثير (٢/ ٢٥٩ تا ٢٦٢)

امام طبری رحمہ اللہ اور امام ابن خلدون رحمہ اللہ نے بارہ ربیع الاوّل کو اختیار کیا ہے۔[1] امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے ''الوفا باحوال المصطفٰی ﷺ'' (۱/۱۵۴) میں دس ربیع الاوّل کو اوّلیت دی ہے۔ جبکہ ماضی قریب کے دو عظیم سیرت نگاروں میں سے علامہ قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی کتاب رحمۃٌ للّعالمین میں اور علامہ شبلی نے سیرت النّبی ﷺ میں ۹/ربیع الاوّل بمطابق ۲۰/اپریل ۵۷۱ء کو از روئے تحقیقِ جدید صحیح ترین تاریخِ ولادت قرار دیا ہے۔[2] اسی تاریخ کو محمد طلعت عرب نے ''تاریخ دول العرب'' میں صحیح قرار دیا ہے۔[3] مصر کے مشہور ماہرِ فلکیات اور معروف ہیئت دان محمود پاشا فلکی نے اپنی کتاب ''التقويم العربي قبل الإسلام و تاريخُ ميلادِالرسُول و هجر تِه'' میں دلائلِ ریاضی کی رُو سے متعدد زائچے بنا کر ثابت کیا ہے:

''عام الفیل ماہِ ربیع الاوّل میں یوم الاثنین (سوموار) کی صحت کے پیشِ نظر اور فرزندِ رسول ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یومِ وفات پر سُورج گرہن لگنے کے حساب کو مدِّنظر رکھا جائے تو آپ ﷺ کی ولادت کی صحیح تاریخ ۹/ربیع الاوّل ہی آتی ہے، جبکہ شمسی عیسوی تقویم کے حساب سے آپ ﷺ کی ولادت کا وقت ۲۰/اپریل ۵۷۱ء بروز پیر کی صبح بنتا ہے۔''[4]

محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

1. صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ (آنحضرت ﷺ کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گرہن لگا تھا اور یہ ۱۰/ہجری تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر کا تریسٹھواں (۶۳) سال تھا۔
2. ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰/ہجری کا گرہن ۷/جنوری ۶۳۲ء کو آٹھ بج کر تیس منٹ پر لگا تھا۔
3. اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری تریسٹھ برس پیچھے ہٹیں تو آپ ﷺ کی پیدائش کا

---

[1] بحوالہ رحمۃٌ للّعالمین علامہ قاضی سید سلیمان منصور پوری (۱/ ۴۰ حاشیہ)

[2] شبلي (١/ ١٧١) قاضی (١/ ٤٠)

[3] بحواله قاضي (١/ ٤٠ حاشيه و ٢/ ٣٦٧) أيضاً و انظر: محمد القدوة الكاملة (ص: ٧)

[4] حدائق الأنوار (١/ ٢٩) التقويم العربي (٣٦ تا ٣٩)

سال ۱۵۷۱ء ہے جس میں ازروئے قواعدِ ہیئت ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ ۱۲/اپریل ۱۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

4 تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاوّل کا مہینہ اور دوشنبہ یعنی پیر کا دن تھا اور تاریخ آٹھ سے لے کر بارہ تک میں منحصر ہے۔

5 ربیع الاوّل مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن صرف نویں تاریخ کو پڑتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر تاریخِ ولادت قطعاً ۲۰/ اپریل ۱۵۷۱ء تھی اور ربیع الاوّل کی نو تاریخ۔ بارہ ربیع الاوّل کی روایت مشہور تو ہے مگر وہ حساب سے صحیح ثابت نہیں ہوتی۔[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی پیدایش ۱۲/ ربیع الاوّل کو نہیں بلکہ صحیح تاریخ ۹/ ربیع الاوّل ہے۔ ہاں آپ ﷺ کی وفات ضرور ۱۲/ ربیع الاوّل کو ہوئی تھی جیسا کہ معروف کتبِ تاریخ و سِیَر سے معلوم ہوتا ہے جس کی مفصّل تحقیق کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف ہمیں اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ ہمارے بھائی جس تاریخ کو خوشیاں مناتے ہیں، وہ نبیِ کریم ﷺ کا یومِ پیدایش نہیں، بلکہ یومِ وفات ہے اور چند سال پہلے بلکہ آج تک ''بارہ وفات'' کے نام سے مشہور ہے۔ تو وفاتِ سرورِ کائنات ﷺ پر خوشیاں؟

ایں چہ بو العجبی است؟

اللہ تعالیٰ اس پہلو پر توجہ دینے اور سوچنے سمجھنے کی توفیق بخشے۔ آمین

مروّجہ مِیلادالنبی ﷺ کی شرعی حیثیت... کتاب وسُنّت کی روشنی میں

پورے عالم کے مسلمانوں اور بالخصوص اسلامیانِ برِّصغیر کا ایک طبقہ اس بات کا عادی ہو چکا ہے کہ بارہ ربیع الاوّل کو عید میلادالنبی ﷺ کے نام سے جشن منائے اور جلوس نکالے۔ اَکل وشرب کی دعوتیں کرے اور قوالیاں سُنے۔ جبکہ دوسرا طبقہ اس جشن کو شرعاً ناجائز قرار دیتا ہے۔

اس مختلف فیہ مسئلے اور ایسے ہی دیگر اختلافی مسائل کے سلسلے میں قرآن پاک نے ہمیں کئی بہترین اصول دیے ہیں جن میں سے پہلا اصول یہ ہے:

---

[1] بحوالہ سیرت النبی ﷺ (۱/ ۱۷۱-۱۷۲)

1 تنازعات کو اوّل تو سرے سے ہوا ہی نہ دی جائے، تاکہ اُمّت کی اجتماعی قوت میں کمزوری نہ پیدا ہو، جیسا کہ سورۃ الانفال (آیت: ۴۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾

''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

2 دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر کبھی کسی معاملے میں اختلاف ہو ہی جائے تو اس چیز کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عدالت میں لے جاؤ اور وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو اسے قبول کر لو، جیسا کہ سورۃ النساء (آیت: ۵۹) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾

''پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔''

3 اس سلسلے میں تیسرا اصول یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ فیصلہ کر دیں تو اسے بلا چوں و چرا قبول کر لینا ہی ایمان کی سلامتی کا ضامن ہے۔ جیسا کہ سورۃ النساء (آیت: ۶۵) میں ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَھُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾

''(اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی قسم وہ مومن نہ ہوں گے جب تک اپنے جھگڑوں کا فیصلہ تجھ سے نہ کروائیں اور پھر تیرے فیصلے سے ان کے دِلوں میں کچھ اُداسی نہ ہو، بلکہ (خوشی خوشی) مان کر منظور کر لیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے کے خلاف دل میں ذرّہ بھر بھی تنگی اور

ناپسندیدگی کی جائے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعاً لِّمَا جِئْتُ بِهِ»[1]

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات بھی میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہوجائیں۔''

نیز سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۶) میں فرمایا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دیں تو پھر کسی کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی مرضی سے کوئی اور راہ اپنائے، بلکہ اُس فیصلے کو قبول کرنا ہی ہوگا، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾

''اور کسی مرد یا عورت کے لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کسی بات کا حکم کر دیں تو پھر ان کو اس بات میں کوئی اختیار رہے، اور جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا فرمان نہ مانے (اور دوسروں کی رائے پر چلے) تو وہ کھلا گمراہ ہو چکا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کسی آیت یا حدیث کے مقابلے میں کسی مجتہد کی رائے پر عمل نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جونہی کوئی آیت یا حدیث ملے اُسے سر آنکھوں پر رکھیں اور مجتہد کی رائے صد احترام کے باوجود ترک کر دیں، کیوں کہ اسی میں ایمان کی سلامتی اور گمراہی سے بچاؤ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عطافرمودہ اصول (اپنے تنازعات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف پھیر دو) کے پیشِ نظر اس جشنِ میلاد جیسے اختلافی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے کتابِ الٰہی کو کھولیں۔ اس کے تیس پاروں یا ایک سو چودہ سورتوں کو اوّل تا آخر پڑھ جائیں، آپ کو کوئی ایک بھی ایسی آیت نہیں ملے گی جس سے مروّجہ جشن منانا ثابت ہو، لہٰذا عدالتِ الٰہی کا فیصلہ میلاد منانے والوں کے حق میں نہ ہوا، اور جس کام کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا، اسے سرانجام دے کر اجر وثواب کی توقّع رکھنا کارِ عبث ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر آیت: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ﴾ [الأحزاب: ٣٦]

جب ہم ارشادِ الٰہی کے مطابق دوسرے ثالث یا عدالتِ مصطفیٰ ﷺ کا رُخ کرتے ہیں تو آپ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ اور سیرتِ عطرہ کا مطالعہ یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ آپ ﷺ نے نہ خود اپنی ولادت کے دن جشن منایا اور نہ ہی اس بات کا کسی کو حُکم فرمایا ہے۔ اور یہ بات بھی نہیں کہ آپ ﷺ نے شاید غربت و افلاس کی وجہ سے ایسا نہ کیا ہو، بلکہ اگر آپ ﷺ کی مکی زندگی کو محدود معنوں میں قدرے تنگدستی کی زندگی بھی سمجھ لیا جائے تو ہجرتِ مدینہ کے بعد دس سال کے دَوران میں آپ ﷺ دولتِ اسلامیہ کے بانی و حاکم ہوگئے تھے۔ عرب وعجم اور ممالکِ مشرق ومغرب کے تمام خزانے آپ ﷺ کے قدموں میں ڈھیر ہوگئے تھے۔ مگر اس فارغ البالی کے باوجود بھی آپ ﷺ نے تادمِ آخر کسی سال بھی اس قسم کی عید اور جشن نہیں منایا تھا۔ اور جب خود صاحبِ میلاد نے ایسا نہیں کیا اور نہ ہی کرنے کا حکم دیا تو ایسے کام کو سرانجام دینا کس طرح نیکی وثواب ہوسکتا ہے؟

اگر اس کام میں نیکی و ثواب ہوتا یا کوئی بھی دینی یا دنیوی فائدہ ہوتا تو آپ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ضرور اس کا حکم دے دیتے، کیوں کہ آپ ﷺ کی شان میں تو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ (آیت: ۱۲۸) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾

''دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تمھیں میں سے ہے۔ تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق گزرتا ہے۔ تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔''

ایسے شفیق نبی ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کسی نیکی سے کیسے محروم رکھ سکتے تھے؟ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے قولاً اور فعلاً دو ہی عیدوں کا پتا چلتا ہے، جو عید الفطر اور عید الاضحٰی ہیں۔ تیسرے نام کی عید کا تصور تک نہیں ملتا۔ البتہ آپ ﷺ کے بعض ارشادات میں یومِ جمعہ کو عید بلکہ دونوں معروف عیدوں سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے۔ بہر حال موقع ہونے اور کوئی امرِ مانع بھی نہ ہونے کے باوجود آپ ﷺ کا نہ خود جشن منانا، نہ اس کا حکم دینا، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ کوئی کارِ خیر نہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اَربعہ رحمہم اللہ کی نظر میں

کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں مروّجہ جشنِ میلاد النّبی ﷺ کی شرعی حیثیت کے بارے میں واضح ہوگیا کہ یہ نہ قرآن سے ثابت ہے اور نہ ہی نبیِ اکرم ﷺ سے، نہ قولاً اور نہ عملاً۔ سنن اربعہ میں حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَوْعِظَةً (بَلِیْغَةً) وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ وَ ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُیُوْنُ، فَقُلْنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! کَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا، قَالَ: اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ تَأَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدًا حَبَشِیًّا فَاِنَّهٗ مَنْ یَّعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرٰی اِخْتِلَافاً کَثِیْراً. فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ، عَضُّوْا عَلَیْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَ اِیَّاکُمْ وَ مُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَکُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَکُلَّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ »[1]

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایسا پُر اثر وعظ فرمایا جس سے ہمارے دل خوف زدہ ہوگئے اور آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ ہم نے عرض کیا! یہ تو گویا الوداعی وعظ معلوم ہورہا ہے، ہمیں وصیّت فرمائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمھیں تقویٰ (اللہ کے خوف) اور سمع وطاعت کی تاکید کرتا ہوں اگرچہ تم پر کوئی حبشی غلام امیر بنا دیا جائے۔ پس تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہا وہ بہت بڑے بڑے اختلافات کو دیکھے گا پس تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سُنّت پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔ (اس سُنّت) کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھو اور دین میں نئی نئی باتیں داخل کرنے سے بچو۔ ہر نئی بات (دین میں داخل کرنا) بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں (لے جانے والی) ہے۔''

نیز مسلم شریف میں ہے:

« إِنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَقُوْلُ فِیْ خُطْبَتِهٖ: اَمَّا بَعْدُ. فَاِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) مسند أحمد (١٧١٤٤)

اللّٰہِ وَ خَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ ﷺ۔ اَمَّا بَعْدُ، وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَ کُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» [1]

''بے شک رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے: بہترین حدیث اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے۔ جبکہ بدترین کام وہ ہیں جو (دین میں) نئے ایجاد کیے گئے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

وفي رواية النّسائی: «وَکُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَکُلَّ بِدْعَةٍ فِی النَّارِ» [2]

''اور ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت آگ میں (لے جانے والی) ہے۔''

نسائی کے علاوہ سُننِ اربعہ، مُسند احمد، ابی یعلی اور طبری کی متقارب الفاظ والی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اِرشاد فرمایا ہے:

«اِفْتَرَقَتِ الْیَھُوْدُ عَلٰی إِحْدَیٰ وَسَبْعِیْنَ فِرْقَةً، وَافْتَرَقَتِ النَّصَارٰی عَلٰی اِثْنَیْنِ وَسَبْعِیْنَ فِرْقَةً، وَسَتَفْتَرِقُ ھَذِہِ الْأُمَّةُ عَلٰی ثَلَاثٍ وَ سَبْعِیْنَ فِرْقَةً کُلُّھَا فِی النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً. قَالُوْا: مَنْ ھِیَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: مَنْ کَانَ عَلٰی مِثْلِ مَا اَنَا عَلَیْہِ . (وَفِیْ رِوَایَةٍ: اَلْیَوْمَ) وَ أَصْحَابِیْ» [3]

''یہود اِکہتّر (۷۱) فرقوں میں اور نصاریٰ بہتّر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے جبکہ یہ میری امت تہتّر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے ایک کے سوا باقی سب جہنّمی ہوں گے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ کون سا ہوگا؟ تو آپ ﷺ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٧٨) و اللفظ له، مسند أحمد، رقم الحديث (١٤٣٣٤) عن جابر بن عبد اللّٰه.

[2] سنن النسائی، رقم الحديث (١٥٧٨) و صححه الألباني في أحكام الجنائز (ص: ٤٣)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤٢)، سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٢٨)، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٩١-٣٩٩٢)، موارد الظمآن، ابن حبان، رقم الحديث (١٨٣٤)، المستدرك للحاكم (١/ ١٢٨) مسند أحمد (٢/ ٣٣٢) صحيح الجامع للألباني، رقم الحديث (١٠٨٢-١٠٨٣)، سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٣، ١٤٩٢)، مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (١/ ٦١) تفصیل کے لیے دیکھیں: فتاوی ابن تيمية (٢٤/ ١٧١) المرعاة للعلامة عبيد اللّٰه رحماني (١/ ٢٦٩ تا ٢٧٩) یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

نے اِرشاد فرمایا: نجات وہ لوگ پائیں گے جن کا عمل مجھ جیسا اور میرے صحابہ جیسا ہوگا۔ (ایک روایت کے مطابق فرمایا: اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آج کے عمل جیسا ہوگا)۔''

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے کتاب و سُنّت کے بعد خلفائے راشدین اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے کو بھی معتبر اور ذریعۂ نجات قرار دیا ہے، لہٰذا جب ہم خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی حیاتِ طیّبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو بکثرت واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی ﷺ کے ایک اشارۂ ابرُو پر اپنا مال و جان قربان کرنے کے لیے بے تاب رہتے تھے اور آپ ﷺ کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ آپ ﷺ کے احکام و ارشادات پر عمل پیرا ہونا اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے، بلکہ آپ ﷺ کی سُنّت پر مَر مٹتے تھے۔

لیکن جب ہم اس مروّجہ عید میلاد کو تلاش کرتے ہیں تو ان کی زندگیوں میں اس کا کہیں سراغ تک نہیں ملتا۔ نہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، نہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں، نہ حضرت عثمان ذوالنّورین رضی اللہ عنہ کے دور میں، نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اور نہ ہی ایک لاکھ چالیس ہزار سے بھی زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے قول و عمل سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اب جو عمل موقع اور گنجایش ہونے اور ممانعت بھی کوئی نہ ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے شیدائیوں اور مصطفیٰ ﷺ پہ مرمٹنے والوں کی نظروں سے پوشیدہ رہا ہو، وہ یقیناً شریعتِ اسلامیہ کا جز نہیں ہوسکتا۔ یا پھر ہمیں اس بدگمانی کا کھل کر اظہار کر دینا چاہیے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نعوذُ باِللہ نبیِ اکرم ﷺ سے محبت نہ تھی یا کم از کم اتنی نہ تھی جتنی آج کے جشن منانے والوں کو ہے۔

بخاری و مسلم شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِيْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُم»[1]

''تمام زمانوں سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے. پھر ان لوگوں کا جو اس کے بعد والے ہیں اور پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد والے ہیں۔''

یہاں آپ ﷺ نے قیامت تک آنے والے لوگوں میں سے اپنے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم، پھر

---

[1] متفق علیه، مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٥) بتحقيق الألباني.

تابعین اور اس کے بعد تبع تابعین کے تین زمانوں کو قرونِ خیر قرار دیا ہے۔ جبکہ اس میلاد کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین و تبع تابعین رحمہ اللہ میں سے کسی سے کچھ منقول نہیں کہ ان تینوں صدیوں میں کسی نے یہ عیدِ ثالث منائی ہو۔ بالآخر چار معروف فقہی مذاہب کے ائمہ مجتہدین حضرت امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی اجتہادی مساعی اور کتبِ فقہ کا مطالعہ کریں تو بھی آپ کو کسی امام صاحب کے یہاں اس عید کا ذکر نہیں ملے گا اور نہ دیگر فقہاء و محدّثین میں سے کسی نے اس کا حکم دیا ہے۔

تو پھر صاحبو! جو چیزیں تینوں قرونِ مشہود لہا بالخیر بلکہ اسلام کے پہلے چھ سو پچّیس برس تک موجود نہ تھی، اُسے جائز وثواب قرار دینا شریعت سازی اور سینہ زوری کے سوا کچھ نہیں۔

جشنِ میلاد کی حیثیت اس وقت اور بھی خطرناک ہوجاتی ہے جب اس میں راگ رنگ اور گانے بجانے کا عنصر شامل ہو جائے، چاہے اسے قوّالی کہیں یا کوئی بھی نام دے لیں۔ اور جب جلوسوں میں مَردوزن کا اختلاط ہوتو وہاں کیا کیا برائیاں جنم نہ لیں گی۔ اور پھر ذِکر و دعا کے اپنے بنائے ہوئے طریقے جن میں کسی کو بدعت کہا جا سکتا ہے تو کئی شرک پر منتج ہوتے ہیں۔ جیسے دُعا و ندائے غیر اللہ وغیرہ۔ اسی طرح ان جلسے جلوسوں میں نبیِ اکرم ﷺ کی شان میں غلو کیا جاتا ہے، یہاں تک کے آپ ﷺ کو مقامِ الوہیّت بلکہ اس سے بھی اُوپر چڑھادیا جاتا ہے، جیسا کہ ایک جاہلانہ شعر ہے ؎

اللہ کا پکڑا چھڑائے محمد ﷺ
محمد ﷺ کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا

یہ حد سے زیادہ بڑھانا اسی غلُو کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کو نُورِ مُجسّم اور عالمِ غیب ثابت کرنا وغیرہ بھی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

قائلینِ عید میلاد النّبی ﷺ کے دلائل اور اُن کا جائزہ

سابقہ سطور میں ہم عید میلاد النّبی ﷺ کی شرعی حیثیت کے بارے میں ذکر کر آئے ہیں کہ اس کا عہدِ رسالت و خلافت اور دورِ صحابہ و تابعین سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، بلکہ ساتویں صدی ہجری (۶۲۵ھ) میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے بہنوئی اور موصل کے قریبی شہر اَربل کے گورنر مَلِک مظفر

ابوسعید کوکبری نے اسے رواج دیا۔ وہ محفلِ میلاد میں بھانڈ، مراثی، راگ ورنگ اور ناچنے والوں کو جمع کرتا، راگ سنتا اور گانا باجا سُن کر خود بھی ناچا کرتا تھا۔[1]

مولف ''الإبداع في مضار الابتداع'' نے لکھا ہے:

''عیسائیوں کے کرسمس کی دیکھا دیکھی مصری فاطمیوں نے جشنِ میلاد کو رواج دیا تھا۔''[2]

قرونِ اُولیٰ میں اس کا ثبوت نہ ہونے اور ساتویں صدی میں آکر شروع ہونے کی وجہ سے ہی اہلِ علم نے اسے ''بدعت'' قرار دیا ہے۔[3] اس میلاد کے جواز کا فتویٰ سب سے پہلے مَلِک مظفر کے عہد کے ایک مولوی ابو الخطاب ابن دحیہ نے ایک رسالے ''التنویر فی مولد البشیر النذیر'' میں دیا۔ جس کی تالیف پر اسے ملِک مظفر نے ایک ہزار دینار انعام دیا تھا۔[4] اس مولوی ''ابن دحیہ'' کو کبار علمائے حدیث نے کذّاب، نا قابلِ اعتبار، غیر صحیح النسب، بے تکی ہانکنے اور فضول باتیں کرنے والا قرار دیا ہے جس کی تفصیلات ''البداية والنهايه'' (۷/ ۱۳/ ۱۳۷) اور ''لسان الميزان'' (٤/ ۲۹٦-۲۹۷) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ایسے اوٹ پٹانگ مولوی کے فتوے کی جو حیثیت ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اور پھر اس کے پیچھے مولویوں کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ متاخرین میلادیوں نے اس کے جواز کے جو دلائل دیے ہیں ان کے ذکر اور ان پر بحث و تنقید کے لیے تو ایک طویل مقالہ درکار ہے، البتہ یہاں محض اشاروں میں مختصراً عرض کر رہے ہیں۔

عید میلاد کی پہلی دلیل:

کہا جاتا ہے کہ اگر میلاد بدعت ہے تو یہ بدعتِ حسنہ ہے اور اس کی کئی مثالیں سابق میں پائی گئی ہیں، جیسا کہ نمازِ تراویح کی جماعت ہے۔ یہ نبیِ کریم ﷺ سے تو صرف تین دن با جماعت ثابت

---

[1] البداية والنهاية (۷/ ۱۳/ ۱۳٦ تا ۱۳۷) الإنصاف فيما قيل في المولد من الغلو والاجحاف لأبي بكر جابر الجزائري، (ص: ۳۱۔ ۳٤)

[2] كلمة الحق في الاحتفال بمولد سيد الخلق للشيخ عبدالله آل محمود (ص: ۵۰)

[3] دیکھیں: مقاله شيخ ابن باز، مجله الجامعة الإسلامية، مدينه منوره (ج: ۵، شماره: ٤، مجريه ۱۹۷۳ء) فتاویٰ المنار، علامه مصر محمد رشيد رضا (۵/ ۲۱۱۱، فتویٰ نمبر: ۷٦۵)

[4] البداية والنهاية (۷/ ۱۳/ ۱۳۷) الانصاف (۳٤/ ۳۵)

ہے۔ پھر عہدِ فاروقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پورا مہینہ جماعت کا اجرا کیا اور با جماعت نماز ادا کرتے لوگوں کو دیکھ کر فرمایا: ''نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هَذِهِ'' ''یہ اچھی بدعت ہے۔'' اسی طرح ہی میلاد بھی ہے۔

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ نمازِ تراویح کو بدعت کہنا درست نہیں، کیوں کہ یہ بدعت تب ہوتی جب اس کا نبیِ کریم ﷺ سے کوئی ثبوت ہی نہ ملتا۔ حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ دیگر کتبِ حدیث کے علاوہ خاص صحیح بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں مذکور ہے کہ تین دن نبیِ اکرم ﷺ نے با جماعت تراویح پڑھائی، لیکن چوتھے دن تراویح کی جماعت کے لیے آپ ﷺ تشریف نہ لائے جس کا سبب یہ بتایا: « خَشِيتُ اَنْ تُفْرَضَ عَلَيْكُمْ فَتَعْجِزُوْا عَنْهَا»

''مجھے خدشہ ہے کہ کہیں تم پر فرض نہ کر دی جائے اور تم اس کو پابندی کے ساتھ ادا کرنے سے عاجز آ جاؤ۔''

پھر جب نبیِ کریم ﷺ اس دُنیا سے تشریف لے گئے اور تراویح کی فرضیّت کا خدشہ زائل ہو گیا تو فراستِ فاروق رضی اللہ عنہ نے الگ الگ تراویح پڑھنے کے بجائے اتفاق واتحاد کی برکت کے پیشِ نظر نبی ﷺ کی سُنّت کے مطابق با جماعت ادا کرنے کا اجرا فرمایا۔ اور انھوں نے اپنے ارشاد میں بدعت کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے وہ بھی اپنے متبادر ومعروف معنوں میں نہیں ہے، بلکہ یہ مشاکلہ (یعنی شکلاً ملتا جلتا) ہے جو عربوں میں معروف تھا کہ ایسا لفظ استعمال کرنا جس سے اس کا اصل معنیٰ نہیں بلکہ کوئی دوسرا معنیٰ مراد ہوتا ہے۔ خود قرآنِ کریم میں اس مشاکلہ کی مثال موجود ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت: ۱۳۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ﴾

''اللہ کا رنگ (دینِ اسلام) اختیار کرو اور اللہ سے اچھا رنگ کس کا ہوگا؟''

یہاں صِبغہ سے مُراد رنگ یا پاؤڈر نہیں بلکہ اسلام مُراد ہے۔ اسی طرح قولِ فاروق رضی اللہ عنہ میں بدعت سے مُراد ہے: ''گذشتہ ایّام میں نہ پائی جانے والی چیز کو وجود میں لانا'' جبکہ یہ بھی نہیں کہ وہ چیز بالکلیہ سابق میں موجود نہ تھی، بلکہ اس کا اجراء سُنّتِ رسول ﷺ ہونے کے پیشِ نظر ہی کیا گیا تھا، جس کا ثبوت ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر آئے ہیں۔

دوسری دلیل:

دوسری دلیل کے طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم پر اعراب نہیں تھے وہ حجاج بن یوسف ثقفی نے لگوائے۔ پھر یہ عمل بھی بدعت ہوا۔

جواب:

یہ محض مغالطہ اور غلط فہمی ہے۔ ورنہ اعرابِ قرآن ''بدعت'' کے ضمن میں ہرگز نہیں آتا، بلکہ یہ ''مصالح مرسلہ'' کے باب سے ہے، یعنی ''دینی اُمور میں سے کسی حرج کو رفع کرنے اور کسی ضروری امر کی حفاظت کے لیے کوئی اقدام کرنا۔''

بات دراصل یہ تھی کہ عہدِ حجاج میں دولتِ اسلامیہ بہت زیادہ پھیل گئی تھی اور عرب و عجم کا اختلاط اور باہم رشتے داریاں ہورہی تھیں، جس کے نتیجے میں لغتِ عربی میں کمزوری آنے لگی اور ''لحن'' عام ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ خود حجاج ایک فصیح و بلیغ عرب ہونے کے باوجود قرآنِ کریم کے بعض حروف میں لحن (قواعد کی خلاف ورزی) کر جاتا تھا۔ وہ زیر والے حروف کو زَبر سے یا زَبر والے کو زیر سے پڑھ جاتا تھا اور یحییٰ بن یعمر نے اُس پر نکیر بھی کی تھی۔[1] لہٰذا حفاظتِ تلفّظ کے لیے اعراب ضروری تھا، کیوں کہ ''جس چیز کے بغیر کوئی واجب ادا نہ کیا جا سکے، وہ بھی واجب ہوتی ہے۔'' لہٰذا اعرابِ قرآن کو قطعاً میلاد کے لیے بطورِ استدلال استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ان مصالح مرسلہ کی کئی دیگر مثالیں بھی موجود ہیں مثلاً: جمع و تدوینِ قرآن، جو عہدِ صدیقی و عثمانی میں عمل میں آئی، وہ بدعت کے قبیل سے ہرگز نہیں ہوسکتی، کیوں کہ حفاظتِ قرآن مسلمانوں پر واجب ہے اور یہ امورِ کمالیات و تحسینات کے باب سے ہیں۔

جمعہ کی پہلی اذان، مساجد کے منارے، محرابیں اور مساجد میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال بھی اسی قبیلِ مصالح سے ہے۔[2] حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کا مانعینِ زکات سے جنگ کرنا۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ہی نافذ کر دینا اور صدقات سے مؤلفۃ القلوب کا حصہ بند

---

[1] البداية والنهاية (٥/ ٩/ ١٢٦)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: الإنصاف لأبي بكر الجزائري (ص: ٢٠ تا ٢٦)

کرنا۔ خراج، دیوان اور جیلوں کو جاری کرنا۔ عام المجاعۃ (بھوک و قحط سالی) میں چوری کی حد (ہاتھ کاٹنے) کو موقوف کرنا وغیرہ سب اپنے اپنے وقت کی اہم ضرورتیں اور دینی اعتبار سے مفید اور دافع ضرر امور تھے۔ اسی طرح ائمہ مجتہدین کی طرف سے بھی بعض قواعد وضع کیے گئے ہیں جو مصالح مرسلہ ضروریہ میں سے ہیں۔[1]

تیسری دلیل:

جشنِ میلاد کے شوقین یہ بھی دلیل دیتے ہیں کہ حصولِ نعمت پر ذکر و شکر واجب ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کی ولادت بھی ایک عظیم نعمت ہے، لہٰذا شکرانِ نعمت کے طور پر ہم جشن مناتے اور خوشیاں کرتے ہیں۔

جواب:

اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ صحیح ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کا وجودِ مسعود ایک نعمتِ عظمیٰ ہے اور یہ بھی درست ہے کہ شکرانِ نعمت واجب ہے، مگر یہ کہاں لکھا ہے کہ ذکر وشکرِ نعمت کے لیے ایک مخصوص دن میں جلوس نکالنا، جلسے کرنا، بھنگڑے ڈالنا، سبیلیں لگانا اور قوالیاں سننا ضروری ہے۔ کیا صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین وائمہ مجتہدین رحمہم اللہ حتیٰ کہ خود صاحبِ میلاد ﷺ نے ایسے ہی اس نعمت کا شکریہ ادا کیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر ہمیں اس کا حق کس نے دیا؟ اور اگر اسی طرح شکرِ نعمت واجب ہے تب تو پھر کاروبارِ زیست ٹھپ کرنا پڑیں گے، تاکہ ہر روز جلوس وجشن کا اہتمام کیا جاسکے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تو شمار ہی مشکل ہے۔ جیسا کہ سورۃ النحل (آیت: ۱۸) اور سورت ابراہیم (آیت: ۳۴) میں خود باری تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾

''اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کرسکو گے۔''

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: الاعتصام للشاطبي (۱/ ۱۱۵) و علم أصول الفقه للشيخ عبدالوهاب خلاف (ص: ۸۵) إرشاد العقول في بدعة الاحتفال بمولد الرسول للشيخ عبد الحميد عبدالمحسن ركن مركز دعوت وارشاد، دبئی (ص: ۱۵ تا ۱۸) كلمة الحق في الاحتفال بمولد سيد الخلق للشيخ عبدالله آلِ محمود آف قطر (ص: ۲۸ تا ۳۲)

اگر ذکر وشکرِ نعمت کا صحیح طریقہ اختیار کیا جائے اور سننِ رسول اللہ ﷺ کو اپنایا جائے تو پھر یہ ہر مسلمان ہر روز کرتا ہے نہ کہ سال میں صرف ایک دن۔ فَلْيَتَدَبَّرْ.

چوتھی دلیل:

عید میلاد کے جواز کی دلیل کے طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ یومِ عاشوراء کا روزہ رکھا کرتے تھے اور اس کا حکم بھی فرمایا تھا۔ اور چونکہ یہ دن مبارک تھا، اس دن کو یہودی بھی روزہ رکھا کرتے تھے۔ کیوں کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون اور اس کے لشکر سے نجات دلائی تھی۔ اور ہمیں بالاولیٰ چاہیے کہ اپنے نبی ﷺ کی ولادت کے بابرکت دن کا روزہ رکھیں۔

جواب:

اندازہ فرمائیں کہ کتنی ٹیڑھی سوچ ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے تو روزہ رکھا اور اس کا حکم فرمایا۔ مگر آج کے میلادیے روزہ رکھنے کے بجائے دستر خوان سجاتے، سبیلیں لگاتے، قوالیاں سُنتے اور بھنگڑے ڈالتے ہیں۔ اَلْعِيَاذُ بِاللّٰه.

آپ ﷺ نے یومِ عاشوراء کا روزہ رکھا، مگر اپنے یومِ ولادت کے بارے میں آپ ﷺ سے ایسی کوئی چیز ثابت نہیں تو ہمیں آپ ﷺ کی اتباع کرنی چاہیے نہ کہ اپنی طرف سے ابتداع، نہ روزہ کی شکل میں اور نہ ہی لہو ولعب کے انداز میں۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ یومِ عاشوراء کا روزہ تو قریش پہلے ہی رکھا کرتے تھے اور ممکن ہے کسی سابقہ شریعت سے انھوں نے اس کا حکم لیا ہو۔ جیسے حُرمت والے چار مہینوں کا احترام کرنا اور حج کرنا وغیرہ ہیں۔ عہدِ جاہلیّت میں لوگوں کے روزہ رکھنے کا ثبوت ''صحیح بخاری مع الفتح'' (۴/ ۲۴۴) اور ''صحیح مسلم مع النووی'' (۷/ ۵) میں موجود ہے۔ اور جس حدیث میں مذکور ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ جب ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے اور یہودیوں کو روزہ رکھتے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کیسا روزہ ہے؟ جب انھوں نے نجاتِ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بتایا اور کہا کہ ہم اسی کے شکرانے کے طور پر روزہ رکھتے ہیں تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں موسیٰ علیہ السلام پر تم سے زیادہ حقدار ہوں، لہٰذا آپ ﷺ نے بھی روزہ رکھا اور اس کا حکم دیا۔ اس کے بارے میں قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

''نبیِ اکرم ﷺ نے (یہود سے سن کر) اس روزے کی ابتدا نہیں کی۔ بلکہ صحاح وسنن میں مذکورہ صحیح حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے: ''عہدِ جاہلیّت میں بھی قریش روزہ رکھا کرتے تھے۔''

امام قرطبی فرماتے ہیں:

''ہوسکتا ہے قریش دینِ ابراہیم علیہ السلام کے کسی حکم پر روزہ رکھتے ہوں اور نبیِ اکرم ﷺ کا روزہ رکھنا موافقتِ دینِ ابراہیم علیہ السلام کے سبب ہو، جیسا کہ حج کا معاملہ ہے۔ پھر جب یہود کو روزہ رکھتے دیکھا تو ان کی تالیفِ قلب کے لیے بھی روزہ رکھا اور اس کا حکم فرمایا ہو۔ اس میں بھی کوئی امرِ مانع نہیں کہ فریقین ایک ہی دن کا روزہ دو الگ الگ اسباب کی بنا پر رکھتے ہوں۔''[1]

پانچویں دلیل:

بعض قائلینِ میلاد تو اس حد تک جسارت کر جاتے اور کہہ دیتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ اپنے یومِ ولادت پر ایک مینڈھا بطورِ عقیقہ ذبح کیا کرتے تھے۔ تو ہم لوگ کیوں نہ عیدِ میلاد منائیں؟

جواب:

سب سے پہلے تو عقیقہ کا معنیٰ سمجھ لیں۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''عقیقہ اس ذبیحہ کو کہتے ہیں جو بچے کی طرف سے ذبح کیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ کھانا جو بچے کی ولادت کی خوشی میں پکایا اور کھلایا جائے. وہ عقیقہ کہلاتا ہے۔''[2]

ان کا کہنا ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک سنّت یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے ساتویں دن ذبح کیا جائے اور تب نہ ہوسکے تو چودھویں دن ہو یا پھر اکیّسویں دن، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔[3]

جو شخص بالغ ہوجائے اور اس کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو، اس میں اختلاف ہے کہ وہ اپنی طرف سے عقیقہ کرے یا نہیں؟

---

[1] فتح الباري شرح صحيح بخارى، حافظ ابن حجر (٤/ ٢٤٨)

[2] المغني لإمام ابن قدامة (٩/ ٤٥٨)

[3] المغني لإمام ابن قدامة (٩/ ٤٦١)

بہر حال اگر جواز والوں کی بات ہی لے لی جائے تو عمر میں ایک مرتبہ عقیقہ کرنا ہوگا اور پھر ہمیشہ کے لیے یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ چہ جائیکہ ہرسال عقیقہ کیا جائے اور کسی قطعی طریق سے ہرگز ثابت نہیں کہ نبوّت ملنے کے بعد آپ ﷺ نے ایک مرتبہ بھی عقیقہ کیا ہو، کہاں ہرسال عقیقہ کا دعویٰ۔ اور جس روایت میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے نبوّت ملنے کے بعد اپنی طرف سے عقیقہ کیا۔ اس کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ مسند بزار کی روایت صحیح ثابت نہیں ہے۔ اور خود امام بزار کا کہنا ہے:

''یہ روایت بیان کرنے میں عبداللہ اکیلا ومنفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔''

آگے فرماتے ہیں:

''امام عبدالرزّاق، صاحبُ المصنّف کا کہنا ہے کہ محدّثین نے صرف اس روایت کے بیان کرنے کی وجہ سے عبداللہ بن محرّر سے روایت لینا ہی ترک کر دیا۔ تو گویا اس روایت کے بیان کرنے نے عبداللہ بن محرّر کی ثقاہت ہی مٹادی تھی، لہٰذا اس سے کسی قسم کا استدلال کیسے درست ہوسکتا ہو؟''[1]

چھٹی دلیل:

بعض مناظر لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ پیر کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، کیوں کہ اس دن آپ ﷺ پیدا ہوئے تھے اور پھر اسی سے عیدِ میلاد کا جواز پیدا کرتے ہیں۔

جواب:

عرض یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ نبیِ کریم ﷺ پیر کا روزہ رکھا کرتے تھے، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اُنہی احادیث میں جمعرات کے روزے کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ ابوداود، ترمذی، نسائی (وصحّحہ ابن حبان) میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ پیر اور جمعرات کا کوشش کرکے روزہ رکھا کرتے تھے۔ جبکہ نسائی اور ابوداود (وصحّحہ ابن خزیمہ) میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر بتایا کہ پیر اور

[1] راجع: فتح الباري (١٢/ ١٢)

جمعرات کو بندوں کے اعمال، اللہ کے حضور پیش کیے جاتے ہیں اور مَیں یہ بات پسند کرتا ہوں کہ میرے اعمال اس حال میں اٹھائے جائیں کہ میں روزے سے ہوں۔[1]

صحیح مسلم و ترمذی میں بھی پیر اور جمعرات کے روزہ کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے۔ مسلم کی ایک حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ پیر کے روزے کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسی دن میں پیدا ہوا تھا اور اسی دن میں مبعوث کیا گیا یا مجھ پر وحی نازل کی گئی تھی۔[2]

ان تمام احادیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ پیر و جمعرات کے روزے کا اصل سبب اعمال کا پیش کیا جانا ہے اور اضافی سبب (صرف پیر کے روزہ کے لیے) یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ اسی دن پیدا ہوئے تھے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ کا روزہ رکھنا محض ولادت کی وجہ سے ہوتا تو آپ ﷺ صرف پیر کا روزہ رکھتے، جمعرات کا نہ رکھتے۔ پھر پیر کا روزہ بھی سال میں ایک مرتبہ رکھتے جو آپ ﷺ کی تاریخِ ولادت کے موافق ہوتا، ہر ہفتے میں نہ رکھتے، کیوں کہ کسی واقعہ کی یاد سال میں ایک مرتبہ ہی منائی جاتی ہے نہ کہ ہر ہفتے میں ایک مرتبہ۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا روزہ رکھنا اعمال کے پیش کیے جانے کی وجہ سے تھا۔ اور اگر کوئی حبِ رسول ﷺ کا دم بھرنے والا ہے تو وہ ہر ہفتے میں پیر اور جمعرات کا روزہ رکھا کرے، جو سنّتِ رسول ﷺ ہے، نہ کہ بدعات کا ارتکاب کرے۔ اور بدعات کے جواز کے لیے احادیث کا مفہوم توڑ موڑ کر بیان کرتا پھرے۔ اور روزے کے بجائے، اکل وشُرب کی محفلوں کی طرف دعوت دیتا پھرے۔

پھر نبیِ کریم ﷺ سے یہ بھی ہرگز ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے ربیع الاوّل (۹یا۱۲) کا روزہ کبھی رکھا ہو جو آپ ﷺ کا یومِ ولادت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ہر سال اس دن کا روزہ اس نیّت سے رکھے تو یہ گویا نبی ﷺ سے پیش قدمی، شریعت سازی اور نعوذُ باللہ نبی ﷺ کو شریعت آموزی ہے۔ وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہ.

ساتویں دلیل:

ان کی ساتویں دلیل یہ ہوتی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں تریسٹھ اُونٹ اپنے

---

[1] فتح الباري (٤/ ٢٣٦)

[2] رياض الصّالحين (ص: ٤٨٨ تا ٤٨٩) مراجعه الأرناؤوط.

دستِ مبارک سے ذبح کیے تھے۔بعض لوگ بڑی دور کی کوڑی لاتے اور اس سے عجیب نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کا تریسٹھ اُونٹ ذبح کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ ﷺ نے ہر سال کے بدلے میں بطورِ عید میلاد ایک اُونٹ ذبح فرمایا۔

جواب:

بدعت ساز اور بدعت نواز لوگ پہلے ایک چیز ایجاد کرتے ہیں اور پھر اسے ثابت کرنے کے لیے نصوص کا آپریشن کرکے انھیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے، جبکہ درحقیقت ان کی اس دلیل اور اصل مسئلے میں کوئی ربط وتعلق نہیں:

1. معروف بات ہے کہ آپ ﷺ نے وہ اُونٹ دس ذوالحج کو ذبح کیے تھے جو بارھواں مہینہ تھا جبکہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاوّل (۹ یا ۱۲) کو ہے جو اسلامی سال کا تیسرا مہینہ ہے۔ لہٰذا ان قربانیوں اور عیدِ میلاد میں کیا مناسبت ہے؟

2. اگر ان قربانیوں سے عیدِ میلاد کا جواز ثابت بھی کرنا ہو تو پھر عیدِ میلاد بھی دس ذوالحج کو ہی ہونی چاہیے نہ کہ ربیع الاوّل میں۔

3. نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سو اُونٹوں کی قربانی دی تھی.ان میں سے تریسٹھ اُونٹ تو آپ ﷺ اپنے ساتھ مدینہ منورہ سے لائے تھے اور سینتیس اُونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے لائے تھے۔''شرح مسلم نووی'' (۸/ ۱۹۲) میں قاضی عیاض رحمہ اللہ کے بقول: آپ ﷺ نے تریسٹھ اُونٹ اپنے دستِ مبارک سے ذبح فرمائے جو آپ ﷺ اپنے ساتھ لائے تھے، جیسا کہ ترمذی شریف میں مذکور ہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وہ سینتیس اُونٹ ذبح کرنے کے لیے دیے گئے جنھیں وہ یمن سے آپ ﷺ کے لیے لائے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ کے تریسٹھ اُونٹ ذبح کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال ہی لایعنی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے جو اُوپر ذکر ہوئی۔

4. بعض علماء کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ کا تریسٹھ (۶۳) اُونٹ ذبح کرنا تو اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ عمرِ شریف کے تریسٹھ (۶۳) سال پورے ہوگئے ہیں اور زیست کی انتہا ہوگئی ہے۔ واقعی حجۃ الوداع

کے موقع پر اس کی طرف اشارے بھی ہوگئے کہ اس حیاتِ مستعار کے خاتمے اور اس جہانِ فانی سے کوچ کا وقت قریب آ گیا ہے۔ مثلاً: یومِ عرفہ میں آیت ﴿ اَلۡیَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ ... ﴾ کا نزول، ایامِ تشریق میں سورۃ الفتح کا نزول، آپ ﷺ کا بار بار خطبات ارشاد فرمانا اور خطبات میں اشارہ کرنا کہ شاید اس سال کے بعد ہم یہاں اکٹھے نہ ہوسکیں وغیرہ۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ اگر تریسٹھ سال کا عدد کسی بات کی دلیل ہے تو وہ صرف اس کی کہ تریسٹھ سال کی عمر مکمل ہوگئی ہے۔ اب ان سالوں میں کسی سال کا اضافہ نہیں ہوگا۔ نہ کہ یہ ابتدائے میلاد کی علامت تھا۔ کہاں ابتداء اور کہاں انتہاء؟

آٹھویں دلیل:

عیدِ میلاد کا جواز ثابت کرنے کے لیے امام سیوطی "اَلۡمَعۡرُوۡفُ عِنۡدَ الۡمُحَدِّثِیۡنَ بِحَاطِبِ اللَّیۡلِ یَعۡنِی یَجۡمَعُ بَیۡنَ الشَّیۡئِ وَ ضِدِّہٖ" نے "الحاوي في الفتاوي" میں ایک تاریخی روایت بیان کی ہے:

خواب میں کسی (عباس بن عبدالمطلب) کو ابو لہبِ خائب و خاسر ملا اور اس نے بتایا کہ مجھے عذاب ہوتا رہتا ہے سوائے اس کے کہ ہر پیر کی رات کو اس دن عذاب میں کچھ تخفیف ہوتی ہے اور اپنی اُنگلیوں کے درمیان سے چند قطرے پانی بھی چوسنے کو ملتا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ جب میری کنیز ثویبہ نے مجھے محمد ﷺ کی ولادت کی خبر دی تھی تو میں نے اُسے آزاد کر دیا تھا اور پھر اسی نے آپ ﷺ کو دودھ بھی پلایا تھا۔

جواب:

یہ قصّہ اور اس سے جوازِ میلاد کی دلیل لینا کئی طرح سے غلط ہے:

① اس بات پر تمام اہلِ اسلام کا اجماع ہے کہ کسی نبی کے خواب کے سوا (کہ نبیوں کا خواب وحی و حق ہوتا ہے) کسی دوسرے کا خواب کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔

② یہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ہیں یا کوئی اور ہے؟ اور پھر ان سے جس نے روایت بیان کی ہے، انھوں نے بالواسطہ بیان کی ہے۔ لہٰذا یہ روایت مُرسل ہوئی جس سے مسائلِ عقائد

کے بارے میں استدلال صحیح نہیں۔ جبکہ علماء کے صحیح تر قول کے مطابق مرسل روایت صرف عقائد ہی میں نہیں بلکہ احکام میں بھی قابلِ حجت نہیں ہوتی۔

۳ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے زمانہ قبل از اسلام میں یہ خواب دیکھا ہو۔ کفر کی حالت میں دیکھے گئے خواب کہاں حجت ہونگے جبکہ مومن ومتقی کا خواب بھی حجتِ شرعی نہیں ہوتا، سوائے انبیاء علیہم السلام کے خواب کے۔

۴ اکثر اہلِ علم کا خیال ہے کہ کافر اگر کفر پر ہی مرجائے تو اسے اس کے کسی عمل کا ثواب نہیں ملتا۔ اور یہی صحیح بھی ہے۔ کیوں کہ سورۃ الفرقان (آیت: ۲۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾

''اور ہم ان (کفّار) کے اُن اعمال کی طرف متوجّہ ہوں گے جو انھوں نے (دُنیا میں) کیے تھے۔ تو اُن (اعمال) کو اُڑتی ہوئی خاک کی طرح کردیں گے۔''

نیز سورۃ الکہف (آیت: ۱۰۵) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ پس اس لیے ان کے سارے اعمال (کفر کی وجہ سے) ضائع ہوگئے۔ قیامت کے روز ہم انھیں کوئی وزن نہ دیں گے۔''

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں فرمانِ الٰہی سے یہی پتا چلتا ہے کہ اگر کوئی حالتِ کُفر پر مرجائے تو اس کے کسی عمل کا ثواب اسے نہیں ملتا۔ اور حدیث میں بھی ہے:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ عبداللہ بن جدعان جو ہر حج کے موقع پر ایک ہزار اُونٹ ذبح کیا کرتا تھا اور ایک ہزار آدمیوں کو حُلّے پہنایا کرتا تھا، جس کے گھر میں حلف الفضول کا معاہدہ طے ہوا تھا۔ (جس میں نبی ﷺ بھی شامل تھے) کیا اسے یہ چیزیں فائدہ پہنچائیں گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ کیوں کہ اس نے عمر بھر کبھی یہ نہیں کہا کہ اے

اللہ! قیامت کے روز میرے گناہوں کو بخش دینا۔"[1]

اس سے بھی معلوم ہوا کہ ابولہب کے خواب کی کوئی قیمت نہیں، نہ اس سے استدلال صحیح ہے۔

(۵) ابولہب کی خوشی ایک طبعی امر تھا (کہ وہ چچا تھا) نہ کہ اس کی خوشی کوئی تعبّدی نقطۂ نظر سے تھی۔ اور جب کوئی خوشی اللہ کے لیے نہ ہو بلکہ اپنے یا کسی قریبی کے یہاں بچے کی پیدائش پر فطری وطبعی خوشی ہو تو اس پر ثواب نہیں ہوتا۔ اس بات سے بھی اس روایت کا ضعیف و کمزور اور جھوٹا ہونا واضح ہوتا ہے۔ محمد بن عبد اللہ کی ولادت پر خوش اور محمد رسول اللہ ﷺ پر گالیاں و بد زبانی، اس ابولہب کے اس عمل کو دلیل بنانا عجیب رویہ ہے۔

(۶) مومن تو اپنے نبی ﷺ کے وجود سے ہر وقت خوش رہتا ہے، لہٰذا اس کے لیے سال میں ایک مرتبہ اظہارِ خوشی کا موقع (میلاد) ایجاد کرنا، کسی طرح بھی لائق نہیں ہے۔

المختصر: خرافیوں کے ان بودے، بے جان اور بے سروپا دلائل، ان کی دُور از کار تاویلوں، چابکدستیوں اور عیّاریوں سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ.

ایّامِ رضاعت

نبیِ اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے بعد آپ ﷺ کو سب سے پہلے آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب نے اپنا دُودھ پلایا۔ دو تین روز کے بعد چند دن کے لیے ثویبہ نے بھی دودھ پلایا جو ابولہب کی کنیز تھیں اور بعد میں اسے آزاد کر دیا گیا۔ ثویبہ کے دودھ پلانے کا واقعہ حدیثِ امّ سلمہ رضی اللہ عنہا میں ہے جسے بخاری، مسلم، نسائی، ابن حبان، ابن ماجہ، احمد اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔[2]

یہ ثویبہ ۷ھ میں فوت ہوئیں۔ ابن مندہ نے کہا ہے: "اختلف في اسلامها" "اس کے اسلام لانے یا نہ لانے میں اختلاف ہے۔"[3] ابونعیم کا کہنا ہے: "لا أعلم أحداً ذكره" "میں کسی کو

---

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٨٩٢) صحيح مسلم (٢١٤) صحيح ابن حبان (٣٣٠) أبو يعلىٰ (٤٦٧٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٥٦) ابن حبان، رقم الحديث (٤١١١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٨٥) سنن ابن ماجه (١٥٨٨) مسند أحمد (٢/ ٢٧٤) الروض الأنف (٢/ ١٦٦) حاشيه، الفتح الرباني للبنا (١٤/ ١٧٩، ١٨٠)

[3] الفتح الرباني للبنا (٢٠/ ١٩٠)

نہیں جانتا جس نے ان کے اسلام لانے کا ذکر کیا ہو۔''[1]

ثویبہ کے دودھ پلانے کے بعد نبیِ رحمت ﷺ کی رضاعت وتربیت کی ذمّے داری حضرت حلیمہ سعدیہ بنت ابی ذؤیب رضی اللہ عنہا نے سنبھالی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تو لکھا ہے کہ حضرت حلیمہ زمانۂ نبوت سے پہلے وفات پا گئی تھیں، جب کہ ابن ابی خیثمہ نے ''تاریخ'' میں، ابن الجوزی نے ''حُداء'' میں، منذری نے ''مختصر سنن ابی داود'' میں اور حافظ ابن حجر نے ''الاصابہ'' میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے۔ علامہ مغلطائی نے تو ان کے اسلام لانے کے اثبات میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ''التحفه الجسیمه في إثبات إسلام حلیمة'' ہے۔[2]

نبیِ اکرم ﷺ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا سے بہت محبت کرتے تھے۔ عہدِ نبوت میں جب وہ آپ ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ: «أُمِّيْ أُمِّيْ» [میری ماں میری ماں] کہہ کر اُن سے لپٹ گئے اور اپنی چادر بچھا کر اس پر انھیں بٹھایا۔[3]

غرض اس زمانے میں عام دستور تھا کہ شہر کے رؤساء وشرفاء اپنے شیر خوار بچوں کو اطراف کے دیہات میں بھیج دیتے تھے۔ اس رواج کا اصل سبب یہ تھا کہ بادیہ اور صحرا کی صاف ستھری اور کھلی آب وہوا کی وجہ سے بچوں کی پرورش اور نشو ونما اچھی طرح سے ہو اور وہ بدوؤں میں پل کر خالص عربی اور فصاحتِ زبان کا جوہر پیدا کریں۔ کیوں کہ شہروں میں ہر قسم اور ہر ملک وقوم کے لوگوں کا آنا جانا عام ہوتا ہے اور ان کے باہم میل جول سے شہری زبان خالص نہیں رہتی اور کئی غیر زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ صحرائی دیہات اس سلسلے میں اصلی زبان کے امین ہوتے ہیں۔

امام سہیلی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں کافی تفصیلات درج کی ہیں اور وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس میں حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم ﷺ سے کہتے ہیں:

'' مَا رَأَیْتُ اَفْصَحَ مِنْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! ''

''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے آپ ﷺ سے بڑا فصیح اللسان کسی کو نہیں دیکھا۔''

---

[1] المواهب اللدنیه (١/ ١٣٧)

[2] سیرت النبي (١/ ١٧٤) نقلًا عن الزرقاني (٣/ ١٦٦)

[3] الوفا (١/ ١٩١)

اس پر نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

«وَمَا يَمْنَعُنِيُ وَاَنَا مِنُ قُرَيُشٍ وَاُرُضِعُتُ فِيُ بَنِيُ سَعُدٍ»[1]

''اس میں میرے لیے کیا چیز مانع ہوسکتی ہے، کیوں کہ میں قریش میں سے ہوں اور میرے فصیح ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں قبیلہ بنی سعد میں پلا ہوں۔''

مشہور مستشرق سرولیم میور نے اپنی کتاب ''لائف آف محمد'' [ﷺ] میں ان فوائد کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محمد (ﷺ) کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی۔ ان کے اخلاق آزاد اور مستغنی عن الغیر تھے، جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں زندگی بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی۔''[2]

الغرض اسی دستور کے مطابق ہر سال دو مرتبہ صحرائی دیہاتوں کی عورتیں شہر میں آیا کرتی تھیں اور شرفائے شہر اپنے نونہالوں کو ان کے سپرد کردیا کرتے تھے۔ نبی ﷺ کی ولادت کے چند روز بعد بھی قبیلۂ ہوازن میں سے بنی سعد کی دس عورتیں بچوں کی تلاش میں مکہ آئیں۔ ان میں سے حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ "شرح المواهب اللدنيه" میں لکھا ہے کہ عورتیں کل دس تھیں جن میں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا آئی تھیں۔[3] واقدی نے بھی دس ہی لکھا ہے۔[4]

آنے والی ہر عورت کی خواہش ہوتی کہ کسی مال دار کے بچے کو گود لوں، تاکہ حقِ رضاعت اور معاوضہ اچھا ملے۔ اس بات کے پیشِ نظر جتنے بچے صاحبِ ثروت لوگوں کے تھے، انھیں تو مختلف دایوں نے اُٹھا لیا، مگر اس درِّ یتیم ﷺ کو لینے کے لیے کوئی عورت صرف اس بنا پر پیش قدمی نہیں کر رہی تھی کہ یہ بچہ تو یتیم ہے، باپ زندہ ہوتا تو بھی کچھ مل جانے کی توقع تھی، مگر اب ہمیں کیا مل سکے گا؟

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے بھی کسی مالدار شخص کے بچے کی تلاش کی، مگر بظاہر وہ اپنے مقصد

---

[1] الروض الأنف (٢/ ١٦٧) بتحقيق عبد الرحمٰن الوكيل رئيس انصار السنه مصر وطبقات ابن سعد (١/ ٧١)

[2] سیرت النبی ﷺ (١/١٧٢)

[3] الروض الأنف (٢/ ١٦٤ حاشيه)

[4] البداية و النهاية (٢/ ٢٧٣)

میں ناکام رہیں۔ مگر کون جانتا تھا کہ یہ وہ ناکامی ہے جس پر لاکھوں کامرانیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ ان کے مقدّر کا ستارہ چمکنے والا ہے۔ دنیا بھر کی دولتیں ان کے ہاتھ میں آنے والی ہیں۔ نبیِ اکرم ﷺ کی والدہ محترمہ نے اپنا یتیم ان کے سپرد کرنا چاہا تو پہلے انھوں نے کچھ پس و پیش کیا، مگر کوئی اور بچہ بھی تو نہ ملا تھا اور خالی ہاتھ بھی نہیں لوٹنا چاہتی تھیں۔ لہٰذا رحمۃٌ للعالمین ﷺ کو اپنی گود میں لے لیا، پھر ان کی قسمت جاگی اور انھوں نے وہ فیوض و برکات حاصل کیے جو دوسرے نہ کر سکے۔

فیوض وبَرکاتِ رسُول ﷺ

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے نبیِ اکرم ﷺ کو گود میں لینے سے لے کر مدتِ رضاعت و بچپن کے پانچ سال کے دوران میں جو عجائبِ قدرت دیکھے اور نبیِ رحمت ﷺ کے وجودِ مسعود سے جو فیض و برکات پائیں، ان کا اعتراف تو ہر مسلم مورخ اور سیرت نگار نے کیا، لیکن دورِ حاضر کے اکثر معتبر سیرت نگاروں نے ان کی تفصیلات ذکر نہیں کیں، بلکہ ان کی طرف مجمل اشارہ کرتے ہوئے گزر گئے ہیں۔[1]

البتہ قدیم اور معروف سیرت نگاروں میں سے امام ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن الجوزی اور ابن کثیر رحمہم اللہ نے ان کی کچھ تفصیلات بھی ذکر کی ہیں۔ ان سب کا ماخذ و مرجع ابن اسحاق کی وہ روایت ہے جسے وہ اپنی سند کے ساتھ حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتی ہیں:

''میں بنی سعد کی کچھ عورتوں کی معیّت میں اپنے گاؤں سے نکلی۔ میرے ساتھ میرا شوہر حارث بن عبد العزّیٰ بھی تھا۔ یہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر یعنی آنحضرت ﷺ کے رضاعی باپ کا نام حارث بن عبد العزیٰ ہے۔ وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت مکہ آئے اور اسلام لائے۔[2] اس طرح میرا ایک شیر خوار بچہ بھی تھا۔ نبیِ اکرم ﷺ کے رضاعی بہن بھائی چار تھے۔ عبداللہ، انیسہ، حذیفہ اور حذافہ، جو شیماء کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان میں سے عبداللہ اور شیماء کا اسلام لانا ثابت ہے، اور باقی دو کا حال معلوم نہیں۔[3]

---

[1] دیکھیں: فقه السيرة لمحمد الغزالي بتحقيق شيخ الألباني (ص: ٦٣) فقه السيرة ڈاکٹر محمد رمضان البوطي (ص: ٤٩) السيرة النبوية أبو الحسن الندوي (ص: ٧٣)

[2] الروض الأنف للسهيلي (٢/ ١٦٠۔ ٦١) سیرت النبی ﷺ (١/ ١٧٤) نقلا عن الاصابه لابن حجر (١/ ١٨٣)

[3] سیرت النبی ﷺ للشبلي (١/ ١٧٥) الفتح الرباني (١٠/ ١٩٢)

قحط سالی کی وجہ سے تنگ دستی کا یہ عالَم تھا کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہ بچا تھا۔ ایک مادہ خر اور ایک بوڑھی اونٹنی ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارا بچہ رات رات بھر بھوک سے بلکتا رہتا۔ نہ میری چھاتی میں دودھ تھا اور نہ ہی اونٹنی کے تھنوں میں کوئی قطرہ نظر آتا۔ مکہ معظّمہ پہنچے تو میری ساتھی عورتوں میں سے ہر کسی نے ایک ایک بچہ لے لیا، مگر مجھے کوئی نہیں ملا۔ جب ہم سب نے واپسی کا عزم کیا تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں خالی ہاتھ تو ہرگز نہ جاؤں گی۔ کم از کم اُس یتیم کو ہی لے آتی ہوں جسے میں اور دوسری عورتوں نے یتیم ہونے کی بنا پر نظر انداز کر رکھا تھا۔ میرے شوہر نے کہا:

”لَا عَلَيْكِ اَنْ تَفْعَلِيْ، عَسَىٰ اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ لَنَا فِيْهِ بَرَكَةً“

”وہی لے آؤ شاید اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اس میں برکت پیدا فرما دے۔“

جب بادلِ نخواستہ میں نے اسے قبول کر لیا اور اٹھا کر اس جگہ لے آئی جہاں ہم سب نے ڈیرہ لگایا ہوا تھا۔ وہاں آ کر میں نے اسے اپنی گود میں رکھا اور جس قدر بھی تھا، دودھ پلانا شروع کیا۔ سو اس بچہ نے خوب پیٹ بھر کر دودھ پیا۔ پھر اس وقت میں نے اپنے دوسرے بیٹے کو بھی دودھ دیا تو اس نے بھی سیر ہو کر پی لیا۔ پھر یہ دونوں سو گئے۔ جب کہ اس سے قبل ایک ہی بچہ ہوتا اور پیٹ بھر کر دودھ نہ ملنے کی وجہ سے نہ وہ خود سوتا اور نہ ہی ہمیں سونے دیتا تھا۔ میرا شوہر اونٹنی کے پاس سے گزرا تو محسوس کیا کہ یہ بھی دودھ سے لدی ہوئی ہے۔ اس نے دودھ دوھیا اور ہم دونوں نے بھی خوب جی بھر کر پیا۔ اس طرح یہ رات ہم نے بڑے خوشگوار انداز سے گزاری۔ جب ہم لوگ صبح جاگے تو میرے شوہر نے کہا:

”تَعْلَمِيْ وَ اللّٰهِ يَا حَلِيْمَةُ! لَقَدْ أَخَذْتِ نَسَمَةً مُبَارَكَةً، فَقُلْتُ: وَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَأَرْجُوْ ذٰلِكَ“

”اے حلیمہ! اللہ کی قسم! یقین کرلو، لگتا ہے کہ تم نے تو کوئی بابرکت روح حاصل کر لی ہے، میں نے کہا کہ واللہ! مجھے بھی یہی توقع ہے۔“

صبح جب ہم واپسی کے لیے روانہ ہوئے تو میں اپنی سواری پر بیٹھ گئی اور اس بچے کو بھی اپنے ساتھ ہی بٹھالیا۔ اب میری سواری اس طرح سفر کاٹ رہی تھی کہ میری دوسری ساتھی عورتوں کی سواریاں مِل نہ پارہی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ مجھے کہنے لگیں: اے بنت ابی ذؤیب! تمھارا بھلا ہو، ہمارا بھی تو خیال رکھو۔ کیا یہ وہی مادہ خر نہیں جس پر تم ہمارے ساتھ آئی تھی؟ میں نے انھیں کہا: "بَلٰی وَاللّٰہِ اِنَّھَا لَھِیَ" ''ہاں واللہ! یہ وہی سواری تو ہے!'' تب انھوں نے کہا: "وَاللّٰہِ اِنَّ لَھَا لَشَاْنًا" ''واللہ پھر تو اس کی کوئی خاص ہی شان ہے!'' جب ہم اپنے گاؤں بنی سعد پہنچیں جہاں کی زمین بارش نہ ہونے کی وجہ سے بنجر و ویران ہوچکی تھی [سبزہ اور ہریالی نہ ہونے کے برابر تھی] مگر جب سے ہم یہ یتیم مکہ ﷺ اپنے ساتھ لے آئے تھے، ہماری بکریاں باہر سے خوب پیٹ بھر کر آتیں۔ ہم ان کا دودھ دوہتے اور پیتے، جبکہ ہمارے اپنے گاؤں کے دوسرے لوگوں کا معاملہ بدستور پہلے سا ہی تھا۔ یہاں تک کہ ہمارے قبیلے کے لوگوں نے اپنے چرواہوں کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ تم بھی اپنی بکریاں وہیں چروایا کرو جہاں بنتِ ابی ذؤیب کا چرواہا چراتا ہے۔''[1]

رسول اکرم ﷺ کا بچپن اورشقِ صدر

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''ہم خیرات و برکات سے مسلسل بہرہ وَر ہورہے تھے کہ آپ ﷺ کی عمر دو سال مکمل ہوگئی اور میں نے آپ ﷺ کا دودھ چُھڑا دیا۔ [عنایتِ الٰہی اور پھر صحت بخش صحرائی آب و ہوا کا اثر تھا کہ] آپ ﷺ کی جسمانی نشو ونما بڑی تیزی سے ہوئی، حتیٰ کہ دو

[1] حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ حدیث ابن حبان، ابن راہویہ، ابو یعلیٰ، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم نے روایت کی ہے۔ دیکھیں: الفتح الرباني (٢٠/ ١٩٤) الروض الأنف (٢/ ١٦٣ حاشيه) الفتح الرباني (٢٠/ ١٩٢) ابن هشام (١/ ٥١۔ ٥٢) تهذيب سيرت ابن هشام عبد السلام هارون (ص: ٣٧۔ ٣٨) الوفا لابن الجوزي بتحقيق محمد زهرى النجار (ص: ١٨٠۔ ١٨٢) البداية و النهاية (٢/ ٢٧٣۔ ٢٧٤) خاتم النبيين محمد ابو زهره (١/ ١٥٠۔ ١٥١) الرحيق المختوم (ص: ٦٣۔ ٦٥) و أورد هذا الحديث الهيثمى و قال: رواه أبو يعلىٰ والطبراني بنحوه و رجالهما ثقات.

سال کی عمر میں ہی آپ ﷺ کافی مضبوط ہوگئے تھے۔''

امام ابن الجوزی نے تو یہاں تک نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ ایک دن میں اتنا بڑھتے جتنا عام بچے ایک ماہ میں بڑھتے ہیں اور آپ ﷺ ایک ماہ میں اس قدر نشو ونما پاتے جتنی عام بچے ایک سال میں پاتے تھے۔[1]

مدّتِ رضاعت مکمل ہونے اور دودھ چھڑانے کے بعد ہم آپ (ﷺ) کو آپ (ﷺ) کی والدہ ماجدہ کے پاس مکۃ المکرّمہ لائے۔ ہم نے جو برکات حاصل کی تھیں ان کے پیشِ نظر ہماری تمنا تھی کہ آپ ﷺ کو مزید کچھ مدت کے لیے اپنے پاس ہی رکھیں۔ اسی بنا پر میں نے آپ ﷺ کی والدہ سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے بیٹے کو اس وقت تک میرے پاس رہنے دیں جب تک کہ یہ مضبوط اور خوب تنومند نہ ہو جائے۔ مجھے مکہ کی آب و ہوا سے بھی خدشہ ہے کہ شاید اس کے موافق نہ رہے۔

آپ ﷺ کی والدہ اس بات کا مشاہدہ کر ہی چکی تھیں کہ بادیہ بنی سعد کی آب و ہوا آپ ﷺ کو خوب موافق ہے، لہٰذا ہمارے مسلسل اصرار کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنا لختِ جگر پھر ہمارے ساتھ ہی بھیج دیا۔ اس طرح رحمۃٌ لّلعالمین ﷺ نے اپنی رضاعت اور بچپن کے پانچ سال بنی سعد میں گزارے، جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:

''حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو پانچ سال اور ایک ماہ بعد واپس کر آئیں۔''

"الروض الانف" (۲/ ۲۷۹) اور "المواهب اللدنية" میں انھی (حافظ ابن عبد البر) سے نقل کرتے ہوئے پانچ سال اور دو دن لکھا گیا ہے۔ بعض روایات سے تین، چار اور چھے سال کا بھی پتا چلتا ہے، جیسا کہ ابن اسحاق کے بیان سے تیسرے سال کے آغاز میں واپسی معلوم ہوتی ہے، جبکہ حافظ عراقی اور ابن حجر نے چار سال لکھا ہے۔[2]

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا ہر چھے ماہ بعد آپ ﷺ کو مکۃ المکرّمہ لاتیں اور آپ ﷺ کو والدہ ماجدہ اور دیگر اقرباء سے ملا کر لے جاتیں۔ شیخ محمد ابو زہرہ مصری نے لکھا ہے کہ کتبِ سیرت سے یہ

---

[1] الوفا (۱/ ۱۸۲)

[2] حاشية الروض الأنف (۲/ ۲۷۹) نقلا عن المواهب (۱/ ۱۵۰)

بات ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو والدہ اور اقرباء سے ملانے کے لیے لے جایا کرتی تھیں اور نہ ہی اس بات کی تردید ہوتی ہے، البتہ مامتا کے تقاضے اس امر کو یقین میں بدلتے ہیں کہ وہ ضرور لے جاتی ہوں گی۔[1] البتہ علامہ منصور پوری رحمہ اللہ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ وہ آپ ﷺ کو ہر چھے ماہ بعد ملا کر لایا کرتی تھیں۔[2]

اکثر سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب نبیِ اکرم ﷺ کی عمر شریف چار سال یا پانچ سال کی ہوئی تو آپ ﷺ کو شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کو نہ صرف اہلِ تاریخ و سیرت ہی نے ذکر کیا ہے، بلکہ خود کتبِ حدیث میں سے صحیح مسلم، مسند احمد، دارمی اور مستدرکِ حاکم میں بھی موجود ہے۔ مسلم شریف میں ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَتَاهُ جِبْرِيْلُ وَهُوَ يَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَصَرَعَهٗ فَشَقَّ عَنْ قَلْبِهٖ فَاسْتَخْرَجَهٗ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ عَلَقَةً سَوْدَآءَ، فَقَالَ: مَا هَذَا؟ فَقَالَ: هَذَا حَظُّ الشَّيْطَانِ مِنْكَ، ثُمَّ غَسَلَهٗ فِيْ طَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ بِمَاءِ زَمْزَمَ، ثُمَّ لَأَمَهٗ، ثُمَّ أَعَادَهٗ اِلٰى مَكَانِهٖ، وَجَاءَ الْغِلْمَانُ يَسْعُوْنَ اِلٰى اُمِّهٖ اَنَّ مُحَمَّدا قَدْ قُتِلَ فَاسْتَقْبَلُوْهُ وَهُوَ مُنْتَقِعُ اللَّوْنِ»[3]

''نبیِ اکرم ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے۔ اُنھوں نے آپ ﷺ کو لِٹایا اور سینہ چاک کر کے آپ ﷺ کا قلبِ مبارک باہر نکال لیا۔ پھر دل کو چیر کر اُس میں سے کالے خون کی ایک پھٹکی سی نکالی اور فرمایا کہ یہ شیطان کا حصہ ہے

---

[1] خاتم النّبيّين (١/ ١٥٢) نقلًا عن الاكتفاء (١/ ١٧١)

[2] رحمةً للعالمين (١/ ٤١)

[3] صحيح مسلم (١/ ١٠٢۔ ١٠١) مسند أحمد (٣/ ١٢١۔ ٢٢٨) الفتح الرباني ترتيب المسند (٢٠/ ٩٦۔ ١٩١) و زاد في آخره: و قال أنس: وَ كُنْتُ أَرَىٰ أَثَرَ ذٰلِكَ الْمَخِيْطِ فِيْ صَدْرِهٖ۔ **''میں آپ کے سینے میں سینے کے آثار دیکھا کرتا تھا۔'' اس حدیث کے شواہد بھی متعدد ہیں مثلاً:** سنن الدارمي (٨١١) عن عتبه بن عبد السلمی، المستدرك للحاكم (٢/ ٦١٦) و صححه و وافقه الذهبی، زوائد المسند (٥/ ١٣٩) عن أبي ابن كعب، الفتح الرباني (٢٠/ ١٩٥) تاريخ ابن جرير (٢/ ٥١۔ ٥٢) عن أبي ذرّ كذا خرجه الألباني في تخريج فقه السيره للغزالي (ص: ٦٤)

(اسے نکال کر پھینک دیا تا کہ آیندہ شیطان آپ ﷺ پر غالب نہ آ سکے) پھر دل کو سونے کی طشتری میں رکھ کر آبِ زمزم سے دھویا (پھر اس میں ایمان وحکمت کا جوہر بھر دیا) پھر اسے اسی طرح جوڑ کر اس کے مقام پر رکھ دیا۔ جو بچے آپ ﷺ کے ساتھ کھیل رہے تھے وہ بھاگتے ہوئے آپ ﷺ کی رضاعی ماں (حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا) کے پاس آئے اور بتایا کہ (ہمارے قریشی بھائی) محمد ﷺ قتل کر دیے گئے ہیں۔ وہ بھاگتے ہوئے آپ کے پاس آئے تو دیکھا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔''

نبیِ اکرم ﷺ کا یہ روحانی آپریشن تھا جو عنایتِ الٰہی کی وجہ آپ ﷺ کے لیے سامانِ عصمت تھا اور یہ واقعہ ایک ہی بار نہیں، متعدد مرتبہ پیش آیا۔

دوسری بار یہ واقعہ دس سال کی عمر میں پیش آیا، جیسا کہ ''دلائل النبوۃ'' ابونعیم، ''المواہب اللدنیہ'' اور ''زوائد مسند احمد'' (الفتح الرباني ۲۰/ ۱۹۵) میں ہے۔ ''شرح المواہب'' میں زرقانی نے لکھا ہے کہ بقولِ شامی: ''دس سال کی عمر میں یہ واقعہ پیش آنے کی حکمت یہ تھی کہ یہ عمر سنِ تکلیف کے قریب ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ کے دل کو ایمان وحکمت سے بھر دیا گیا، تاکہ آپ ﷺ سے کوئی ایسا فعل صادر نہ ہونے پائے جو آپ ﷺ کے لیے عیب شمار ہو۔''

اس واقعے کا ذکر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری، کتاب التوحید میں بڑے جزم کے ساتھ کیا ہے۔ المواہب میں ابونعیم وبیہقی اور طیالسی وحارث سے نقل کر کے لکھا ہے:

''یہی واقعہ تیسری مرتبہ اس وقت پیش آیا جب غارِ حراء میں پہلی وحی لے کر حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آئے۔''

حافظ ابنِ حجر لکھتے ہیں:

''یہ اس لیے تھا تاکہ مزید طہارت وتقدیس ہوجائے۔ اور آپ ﷺ قوی دل کے ساتھ وحی کو قبول کرسکیں۔''

پھر خاص طور پر (چوتھی مرتبہ) معراج سے قبل جو واقعہ رونما ہوا اس کی تفصیلات تو بخاری ومسلم

اور دیگر کتبِ حدیث میں بھی موجود ہیں۔[1] حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کے اکرام میں اضافہ ہو اور آپ ﷺ مناجاتِ الٰہی کے لیے خوب تیار ہو جائیں۔[2]

والدہ اور دادا کی کفالت اور وفات

نبیِ رحمت ﷺ چار پانچ سال تک بادیۂ بنی سعد میں حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے اور واقعۂ شقِّ صدر کے بعد جب وہ آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی والدہ کے پاس چھوڑ گئیں تو آپ ﷺ اپنی والدہ اور دادا کے سایۂ شفقت میں زندگی بسر کرنے لگے۔ جب آپ ﷺ کی عمر چھے برس کی ہوئی تو آپ ﷺ کی والدہ محترمہ نے اپنے شوہر نامدار عبداللہ بن عبدالمطلب سے خلوص ووفا کا اظہار کرنے کے لیے ان کی قبر کی زیارت کا ارادہ کیا جو مدینہ منورہ میں تھی۔ مکہ مکرمہ سے یک طرفہ پانچ سو کلو میٹر کے اس طویل و شاق سفر میں حضرت امِّ ایمن رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ بعض سیرت نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سفر میں آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب بھی ساتھ تھے۔

حضرت امّ ایمن رضی اللہ عنہا وراثتاً آپ ﷺ کی ملکِ یمین اور قرابتاً آپ ﷺ کی دایہ تھیں۔ یہ حضرات ایک ماہ تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ اس قیامِ مدینہ کی بہت سی یادیں اور باتیں نبیِ اکرم ﷺ کے ذہنِ مبارک میں محفوظ ہوگئی تھیں۔

جب ہجرت کے بعد قیامِ مدینہ کے زمانے میں ایک دفعہ بنو عدی بن نجّار کی منازل کے پاس سے نبیِ اکرم ﷺ کا گزر ہوا تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں۔ یہی وہ تالاب ہے جس میں مَیں نے تیرنا سیکھا تھا اور اسی میدان میں انیسہ نام کی ایک انصاری لڑکی کے ساتھ میں کھیلا کرتا تھا۔[3]

ایک ماہ کے بعد جب مدینہ سے واپس ہوئے تو راستے میں ہی آپ ﷺ کی والدہ مکرّمہ بیمار

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٦/ ٣٣٢) صحيح مسلم (١/ ١٠٣) سنن النسائي (١/ ٧٦)

[2] فتح الباري (٢٠/ ١٩٥۔ ١٩٦)

[3] طبقات ابنِ سعد (١/ ١٧٣) شرح مواهبِ لدنيه (١/ ١٦٧۔ ١٦٨) سيرت النبى شبلى (١/ ١٧٥) و السيرة النبويه أبو الحسن الندوي (ص: ٧٤)

ہوگئیں اور میقاتِ حج (جحفہ) سے تیئس میل پہلے واقع ایک گاؤں ابواء پہنچ کر وفات پا گئیں۔ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے زمانۂ نبوت میں ان کی قبر کی زیارت کی اور خوب روئے، جیسا کہ مسند احمد میں ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ زَارَ قَبْرَ أُمِّهٖ بِالْأَبْوَاءِ ...فَبَکٰی وَ أَبْکٰی»

''بے شک رسول ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت ابواء نامی گاؤں میں کی تو رو پڑے اور (موجود صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی) رلایا۔''

راویِ حدیث کہتے ہیں:

«ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ وَعَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ» [1]

''پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔''

صحیح مسلم و ابنِ ماجہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِسْتَأْذَنْتُ رَبِّيْ فِيْ زِيَارَةِ أُمِّيْ فَأَذِنَ لِيْ» [2]

''میں نے اپنے پروردگار سے اپنی والدہ مکرّمہ (کی قبر) کی زیارت کے لیے اجازت طلب کی تو مجھے اجازت دے دی گئی۔''

آپ ﷺ نے اپنے والد کا صرف نام سُنا تھا شکل تک نہیں دیکھی تھی، اور اب والدہ بھی ساتھ چھوڑ گئیں اس وقت آپ ﷺ کی عمر چھے سال، تین ماہ اور دس دن تھی۔ [3]

امِّ ایمن رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو اپنے ساتھ مکہ مکرمہ لے کر آئیں اور دادا کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے جب آپ ﷺ کو اپنے دامنِ کفالت و تربیّت میں لیا تو جی بھر کر پیار دیا۔ اپنی جان سے بھی عزیز رکھا۔ ہمیشہ اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا اور آپ ﷺ کو کبھی ابن عبد اللہ کہہ کر نہیں پکارا۔ بلکہ ہمیشہ ابنی (میرے بیٹے) کہا کرتے، تا کہ آپ ﷺ کو باپ کی کمی کا احساس ہی نہ ہونے پائے۔ آپ ﷺ کی دایہ امِّ ایمن رضی اللہ عنہا کو بھی اسی قسم کی تاکید کر رکھی تھی تا کہ وہ ماں کی کمی پوری کرنے میں کوشاں

[1] اس حدیث کو سہیلی نے ''الروض الأنف'' (۲/ ۱۸۵) میں صحیح قرار دیا ہے۔
[2] حوالہ سابقہ و صحیح مسلم مع النووي (۷/ ٤٥)
[3] الفصول في اختصار سيرةِ الرسول ﷺ لابنِ كثير (ص: ۸۰۔ ۸۱)

رہیں۔ یہ بس ان لوگوں کی محبت وشفقت اور چارہ سازی تھی، ورنہ اس کمی کو کون پورا کر پاتا ہے؟

ابنِ اسحاق نقل کرتے ہیں:

''عبد المطلب آپ ﷺ کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ ان کے لیے کعبہ شریف کے سائے میں جو مسندِ خاص بچھائی جاتی تھی کوئی شخص اس پر اکراماً نہیں بیٹھا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے بیٹے آتے اور مسند کے اردگرد بیٹھ جاتے۔ مگر نبی ﷺ آتے تو سیدھے اسی مسند پر بیٹھ جاتے۔ آپ ﷺ کے چچے آپ ﷺ کو وہاں سے اٹھانا چاہتے تو دادا کہا کرتے تھے: ''دَعُوْا اِبْنِيْ، فَوَ اللّٰهِ اِنَّ لَهٗ لَشَأْنًا'' ''میرے بیٹے کو بیٹھنے دو، اللہ کی قسم! اس کی تو شان ہی نرالی ہے۔'' پھر آپ ﷺ کی پشت پر فرطِ محبت سے ہاتھ پھیرتے اور آپ ﷺ کے اس اندازِ شاہانہ اور استغناء کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ اپنی تاریخ ''البداية و النهاية'' میں لکھتے ہیں:

''آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کے فوت ہوجانے کے بعد تو دادا نے اور بھی زیادہ توجّہ دینا شروع کر دی تھی اور اس قدر خیال رکھا کرتے کہ کبھی اپنے کسی بیٹے کا بھی نہ رکھا ہوگا۔ آپ ﷺ کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتے اور جب آپ ﷺ سوئے ہوئے ہوتے تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر وہ آپ ﷺ کی خبر گیری کیا کرتے تھے، لیکن اسی دوران میں نبی ﷺ ایک تیسرے امتحان سے دو چار کر دیے گئے۔ بیاسی سال کی عمر پا کر یہ شفیق دادا بھی راہیِ ملکِ عدم ہوگئے اور حجون میں دفن ہوئے۔ بعض مؤرخین نے ان کی عمر ایک سَو دس سال اور بعض نے ایک سَو چالیس سال لکھی ہے،[1] جبکہ بعض نے ایک سَو بیس سال نقل کی ہے۔[2] جب ان کا جنازہ اٹھا تو نبی ﷺ بھی ساتھ تھے اور فرطِ محبت و شدّتِ غم سے روتے جاتے تھے۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر شریف صرف آٹھ سال دو ماہ اور دس دن تھی۔[3]

---

[1] الفتح الرباني (٢٠/ ١٩٤)

[2] فقه السيرة محمد غزالي.

[3] البداية و النهاية (٢/ ٨٢۔ ٢٧٩) ابن هشام (١/ ١٥٥۔ ١٥٦) الوفاء (١/ ١٩٣۔ ٢٠٠) تلقيح فهوم أهل الأثر لابنِ الجوزي (ص: ٧) فقه السيرة محمد الغزالي (ص: ٦٦۔ ٦٧) الرحيق المختوم (ص: ٦٥۔ ٦٦) السيرة النبوية أبو الحسن على الندوي (ص: ٧٤۔ ٧٥) رحمةٌ للعالمين (١/ ٤١) و سيرت النبي ﷺ شبلي (١/ ١٧٥۔ ١٧٦)

دعوتِ فکر

سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر پیش کیے گئے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تمام قارئین کو دعوتِ فکر دیں کہ تمام اسلامیانِ عالَم تو نہیں صرف ہمارے برِّ صغیر میں رہنے والے مسلمانوں کا ایک طبقہ اس بات پر مصرّ ہے کہ نبی ﷺ جنسِ بشر میں سے نہیں تھے، بلکہ نورانی مخلوق اور نورٌ من نور اللہ تھے۔ تو آیئے ذرا غور وفکر سے کام لیں اور دیکھیں کہ ان کے اس دعوے میں کہاں تک معقولیّت ہے!

اگر بات صرف اس حد تک رہے کہ آپ ﷺ ضلالت و گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکی انسانیّت کے لیے ہادی و رہبرِ کامل اور نورِ ہدایت تھے، تو اس میں کسی قسم کے اختلاف کی کوئی گنجایش ہی نہیں تھی، کیوں کہ آپ ﷺ کی تعلیمات واحکامِ شریعت واقعی نورِ ہدایت ہیں۔ لیکن یہ کہہ دینا کہ خود آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی اور جسدِ اطہر بھی نورِ مجسم تھا اور آپ ﷺ نورانی مخلوق تھے۔ آپ ﷺ کو نوعِ بشر سے خارج قرار دینا کہاں تک عقل وفکر کے مطابق اور قرینِ قیاس ہے؟

آپ ذرا امّتِ اسلامیہ کے المیہ ''فرقہ وارانہ ذہنیت'' سے بالا ہوکر، ہر قسم کے مذہبی تعصّب کو بالائے طاق پر رکھتے ہوئے اور قرآن وسنت میں موجود لا تعداد دلائل وشواہد سے بھی وقتی طور پر صَرفِ نظر کر کے صِرف عقلی نقطۂ نگاہ سے ہی سوچیں کہ نہ صرف ہماری گزشتہ معروضات بلکہ سیرت کی کوئی بھی کتاب اُٹھالیں، اس میں آپ کو نبیِ رحمت ﷺ کے شجرۂ نسب یا نسب نامہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات تو ضرور ہی مل جائیں گی، آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے والدِ گرامی سے لے کر پیچھے کی اَسّی پُشتوں کے بعد حضرت آدم علیہ السلام آ جاتے ہیں۔ اگر نبیِ اکرم ﷺ کو بشر نہیں بلکہ نورانی مخلوق مان لیا جائے تو پھر اس نسب نامہ میں مذکور باقی تمام حضرات بھی بشر نہیں ہونے چاہییں، حتی کہ حضرت آدم علیہ السلام جنھیں ابو البشر یعنی تمام نوعِ بشر کے باپ کا خطاب دیا جاتا ہے خود انھیں بھی بشریّت سے خارج قرار دینا پڑے گا۔

آپ اتنی دور نہ جائیں بلکہ قریب ہی سے دیکھیں کہ اس طرح تو نہ صرف آپ ﷺ کے والدینِ گرامی بلکہ آپ ﷺ کے کافر چچا ابولہب اور ابو طالب کو بھی نورانی مخلوق ماننا پڑے گا، کیوں کہ

وہ دونوں بھی آپ ﷺ کے والدِ گرامی کے بھائی تھے، اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک ہی باپ کی اولاد میں سے ایک بھائی نوری اور دوسرا از جنسِ بشر ہو۔ نبی ﷺ کے شجرۂ مبارکہ کی آخری کڑی حضرت آدم وحوا علیہما السلام بھی نوری ٹھہرے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے اس دعوے نے پورے نظامِ فطرت کو ہی بدل کر رکھ دیا اور ہم نے خاکی، نوری اور ناری تین قسم کی مخلوقات کو صرف دو ہی اقسام نوری اور ناری میں منحصر کر دیا۔ جبکہ یہ امر ذاتِ الٰہی سے کھلی بغاوت ہے۔

پھر اگر مان ہی لیا جائے کہ نبی ﷺ خیر البشر نہیں بلکہ مخلوقِ نور ہیں تو پھر اس شجرۂ نسب کی کیا حیثیت ہوگی؟ کیوں کہ نوری مخلوق کے ماں باپ اور دادوں کا کہیں پتا نہیں ملتا۔ کبھی کسی نے حضرت جبرائیل، عزرائیل [ملک الموت] میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کا نسب نامہ اور ان کے ماں باپ دادوں کا ذکر کیا یا سنا ہے؟

اللہ کے لیے ذرا سوچیے تو سہی! جس کے ماں باپ دادے ہوں، جسے ایّامِ رضاعت میں تین عورتوں نے دودھ پلایا ہو، جو کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، کھیلتا اور بکریاں چراتا ہو، جس نے متعدد شادیاں کی ہوں، جس کے لڑکے لڑکیاں ہوں اور جسے تمام بشری ضرورتیں لاحق ہوں، اسے غیر بشری مخلوق قرار دینا فرزانگی ہے یا دیوانگی؟ اور پھر آپ ﷺ ہما شما کی طرح نہیں بلکہ خیر البشر تھے جن کی عظمت کا اندازہ کرنا ہو تو وقائع معراج میں سے سدرۃ المنتہیٰ تک تو آیئے اور دیکھئے کہ خیر البشر کہاں تک پہنچ جاتے ہیں؟ شرعی دلائل دیکھنا چاہیں تو کتاب وسنّت کا مطالعہ کریں، آپ کو سیکڑوں مقامات سے پتا چلے گا: ؎

مُحَمَّدٌ بَشَرٌ وَلَيْسَ كَالْبَشَرِ
مُحَمَّدٌ كَالْيَاقُوتَةِ وَ النَّاسُ كَالْحَجَرِ

''حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بشر تو تھے مگر عام بشری مخلوق کی طرح نہیں تھے۔ لوگوں میں سے آپ ﷺ کی مثال تو اس یاقوت کی سی ہے جو ہوتا تو پتھر ہی ہے، مگر عام پتھروں کی طرح نہیں، جب کہ لوگوں کی مثال آپ ﷺ کے سامنے عام پتھر کی سی ہے۔''

بشریتِ رسول ﷺ... بریلوی مکتبِ فکر کے علماء کے اقوال میں

علماء کا ایک گروہ جس کا تعلق بریلوی مکتبِ فکر سے ہے وہ نبی مکرم ﷺ کو ''بشریت'' سے

خارج قرار دینے پر تُلے ہوئے ہیں اور آپ ﷺ کو ''نورِ مجسّم'' ثابت کرتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اپنے مکتبِ فکر کے بانی حضرت شاہ احمد رضا خان بریلوی اور دیگر علماء اصلِ حقیقت کے معترف تھے۔ چنانچہ بہارِ شریعت مرتبہ مولانا محمد امجد علی مصدّقہ مولانا احمد رضا خان (۱/ ۱۰) میں لکھا ہے:

''انبیاء سب بشر تھے اور مرد، نہ کوئی جنّ نبی ہوا، نہ عورت۔''

مولانا نعیم الدین مراد آبادی دستِ راست فاضل بریلوی ''کتاب العقائد'' (ص: ٦ طبع دہم) میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت کے لیے جن پاک بندوں کو اپنے احکام پہنچانے کے واسطے بھیجا، ان کو نبی کہتے ہیں۔ انبیاء وہ بشر ہیں جن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے۔''

فاضل بریلوی کے خلیفۂ مجاز، مرکزِ حزب الاحناف وجمعیت علمائے پاکستان کے مرکزی صدر اور مسجد وزیر خان لاہور کے خطیب ابوالحسنات مولانا احمد شاہ صاحب ''العقائد'' (ص: ۱۵، ۱٦) میں لکھتے ہیں:

''نبی وہ بشر ہوتا ہے جو خدا کی طرف سے آئے اور احکامِ الٰہی اس پر بذریعہ وحی آئے ہوں۔ جس قدر بھی انبیاء گزرے سب بشر ہی تھے۔''

بریلوی مکتبِ فکر کے معروف علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی گجراتی شاگرد رشید و خلیفہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی اپنی معروف کتاب ''جاء الحق'' (طبع ہفتم) مصدقہ ومجوزہ پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری (ص: ۱٦۴) میں لکھتے ہیں:

''نبی جنس بشر ہی میں آتے ہیں اور انسان ہی ہوتے ہیں، جنّ یا فرشتہ نہیں۔''

نیز لکھتے ہیں:

''ہم بھی عقیدے کے ذکر میں کہتے ہیں کہ نبی بشر ہی ہوتے ہیں۔''

نیز مفتی موصوف ہی کی دوسری کتاب ''رحمتِ خدا'' (ص: ۴۰) میں مذکور ہے:

﴿ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾

''(اے لوگو! گھبراؤ نہیں) میں تم جیسا ہی بشر ہوں۔ (فرشتہ یا جن کی جنس سے نہیں ہوں)۔''

فاضل بریلوی کے ترجمۂ قرآن ''کنز الایمان'' اور اس پر مولانا نعیم الدین مراد آبادی کے تفسیری حاشیہ ''خزائن العرفان'' میں بھی جا بجا اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ التغابن (آیت: ٦) میں ہے:

﴿فَقَالُوٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا﴾

''بولے کیا آدمی ہمیں راہ بتائیں گے؟ تو کافر ہوئے۔''

''**ف**: اول انھوں (کافروں) نے بشر کے رسول ہونے سے انکار کیا اور یہ کمال بے عقلی و نافہمی ہے کہ بشر کا رسول ہونا تو نہ مانا، پتھروں کا خدا ہونا تسلیم کرلیا۔''

سورۃ الکہف (آیت: ١١٠) میں ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَاْ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

''تم فرماؤ! ظاہری صورت بشر میں (تو) میں تم جیسا ہی ہوں (البتہ) مجھے وحی ہوتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔''

ف: ''مجھ پر بشری اعراض و امراض طاری ہوتے ہیں۔''

سورت حٰمٓ السجدہ (آیت: ٦) ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَاْ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ ''تم فرماؤ آدمی ہونے میں مَیں تم جیسا ہوں۔''

ف: ''ظاہر میں کہ میں دیکھا بھی جاتا ہوں۔ میری بات سنی بھی جاتی ہے اور میرے تمھارے درمیان بظاہر کوئی جنسی مغایرت بھی نہیں ہے تو پھر تمھارا یہ کہنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ میری بات نہ تمھارے دل تک پہنچے نہ تمھارے سننے میں آئے اور میرے تمھارے درمیان کوئی روک ہو۔ بجائے میرے کوئی غیر جنس جن یا فرشتہ آتا تو تم کہہ سکتے تھے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی جنسی مغایرت ہی بڑی روک ہے، لیکن یہاں تو ایسا نہیں ہے، کیوں کہ میں بشری صورت میں ہوں۔ مجھ سے مانوس ہونا چاہیے۔''

ان آیات کے ترجمے اور حاشیے میں فاضل بریلوی اور ان کے دستِ راست مولانا مراد آبادی کے الفاظ میں ''ظاہری صورت میں۔'' اور ''بشری صورت میں'' آئے ہیں۔ ان میں بعض لوگ چابکدستی سے کئی معانی گھسیڑ دیتے ہیں۔ جبکہ انھی دونوں افاضل کی دوسرے مقامات پر مذکور صراحتیں

بڑی واضح ترین ہیں کہ وہ تمام انبیاء اور نبیِ اکرم ﷺ کو بشر ہی مانتے تھے۔ جیسا کہ ''بہارِ شریعت'' اور ''العقائد'' کے حوالے شروع میں درج ہیں۔ قاضی عیاض کی کتاب ''الشفا فی حقوق المصطفے ﷺ'' جو فاضل بریلوی کی مصدّقہ ہے، اس کی جلد دوم، صفحہ نمبر ۹۸ پر انبیائے کرام (علیہم السلام) اور نبی ﷺ کے بشر ہونے اور پھر بشریت کے عقلی دلائل کے طور پر اس کی علامتیں بھی بالتفصیل مذکور ہیں۔

امامِ ربانی حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ نے اپنے مکتوبات میں جابجا اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ جلد اول، ص: ۲۱ مکتوب نمبر: ۲۰۹ طبع نول کشور میں لکھتے ہیں:

''اتیانِ لفظ ﴿مِثْلُكُمْ﴾ برائے تاکیدِ بشریت است۔''

(آیت ﴿إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ میں) لفظِ ﴿مِثْلُكُمْ﴾ کا لانا بشریت کے وصف کی تاکید کے لیے ہے۔)

نیز صفحہ (۲۶۶، ۳۲۹) پر لکھتے ہیں:

''نمی بنی کہ انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات باتمامہ در نفسِ انسانیت برابر اند در حقیقت وذات ہمہ متحد، تفاضل باعتبار صفات کاملہ آمدہ است۔''

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰت والتسلیمات عام انسانوں کے ساتھ صفتِ انسانیت میں برابر ہیں اور تمام انسان اصل حقیقت و ذات میں برابر ہیں۔ انبیاء کی فضیلت وعظمت ان کی صفاتِ کاملہ کی وجہ سے ہے۔''

جلد: ۲، ص: ۱۲۹ میں فرماتے ہیں:

''عوام انسان ہر چند، با نبیآء علیہم الصلوٰت والتسلیمات در نفسِ انسانیت شریک اند ...الخ۔

''عام انسان بہر صورت صفتِ انسانیت وبشریت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابر شریک ہیں۔''

جلد اول، صفحہ: ۱۷۷ پر خاص نبی ﷺ کے بارے میں فرمایا ہے:

''اے برادر! محمد رسول اللہ ﷺ بآں علوِ شان بشر بود۔''

''اے بھائی! محمد رّسول اللہ ﷺ بڑی بلند شان والے ہونے کے باوجود بشر تھے۔''

کیا ہر سال بڑی دھوم دھام سے ''بزمِ مجدّد الف ثانی'' منانے والے حضرات ان کے ان فرمودات پر غور کریں گے؟

شاہ احمد رضا خان فاضل بریلوی اور دیگر بریلوی علماء نے نبی ﷺ کے نوری نہیں بلکہ خاکی ہونے کا واضح اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ فاضل بریلوی کے شیخِ محقق عبد الحق محدّث دہلوی رحمہ اللہ "جذب القلوب إلیٰ دیار المحبوب" (ص: ۱۵) میں لکھتے ہیں:

''احادیث صحیحہ از طُرق متعدد آمدہ کہ خلق ہر نفسے از تربت کہ مدفون کرد وروئے لازم آید کہ خلق نفس زکیہ حضرت سیدِ کائنات ﷺ از تربتِ طابہ مدینہ باشد وکذلک نفوس اکثر آل واصحاب رضی اللہ عنہم اورتابعین رحمہم اللہ کہ دریں بقعہ آسودہ اند۔''

''احادیثِ صحیحہ میں طُرقِ متعددہ سے وارد ہے کہ آدمی کی پیدائش اس مٹی سے ہوئی ہوتی ہے جہاں دفن ہو، تو لازم ہے کہ نبی ﷺ کی پیدائش مدینہ طیبہ کی مٹی سے ہوگی۔ اور اسی طرح اکثر آل واصحاب رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی پیدائش بھی تربتِ مدینہ سے ہوگی جو اس مبارک زمین میں مدفون ہیں۔''

اس مذکورہ حدیث کو فاضل بریلوی نے اپنی کتاب ''فتاوی افریقیہ'' (ص: ۲۵) میں یوں نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ فِیْ سُرَّتِه مِنْ تُرْبَتِهِ الَّتِیْ خُلِقَ مِنْهَا حَتّٰی یُدْفَنَ فِیْهَا وَ أَنَا وَاَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ خُلِقْنَا مِنْ تُرْبَةٍ وَاحِدَةٍ، فِیْهَا نُدْفَنُ»

''ہر بچے کی ناف میں اس مٹی کا حصہ ہوتا ہے جس سے اس کی تخلیق ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس میں دفن بھی کیا جائے۔ اور میں (یعنی نبی ﷺ) اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ایک مٹی سے بنے ہیں۔ اسی میں دفن ہوں گے۔''

''مدارج النبوۃ'' (۱/۶۳، طبع نول کشور) میں حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی لکھتے ہیں:

''وجودِ عنصری وے ﷺ ارضی است''

''نبی ﷺ کا وجودِ عنصری ارضی (زمینی وخاکی) ہے۔''

شیخ دہلوی نے یہ الفاظ در اصل آیت: ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا﴾ [الأحزاب: ٤٥۔ ٤٦] کی تفسیر وتشریح بیان کرتے

ہوئے لکھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو روشن چراغ فرمایا۔ اس لیے کہ چراغ بنا ہوتا ہے مٹی سے اور اس میں تیل ہے، بتی ہوتی ہے، پھر اسے روشن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح نبی ﷺ کا جود خاکی ہے، مگر اس میں اللہ نے نورِ نبوت رکھا اور آپ ﷺ کو نورِ ہدایت بنایا۔ سورۃ الاعراف (آیت: ۱۵۷) ﴿ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ ﴾ کے حاشیہ نمبر: ۲۹۷ (ازخزائن العرفان بر حاشیہ کنز الایمان) کے تحت بریلوی جماعت کے صدر الافاضل اور فخر الاماثل مولانا نعیم الدین مراد آبادی نبی ﷺ کی شان گرامی میں یہ شعر لکھتے ہیں:

خاکی وبر اوجِ عرش منزل امی وکتاب خانہ در دل

جس کا پہلا ہی لفظ واضح ترین ہے۔ اہلِ سنت کی معتبر کتابِ عقائد (ضروریاتِ اسلام حصہ اوّل در بیان عقائد مصدقہ مولانا محمد امجد علی طبع مطبع اعلیٰ حضرت) میں رسول کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"اَلرَّسُوْلُ اِنْسَانٌ بَعَثَهُ اللّٰهُ اِلَی الْخَلْقِ لِتَبْلِیْغِ الْاَحْکَامِ"

''رسول وہ انسان ہے جو اللہ کی طرف سے احکامِ دین کی تبلیغ کے لیے بھیجا گیا ہو۔''

پھر آگے یہ بھی وضاحت ہے:

''نبی سب مرد تھے، کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔''

اور شرح عقائد نسفی (ص: ۱۴، طبع کانپور ومجتبائی) میں ہے:

''انبیاء ومرسلین ''انسان'' ہوتے ہیں۔''

امید ہے کہ بات واضح ہوگئی ہوگی۔[1]

نورِ مجسم نہیں، نورِ ہدایت

اب رہا اس مسئلہ کا دوسرا پہلو کہ آیا نبی ﷺ مجسم نور تھے؟

اس کی تردید تو بریلوی علماء کے اقوال سے ہی ہوگئی اور واضح ہو گیا کہ آپ ﷺ خاکی تھے،

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: تعلیمات شاہ احمد رضا خان بریلوی ازمولانا محمد حنیف یزدانی (ص: ۲۱، ۳۴) طبع مکتبہ نذیریہ لاہور۔

''بشر'' تھے۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ ''نورِ ہدایت'' تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو''نورِ نبوت'' عطا فرمایا تھا۔ اس کی تائید بھی خود بریلوی مکتبۂ فکر کے علماء کرتے ہیں۔ بریلوی جماعت کے بانی فاضل بریلوی نے اپنے ترجمۂ قرآن موسومہ کنز الایمان اور بریلویہ کے صدر الافاضل مولانا مراد آبادی نے اس پر اپنے تفسیری حاشیہ موسومہ خزائن العرفان میں متعدد مقامات پر یہ لکھا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ (آیت: ۱۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾

''بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا اور روشن کتاب۔''

ف: ''سید عالم ﷺ کو نور فرمایا۔ کیوں کہ آپ ﷺ سے تاریکیِ کفر دور ہوئی اور راہِ حق واضح ہوئی۔''

یہاں مراد آبادی صاحب نے نبی ﷺ کے نورِ ہدایت ہونے کا اعتراف تو کیا ہے لیکن اصل مرادِ الٰہی کو پانے میں نامراد رہے ہیں، کیوں کہ یہاں ''سید عالم'' ﷺ کو نور نہیں فرمایا گیا بلکہ ''روشن کتاب'' کو ہی نور بھی قرار دیا گیا ہے جس کی مسکت دلیل اگلی ہی آیت: ۱۶ کے آغاز میں آنے والی ضمیر مفرد ﴿يَهْدِيْ بِهِ﴾ ہے۔ اگر روشن کتاب اور سید عالم دو الگ الگ مراد ہوتے تو ﴿يَهْدِيْ بِهِ﴾ نہیں بلکہ ضمیر تثنیہ ''يَهْدِيْ بِهِمَا'' آنی چاہیے تھی، جیسا کہ معمولی عربی گرائمر جاننے والا بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن برا ہو تعصب کا کہ وہ اپنا رنگ دکھلائے بغیر نہیں رہتا۔

پھر سورۃ التغابن (آیت: ۸) ہے:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا﴾

''تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر جو ہم نے اتارا۔''

ف: ''نور سے مراد قرآن شریف ہے، کیوں کہ اس کی بدولت گمراہی کی تاریکیاں دور ہوتی ہیں اور ہر شے کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔''

نیز سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۶) میں ہے:

﴿وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾

''اللہ کی طرف سے اس کے حکم سے بلاتا ہے اور چمکا دینے والا آفتاب ہے۔''

ف: ''درحقیقت ہزاروں آفتابوں سے زیادہ روشنی آپ ﷺ کے نورِ نبوت نے پہنچائی اور کفر کے ظلماتِ شدیدہ کو اپنے نورِ حقیقت افروز سے دور کر دیا۔ خلق کے لیے معرفتِ الٰہی تک پہنچنے کی راہیں روشن اور واضح کر دیں اور ضلالت کی تاریک وادیوں میں راہ گم کرنے والوں کو اپنے نورِ ہدایت سے راہ یاب فرمایا اور اپنے نورِ نبوت سے ضمائر و بصائر اور قلوب وارواح کو منور کیا۔''

یہ تو فاضل بریلوی کا ترجمۂ قرآن اور مولانا مراد آبادی کے حواشی تھے جبکہ مفتی احمد یار خان نعیمی گجراتی اپنے ''رسالہ نور'' (ص: ۷، مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی) میں لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ، اسلام، قرآن، نور ہیں۔ حضور ﷺ کے نور ہونے کے نہ تو یہ معنی ہیں:

ا۔ حضور ﷺ خدا کے نور کا ٹکڑا ہیں۔

ب۔ نہ یہ کہ حضور ﷺ خدا کی طرح ازلی، ابدی، ذاتی نور ہیں۔

ج۔ نہ یہ کہ رب کا نور حضور ﷺ کے نور کا مادہ ہے۔

د۔ نہ یہ کہ ربِ تعالیٰ حضور ﷺ میں سرایت کر گیا ہے، تاکہ شرک وکفر لازم آئے۔ آپ ایسے نور ہیں جیسا کہ اسلام اور قرآن نور ہیں۔''[1]

بریلوی علماء کی ان تصریحات سے واضح ہوا کہ نبی ﷺ نورِ مجسم نہیں بلکہ اسلام اور قرآن کی طرح نورِ ہدایت ہیں اور یہی صحیح ترین بات اور اہلِ سنّت کا عقیدہ ہے۔

عنایت وحکمتِ الٰہی

نبیِ رحمت ﷺ جو باپ کی طرف سے تو پیدا ہی یتیم ہوئے تھے، صرف چھے ہی برس کی عمر میں ماں کی طرف سے بھی یتیم ہو گئے اور ابھی اس ننھی منی اور معصوم عمر کا آٹھواں ہی سال پورا ہوا تو دادا بھی چل بسے۔

ذرا تصوّر تو کیجیے! اللہ نہ کرے اگر آج کسی بچے کو اس طرح کے حالات پیش آجائیں تو اس کے دل پر کیا گزرے گی اور وہ کن کن محرومیوں، مایوسیوں اور دماغی واعصابی تکلیفوں کا شکار ہوگا؟

[1] رسالہ نور (ص: ۷) بحوالہ تعلیمات شاہ احمد رضا از مولانا محمد حنیف یزدانی (ص: ۳۸، ۳۹)

احساسِ کمتری، مستقبل کی تاریکی اور نا جانے اس کی کن کن تمناؤں کا خون ہوگا۔

لیکن ادھر ہمارے رہبرِ اعظم ﷺ ان حالات سے تو دو چار ہوئے مگر ان مشکلات میں مبتلانھیں ہوئے، کیوں کہ عنایتِ الٰہی ان کے شاملِ حال تھی۔ آپ ﷺ کا یتیم پیدا ہونا، چھے سال عمر میں والدہ کا ساتھ چُھوٹ جانا اور آٹھ سال کی عمر میں دادا کا انتقال کر جانا محض اتفاق نہیں تھا بلکہ اس میں بھی کئی راز تھے جن کا پتا جان لینا تو انسان کے بس میں نہیں، مگر جہاں تک عقلِ انسانی کی رسائی ممکن ہے، ان حالات میں یہ اہم حکمت محسوس کی جا سکتی ہے کہ جس ذات کو کل تک رہبرِ اعظم، ہادیِ عالم، سرورِ کونین اور رحمۃٌ للعالمین کا خطاب ملنے والا تھا، اس کی تربیت خاص اپنی نگرانی میں کرانا مقصود تھا۔ لہٰذا ماں باپ اور دادا جیسے تعلقات کو جلد ہی منقطع کر دیا اور اس طرح اس وسوسۂ شیطانی کی بھی جڑ کاٹ دی کہ کوئی شخص یہ پروپیگنڈا کر سکے کہ آپ ﷺ کے دادا اپنی قوم کے سردار تھے اور یہ طبعی امر ہے کہ باپ دادا اپنی اولاد کی تربیت و پرورش ہی اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ ان کی میراث کو سنبھال سکیں۔ لہٰذا انھوں نے آپ ﷺ کی پرورش ہی اس نہج پر کی کہ آپ ﷺ کا ذہنی رجحان سرداری کی طرف مائل ہو جائے اور آپ ﷺ نے (نعوذ باللہ) اس ہدف یا ٹارگٹ کو پانے کے لیے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور پھر بادشاہی بھی مل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وسوسے اور مسموم پروپیگنڈا کا پہلے ہی سے دروازہ بند کر دیا۔ آپ ﷺ کی پرورش و تربیت ہی ماں باپ اور دادا سے دور ہوئی، بلکہ پورے خاندان سے دور آپ ﷺ نے اپنا بچپن بادیہ بنی سعد میں گزارا۔

جب دادا کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی کفالت آپ کے چچا ابو طالب نے کی تو یہاں بھی اسی حکمتِ الٰہی کا تتمہ نظر آتا ہے کہ وہ آخر دم تک مسلمان ہی نہیں ہوئے، تاکہ کسی کو یہ وہم بھی نہ گزرے کہ آپ ﷺ کی دعوت میں آپ ﷺ کے چچا کے خیالات وافکار کا بھی عمل ودخل تھا اور یہ بدگمانی بھی نہ ہو سکے کہ آپ ﷺ کا پیغام آسمانی پیغام نہیں بلکہ وہ دراصل خاندان وقبیلہ اور سرداری ومنصب کا مسئلہ تھا۔

بلکہ اس سلسلے کی آخری کڑی مال کی فراوانی ہوسکتی تھی کہ آپ ﷺ بڑے مالدار تھے جس کے بل بوتے پر آپ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس شیطانی خیال کو بھی ابھرنے کا موقع

نہ دیا۔ آپ ﷺ کو وراثت میں کل پانچ اونٹ، چند بکریاں اور ایک حبشی کنیز ملی تھی۔ آپ ﷺ کی کفالت کرنے والے چچا ابو طالب کے کثیر العیال اور قلیل المال ہونے پر تاریخ شاہد ہے۔

پھر نبوت ورسالت کوئی کسبی مقام نہیں کہ اسے محنت وذہانت کے بل بوتے پر حاصل کیا جا سکتا ہو۔ یہ تو اصطفاء واختیارِ الٰہی ہے۔

اگر بالفرض یہ قرابت دارانِ رسول ﷺ زندہ بھی رہتے تو کیا وہ کوئی ایسا اندازِ تربیت اختیار کر سکتے تھے جو ان کے نورِ نظر کو نبی بنا دیتا؟ نہیں، اور ہرگز نہیں۔ قرآن شاہد ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام دنیاوی نشیب وفراز، تجرباتِ حیات اور حکمت ودانائی ہی نہیں، بلکہ مقامِ نبوت پر بھی فائز تھے مگر اپنے لختِ جگر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے کوئی کورسِ نبوت مقرر نہ کر سکے بلکہ الٹا بچھڑ گئے اور مدتِ مدید کے بعد جب ملے تو پتا چلا کہ وہ بھی مقامِ نبوت پر سرفراز ہو چکے ہیں۔[1]

الغرض آپ ﷺ کا یتیم پیدا ہونا اور پھر والدہ اور دادا کا جلدی ساتھ چھوڑ جانا بھی حکمت سے خالی نہ تھا۔

ابو طالب کی آغوشِ کفالت اور آپ ﷺ کا بکریاں چَرانا

نبیِ اکرم ﷺ کے دادا عبد المطلب جب قریبِ مرگ تھے تو انھوں نے اپنے بیٹے ابو طالب کو وصیت کی کہ وہ آپ کو اپنی آغوشِ کفالت وتربیت میں لے لیں۔ آپ کے چچا تو اور بھی تھے مگر ابو طالب اور رسول اللہ ﷺ کے والدِ گرامی دونوں ایک ہی ماں کے شکم سے تھے۔ دوسرے چچاؤں کی مائیں الگ تھیں۔ اس لحاظ سے ابو طالب اور رسول اللہ ﷺ کے والدِ گرامی ماں باپ ہر دو جانب سے حقیقی اور سگے بھائی تھے۔ رشتے کی اس گہرائی اور قرابت کے پیشِ نظر دادا نے آپ ﷺ کی کفالت کی وصیت ابو طالب کو کی۔ انھوں نے اس ذمے داری کو بڑے احسن طریقے سے تادمِ آخر نبھایا۔ وہ آپ ﷺ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ ﷺ کے مقابلے میں اپنے بچوں کی بھی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔ سوتے تو آپ ﷺ کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو آپ ﷺ کو ساتھ لے کر باہر جاتے۔

---

[1] فقه السيرة، محمد الغزالي تحقيق الباني (ص: ٦٢) فقه السيرة، ڈاکٹر محمد سعيد رمضان البوطى (ص: ٥٠-٥١)

نبیِ رحمت ﷺ جب بچپن وکم سنی کی حدود سے گزر کرلڑکپن میں داخل ہوئے اور اچھی طرح ہوش سنبھالا تو محسوس کیا کہ میرے شفیق چچا کثیر العیال ہیں اور مادی حیثیت سے قلیل المال۔ لہٰذا آپ ﷺ نے بھی ان کی محبت و شفقت کے پیشِ نظر ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں نبیِ اکرم ﷺ نے بکریاں بھی چرائیں۔ اسی دوران میں آپ ﷺ کو شقِ صدر کا واقعہ دوسری مرتبہ پھر پیش آیا، جبکہ آپ ﷺ کی عمر شریف دس سال اور چند ماہ تھی۔[1]

آپ ﷺ کا بکریاں چرانا بڑا معروف واقعہ ہے جسے امام بخاری اور دیگر ائمۂ حدیث نے صحاح وسنن میں خود آپ ﷺ سے نقل کیا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ نے بکریاں چرائی ہیں بلکہ آپ ﷺ نے اسے سننِ انبیاء علیہم السلام میں سے قرار دیا ہے، جیسا کہ بخاری شریف جلد اوّل کتاب الاجارۃ میں ہے:

''ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جھڑ بیریاں (پیلو) توڑ توڑ کر کھانے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ مِنْهُ فَإِنَّهُ أَطْيَبُهُ»

''ان بیروں (پیلو) میں سے جو خوب سیاہ ہو چکے ہیں وہ توڑ کر کھاؤ، وہ زیادہ مزے کے ہوتے ہیں۔''

نیز فرمایا کہ یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: کیا آپ ﷺ بھی بکریاں چرایا کرتے تھے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔

«وَهَلْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا قَدْ رَعَاهَا»[2]

''کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔''

یہی حدیث بخاری شریف میں بھی مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] الفتح الرباني (٢٠/ ٩٦۔ ١٩٥) وأخرجه ابن حبان والحاكم وابن عساكر والضياء في المختارة، وأورده الهيثمي في المجمع، وقال: رواه عبد الله (ابن الإمام أحمد) ورجاله ثقات، وثقهم ابن حبان۔ **حافظ ابن حجر** رحمہ اللہ **نے** "فتح الباري، كتاب التوحيد"، **میں اس شقِ صدر کو جزماً بیان کیا ہے۔** قاله البنّا.

[2] مسند أحمد بسند جيد، الفتح الرباني (١٥/ ١٢٧)

«مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيّاً اِلَّا رَعَى الْغَنَمَ. فَقَالَ أَصْحَابُهٗ: وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلٰى قَرَارِيْطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ »[1]

''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی بھی ایسا مبعوث نہیں فرمایا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیا آپ (ﷺ) نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: ہاں۔ میں اہلِ مکہ کی بکریاں قراریط (کچھ اجرت یا مقام) پر چرایا کرتا تھا۔''

سنن ابن ماجہ میں ہے: «كُنْتُ أَرْعَاهَا لِأَهْلِ مَكَّةَ بِالْقَرَارِيْطِ»[2]

''میں چند قراریط پر مکہ والوں کی بکراں چرایا کرتا تھا۔''

بقول سوید بن سعید شیخ ابن ماجہ: قراریط جمع ہے قیراط کی، یعنی ہر بکری چرانے کے عوض ایک قیراط۔ علامہ سندھی نے حاشیہ ابن ماجہ میں لکھا ہے کہ قیراط ایک دینار کے جزء کو کہا جاتا ہے اور اکثر ممالک میں ایک دینار کے بیسویں جزء کو قیراط کہا جاتا ہے۔ جب کہ اہلِ شام کے نزدیک یہ چوبیسواں جزء ہے اور ایسے ہی مصر میں بھی ہے۔[3] اسی رائے کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس حدیث کو باب الاجارۃ میں لائے ہیں۔ لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے۔ علامہ ابن الجوزی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور علامہ عینی نے ''عمدة القاري'' (٦/ ٦٣١) میں بحث و دلائل سے علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ کی رائے کو ہی صحیح قرار دیا ہے۔[4]

ایک حدیث میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْفَخْرُ وَالْخُيَلَاءُ فِيْ أَهْلِ الْإِبِلِ، وَالسَّكِيْنَةُ وَالْوَقَارُ فِيْ أَهْلِ الْغَنَمِ»[5]

''فخر و تکبر اونٹ چرانے والوں میں ہوتا ہے اور بردباری و وقار بکریاں چرانے والوں کا خاصہ ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤/ ٣٤٩، حديث: ٢٢٦٢) فقه السيرة محمد الغزالي.
[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٥٩)
[3] الفتح الرباني (١٥/ ١٢٧)
[4] سیرت النبی ﷺ شبلی (۱/۱۷۸ حاشیہ)
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢) الأدب المفرد للبخاري (٤٤٦)

علامہ ساعاتی نے اپنی تالیف "الفتح الرباني" (۲۰/ ۱۹۵) میں اہلِ علم سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انبیائے کرام علیہم السلام کو قبل از نبوت بکریاں چرانے کے الہام میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ انھیں عنقریب جو عالَمِ انسانیت کی گلہ بانی سونپی جانے والی ہے اس کا انھیں تجربہ ہو جائے اور حلم وبردباری، صبر وشکیب اور تواضع وانکساری جیسی صفات ان میں خوب راسخ ہو جائیں۔ یاد رہے کہ عربوں میں بکریاں چرانا کوئی معیوب کام بھی نہیں تھا، بلکہ بڑے بڑے شرفاء وامراء کے بچے بکریاں چرایا کرتے تھے۔''[1]

سفرِ شام اور بُحَیرہ راہب کا قِصّہ

نبیِ اکرم ﷺ کے چچا ابو طالب تجارت پیشہ تھے اور جب وہ اس غرض سے دیگر اعیانِ قریش کے ساتھ سفرِ شام کے لیے نکلنے لگے تو نبی ﷺ نے بھی اصرار کیا کہ میں بھی ساتھ چلوں گا، لہٰذا ابو طالب نے آپ ﷺ کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمرِ مبارک بارہ سال دو ماہ اور دس دن تھی۔ عام مورخین اور سیرت نگاروں نے تو بارہ سال عمر لکھی ہے جبکہ ماہ وسال اور دن کی تحدید امام ابن الجوزی اور مقریزی نے کی ہے۔[2] بعض مورخین نے اس واقعہ کے وقت آپ ﷺ کی عمر نو سال بھی لکھی ہے۔

جب یہ قافلہ شام کے شہر ''بُصریٰ'' پہنچا[3] تو انھوں نے ایک اہل کتاب عالم المعروف ''بُحَیرہ راہب'' کی عبادت گاہ کے قریب ڈیرہ لگایا۔ تاریخ وسیرت کی اکثر کتابوں حتیٰ کہ اصولِ ستہ کی ایک کتاب ''ترمذی شریف'' کے علاوہ یہ حدیث بزار، رزین اور مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ بیہقی اور

---

[1] اختیاری تو نہیں بلکہ اضطراری یا اتفاقی صورت کہہ لیں کہ اس کتاب کے مؤلف راقم آثم (ابو عدنان قمر) کو بھی بچپن میں آغازِ تعلیم سے پہلے دو تین سال اپنے گاؤں ریحان چیمہ (ڈسکہ) اور قرب وجوار کے دیہات میں اپنے ہی گھر والوں کی بھیڑ بکریاں چرانے کی سنتِ انبیاء علیہم السلام پر عمل کا شرف حاصل رہا ہے۔ وللہ الحمد.

[2] الرحيق المختوم (ص: ٦٧) نقلًا عن تلقيح فهوم أهل الأثر لابن الجوزي (ص: ٧) و إمتاع الأسماع للمقريزي (١/ ٨)

[3] یہ بُصریٰ شام میں ہے، جب کہ عراق کا ایک شہر بَصرہ ہے جہاں کے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تھے۔ دونوں ناموں کے تلفظ میں بہت قرب ہے، لیکن لکھنے کا انداز ایک دوسرے سے بہت بعید ومختلف ہے جس کے تلفظ میں عموماً فرق نہیں کیا جاتا۔

ابونعیم نے ''دلائل النبوۃ'' میں اور خرائطی، ابن عساکر اور ابن ابی شیبہ نے بھی اسے بیان کیا ہے۔[1]

قریشِ مکہ کے تجارتی قافلے پہلے بھی وہاں ٹھہرا کرتے تھے، مگر وہ بُحیرہ راہب کبھی اپنے صومعہ سے باہر نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی کسی قافلے پر توجہ دی تھی، لیکن اس مرتبہ وہ اپنی خلوت گاہ سے نکلا اور نہ صرف اہلِ قافلہ کے پاس چل کر آیا بلکہ اس نے ان سب کی دعوت بھی کی۔ نبی اکرم ﷺ جو ابھی بارہ سال کے کمسن بچے تھے، اس نے آپ ﷺ کا دستِ مبارک پکڑا اور کہا کہ اس بچے کا سرپرست کون ہے؟ ابو طالب نے کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے! راہب نے کہا کہ تمھاری بات صحیح نہیں، کیوں کہ ہماری کتاب کے مطابق اس کا باپ تو زندہ ہی نہیں ہونا چاہیے۔ تب ابو طالب نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے اور اس کے پوچھنے پر باپ کے بارے میں بتایا کہ وہ اس وقت فوت ہو گئے تھے، جبکہ یہ بچہ ابھی شکمِ مادر میں تھا۔ تب اس نے آپ ﷺ کی پشتِ مبارک کھول کر آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان پائی جانے والی ''مہرِ نبوت'' بھی انھیں دکھائی اور بتایا کہ یہ بچہ ''سرورِ عالَم'' اور ''رحمۃ للعالمین'' بننے والا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرے گا۔

امام سہیلی نے "الروض الأنف" (۲/ ۲۲۱تا ۲۲۳) میں "من صفات ختم النبوۃ" عنوان کے تحت آٹھ روایات کا ذکر کیا ہے جن میں ''مہرِ نبوت'' کے بارے میں مذکور ہے، جن کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے مابین پشتِ مبارک پر کچھ گوشت ابھرا ہوا سا تھا جو سیب، انڈے یا حجلۂ عروس کے بڑے بٹن کے مانند تھا اور اس پر کالے بال بھی تھے۔ ''تاریخ حاکم'' وغیرہ میں لکھا ہے کہ اس مہرِ نبوت پر لکھا ہوا تھا: ''محمد رسول اللہ'' جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''فتح الباری'' میں اس بات کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ثابت نہیں۔ ابن حبان میں اس بات کے مذکور ہونے اور ان کے اس کی تصحیح کرنے سے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے۔ یہ تصحیح ان کی غفلت کا نتیجہ ہے۔[2]

غرض اہلِ قافلہ نے اس راہب سے پوچھا کہ یہ باتیں تمھیں کیسے معلوم ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ جب تم اس گھاٹی سے اتر رہے تھے تو کوئی شجر و حجر یا درخت اور پتھر ایسا نہ تھا جو سجدہ ریز

---

[1] حاشیه الروض الأنف (۲/ ۲۲٤) تحفة الأحوذي (۱۰/ ۹۲) فقه السيرة للغزالي، تعليق الألباني (ص: ٦٨)

[2] عارضة الأحوذي شرح سنن الترمذي لابن العربي (۷/ ۱۳/ ۷/ ۱۰٦) طبع سوريا.

نہ ہوا ہو اور یہ کسی نبی کے سوا ایسا نہیں کرتے۔ آپ ﷺ کے دونوں شانوں کے مابین ''مہرِ نبوت'' بھی اس کی علامت ہے اور جب یہ بچہ اونٹوں کو باندھ کر اس درخت کی طرف آرہا تھا تو اسے بادل کا ایک ٹکڑا سایہ کیے ہوئے تھا۔ جب آپ ﷺ درخت کے قریب پہنچے تو قریش ساری سایہ دار جگہ پر قبضہ کر چکے تھے۔ آپ ﷺ آئے اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے تو درخت کا سایہ بھی ڈھل کر آپ ﷺ تک جا پہنچا۔ ان تمام علامتوں کے پیشِ نظر بحیرہ نے ابو طالب سے کہا کہ اسے اپنے ساتھ یہاں سے آگے ہرگز نہ لے جانا، ورنہ یہودی آپ ﷺ کو قتل کر دیں گے۔

اسی دوران میں سات رومیوں کا ایک وفد بھی یہاں آپہنچا۔ بُحیرہ نے ان سے آنے کا مقصد پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اس وقت کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر نبی موعود کی تلاش میں پہرے نہ بٹھا دیے گئے ہوں اور ہمیں اس راستے کی طرف بھیجا گیا ہے کہ جب اور جہاں بھی اس کو پائیں وہیں قتل کر دیں۔ بحیرہ راہب نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا کہ جس کام کو اللہ تعالیٰ سرانجام دینا چاہے، کیا دنیا کی کوئی طاقت اسے روک سکتی ہے؟ انھوں نے کہا: ہرگز نہیں۔ تو اس نے کہا: تب پھر تم اپنے ارادوں سے باز آجاؤ۔ بلکہ میرے ساتھ عہد کرو کہ تم اسے کوئی ایذا نہیں پہنچاؤ گے۔ وہ اس راہب کی بات پر قائل ہو گئے اور اپنے ارادے بدل دیے۔ اور واپسی کے بجائے راہب ہی کے ہو کر رہ گئے۔

اب راہب نے پھر ابو طالب سے اصرار کیا کہ اس بچے کو واپس بھیج دو، تب ابو طالب نے وہیں سے آپ ﷺ کو واپس کر دیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بھی آپ ﷺ کے ساتھ بھیجا۔ اس راہب نے کھانے کی کچھ چیزیں اور زیتون بطورِ زادِ راہ آپ ﷺ کو دے کر بھیجا۔[1]

یہ قصہ عام سیرت نگاروں کے یہاں بڑا معروف ہے مگر اہلِ تحقیق علماء نے بُحیرہ کے اس واقعہ کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

---

[1] البداية والنهاية (٢/ ٢٨٧ ـ ٢٨٣) سیرت ابن هشام (١/ ٦٧ ـ ١٦٥) تاریخ طبری اُردو (١/ ٥٨ تا ٦٠) طبع نفیس اکیڈمی کراچی، تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي علامه عبد الرحمن مبار کپوری (١٠/ ٩٠ تا ٩٢) طبع مدنی. بلوغ الأماني من إسرار الفتح الرباني للبنا (٢٠ / ١٩٦)

داستانِ بحیرہ پر عیسائی مُصنّفین کے بَرگ و بار

نبیِ اکرم ﷺ اور بحیرہ راہب کی داستان محقق اہلِ علم اور سیرت نگاروں کے نزدیک سند و متن ہر دو اعتبار سے غیر معتبر ہے۔ مگر قبولِ روایت میں تساہل پسند مصنّفین کی وجہ سے یہ واقعہ عام مسلمانوں میں بڑا معروف ومقبول ہے۔ کیوں کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ نبی ﷺ کم سنی میں ہی نبیِ موعود ہونے کی حیثیت سے پہچانے گئے۔ بچپن میں ہی بادل سایہ کرنے لگے اور شجر وحجر سجدہ ریز ہو گئے وغیرہ۔ یہ ایسے امور ہیں کہ جن میں نبی ﷺ کی عظمت کا اظہار پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ واقعہ زبان زدِخاص وعام ہو گیا۔

تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ یہی قصہ عیسائی مصنّفین اور مستشرقین میں بھی بڑا معروف ومقبول ہے۔ اُن دشمنانِ اسلام نے اس واقعہ کو خوب اچھالا، بلکہ سر ولیم میور، ڈریپر اور مارگولیوسس وغیرہ تو اس واقعہ کو عیسائیت کی فتحِ عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدّعی ہیں کہ رسول ﷺ نے مذہب کے تمام حقائق واسرار (نعوذ باللہ) اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے اُنہی پر آپ ﷺ نے عقائدِ اسلام کی بنیاد رکھی اور اسلام کے تمام اصول انہی نکتوں کے شروح وحواشی ہیں۔

ڈریپر نے اپنی کتاب ''معرکۂ علم ومذہب'' میں لکھا ہے کہ بحیرہ راہب نے بُصریٰ (شام) کی خانقاہ میں محمد (ﷺ) کو عیسائی (نسطوری فرقہ) کے عقائد کی تعلیم دی ...آپ (ﷺ) کے غیر تربیت یافتہ لیکن اَخّاذ دماغ نے اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا ...... بعد میں آپ (ﷺ) کے طرزِ عمل سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوری فرقہ کے عیسائیوں کے مذہبی عقائد نے آپ (ﷺ) پر کہاں تک قابو پا لیا تھا؟ ولیم میور نے بھی نہایت آب وتاب سے یہ ثابت کرنے کی نامسعود کوشش کی ہے کہ آپ (ﷺ) کو بُت پرستی سے جو نفرت تھی اور ایک جدید مذہب کا جو خاکہ آپ (ﷺ) نے قائم کیا وہ (نعوذ باللہ) سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب ومشاہدات کے نتائج تھے۔

پروفیسر سیڈیو (تاریخ العرب العام، ص: ٦٦) اور گستاف لو بون (حضارة العرب، ص: ١٣٠) نے اپنی اپنی کتاب میں چارہ سازی کی ہے اور زور دیا ہے کہ محمد ﷺ نے اس سفر میں بحیرہ سے (نعوذ باللہ) تورات پڑھی تھی۔ فرانسیسی مصنف ''کارا'' نے تو اس موضوع پر مستقل ایک کتاب لکھ ماری جس

کا نام ''مؤلفِ قرآن'' رکھا اور اس میں اُس نے اپنی تمام سعیِ نامشکور اس بات پر صرف کردی کہ پورا قرآن ہی نبی ﷺ نے بحیرہ سے سیکھا تھا۔ کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار مارگولیوس نے اپنی کتاب ''لائف آف محمد ﷺ'' میں کیا ہے۔

قارئینِ کرام! ''نقل کفر، کفر نباشد'' کے پیشِ نظر ہم نے یہ چند عبارتیں نقل کردی ہیں، تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ ان عیسائی پادریوں اور مصنّفین نے کس طرح رائی کا پہاڑ بنایا ہے اور ذرا سی بات کو افسانہ کردیا ہے۔ جبکہ اوّل تو بحیرہ کا واقعہ ہی صحیح نہیں۔ اگر اسے صحیح مان ہی لیا جائے تو بات صرف اتنی ہے کہ وہ ملا، اس نے بعض علامات کو دیکھ کر آپ ﷺ کے نبی ہونے کی بشارت دی اور ازراہِ عقیدت سارے قافلے کو کھانا کھلایا، مگر ان معاندینِ اسلام اور دشمنانِ رسول ﷺ نے اس واقعہ کو یہ برگ و بار بھی لگا دیے۔ حالانکہ آپ تاریخ وسیرت کی کوئی کتاب اٹھالیں جس میں یہ واقعہ مذکور ہو، اس میں آپ کو کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نظر نہیں آئے گا جس سے یہ شک بھی گزر سکتا ہو کہ بحیرہ نے آپ ﷺ کو کوئی تعلیم دی تھی۔

عیسائی اگر داستان کو صحیح مانتے ہیں تو پھر انھیں اسی طرح ماننا چاہیے جیسی کہ وہ ہے۔ اس میں بحیرہ کی تعلیم کا کوئی ذکر نہیں ہے اور کسی فکرِ سلیم کے مالک شخص کے لیے یہ بات قرینِ قیاس بھی نہیں کہ دس بارہ سال کا بچہ چند گھنٹوں میں تمام اسرار ورموزِ مذہب سیکھ پائے۔

اگر بالفرض آپ ﷺ بحیرہ کے تعلیم یافتہ ہوتے تو آپ ﷺ نے توحیدِ خالص کی دعوت کیوں دی؟ نظریۂ تثلیث وصلیب کا پرزور رد کیوں کیا؟ اور اگر نظریۂ توحید اور ردِّ تثلیث وصلیب اسی راہب نے سکھلایا تھا تو آج عیسائی اپنے اس بزرگ کی تعلیم کو قبول کیوں نہیں کر لیتے؟[1]

کسی نے سچ ہی کہا ہے ع

دروغ گو را حافظہ نباشد

---

[1] رحمة للعالمين (١/ ٤٢) سيرت النبی ﷺ (١/ ١٧٩) متن وحاشيه السيرة النبوية على مياں ندوي (ص: ٧٦ حاشيه)

داستانِ بحیرہ کی علمی تحقیق

سفرِ شام کے دوران میں بحیرہ راہب کی نبیِ اکرم ﷺ سے ملاقات، جس کی بعض تفصیلات اور ان پر عیسائی برگ وبار کا ذکر ہو چکا ہے، کی یہ داستان جتنی مشہور ہو چکی ہے اتنی صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اہلِ تحقیق علماء نے اسے کئی وجوہات اور دلائل کی روشنی میں غیر معتبر قرار دیا ہے۔

أوّلاً: اس روایت کے جتنے بھی طرق یا سندیں ہیں، وہ سب مرسل ہیں۔ یعنی راویِ اوّل اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے وقت خود تو وہاں موجود نہیں تھے اور اس راوی کا نام نہیں لیتے جو شریکِ واقعہ ہے۔

ثانیاً: اس روایت کا سب سے مستند طریق ترمذی شریف والا ہے اور اس میں بھی کئی باتیں محلِ نظر ہیں:

پہلی بات: یہ کہ خود امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب قرار دیا ہے جبکہ حسن کا درجہ صحیح سے کم اور غریب کا کم تر ہوتا ہے۔

دوسری بات: یہ کہ اس روایت کے راوی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں جن کے بارے میں مورّخِ اسلام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البداية والنهاية" (٢/ ٢٨٥) اور "السيرة النّبوية" (١/ ٢٧٤ حلبی بحواله فقه السيرة، ص: ٦٩) میں صراحت کی ہے کہ وہ ۷ھ میں فتحِ خیبر کے سال اسلام لائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقوع کے وقت وہ خود موجود نہیں تھے۔ پھر انھوں نے کسی عینی شاہد کا حوالہ دیا ہے اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ یہ بات میں نے خود نبی ﷺ سے سنی ہے۔

تیسری بات: یہ کہ سند میں ایک راوی عبد اللہ بن غزوان ہیں جن کو بعض حضرات نے ثقہ قرار دیا ہے۔ مگر اکثر اہلِ فن نے اس کی نسبت عدمِ اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں کہا ہے کہ وہ منکر حدیث بھی بیان کر دیا کرتے تھے اور ان میں سے سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرہ کا واقعہ مذکور ہے۔

چوتھی بات: یہ کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں اس روایت کو بخاری ومسلم کی شرائط کے مطابق قرار دیا تو علامہ ذہبی نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے "تلخيص المستدرك" میں لکھا ہے کہ "میں اس روایت کے بعض واقعات کو موضوع اور بعض کو من گھڑت اور باطل سمجھتا ہوں۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ، جو صحیح بخاری کے شارح ہیں، انھوں نے ''تہذیب التہذیب'' میں انہی عبد اللہ کے بارے میں اس قدر صراحت کی ہے کہ وہ کبھی کبھی خطا کر جایا کرتے تھے، لہٰذا ان کی طرف سے اس روایت (یا اس کے بعض واقعات) کی صحت میں شبہہ ہوسکتا ہے۔[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے شاگردِ رشید علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی مشہورِ عالم کتاب ''زاد المعاد'' (۱/ ۷۱) میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ترمذی والی روایت کے آخر میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ بحیرہ کے اصرار پر جب ابو طالب نبی ﷺ کو واپس بھیجنے لگے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ (ﷺ) کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بھی (برائے خدمت) بھیج دیا، جب کہ یہ بات بالکل غلط ہے، کیوں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے عمر میں اتنے چھوٹے تھے کہ شاید اس واقعہ کے وقت وہ ابھی پیدا بھی نہ ہوئے ہوں اور اگر پیدا ہو چکے تھے تو کم از کم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس نہ تھے۔''

اس بات کی مزید وضاحت علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے جزری سے نقل کرتے ہوئے کی ہے۔ علامہ موصوف ''تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي'' (۱۰/ ۹۳) میں لکھتے ہیں:

''جب نبیِ اکرم ﷺ کی عمر بارہ سال تھی، تو اس وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہم کی عمر دس سال ہوگی۔ کیوں کہ وہ آپ ﷺ سے دو سال کم عمر تھے۔''

یہ اس وقت ہے جب آپ ﷺ کی عمر بارہ سال سمجھی جائے۔ اور جب طبری [۱/ ۵۹، اردو] وغیرہ کے بیان کے مطابق آپ ﷺ کی عمر نو سال تسلیم کی جائے [جسے علی میاں ندوی نے اپنی کتاب ''السيرة النبوية'' میں زیادہ صحیح قرار دیا ہے] تو اس صورت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی عمر صرف سات سال ہوگی۔ اور ان ہر دو شکلوں میں ان کا تجارت کے لیے اہل ہونا قرینِ قیاس نہیں ہے۔ اس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ اتنے کم سن تھے کہ شاید اس واقعہ کے وقت وہ وجود میں بھی نہ آئے ہوں۔ لہٰذا اس روایت میں حضرت ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما کا ذکر غیر محفوظ بلکہ مجرد وہم ہے۔

---

[1] سیرت النبی۔ شبلی (۱/ ۱۸۰۔۱۸۱)

علامہ قسطلانی نے ''الموھب اللدنیہ'' میں اور علامہ زرقانی نے ''شرح المواھب'' میں نقل کیا ہے:

''امام ذہبی رحمہ اللہ نے ابوبکر و بلال رضی اللہ عنہما کے ذکر کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور بقول یعمری حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس واقعہ کے کم وبیش ۳۰ سال بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچے تھے۔''

علامہ قاضی منصور پوری رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے کہ قرآنی آیت:

﴿وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [البقرة: ۸۹]

''اور پہلے (یہود) کافروں پر فتح مانگتے تھے۔''

سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی نبیِ موعود کے انتظار میں رہتے تھے اور آپ ﷺ کی بعثت تک ان کا یہ عقیدہ رہا کہ آپ ﷺ کی بعثت سے ہی مشرکین پر فتح ونصرت حاصل ہوگی۔ لہٰذا خود بحیرہ کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ کو واپس بھیج دو، ورنہ یہودی قتل کر دیں گے، بالکل جھوٹ ہے کیوں کہ یہودی اگر آپ ﷺ کو اس لڑکپن میں پہچان لیتے تو اپنے اعتقاد کے مطابق اپنی فتح ونصرت کا دیوتا سمجھ کر نہایت خدمت گزاری کرتے۔[1]

یہ قصہ بقول حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ''البداية والنهاية'' (۲/ ۲۸۵) مرسلاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہے اور اس کے علاوہ اس روایت (قصہ) میں تناقضات بھی عجیب اور بکثرت ہیں۔ مثلاً:

1. امام زہری رحمہ اللہ نے اس راہب کو یہود تیماء میں سے قرار دیا ہے، جبکہ مسعودی نے مروج الذہب میں بنی عبدالقیس کا عیسائی لکھا ہے۔
2. کہیں اس راہب کا نام سرجس ہے، کسی روایت میں جرجس ہے، کسی میں جرجیس اور کسی میں نام ہی نہیں ہے۔
3. کسی روایت میں مذکور ہے کہ راہب عبادت گاہ سے باہر آ گیا اور دعوت دی۔ اور کسی میں ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے صومعہ میں گئے۔

[1] رحمة للعالمين ﷺ (۱/ ٤٢)

4 کسی روایت میں مذکور ہے کہ راہب نے ابو طالب کو یہودیوں سے ڈرایا اور کسی میں ہے کہ رومیوں (نصاریٰ) سے ڈرایا۔

5 کہیں سات رومیوں ذکر ہے اور کہیں نو یا کم وبیش کا۔

6 کسی مؤرخ وسیرت نگار نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ تب پیش آیا جبکہ آپ ﷺ ابو طالب کے ساتھ سفر پر تھے اور بعض نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں گئے تھے، وغیرہ۔[1]

انہی امور کے پیشِ نظر یہ داستان نا قابلِ اعتبار ہے اور دورِ حاضر کے علماء ومحققین میں سے شیخ محمد غزالی مصری، علامہ قاضی سلیمان منصور پوری اور علامہ شبلی نعمانی نے ترمذی وغیرہ میں مذکور اس داستانِ بحیرہ کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ ابن سعد کی روایت بھی مرسل یا معضل وضعیف ہے۔[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے (ماسواذکر ابو بکر وبلال رضی اللہ عنہما) اس روایتِ ترمذی کو صحیح قرار دیا ہے۔[3] امام جزری اور شیخ البانی نے بھی اسی طرح اسے صحیح کہا ہے اور بزار کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس روایت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بجائے ''کسی آدمی'' کا ذکر ہے۔[4]

حرب الفجار میں شمولیّت

ظہورِ اسلام تک عربوں میں لڑائیوں کا جو طویل سلسلہ چلا آرہا تھا، ان میں سے چار لڑائیاں حروبِ فِجار کے نام سے مشہور ہیں۔ اور یہ چاروں لڑائیاں حرمت والے مہینوں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب میں سے کسی نہ کسی ماہ میں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ ان چاروں مہینوں میں چوری، ڈاکا، قتل وغارت اور جنگ وجدال کو اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں بھی اچھا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ وہ ان امور کو فجور وگناہ سمجھتے تھے۔ چونکہ یہ چاروں لڑائیاں ہی انہی حرمت والے مہینوں میں واقع ہوئیں تو ان کا نام ہی ''حروبِ فجار'' رکھ دیا گیا۔

---

[1] قاله عبد الرحمان الوكيل، حاشية الروض الأنف (٢/ ٢٢٦ـ ٢٢٧)

[2] فقه السيرة (ص: ٦٩) رحمة للعالمين (١/ ٤٢) سيرت النبى ﷺ للشبلي (١/ ١٨٠ـ ١٨١)

[3] سیرت النبی ﷺ (۱۸۱/۱)

[4] فقه السيرة، محمد الغزالي، تعليق الألباني (ص: ٦٨)

معروف مورخ مسعودی نے ان چاروں حروبِ فجار کے الگ الگ نام اور ہر لڑائی میں فریقین بھی ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے پہلی لڑائی کا نام ''فجار الرجل'' یا ''فجار بدر بن معشر''، دوسری کا نام ''فجار القرد'' تھا۔ یہ دونوں لڑائیاں بنی کنانہ اور ھوازن کے مابین ہوئیں۔ تیسری لڑائی کا نام ''فجار المرأۃ'' تھا جو قریش اور ھوازن کے درمیان لڑی گئی۔ جبکہ چوتھی لڑائی کا نام ''فجار البرّاض'' تھا۔ یہ لڑائی ذوالقعدہ میں ہوئی تھی۔ اس میں ایک طرف قریش و کنانہ اور دوسری طرف ہوازن و بنی قیس تھے۔

چوتھی و آخری حربِ فجار کے وقت نبیِ اکرم ﷺ کی عمرِ شریف بیس سال اور بعض مورخین کے بقول پندرہ سال ہو چکی تھی۔ آپ ﷺ بھی اس لڑائی میں شریک ہوئے تھے۔ قریش کے تمام خاندانوں نے اس معرکے میں اپنی الگ الگ فوجیں تیار کی تھیں اور ان سب دستوں کا مشترکہ کمانڈر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا والد اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دادا حرب بن امیہ تھا۔ وہ عمر میں سب سے بڑا اور اپنے قبیلے کا تجربہ کار اور معزز شخص تھا۔ آل ہاشم کے علمبردار نبی اقدس ﷺ کے چچا زبیر تھے اور اسی صف میں نبی ﷺ خود بھی شریک تھے۔ بڑے زور کا معرکہ ہوا۔ دن کے آغاز میں تو ہوازن و بنی قیس کا پلّہ بھاری رہا، مگر دوپہر کے بعد کنانہ و قریش کو غلبہ حاصل ہو گیا اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہوا۔ اس جنگ میں چونکہ قریش حق پر تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا، اس لیے نبیِ اکرم ﷺ نے بھی شرکت فرمائی اور اپنے چچاؤں کا دشمن کے نیزوں سے دفاع کرتے رہے۔ مگر خود آپ ﷺ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بلکہ امام سہیلی نے تو ''الروض الأنف'' میں یہاں تک لکھا ہے:

''وَاِنَّمَا لَمْ يُقَاتِلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَعَ أَعْمَامِهٖ وَكَانَ يُنْبِلُ عَلَيْهِمْ وَقَدْ بَلَغَ سِنَّ الْقِتَالِ لِأَنَّهَا كَانَتْ حَرْبِ فِجَارٍ وَكَانُوْا أَيْضاً كُلُّهُمْ كُفَّارٌ وَلَمْ يَأْذَنِ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمُوْمِنٍ اَنْ يُقَاتِلَ اِلَّا لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا''

''رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچاؤں کے ساتھ مل کر حروبِ فجار میں بنفسِ نفیس جنگ نہیں کی حالانکہ آپ ﷺ عمرِ قتال و جنگ کو پہنچ چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لڑائی حرمت والے مہینوں میں ہو رہی تھی۔ جنگ و قتال میں بنفسِ نفیس شرکت نہ کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ فریقین ہی کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم اللہ تعالیٰ نے صرف اس لیے دیا،

تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اس کا بول بالا ہو۔''

اس لڑائی کے وقت آپ ﷺ کی عمر ایسی تھی کہ جس دور میں پیش آنے والے واقعات ہمیشہ یاد رہ سکتے ہیں، مگر اس شمولیت کے بارے میں خود نبی ﷺ سے کوئی معتد بہ حدیث نہیں ملتی، تاہم مؤرخین اور سیرت نگاروں میں آپ ﷺ کا شرکت کرنا معروف ہے۔[1]

حلف الفضول میں شرکت

آغازِ اسلام سے قبل عربوں میں ہونے والی لاتعداد اور مسلسل لڑائیوں نے بے شمار گھرانے برباد کر دیے تھے اور قتل و غارت گری ان کی ایک موروثی عادت بن چکی تھی۔ ان جگر خراش حالات کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کے دلوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی۔ جب یہ لوگ حربِ فجار سے واپس لوٹے تو قریش کے سرکردہ فرد اور نبی ﷺ کے چچا زبیر بن عبد المطلب کی تجویز پر بنی ہاشم، بنی زہرہ اور بنی تمیم وغیرہ عبد اللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے اور وہاں سب نے مل کر یہ معاہدہ کیا:

''ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں رہنے نہیں پائے گا۔''

اس معاہدے کا فوری محرک یہ ہوا کہ یمن کا ایک زبیدی شخص مالِ تجارت لے کر مکہ آیا تو عاص بن وائل سہمی نے اس سے وہ مال خرید لیا، مگر اس کی قیمت ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس زبیدی نے اپنے حلیفوں عبد الدار، مخزوم، جمح، سہم اور عدی سے مدد طلب کی مگر کوئی بھی اس کے لیے تیار نہ ہوا تو وہ جبل ابی قبیس پر چڑھ کر بآواز بلند ایسے شعر کہنے لگا جن میں اس نے اپنی داستانِ مظلومیّت کی خوب دہائی دی تو عمِ رسول ﷺ زبیر بن عبد المطلب اٹھے اور اس شخص کا سارا واقعہ معلوم کرنے کے بعد مختلف خاندانوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش شروع کر دی اور مل کر یہ معاہدہ کیا۔ پھر سب مل کر عاص سہمی کے پاس گئے اور اس سے زبردستی زبیدی کا حق دلوایا۔

یہ عاص سہمی وہی بدبخت و بدنصیب شخص ہے جس کا قصّہ قرآن پاک میں بھی ہے۔ سورت

---

[1] الروض الأنف للسهيلي وتعليق الشيخ عبد الرحمن الوكيل (٢/ ٢٢٣۔ ٢٣٦) الفتح الرباني و بلوغ الأماني من أسرار الفتح الرباني (٢٠/ ١٩٧) ابن هشام (١/ ٧٠۔ ١٦٨) البداية والنهاية (٢/ ٩٠۔ ٢٨٩) سيرت النبى ﷺ للشبلي (١/ ١٨١۔ ١٨٢)

مریم کی چند آیات اسی کے بارے میں نازل ہوئیں جو یہ ہیں:

﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴾ [مریم: ۷۷۔ ۸۰]

''کیا پس آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات ماننے سے انکار کردیا اور کہا: میں تو (آخرت میں بھی) مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا۔ کیا وہ غیب پر مطلع ہوگیا ہے؟ یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد (واقرار) لے رکھا ہے؟ ہرگز نہیں (بلکہ) جو کچھ وہ کہتا ہے ہم اسے لکھ لیتے ہیں، اور اس کے لیے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے اور جو کچھ وہ کہتا ہے ہم اس کے وارث رہ جائیں گے اور وہ تنہا ہمارے پاس آئے گا۔''

یہی معاہدہ یا حلف نامہ تاریخِ اسلام میں ''حلف الفضول'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کا نام حلف الفضول ہونے کی وجہ یہ تھی کہ پہلے پہل اس معاہدے کا خیال جن لوگوں کو آیا، ان کے نام میں فضیلت کا مادہ فضل (ف،ض، ل) پایا جاتا تھا۔ مثلاً: فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ، اور مفضل وفضل وغیرہ۔ اس مادے کی جمع فضول بنتی ہے، لہٰذا یہ معاہدہ ہی حلف الفضول کے نام سے مشہور ہوگیا۔ ہمارے نبیِ مکرّم ﷺ بھی اس معاہدۂ خیر میں شریک ہوئے تھے اور عہدِ نبوت میں آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

«لَقَدْ شَهِدْتُّ مَعَ عُمُوْمَتِيْ حَلْفاً فِيْ دَارِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَدْعَانَ، مَا اُحِبُّ اَنَّ لِيْ بِهٖ حُمُرَ النَّعَمِ وَلَوْ دُعِيْتُ بِهٖ فِي الْاِسْلَامِ لَاَجَبْتُ»[1]

''میں نے اپنے چچوں کے ساتھ عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں طے پانے والے معاہدے میں شرکت کی تھی۔ اس معاہدے کے مقابلے میں اگر کوئی مجھے سرخ اونٹ بھی

[1] سیرت ابن هشام (۱/ ۹۲) وقال الشيخ الألباني في تعليقه على فقه السيرة (ص: ٥٧): هذا سند صحيح لولا أنه مرسل. ولكن له شواهد تقويه، كما في البداية والنهاية لابن كثير (۲/ ۲۹۱) وما رواه الحميدي مرسلًا أيضاً و مسند أحمد (١٦٥٥۔ ١٦٧٦) من حديث عبد الرحمن بن عوف مرفوعاً دون قوله (وَلَوْدُعِيْتُ بِهٖ فِيْ الْاِسْلَامِ لَاَجَبْتُ) وسنده صحيح.

دیتا تو میں ہرگز قبول نہ کرتا اور آج عہدِ اسلام میں بھی اگر مجھے کوئی کسی ایسے معاہدے کے لیے بلائے تو میں حاضر ہوں۔''

نبیِ اکرم ﷺ کے ان کلمات میں اس معاہدے کی کس طرح ستایش کی گئی ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ معاہدہ اگرچہ ظہورِ اسلام سے قبل طے پایا تھا، مگر ظالم چاہے کتنا ہی صاحبِ اثر و نفوذ کیوں نہ ہو، اس کا ہاتھ روکنا اور مظلوم چاہے کتنا ادنیٰ وفقیر ہی کیوں نہ ہو، اس کی مدد کرنا عین روحِ اسلام ہے۔ فساد وشر اور بغاوت کی بیخ کنی و سرکوبی کرنا اسلام کا طرّۂ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ زمانۂ نبوت میں بھی اس معاہدے کو بڑے اچھے الفاظ میں یاد کیا کرتے تھے۔[1]

مالِ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تجارت

حرب الفجار کے خاتمے اور حلف الفضول کے آغاز کے ساتھ ہی نبیِ اکرم ﷺ اپنے بچپن ولڑکپن کی دونوں منزلیں طے کر کے حیاتِ طیّبہ کے تیسرے مرحلے یا عہدِ شباب میں داخل ہو گئے۔ اہلِ عرب، خصوصاً قریش چونکہ ظہورِ اسلام سے قبل بھی تجارت پیشہ تھے اور نبیِ اکرم ﷺ کے جدِ اعلیٰ ہاشم بن عبد مناف نے قبائلِ عرب سے مختلف تجارتی معاہدوں کے ذریعے اپنے اس خاندانی طریقۂ اکتساب کو خوب مستحکم اور باوقار بنالیا ہوا تھا۔ نبیِ اکرم ﷺ کے چچا ابو طالب خود بھی تاجر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ شباب کو پہنچتے ہی جب نبی اکرم ﷺ کو فکرِ معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

آپ ﷺ بچپن میں بھی اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ بعض تجارتی سفر کر چکے تھے، جن کے نتیجے میں آپ ﷺ کو تجارتی کاروبار اور لین دین کے معاملات میں کافی مہارت وتجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ دورانِ تجارت نبی اقدس ﷺ کے حسنِ معاملہ اور امانتداری وصداقت کی شہرت بھی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ آپ ﷺ کے شرکاءِ تجارت کی کئی شہادتیں کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ وسیرت میں مذکور ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کس دیانت داری اور راست بازی کے ساتھ اس پیشے کو سرانجام

---

[1] فقه السيرة (ص ٧٤ تا ٧٦) الرحيق المختوم (ص: ٦٨) البداية والنهاية (٢/ ٩٣۔ ٩٢۔ ٢٩١) الفتح الرباني وبلوغ الأماني (٢٠/ ١٩٧١) سیرت النبی ﷺ (١/ ٢٨٢۔ ٢٨٣)

دیتے تھے۔ ابو داود میں ہے کہ حضرت سائب رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہو کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے آپ ﷺ کے سامنے ان کی اچھے الفاظ میں تعریف بیان کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں انھیں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔''

حضرت سائب رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ (ﷺ) پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ آپ (ﷺ) میرے شریکِ تجارت تھے۔ لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔'' ﴿لَاتَدَارِیُ وَلَا تُمَارِیُ﴾[1]

ایسے ہی ایک صحابی حضرت قیس بن سائب مخزومی رضی اللہ عنہ نے بھی انہی الفاظ میں آپ ﷺ کے حسنِ معاملہ کی شہادت دی ہے۔[2]

تجارت کی غرض سے شام، بُصریٰ اور یمن وغیرہ کے متعدد سفر آپ ﷺ نے کیے تھے۔ اس وقت ایک معزز خاتون حضرت خدیجۃ الکبری بنت خویلد رضی اللہ عنہا تھیں۔ معروف مؤرخِ اسلام ابن الاثیر نے ''الكامل في التاريخ'' میں لکھا ہے:

''وہ بہت بڑی تاجر، شریف النفس اور صاحبۂ ثروت تھیں، اور دوسرے لوگوں کو اپنا مال دے کر تجارت کے لیے بھیجا کرتی تھیں۔''[3]

ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں نبیِ اکرم ﷺ کے خاندان سے جاملتا ہے۔ وہ بیوہ تھیں۔ شرافتِ نفس، پاکیزگیِ اخلاق اور عفت وعصمت کی وجہ سے زمانۂ جاہلیّت میں بھی لوگ انھیں ''طاہرہ'' کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ ان کی دولت مندی کا یہ عالم تھا کہ طبقات ابنِ سعد میں لکھا ہے:

''جب اہلِ مکہ کا کوئی قافلہ تجارت کے لیے روانہ ہوتا تو اکیلی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سامانِ تجارت تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔''

جب نبی ﷺ کے حسنِ معاملہ، راست بازی، صدق وامانت اور پاکیزہ اخلاق کی خبر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو پہنچی تو انھوں نے پیغام بھیجا کہ آپ (ﷺ) میرا مالِ تجارت لے کر شام جائیں، اور جو معاوضہ میں دوسروں کو دیتی ہوں آپ (ﷺ) کو اس سے دوگنا دوں گی۔ دورانِ سفر آپ (ﷺ) کی

---

[1] سنن أبي داود (٢/ ٣١٧) الأحاديث المختارة للضياء المقدسي (٣٦٩)

[2] الاصابة (٥/ ٢٥٣)

[3] فقه السيرة (ص: ٧٨)

خدمت کے لیے اپنا غلام میسرہ بھی ساتھ بھیج دوں گی۔ نبیِ اکرم ﷺ نے ان کی اس پیش کش کو قبول کر لیا اور سفرِ شام کے لیے تیار ہو گئے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی

نبیِ رحمت ﷺ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مالِ تجارت لے کر شام گئے تو توفیقِ الٰہی سے پہلے کے اُن تمام تجارتی سفروں کی نسبت، جو آپ ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ کیا کرتے تھے، اس سفر میں بہت ہی زیادہ منافع ہوا۔

اس سفر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ بھی ساتھ تھا، اس نے آپ ﷺ کی تمام خوبیوں، بزرگیوں اور صفاتِ حمیدہ کا ذکر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کیا جو اس نے دورانِ سفر خود دیکھی تھیں۔ یہ تمام امور ان کے لیے باعثِ مسرت واطمینان تھے، کیوں کہ ان کے بیوہ ہونے کی وجہ سے کئی بڑے بڑے قریشی سردار انھیں پیغامِ نکاح دے چکے تھے جنھیں وہ رد کر چکی تھیں۔ ان کے فہم وفراست کا یہ عالم تھا کہ ان سردارانِ قریش کے پیغامات سے یہ بھانپ گئیں کہ یہ لوگ مال وجمال کے بھوکے ہیں، لیکن جب وہ نبیِ اکرم ﷺ جیسے نوجوان سے متعارف ہوئیں تو آپ ﷺ کو ان لوگوں سے مختلف ایک متوکّل وقانع شخص پایا۔ شیخ محمد غزالی "فقه السيرة" میں لکھتے ہیں:

"جب مالِ تجارت کا حساب وکتاب ہونے لگتا تھا تو دوسرے لوگ شاید لالچ اور دھوکا کر جاتے ہوں گے، لیکن نبی ﷺ کا حساب دیتے وقت یہ عالَم تھا کہ نہ مال کی غرض، نہ جمال کی حرص بلکہ اپنا فرض ادا کیا اور راضی بر ضا چل دیے۔ یہ بات "طاہرہ" کو بھا گئی۔ وہ اسی گمشدہ دولت کی متلاشی تھیں۔ انھوں نے اپنے دل کی بات اپنی ایک سہیلی نفیسہ بنت منبّہ سے کہی تو وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پیغامِ نکاح لے کر نبیِ اکرم ﷺ کے پاس گئیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں تاریخ وسیرت کی کتابوں میں متعدد متناقض روایات ملتی ہیں، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد زندہ تھے اور

[1] فقه السيرة (ص: ٧٨) طبقات ابن سعد اردو (ص: ٦١) رحمة للعالمين (١/ ٤٢) سيرت النبی ﷺ للشبلي (١/ ٧٨ـ ٨٨)

انھیں شراب کے نشے میں مخمور کر کے اس شادی کا اقرار لیا گیا، کیوں کہ وہ شادی کے خلاف تھا اور ہوش میں آتے ہی اس نے پھر انکار کرنا چاہا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عار دلائی وغیرہ۔ یہ روایت نہ صرف کتبِ تاریخ وسیرت بلکہ مسند احمد (الفتح الربانی: ۲۰/ ۱۹۷۔ ۱۹۸) میں اور طبرانی میں بھی موجود ہے۔ امام ہیثمی نے کہا ہے کہ اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ لیکن امام طبری نے واقدی کے حوالے سے اس روایت کو غلط وغیر صحیح قرار دیا ہے۔[1]

غرض ان روایات میں سے صحیح ترین روایت وہی ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ ہے۔ اس کے مطابق نبیِ اکرم ﷺ نے پیغامِ نکاح کی بات اپنے چچوں سے کی، تو ان میں سے ابو طالب اور سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ تاریخِ نکاح کے تعین کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا عمرو بن اسد کے پاس گئے، کیوں کہ بقولِ امام سہیلی، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے والد حربِ فجار سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔[2]

جب سفرِ شام سے واپسی کو تقریباً تین ماہ اور بالتحدید دو ماہ اور چوبیس دن ہو گئے[3] تو تاریخِ معین پر ابو طالب، امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اور تمام روسائے خاندان حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر آئے اور پانچ سو طلائی درہم مہر کے عوض آپ ﷺ کا نکاح ہوا۔ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے بوقتِ نکاح خطبہ دیتے ہوئے کہا:

"اِنَّ مُحَمَّداً لَا یُوْزَن بِہٖ فَتیً مِنْ قُرَیْشٍ اِلَّا رَجَّحَ بِہٖ شَرَفاً وَنُبْلًا وَعَقْلًا وَاِنْ کَانَ فِیْ الْمَالِ قِلًّا، فَاِنَّ الْمَالَ ظِلٌّ زَائِلٌ وَعَارِیَۃٌ مُسْتَرْجِعَۃٌ، وَلَہٗ فِیْ خَدِیْجَۃَ بُنَتِ خُوَیْلَدٍ رَغْبَۃٌ وَلَھَا فِیْہِ مِثْلُ ذٰلِکَ"[4]

"محمد (ﷺ) کا قریش کے کسی بھی جوان کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو شرافت وذہانت

[1] تاریخ الطبری (۱/ ٦٢، ٦٣) اردو.

[2] الروض الأنف (۲/ ۲۳۸۔ ۲٤۰) تحقیق عبد الرحمن الوکیل، مصر.

[3] بلوغ الأماني من أسرار الفتح الرباني (۲۰/ ۱۹۷) نقلًا عن بهجة المحافل للإمام عماد الدين يحيىٰ بن أبي بكر العامري

[4] فقه السيرة (ص: ۷۹)

اور فضیلت و عقل کے اعتبار سے آپ ﷺ کا پلّہ ہی بھاری ہے۔ آپ ﷺ اگر چہ مادی اعتبار سے قلیل المال ہیں، لیکن مال کی حقیقت تو کچھ نہیں، یہ تو ڈھلتا سایہ اور شے مستعار ہے۔ آپ ﷺ خدیجہ بنت خویلد (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کی رغبت رکھتے ہیں اور خود خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کی رغبت بھی آپ ﷺ سے نکاح کرنے کی ہے۔''

اس خطبے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا عَمرو بن اسد نے اپنی بھتیجی کا نکاح نبی ﷺ سے کر دیا۔ اس نکاح کے وقت آپ ﷺ کی عمرِ مبارک پچیس سال اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔[1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پہلا اور دوسرا نکاح

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا تھا۔ اس سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کے فوت ہو جانے کے بعد انھوں نے ابو ہالہ ہند بن نباس تمیمی سے نکاح کیا، جس سے ان کے تین لڑکے تھے اور یہ تینوں ہی شرفِ صحابیت سے نوازے گئے پہلے بیٹے ہالہ تھے جن کا ذکر بخاری شریف میں یوں آیا ہے کہ جب وہ نبی ﷺ کے گھر آئے اور دروازے پر آنے کی طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰھُمَّ ھَالَۃ» ''اے اللہ، ہالہ آیا ہے۔'' یہ اظہارِ مسرت کا ایک انداز ہے۔

دوسرے بیٹے طاہر تھے جنھیں آپ ﷺ نے چوتھائی یمن کا حاکم مقرر فرمایا۔ وفاتِ نبوی ﷺ کے بعد تک وہ اس عہدے پر برقرار رہے اور عہدِ صدیقی میں جب فتنۂ ارتداد نے سر اٹھایا تو انھوں نے مرتدوں کے ساتھ جنگ کی اور فتح پائی۔ تیسرے بیٹے ہند تھے جو پروردۂ رسول ﷺ تھے۔ یہ جنگِ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور شہید ہوئے۔ انھیں وصّاف النبی ﷺ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، کیوں کہ یہ آپ ﷺ کا حلیۂ مبارک نہایت خوبی اور صحت کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے عتیق سے بھی ایک لڑکا عبد مناف اور لڑکی ہند ذکر کیے ہیں۔[2]

---

[1] سیرت ابن ھشام (١/ ٧٤۔ ١٧١) البدایة والنھایة (٢/ ٩٤۔ ٢٩٣) رحمة للعالمین (١/ ٤٤، ٤٣) سیرت النبی ﷺ للشبلي (١/ ١٨٧۔ ١٨٨)

[2] رحمة للعالمین (٢/ ١٤٤ تا ١٤٧)

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے اولادِ رسول ﷺ اور نظریۂ مختارِ کل

حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نبیِ رحمت ﷺ کی پہلی بیوی تھیں اور پچیس سال تک آپ ﷺ کی زوجیّت میں رہیں۔ وہ جب تک زندہ رہیں، آپ ﷺ نے دوسری کوئی شادی نہیں کی۔ فرزندِ رسول ﷺ ابراہیم رضی اللہ عنہ کے سوا، جو حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ طاہر سے تھے، باقی تمام اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے شکمِ طاہر سے تھی۔

نبی ﷺ کے پہلے بیٹے قاسم تھے اور انہی کے نام سے آپ ﷺ کی کنیت ابوالقاسم معروف ہوئی۔ یہ جگر گوشۂ رسول ﷺ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حضرت زینب، رقیہ، ام کلثوم، فاطمۃ الزہراء اور عبداللہ رضی اللہ عنہم عطا فرمائے۔ یہ دوسرے بیٹے عبد اللہ عہدِ نبوت میں پیدا ہوئے، انہی کا لقب طیب اور طاہر معروف ہوا۔

یہ عبد اللہ اور ابراہیم بھی دونوں ہی بچپن میں وفات پا گئے۔ البتہ آپ ﷺ کی سب بیٹیاں اسلام لائیں اور سب نے ہجرت کی، مگر حضرت فاطمۃ الزاہراء رضی اللہ عنہا کے سواسب آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں وفات پا گئیں۔[1] حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال بھی نبی ﷺ کی وفات کے صرف چھے ماہ بعد ہی ہو گیا۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے:

«وَعَاشَتْ بَعْدَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ سِتَّةَ أَشْهُرٍ»[2]

”اور وہ (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) رسول اللہ ﷺ کے (فوت ہو جانے کے) بعد صرف چھے ماہ زندہ رہیں۔“

جب نبی ﷺ کے نورِ نظر عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو کفار و مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ آپ (ﷺ) کی کوئی نرینۂ اولاد باقی نہیں رہی، لہٰذا اب دنیا میں ان کا نام لینے والا کوئی نہیں رہا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تیسویں پارے کی سورۃ کوثر نازل فرمائی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] زاد المعاد (١/ ٢٦) طبع قديم، ابنِ هشام (١/ ١٧٤۔ ١٧٥) الروض الأنف (٢/ ٢٣٢۔ ٢٤٣) فقه السيرة (ص: ٨٠)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥٩۔ ٥٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾

''(اے پیغمبر) ہم نے تجھ کو کوثر دیا۔ تو (اس کے شکر میں) اپنے مالک کے لیے قربانی کر۔ بے شک تیرا دشمن (عاص بن وائل یا کعب بن اشرف یا ابوجہل) وہی نگوڑا ناٹھا ہے۔''

اس کے برعکس نبیِ مکرّم ﷺ کا ذکرِ خیر قیامت تک اذان و اقامت اور نماز و درود شریف میں ایک عالم کی زبانوں پر جاری اور دلوں پر حاوی رہے گا۔ اولاد پر فخر کرنے والے کیا جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تو تورات میں بشارت دے رکھی تھی کہ ہم اپنے نبی کا نام بلند کریں گے، جیسا کہ تورات میں ایک جگہ فرمایا:

''میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا۔ پس سارے لوگ ابد الآباد تک تیری ستایش کریں گے۔'' (۴۵۔۱۷)

دوسری جگہ فرمایا:

''اس کا نام ابد تک باقی رہے گا۔ لوگ اس کے باعث اپنے آپ کو مبارک کہیں گے اور ساری قومیں اسے مبارک باد دیں گی۔'' (۷۲۔۱۷)

ایک مقام پر فرمایا:

''اس کے حق میں سدا دُعا ہوگی اور ہر روز اسے مبارک باد کہی جائے گی۔'' (۷۲۔۱۵)[1]

جب نبیِ اکرم ﷺ کے بیٹے ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہونے لگے تو آپ ﷺ نے اپنے دم توڑتے لختِ جگر کو گود میں اٹھایا اور فرمایا:

«يَا اِبْرَاهِيْمُ لَا نُغْنِيْ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا»

''اے ابراہیم! حکمِ الٰہی کے سامنے ہم تیرے کسی کام نہیں آ سکتے۔''

پھر ارشاد فرمایا:

«لَوْلَا اَنَّهٗ أَمْرُ حَقٍّ وَوَعْدُ صِدْقٍ وَاَنَّ آخِرَنَا سَيَلْحَقُ أَوَّلَنَا لَحَزِنَّا عَلَيْكَ

[1] رحمة للعالمين (٢/ ٩٦)

حُزْناً أَشَدَّ مِنْ هَذَا وَ اِنَّا بِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ، تَبْكِي الْعَيْنُ وَيَحْزُنُ الْقَلْبُ وَلَا نَقُوْلُ مَا يُسْخِطُ الرَّبَّ »

''ہم جانتے ہیں کہ موت تو امرِ حق اور وعدۂ صدق ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والے بھی پہلے چلے جانے والوں کے ساتھ جاملیں گے۔ اگر یہ حقیقت نہ ہوتی تو ہم فراقِ ابراہیم رضی اللہ عنہ کا غم اس سے بھی زیادہ کرتے۔ اور (موت کے یقینی ہونے کے باوجود) اے ابراہیم رضی اللہ عنہ! ہم تیرے فراق میں غمزدہ ہیں، آنکھوں میں آنسو اور دل میں غم ہے، مگر زبان سے ہم کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جو ہمارے رب کو ناپسند ہو۔''[1]

یہی بات کتبِ تاریخ وسیرت کے علاوہ صحیح بخاری شریف میں موجود ہے۔ بخاری شریف میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

« إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزُنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يُرْضِي رَبَّنَا، وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ »[2]

''آنکھیں اشکبار ہیں اور دل غمزدہ ہے۔ مگر زبان سے ہم وہی بات کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہو اور اسے راضی کر دے۔ اے ابراہیم! ہم تیرے فراق میں غمزدہ ہیں۔''

قارئینِ کرام! ان الفاظ میں منصب ومقامِ نبوت کی شان کا اندازہ کریں، دم توڑتے بچے کو گود میں اٹھایا تو توحیدِ باری تعالیٰ کی تعلیم کا زبردست نقطہ بیان فرمادیا: ''اے براہیم! حکمِ الٰہی کے سامنے ہم تیرے کسی کام نہیں آسکتے۔''

نبی ﷺ کے یہ الفاظ نہ صرف لمحۂ فکر یہ بلکہ تازیانۂ عبرت ہیں ہمارے ان بھائیوں کے لیے جو حبِ رسول ﷺ میں غلو سے کام لیتے ہوئے آپ ﷺ کو ''مختارِ کل'' شمار کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان الفاظ میں آپ ﷺ نے بتا دیا ہے کہ تمام اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور صرف وہی مختارِ کل ہے جس کے اختیارات لامحدود ہیں، اور بچے سے مخاطب ہو کر پوری امّت کو بتا دیا کہ ہمارے اختیارات کا عالم تو یہ ہے:

---

[1] رحمة للعالمين (٢/ ٩٧)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ١٧٢ـ ١٧٣)

«لَا نُغْنِیُ عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْئاً»

''حکمِ الٰہی کے سامنے ہم تیرے کسی کام نہیں آسکتے۔''

اگر آپ ﷺ ہمارے بنائے ہوئے تصورات کے مطابق ''مختارِ کل''ہی ہوتے تو کم از کم اپنے دم توڑتے بچے کی سانس ہی روک لیتے۔ اگر حکمِ الٰہی کے سامنے اپنے اس عجز و انکساری کے باوجود بھی آپ ﷺ مختارِ کل ہی ہیں تو ہمارے اس عقیدے کے حامل بھائی آپ ﷺ کے اِن الفاظ کا ترجمہ و تعبیر کیا کریں گے؟!

وفاتِ ابراہیم رضی اللہ عنہ پر سورج کو گرہن لگ جانا

قدیم عربوں کا عقیدہ تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کی وفات ہو تو چاند یا سورج کو گرہن لگ جاتا ہے۔ جب ابراہیم رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو اتفاق یہ ہوا کہ اسی دن سورج کو گرہن لگ گیا تو بعض مسلمانوں نے بھی اِسی بات کا اظہار کیا۔ جب یہ بات نبی ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آیَتَانِ مِنْ آیَاتِ اللّٰهِ لَا یَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَیَاتِهٖ، فَاِذَا رَأَیْتُمُوْهَا فَادْعُوا اللّٰهَ وَصَلُّوْا حَتّٰی تَنْكَشِفَ»

''بے شک چاند اور سورج اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں اور یہ کسی کی موت و حیات سے نہیں گہناتیں، جب تم انھیں اس حالت میں دیکھو تو دعا کرو اور نماز پڑھو، یہاں تک کہ گرہن کھل جائے۔''

صلاۃ الکسوف و صلاۃ الخسوف:

اس ارشادِ نبوی ﷺ کی رُو سے سورج یا چاند کے گرہن لگنے پر دو رکعت نماز ادا کرنا سنت ہے۔ اس نماز کو صلاۃ الکسوف یا صلاۃ الخسوف کہا جاتا ہے جنھیں ادا کرنے کا تفصیلی طریقہ مسائلِ نماز

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۰۴۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۱۱) عن المغیرة بن شعبة و النعمان بن بشیر و غیرهما.

سے متعلق ہماری کتاب ''فقہ الصلاۃ'' جو تین جلدوں میں چھپ چکی ہے، میں ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مزید توفیق دے۔ آمین ثم آمین

عقیدۂ ''مختارِ کل'' اور حضرت پیر جیلانی رحمہ اللہ کا نظریہ

بعض لوگ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کو بڑی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہر ماہ ایصالِ ثواب کے لیے ''گیارہویں'' بھی دیتے ہیں۔ انھیں نہ صرف پیر بلکہ ''پیرانِ پیر'' مانتے ہیں جو غلط العام ہے جبکہ صحیح ہے: ''پیرِ پیراں۔''

ان کی تعلیمات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک زندگی، موت، خوشی، غم سب کچھ صرف اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ دم مار سکے۔ اس کے سامنے ساری مخلوق ایک بے بس قیدی کی مانند ہے اور انبیاء علیہم السلام و اولیاء رحمہم اللہ بھی اسی کے فیصلے کے پابند ہیں۔

اس مسئلے میں قرآن وسنت کی نصوصِ قطعیہ سے صرفِ نظر بھی کر لیں تو شیخ جیلانی رحمہ اللہ کے عقیدتمندوں اور عام مسلمانوں کے لیے ان کی تعلیمات میں بھی کافی کچھ موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو ''مختارِ کل'' ماننے والے گوشِ ہوش سے سنیں۔ پیر موصوف اپنی کتاب ''فتوح الغیب'' کے مقالہ نمبر: ۱۷ میں لکھتے ہیں:

> ''ساری مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح سمجھو جس طرح ایک بادشاہ ہے جس کا ملک بہت بڑا اور وسیع ہے، جس کا حکم سخت اور دل ہلا دینے والا ہے۔ اس نے ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر، اسے ایک صنوبر کے درخت کے ساتھ ایک دریا کے کنارے لٹکا دیا ہے۔ جس دریا کی موجیں زبردست، پاٹ بہت بڑا، گہرائی زیادہ اور بہاؤ انتہائی زوروں پر ہے، اور خود بادشاہ ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ جس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے۔ اس بادشاہ کے پاس تیر وتلوار اور نیزہ وکمان وغیرہ ہتھیار اتنے ہیں کہ اس کا اندازہ اس بادشاہ کے سوا کسی کو نہیں۔ اب ان اشیاء میں سے جو چیز چاہتا ہے، اس قیدی کو اٹھا کر مار دیتا ہے۔ وہ قیدی چونکہ جکڑا ہوا

ہے اور اونچی جگہ پر ہے، اس لیے نہ وہ ہل سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اسے چھڑا سکتا ہے۔ جو لوگ اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھیں، اگر وہ اس قیدی سے ڈریں اور اس سے نفع ونقصان کی امیدیں رکھیں، اور اس بادشاہ سے نہ رکھیں تو ان کے لیے صدحیف وافسوس ہے۔ جو شخص ایسا کرے کیا وہ عقل کے قضیے میں بے عقل و بے ادراک، دیوانہ اور نوعِ انسانی سے خارج حیوان وچوپایہ نہیں ہے؟''

سورت یونس (آیت: ۱۰۷) کی تشریح کے دوران میں ہر قسم کے نفع ونقصان کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں محصور کرتے ہوئے ''فتوح الغیب'' (مقالہ نمبر: ۱۸) میں لکھتے ہیں:

''نفع ونقصان، عزت وذلت، بلندی وپستی، غریبی وامیری اور کسی چیز کو حرکت دینا یا ٹھہرانا کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ تمام اشیاء اللہ کی مخلوق ہیں اور اسی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ ان کا جاری ہونا یا چلنا اسی کے اذن وحکم سے ہے۔ ہر چیز ایک مقررہ مدت کے لیے جاری ہے اور اس کے یہاں ہر چیز ایک اندازے میں ہے، جسے وہ پیچھے کر دے، اُسے آگے کرنے والا کوئی نہیں، اور جسے وہ آگے کردے، اسے پیچھے کرنے والا کوئی نہیں۔ چنانچہ سورت یونس (آیت: ۱۰۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ﴾

''اگر اللہ تعالیٰ آپ کو تکلیف پہنچانا چاہے تو اسے اس کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں، اور اگر وہ آپ کو بھلائی پہنچانا چاہے تو اس کے فضل وکرم کو آپ سے روکنے والا کوئی نہیں۔''[1]

حضرت جیلانی رحمہ اللہ کی ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ ''مختارِ کل'' صرف اللہ تعالیٰ ہے دوسرا کوئی نہیں۔ کوئی نبی ہو یا ولی، پیر ہو یا امام، سب اسی کے فیصلے کے پابند ہیں۔ مذکورہ آیت کی تشریح کے طور پر تفسیر کبیر امام رازی رحمہ اللہ، تفسیر خازن اور تفسیر ابن کثیر میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔ ایسے ہی سورۃ الانعام (آیت: ۱۷) اور سورۃ الجن (آیت: ۲۱) میں بھی مذکور ہے:

﴿قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا﴾

---

[1] بحوالہ مرشد جیلانی رحمہ اللہ کے ارشاداتِ حقانی از مولانا محمد حنیف یزدانی، طبع لاہور

''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میں تمھارے نقصان یا نفع کا اختیار نہیں رکھتا۔''

یعنی رفعِ ضرر اور جلبِ منفعت نبی کے اختیار میں نہیں ہے، اور نہ ہی آپ دافع البلاء ہیں۔ حتیٰ کہ سورۃ الاعراف (آیت: ۱۸۸) میں تو واضح طور پر مذکور ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا﴾

''(اے پیغمبر!) کہہ دے میں اپنی ذات نفع نقصان (بھی) مالک نہیں۔''

یعنی خود نبی اپنی ذات کے لیے بھی نفع ونقصان کے مالک نہیں۔ اور جب انبیاء و رسل اور خاص کر امام الانبیاء ﷺ کے ''اختیارات'' کا یہ عالَم ہے تو پھر افسوس ہے ان لوگوں پر جو آپ ﷺ کو ''مختارِ کل'' مانتے ہیں اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ جہالت کی وجہ سے انبیاء ورسل علیہم السلام تو کُجا، وہ تو تمام اولیاء اللہ کو ''مختارِ کل'' کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں، حتیٰ کہ ایک اللہ کو ''مختارِ کل'' ماننے کی تعلیم دینے اور باقی تمام مخلوقات سے اس ''عہدۂ خاص'' کی نفی کرنے والے بزرگ جیلانی رحمہ اللہ کو بھی یہ ''عہدہ'' تھما دیا گیا ہے۔

ایک شرکیہ وظیفے کی حقیقت:

پیر عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کے عقیدت مندوں نے ایک ''وظیفہ'' ایجاد کر رکھا ہے:

''یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للّٰہ'' جو سراسر شرک ہے اور صفاتِ الٰہی کو اس کے بندوں میں ماننے کے جرم کا ارتکاب ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمہ اللہ کے شاگردِ رشید، ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی رحمہ اللہ کے بقول ''بیہقیِ وقت'' اور ان کے ہم سبق مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ کے بقول ''عَلَم الہدیٰ'' حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ ''ارشاد الطالبین'' (ص: ۹) میں لکھتے ہیں:

''جاہل لوگ جو یہ کہتے ہیں: ''یا شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ شیئاً للّٰہ۔'' ''یا خواجہ شمس الدین پانی پتی شیئاً للّٰہ'' یہ کہنا جائز نہیں، بلکہ شرک وکفر ہے۔''

ممتاز حنفی محدث وفقیہ ابو الحسنات مولانا عبد الحی لکھنوی اپنے ''فتاویٰ'' (۳۴/۲) میں لکھتے ہیں:

''یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للّٰہ'' جیسے وظیفے سے احتراز لازم وواجب ہے۔ کیوں کہ یہ

وظیفہ ''شیئاً للہ'' کے الفاظ پر مشتمل ہے۔ اورفقہاء میں سے بعض نے ایسے الفاظ پر کفر کا حکم لگایا ہے۔''

جبکہ شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی رحمہ اللہ کے شاگردِ رشید، عارف باللہ مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ کے خلیفۂ خاص اور خواجہ غلام محی الدین قصوری کے پیر ومرشد حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمہ اللہ، ''درّالمعارف'' (ص: ۵۴) میں لکھتے ہیں:

''ایک دن میں نے ''یا شیخ عبد القادر [جیلانی] شیئاً للہ'' کہا تو میرے کانوں میں غیب سے آواز آئی کہ (اس طرح نہیں) یوں کہا کرو: اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ شَیْئاً لِلّٰہِ۔''[1]

یہ ہے اس وظیفے کی اصل حقیقت، جسے بریلوی مکتبِ فکر کے لوگ دینی ودنیوی امور، کشائشِ رزق، قیدیوں کی رہائی، حلِّ مشکلات، دفعِ بلیّات اور قضائے حاجات کے لیے بڑے جوش و جذبے اور تکرار سے پڑھتے ہیں۔

اندازہ فرمائیں کہ جس کا پڑھنا کفر وشرک ہو، جو جعل سازی کا پلندہ اور ایجادِ بندہ ہو، اس سے کیا قضائے حاجت ہوگی؟ اور جسے خلفاء وصحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین و ائمہ اربعہ، محدّثین وفقہاء اور صوفیہ رحمہم اللہ میں سے کسی نے نہ پڑھا ہو، نہ پڑھنے کی تعلیم دی ہو تو اس میں بھلا خیر کہاں سے آئے گی؟!

اولادِ رسول ﷺ کے بارے میں ایک غلط فہمی:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ طاہر سے نبی ﷺ کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ جبکہ ایک بیٹا حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے شکم سے تھا۔ اس طرح آپ ﷺ کے کل تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں، مگر اولادِ رسول ﷺ کے سلسلے میں بعض اہلِ سنت اور اکثر شیعہ سیرت نگاروں میں ایک عجیب قسم کا ''اختلافی اتحاد'' پایا جاتا ہے کہ بعض اہلِ سنت سیرت نگاروں نے نبی اکرم ﷺ کے تین کے بجائے پانچ بیٹے شمار کر دیے ہیں۔ چار بیٹے قاسم، عبد اللہ، طیب اور طاہر رضی اللہ عنہم بطنِ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے، ایک اور بیٹا ابراہیم رضی اللہ عنہ شکمِ ماریہ رضی اللہ عنہا سے۔

یہ تعداد دراصل اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے عبد اللہ، طیب اور طاہر رضی اللہ عنہم تین الگ

---

[1] بحوالہ مرشد جیلانی رحمہ اللہ کے ارشاداتِ حقانی (ص: ۵۴۔۵۵)

الگ بیٹے شمار کیے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں، بلکہ تمام محقق سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طیب، طاہر اور عبد اللہ ایک ہی بچے کے نام ہیں، بلکہ یوں کہیں کہ عبد اللہ جو عہدِ نبوت میں پیدا ہوئے تھے، اس مولودِ مسعود کا نام تو عبد اللہ ہی رکھا گیا تھا مگر وہ طیب اور طاہر کے لقب سے بھی پکارے جاتے تھے، تو گویا نام تین ہیں، مگر بچہ ایک ہی ہے۔ اس طرح صحیح یہی ہے کہ آپ ﷺ کی نرینہ اولاد صرف تین بیٹے تھے نہ کہ پانچ۔[1]

ادھر شیعہ حضرات ہیں تو انھوں نے کسی غلط فہمی سے کوئی اضافہ کرنے کے بجائے اپنے بعض نظریات مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول ﷺ کا دامادِ وحید ثابت کرنے کا نظریہ، تاکہ اس طریقے سے حضرت عثمان ذوالنورین اور ابو العاص رضی اللہ عنہما کو شرفِ دامادی سے محروم کیا جا سکے، اور پھر اسی پر اپنے عقائد کی عمارت تعمیر کی جا سکے۔ اس نظریے کو سہارا دینے کے لیے آپ ﷺ کی بیٹیوں کی تعداد میں عمداً وقصداً اس حد تک کمی کر دی کہ صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہی حقیقی بیٹی مانا اور باقی تین کی نفی کر دی۔ حالانکہ نہ صرف اہلِ سنت مورّخین بلکہ خود بعض محقق ومنصف مزاج شیعہ اہلِ علم نے بھی اعتراف کیا ہے کہ آپ ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں۔ جیسا کہ ان کی معتبر کتاب ''اصولِ کافی'' اس بات پر شاہد ہے جس کے مؤلف الشیخ ابوجعفر بن یعقوب الکلینی الرازی نے (ص: ۲۷۸، طبع ہندنول کشور) لکھا ہے:

''نبی ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں اور چاروں ہی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطنِ طاہر سے تھیں۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا قاسم سے چھوٹی اور باقی سب بہن بھائیوں سے بڑی تھیں۔ ان کی شادی اپنے خالہ زاد (ہالہ بنت خویلد کے بیٹے) ابو العاص رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی۔ ان کا ایک بیٹا علی اور ایک بیٹی اُمامہ تھیں۔ وہ اُمامہ جن کا ذکر صحیح مسلم، ابو داود اور نسائی شریف میں موجود ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں گود میں لے کر اور کندھوں پر اٹھا کر ایک نماز ادا فرمائی تھی۔[2]

دُوسری بیٹی رقیہ رضی اللہ عنہا تھیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ جن کا ایک ہی بیٹا عبد اللہ رضی اللہ عنہ تھا جو چھے سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ تیسری بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں

---

[1] زاد المعاد (۱/ ۱۰۳) تحقیق الأرناؤوط.

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥١٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٤٣)

ہوئی تھی۔ یہ بھی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ نبی اکرم ﷺ کی انہی دو بیٹیوں کے یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آنے کی وجہ سے انھیں ''ذوالنورین'' کا خطاب ملا جو اس بات کی شہادت ہے کہ وہ نبی ﷺ کے دوہرے داماد تھے۔ آپ ﷺ کی چوتھی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا تھیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شریکِ حیات اور حسنین رضی اللہ عنہما کی والدہ تھیں۔[1]

آپ ﷺ کی ایک بیٹی کو تسلیم کرنے اور تین کا انکار کرنے والے حضرات تاریخی شہادتوں کو چھوڑیں، صرف قرآنِ پاک کی سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۹) کھول کر دیکھ لیں جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ ... ﴾

''اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو۔''

اس آیتِ حجاب میں اللہ تعالیٰ نے عہدِ نبوی کی مومنات کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے:

① ازواج النبی رضی اللہ عنہن ② بنات النبی رضی اللہ عنہن ③ نساء المومنین رضی اللہ عنہن۔

اور یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ لفظِ بنات، بنت کی جمع ہے اور عربی میں جمع کا صیغہ دو سے زیادہ کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی تین یا تین سے بھی زیادہ، تو اس آیت میں خود ارشادِ الٰہی گواہ ہے کہ نبیِ رحمت ﷺ کی نہ ایک، نہ دو بلکہ کم از کم تین یا تین سے زیادہ بیٹیاں تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ﴿ بَنَاتِكَ ﴾ جمع کا صیغہ استعمال فرما کر تین یا تین سے زیادہ کا اشارہ دے دیا ہے تو پھر آپ ﷺ کی چار بیٹیاں ماننے میں کونسا امر مانع ہے؟

اب اگر یہ شیعہ حضرات کہیں کہ بنات میں آپ ﷺ کی بیویوں کی سابقہ شوہروں سے بیٹیوں کو بھی مجازاً بیٹیاں شمار کر کے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے تو یہ بات کئی وجوہ کی بنا پر ناقابلِ قبول ہے:

أوّلاً: اسی سورۃ احزاب کی ابتدائی آیات میں سے پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی طرف منسوب کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾

[1] رحمة للعالمين (۲/ ۱۰۰ تا ۱۲۵)

''انھیں ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہی اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔''

جب ذاتِ الٰہی خود حکم دیں کہ ہر ایک کو اس کے باپ کے نام سے پکارو اور پھر وہی ذاتِ الٰہی اُسی سورت (آیت: ۵۹) میں ایسی لڑکیوں کو نبی ﷺ کی بیٹیاں بتائیں جو دراصل آپ ﷺ کے خون سے نہیں تھیں، یہ بات نہ قرینِ قیاس ہے اور نہ قرینِ انصاف، بلکہ قرآنِ کریم پر اس بدظنّی کے مترادف ہے کہ اس میں بھی اختلاف وتناقض پایا جاتا ہے، جو نہ صرف توہینِ قرآن بلکہ گستاخی وکفر ہے۔

ثانیاً: اس کلامِ محکم پر قیاس نہیں چل سکتا کہ شاید بیویوں کی بیٹیوں کو مجازاً بنات کہہ دیا گیا ہو، کیوں کہ حقیقت کے سامنے مجاز کی کیا وقعت ہے اور منطوقِ الٰہی کے سامنے قیاسِ انسانی کی کیا منزلت؟

ثالثاً: عربی ایسی وسیع زبان ہے کہ اس میں بیویوں کی بیٹیوں کے لیے الگ لفظ موجود ہے۔ خود قرآن نے ایسی لڑکیوں کے لیے لفظ ''ربائب'' استعمال کیا ہے۔ لفظِ ''بنات'' نہیں۔ جیسا کہ سورۃ النساء (آیت: ۲۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىْ فِىْ حُجُوْرِكُمْ﴾ ''اُن کی وہ لڑکیاں جن کی تم پرورش کرتے ہو۔''

الغرض کلام اللہ کے لفظِ ﴿بَنَاتِكَ﴾ نے اہلِ سنت علمائے نسب اور چار بیٹیاں تسلیم کرنے والے شیعہ اہلِ علم کی تحقیقات کی تصدیق فرمادی ہے۔ اور یاد رہے کہ نبی ﷺ کی ربائب چار تھیں: درہ، زینب اور ام کلثوم، یہ تینوں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں تھیں۔ اور چوتھی حبیبہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی دختر تھیں۔ دیگر ازواج النبی رضی اللہ عنہن میں سے کسی کی پہلے شوہر سے کوئی لڑکی نہ تھی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبی ﷺ سے ۴ھ میں ہوا تھا اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ۶ھ میں۔ اس طرح مذکورہ لڑکیوں کو ربائب ہونے کا درجہ ۴ھ سے پہلے حاصل نہ تھا۔ جبکہ بنتِ رسول ﷺ، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا ذکر ۲ھ میں ہونے والے غزوۂ بدر کے اسیران کے فدیے میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا جہیز میں دیا ہوا ہار اپنے شوہر ابوالعاص رضی اللہ عنہ کی رہائی کے لیے بھیجا تھا جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ ۶ھ میں اسلام لائے۔ ام کلثوم و رقیہ رضی اللہ عنہما کا ذکر ہجرت سے بھی پہلے ابولہب کے خاسرانہ اعمال میں آتا ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں بہنیں اس بدبخت کی بہویں بنی تھیں، مگر اسے یہ سعادت راس نہ آئی اور اس نے خود

اپنے بیٹوں سے انھیں طلاق دلوا دی تھی۔ پھر ان ہر سہ بناتِ رسول ﷺ کا انتقال حیاتِ نبوی ﷺ میں ہوا۔ مگر مذکورہ ربائب ارتحالِ نبوی ﷺ کے بعد بھی دیر تک اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں جن کی تفصیل ان کے حالات میں ملتی ہے۔[1]

اس ساری تفصیل سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ نبی ﷺ کی صرف ایک نہیں بلکہ دو سے بھی زیادہ اور بالتحدید چار صاحبزادیاں تھیں۔

سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی فضیلت

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اوصافِ حمیدہ اور فضائلِ جلیلہ تو الگ ایک موضوع ہے، لیکن یہاں ہم صرف ایک دو احادیث پر ہی اکتفا کریں گے۔ ان کے لیے یہی فضیلت کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ جبرائیل علیہ السلام انھیں سلام بھیجا اور جنّت میں گھر عطا کرنے کی خوشخبری دی۔ جیسا کہ بخاری و مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا:

«يَا رَسُولَ اللّٰهِ! هَذِهِ خَدِيجَةُ قَدْ أَتَتْ مَعَهَا اِنَاءٌ فِيهِ اِدَامٌ وَطَعَامٌ، فَاِذَا اَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَبِّهَا وَمِنِّي وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ، لَا صَخَبَ فِيهِ وَلَا نَصَبَ»[2]

''اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آرہی ہیں۔ ان کے پاس برتن میں سالن اور کھانا ہے۔ جب وہ آپ ﷺ کے پاس آئیں تو ان کے رب کی طرف سے اور میری طرف سے انھیں سلام کہیں اور جنّت میں گھر ملنے کی خوشخبری بھی دے دیں جو ہیرے کا بنا ہوا ہے۔ اس گھر میں نہ کوئی شور وشغب ہوگا اور نہ ہی کوئی تھکاوٹ ہوگی۔''

یہ وہ شرف ہے جو دنیا کی کسی بھی دوسری عورت کو نصیب نہیں ہوا اور صحیحین میں ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں ''خير النسآء زمانها'' کا خطاب عطا فرمایا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

---

[1] رحمة للعالمين (٢/ ١٠١۔ ١٠٢ متن وحاشيه)

[2] متفق عليه، مشكاة المصابيح تحقيق الألباني (٦١٧٦)

«خَيْرُ نِسَآئِهَا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَخَيْرُ نِسَآئِهَا خَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ»[1]

''مریم بنت عمران ؓ (اپنے زمانے کی) عورتوں میں سے بہترین عورت تھیں اور خدیجہ بنت خویلد ؓ اپنے زمانے کی تمام عورتوں سے بہترین تھیں۔''

صادق و امین اور تعمیرِ کعبہ

حضرت خدیجہ ؓ کے ساتھ شادی کے بعد نبی ﷺ کا سارا وقت ذکرِ الٰہی، کائنات میں تفکّر و تدبّر اور بنی آدم کی فلاح و بہبود میں صرف ہوا کرتا تھا۔ انہی دنوں نبیِ اکرم ﷺ نے مختلف قبائل کے سرداروں اور سمجھ دار لوگوں کو جمع کیا اور ملک میں پائی جانے والی بدامنی، راستوں کے پُر خطر ہونے، مسافروں کے چوروں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ہاتھوں لٹنے اور غرباء و مساکین پر دولت کے گھمنڈ میں ظلم کرنے والے لوگوں کے مظالم بیان کیے اور ان جمع شدہ لوگوں کو ان سب امور کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ آخر ایک انجمن یا کمیٹی قائم ہوگئی جس میں بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو اسد، بنو زہرہ اور بنو تمیم شامل تھے۔ اس کمیٹی کے ممبر یہ عہد و اقرار کیا کرتے تھے:

- ہم ملک سے بدامنی دُور کرنے کی تدابیر اختیار کریں گے۔
- مسافروں کی حفاظت کے انتظامات کریں گے۔
- غرباء و مساکین کی امداد کیا کریں گے۔
- اور زبردست کو زیردست پر ظلم و ستم ڈھانے سے ہر ممکن طریقہ اختیار کر کے روکا کریں گے۔

اس انجمن کے قیام اور تدابیر سے بنی آدم کے جان و مال کی بڑی حد تک حفاظت ہوگئی۔ ایسے ہی نیک قومی ورفاہی اور سماجی کاموں کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی شرافت وصداقت اور پاکیزہ اخلاق کی وجہ سے نبیِ اکرم ﷺ لوگوں کے دلوں میں اس قدر محبوب ہو چکے تھے کہ وہ آپ ﷺ کو نام لے کر نہیں بلکہ الصادق یا الامین کہہ کر پکارا کرتے تھے جو آپ ﷺ کی راستبازی و امانت داری کا ثبوت تھا۔[2]

---

[1] متفق علیه بحواله مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٦١٧٥)

[2] رحمة للعالمين (١/ ٤٣)

نبیِ اکرم ﷺ کی بعثت سے صرف پانچ سال پہلے تک خانہ کعبہ صرف نو ہاتھ اونچی چار دیواری پر مبنی تھا۔ اس پر چھت نہیں تھی۔ لہٰذا خانہ کعبہ شریف میں پڑے خزانے سے چوری ہوگئی۔ اس کے علاوہ اسی سال مکۃ المکرّمہ میں ایک زبردست سیلاب آیا جو ''سیلِ عرم'' کے نام سے معروف ہے۔ اس سیلاب کی وجہ سے خانہ کعبہ کی دیواریں نہایت متاثر ہوئیں۔ انھیں زنگ وکائی لگنے کے ساتھ ساتھ گرنے کے قریب ہوگئیں تو قریش کعبہ شریف کی تعمیرِ جدید کے لیے تیار ہوگئے۔[2]

یہاں یہ بات بطورِ خاص یاد رکھیں کہ تجدید تعمیرِ کعبہ کی ضرورت مرورِ زمانہ کے اثر یا صدمۂ سیلاب وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہوجاتی تھی، ورنہ کسی غیر قوم کے قبضہ کر کے توڑ پھوڑ کرنے اور منہدم کرنے کا واقعہ اس مبارک عمارتِ کعبہ کے ساتھ پانچ ہزار سال سے کبھی نہیں ہوا۔ جبکہ ہیکلِ یروشلم کے ساتھ بارہا ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں اور یہ ایک ایسا شرف ہے جو کعبہ کے سوا دنیا کے کسی دوسرے عبادت خانے کو حاصل نہیں۔[2]

قریش نے جب تجدیدِ تعمیرِ کعبہ کا پختہ ارادہ کر لیا تو پدرِ رسول ﷺ عبد اللہ کے ماموں ابو وہب بن عَمر ومخزومی کے کہنے پر پہلے سب نے یہ عہد کیا کہ تعمیرِ کعبہ میں جو شخص جتنا بھی حصہ ڈالنا چاہے وہ صرف مالِ حلال وطیب میں سے ہونا چاہیے۔ کوئی کسی عورت کی کمائی، سود کا پیسہ یا کسی سے ظلماً لیا ہوا مال شامل نہ کرے۔ اس طرح جب پرانی دیواروں کو گرانے کا وقت آیا تو سب ڈرنے لگے کہ کہیں ہم پر کوئی مصیبت نہ آجائے اور چونکہ وہ کعبہ کو گرانے نہیں بلکہ تعمیر کرنے والے تھے، ان کی نیت صاف تھی اسی بات کے پیشِ نظر سب سے پہلے ولید بن مغیرہ مخزومی نے: ''اَللّٰھُمَّ اِنَّا لَانُرِیْدُ اِلَّا الْخَیْرَ'' ''اے اللہ! ہم بھلائی کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔'' یہ کہتے ہوئے پرانی دیواروں کو گرانے کا آغاز کیا اور جب دوسرے لوگوں نے دیکھ لیا کہ انھیں کچھ نہیں ہوا تو وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے اور قواعد واساسِ ابراہیم علیہ السلام تک کی پرانی دیواریں مسمار کر دیں۔[1]

---

[1] سیرت ابن هشام (١/ ١٧٨) فقه السيرة (ص: ٨٣) الرحيق المختوم (ص: ٧٠)

[2] رحمة للعالمين (١/ ٤٣ حاشيه)

[3] البداية والنهاية (٢/ ١٩٨ تا ٣٠١) سيرت ابن هشام (١/ ٧٩ـ ١٧٨) تفسير الطبري اردو (١/ ٦٣ تا ٦٨)

تعمیرِ کعبہ اور نبی اکرم ﷺ کا حَکَم مقرر ہونا

کعبہ شریف کے معمارِ اوّل جد الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کے لختِ جگر اور نبیِ رحمت ﷺ کے جدِّ اعلیٰ حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام بھی تھے۔ تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہو کر ان برگزیدگانِ الٰہی نے دعا مانگی تھی:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ [البقرة: ١٢٩]

''اے ہمارے ربّ! ان (اہلِ مکہ) میں انہی میں سے رسول بھیج۔''

اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول کی جو نبیِ رحمت ﷺ کی بعثت کی شکل میں پوری ہوئی۔ اب حکمتِ الٰہی نے چاہا تو نبیِ رحمت ﷺ کی بعثت سے صرف پانچ سال قبل جبکہ آپ ﷺ کی عمرِ شریف پینتیس سال تھی، قریش تجدیدِ تعمیر پر متفق ہوگئے اور نبیِ آخر الزماں ﷺ نے تعمیرِ کعبہ میں عملی طور پر حصہ لیا اور پتھر اٹھائے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے شانے مبارک زخمی ہو گئے۔

اس مرتبہ جب تعمیرِ کعبہ کا کام شروع ہوا تو حسنِ اتفاق سے جدہ کے قریب ایک سمندری جہاز کنارے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ قریش کو جب اس حادثے کی خبر ہوئی تو ولید بن مغیرہ مخزومی نے جدہ پہنچ کر کعبہ شریف کی چھت ڈالنے کے لیے اس جہاز کی لکڑی خرید لی۔ اس جہاز میں باقوم نامی ایک رومی معمار بھی تھا۔ ولید اسے بھی ساتھ لے آیا اور اسی کی نگرانی میں تعمیرِ کعبہ کا کام شروع ہوا۔ تعمیر کا کام تمام قبائلِ قریش نے مل بانٹ کر کیا۔ ان مختلف قبائل کے مابین کعبہ شریف کے مختلف حصے تقسیم کر دیے گئے تھے، تاکہ تعمیرِ کعبہ کے شرف سے کوئی شخص محروم نہ رہے۔

ابن اسحاق رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ تعمیرِ کعبہ کے وقت بابِ کعبہ والی دیوار بنی عبد مناف و بنی زہرہ کے حصے، رکنِ یمانی اور حجرِ اسود کی درمیانی دیوار بنی مخزوم اور بعض دیگر قبائلِ قریش کے حصے، چھت کا کام بنی جمح و بنی سہم کے حصے اور حطیم کی طرف والی دیوار بنی عبد الدار کے حصے میں آئی، جبکہ حطیم کی دیوار بنی اسد و بنی عدی کے حصے آئی تھی۔[1]

جب حجرِ اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت اختلاف رونما ہوا۔ ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ

[1] البداية والنهاية (٢/ ٣٠٣)

حجرِ اسود کی تنصیب کا شرف اسے ہی نصیب ہو۔ چار دن مسلسل یہ جھگڑا چلتا رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ تلواریں نیاموں سے نکل آئیں اور خطرہ تھا کہ خونریز جنگ شروع ہو جائے۔ آخر پانچویں دن قریش کے سب سے عمر رسیدہ شخص ابو امیّہ بن مغیرہ نے مشورہ دیا کہ کسی شخص کو حَکم یا ثالث مقرر کر کے اس کے فیصلے پر عمل کیا جائے۔ سب نے اس بات کو پسند کیا اور اتفاق کر لیا۔ طے یہ پایا کہ کل صبح کو جو شخص سب سے پہلے حرم میں داخل ہو اسے حَکم مانا جائے۔ اس تجویز کو بھی سب نے تسلیم کر لیا۔

اگلی صبح تمام قبائل کے سردار اور آدمی موقع پر پہنچ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں اب اس بابِ صفا میں سے کون شخص سب سے پہلے داخل ہوتا ہے۔ اب کرشمۂ ربانی دیکھیں کہ سب سے پہلے لوگوں کی نظر جس پر پڑی وہ جمالِ جہانتاب، رخِ زیبائے مصطفیٰ (ﷺ) تھا۔ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی تمام معزّزینِ قریش پکار اٹھے:

«اَتَاکُمُ الْاَمِیْنُ، هَذَا الْاَمِیْنُ اِرْتَضَیْنَاهُ حَکَماً، هَذَا الْاَمِیْنُ رَضِیْنَاهُ»[1]

''یہ لو امین آ گیا اور ہم امین کو اپنا حَکم ماننے پر رضامند ہیں۔''

رحمتِ عالم ﷺ نے انتہائی زیرکی و معاملہ فہمی سے ایسی تدبیر اختیار فرمائی کہ سب ہی خوش ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ایک چادر بچھائی اور اپنے مبارک ہاتھوں سے حجرِ اسود کو اٹھا کر اس چادر کے وسط میں رکھ دیا۔ پھر تمام قبائل کے سرداروں کو کہا کہ چادر کو اطراف سے پکڑ کر اٹھاؤ۔ اسی طرح حجرِ اسود کو اس مقام تک لایا گیا جہاں اسے نصب کرنا تھا۔ وہاں پھر آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اسے اٹھایا اور دیوارِ کعبہ میں نصب کر دیا۔[2]

یوں آپ ﷺ نے حسنِ تدبیر سے نہ صرف ایک خون آشام جنگ کا خطرہ ٹال دیا، بلکہ تمام قبائل کو اس شرف میں شامل کر کے شِیر و شکر کر دیا۔ کعبہ شریف کی عمارت پر اب چھت ڈال دی گئی تھی۔ مگر سامانِ تعمیر چونکہ کافی نہ تھا، لہٰذا ایک طرف سے کچھ جگہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصے کے گرد چار دیواری کھینچ دی کہ پھر کبھی موقع بنا تو شامل کر لیں گے۔ یہی نصف دائرہ کی شکل والا

---

[1] البداية (٢/ ٣٠٣) الفتح الرباني (٢٠ / ١٩٨ تا ٢٠١) فقه السيرة (ص: ٨٣ـ ٨٤) رحمةٌ للعالمين (١/ ٣٩ـ ٤٠)

[2] مسند أحمد (٢/ ٤٢٥) علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ (تحقيق فقه السيره محمد غزالي، ص: ٨٤)

حصہ حجر یا حطیم کہلاتا ہے، جس کے بارے میں عہدِ نبوت میں آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا تھا کہ اسے بھی کعبہ میں شامل کر دوں، مگر پھر خیال آیا کہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، دیوارِ کعبہ کو گرانے سے کہیں بدگمان نہ ہو جائیں۔[1]

کعبہ شریف کی چھت چھے ستونوں پر پندرہ میٹر اونچی ہے۔ بابِ کعبہ زمین سے دو میٹر اور حجرِ اسود زمینِ مطاف سے ڈیڑھ میٹر اونچائی پر ہے۔ بابِ کعبہ اور مقابل والی دیوار کی لمبائی بارہ بارہ میٹر، اور رکنِ یمانی و حجرِ اسود کی درمیانی اور اس کی مقابل والی دیوار کی لمبائی دس میٹر ہے۔[2]

بعثتِ نبوی ﷺ کے بعد تعمیرِ کعبہ اور چند حکایتیں

دوسری مرتبہ تعمیرِ کعبہ بعثتِ نبوی ﷺ سے پانچ سال قبل ہوئی، جس میں آپ ﷺ بھی شریک ہوئے۔ پھر حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کی ضرورت پڑی تو انھوں نے حطیم کو خواہشِ نبوی ﷺ کے مطابق کعبہ میں شامل کر دیا۔ پھر عبد الملک بن مروان کے زمانے میں تعمیر ہوئی اور انھوں نے حطیم کو پھر الگ کر دیا۔ اس کے بعد سے اب تک اسی حالت پر ہے۔

امام سہیلی اور بعض دیگر سیرت نگاروں نے جو یہ لکھا ہے کہ سب سے پہلے فرشتوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے، پھر ان کے بیٹے شیث علیہ السلام نے، اور حضرت آدم علیہ السلام نے اس کا طواف کیا۔ یہ سب بلا ثبوت اور بے اصل باتیں ہیں۔ کسی صحیح حدیث سے ان امور کا پتا نہیں چلتا، بلکہ قرآن وسنت سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ اولین معمارِ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی تھے۔

نیز یہ بھی لکھا ہے:

جب طوفانِ نوح علیہ السلام آیا تو کعبہ شریف موجود تھا، مگر پانی اس پر نہیں چڑھ سکا۔ نوح علیہ السلام نے سفینے میں بیٹھے بیٹھے اس کا طواف کیا۔ سب سے پہلے ایک مچھلی نے کعبہ کی پناہ مانگی تھی جو چھوٹی سی تھی اور بڑی مچھلی سے ڈر گئی تھی۔ یہ سب اساطیر اور کہانیاں ہیں جو بے سند و بے ثبوت ہیں۔ کہا جاتا ہے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (..........) صحيح مسلم، رقم الحديث (..........)

[2] الرحيق المختوم (ص: ٧١) تعمیرِ کعبہ کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں: زرقاني (١/ ٤٠۔ ٢٣٦) سيرت النبي ﷺ (١/ ١٨٤۔ ١٨٥) الروض الأنف (٢/ ٢٦٤۔ ٣٨٣) سيرت ابن هشام (١/ ١٨١۔ ١٨٢) طبری اردو (١/ ٦٨، ٦٩)

کہ حضرت ہود و صالح علیہما السلام نے بھی حج بیت اللہ کیا جبکہ اس سلسلے میں بھی کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔ امام سہیلی و حافظ ابن کثیر نے البدایۃ میں پرانی عمارتِ کعبہ کے مسمار کرنے کے دوران میں ایک کا غذ یا سہ کونہ پتھر ملنے کی حکایت نقل کی ہے جس میں ''اِنِّیْ أَنا ذُوْ بَكَّةَ...'' لکھا تھا۔ یہ قصہ بھی سراسر بے سروپا اور خود ساختہ ہے۔[1]

سِیرت امام الانبیاء ﷺ قبل از بعثت

اجمالی نظر:

نبی ﷺ کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے تمام مرحلے ہر قسم کی فضول حرکات وسکنات سے قطعی پاک تھے۔ اس زمانے میں کام کاج میں یا کسی بھی ضرورت کے وقت تہمد اُتار دینا معمولی بات تھی۔ مگر نبی ﷺ سے بعثت سے قبل بھی ایسا کوئی واقعہ سرزد نہیں ہوا۔ بلکہ صحیح بخاری و مسلم شریف میں روایت موجود ہے کہ تعمیرِ کعبہ کے دوران میں جب آپ ﷺ اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ پتھر اٹھایا کرتے تھے اور کندھوں پر کوئی کپڑا نہ ہونے کی وجہ سے شانے مبارک زخمی ہو گئے تو آپ ﷺ کے چچا نے ازراہِ شفقت کہا:

''اِجْعَلْ اِزَارَكَ عَلٰى رَقَبَتِكَ يَقِيْكَ الْحِجَارَةَ''

''اپنا تہمد اتار کر اپنی گردن پر رکھ لیں، تاکہ پتھر سے بچ جائیں۔''

تو ان کی اس نصیحت پر عمل کرنا ہی تھا کہ آپ ﷺ زمین پر گر گئے:

''فَطَمَحَتْ عَيْنَاهُ اِلَى السَّمَآءِ (فَقَالَ:) اِزَارِىْ، اِزَارِىْ فَشُدَّ عَلَيْهِ فَمَا رُؤِيَ بَعْدُ عُرْيَانًا''[2]

''آپ (ﷺ) کی آنکھیں آسمان کی طرف جم گئیں اور آپ (ﷺ) نے فرمایا: میری چادر، میری چادر۔ فوراً آپ ﷺ کو چادر دی گئی جو آپ ﷺ نے باندھ لی اور اس کے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: تعليق الشيخ عبد الرحمن الوكيل (رئيس أنصار السنة مصر) على الروض الأنف (٢/ ٢٦٥ـ ٢٦٩ـ ٢٧١، ٢٨٠)

[2] صحيح البخاري (١/ ٣٧٧) صحيح مسلم (١/ ١٨٤) وغيرهم بحواله فقه السيرة (ص: ٨٣)

بعد تاحینِ حیات آپ ﷺ کبھی عریاں نہیں دیکھے گئے۔''

ایک واقعہ آپ ﷺ کے بچپن کا بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے چادر اتاری تو غیب سے کسی نے گھونسا مارا اور کہا کہ چادر باندھو۔[1] مگر یہ واقعہ کسی صحیح روایت میں ثابت نہیں، بلکہ اس کی نسبت یہ بخاری ومسلم کا صحیح ثابت شدہ واقعہ ہی کیا کم ہے جو تعمیرِ کعبہ کے دوران پیش آیا۔ اس صحیح ترین روایت کی موجودگی میں کسی بےثبوت واقعہ کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ایسے ہی آپ ﷺ کی قبل از بعثت کی چالیس سالہ زندگی خصوصی عنایتِ الٰہی کی وجہ سے ہر قسم کی مشرکانہ رسوم اور جاہلانہ عادات سے قطعی پاک تھی۔ بخاری شریف میں مذکور ہے:

''ایک دفعہ قریش نے آپ ﷺ کے سامنے کھانا لاکر رکھا۔ یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا اور جو جانور ذبح کیا گیا تھا وہ کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے وہ کھانا کھانے سے صاف انکار کر دیا۔''[2]

منصبِ نبوت سے سرفراز ہونے سے قبل بھی جو لوگ آپ ﷺ کے احبابِ خاص تھے، وہ سب نہایت پاکیزہ اخلاق اور عالی مرتبت تھے۔ ان میں سے سب سے مقدّم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ برسوں آپ ﷺ کے شریکِ صحبت رہے۔[3]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچیرے بھائی حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے، وہ بھی آپ ﷺ کے احبابِ خاص میں سے تھے۔ حرم کا منصبِ رفادہ (حجاج کے کھانے پینے کے انتظامات) انھیں کے ہاتھ تھا اور دار الندوہ کے بھی وہی مالک تھے جو اسلام کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم میں بیچ دیا اور یہ کل رقم خیرات کر دی۔ یہ نبی اقدس ﷺ سے عمر میں پانچ برس بڑے تھے۔ وہ طویل مدت تک دولتِ ایمان سے محروم رہے، مگر نبی ﷺ سے برابر محبت کیا کرتے تھے۔ بالآخر توفیقِ الٰہی شامل حال ہوئی تو ۸ھ میں اسلام لائے۔[4]

---

[1] سيرت ابن هشام (١/ ١٦٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (..........) بحوالہ سیرت النبی ﷺ (۱/۱۹۱)

[3] الإصابة (٢/ ٣٤١)

[4] الإصابة، ذكر حكيم بن حزام.

ایسے ہی حضرت ضماد بن ثعلبہ ازدی رضی اللہ عنہ جو طبیب وجراح تھے اور حضرت قیس بن سائب مخزومی جو تاجر اور نبی ﷺ کے شریکِ تجارت تھے، یہ دونوں بھی آپ ﷺ کے احبابِ خاص میں سے شمار ہوتے ہیں۔[1]

نبی ﷺ کے مبعوث ہونے سے قبل فیضِ الٰہی کی خفیف شعاعیں ملکِ عرب میں پھیلنا شروع ہوگئی تھیں، حتیٰ کہ چند طالبانِ حق اور متلاشیانِ صراطِ مستقیم نے شرک اور بت پرستی سے انکار کردیا تھا۔ ان میں سے قیس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن حویرث اور زید بن عمرو بن نفیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے نبی ﷺ نے زید سے ملاقات کی تھی، جس کا ذکر ''صحیح البخاری'' (۷/ ۱۴۔ ۱۵) میں موجود ہے۔ ورقہ بن نوفل چونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے برادرِ عمزاد تھے اور مکہ ہی میں رہتے تھے، ان سے بھی آپ ﷺ کی ملاقات عین قرینِ قیاس ہے، بلکہ بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ سے ان کی گہری دوستی تھی۔[2]

اچھے احباب کا انتخاب صاف ستھرے کردار کا ثبوت ہوتا ہے اور ہمارے نبیِ رحمت ﷺ قبل از بعثت بھی اس ممتاز مقام پر فائز تھے۔

ایک مشہور روایت:

''الكامل في التاريخ لابن أثير''، ''الخصائص الكبرىٰ للسيوطي'' (۱/ ۸۸)، ''مسند البزار'' اور ''المستدرك للحاكم'' (٤/ ٢٤٥) میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

«مَا هَمَمْتُ بِشَيْءٍ مِمَّا كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَعْمَلُوْنَ غَيْرَ مَرَّتَيْنِ، كُلُّ ذٰلِكَ يَحُوْلُ اللّٰهُ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ، ثُمَّ مَا هَمَمْتُ بِهٖ حَتّٰى اَكْرَمَنِي اللّٰهُ بِرِسَالَتِهٖ»

''اہلِ جاہلیّت کے افعال میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرنے کا میں نے دو مرتبہ کے سوا کبھی ارادہ نہیں کیا اور ان دو مرتبہ میں جو ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ میرے اور اس فعل کے

---

[1] سیرت النبی ﷺ (۱/ ۱۹۶۔ ۱۹۸)

[2] سیرت النبی ﷺ (۱/ ۱۹۳۔ ۱۹٤) فقه السيرة، (ص: ۸۵ تا ۸۸)

مابین حائل ہو گیا۔ پھر میں نے کبھی ارادہ بھی نہیں کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شرفِ رسالت سے نواز دیا۔''

آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''میں نے ایک رات اپنے ساتھ بکریاں چرانے والے لڑکے سے کہا کہ اگر تم میری بکریوں کا خیال رکھو تو میں بھی مکہ جا کر اس محفل میں شریک ہو جاؤں جس میں قصے کہانیاں بیان ہوتے ہیں اور اکثر نوجوان اس میں شرکت کرتے ہیں۔ میرے ساتھی نے کہا: چلے جاؤ۔ میں وہاں سے چلا اور جب مکہ کے پہلے ہی گھر کے قریب پہنچا تو میں نے آلاتِ موسیقی کی آواز سنی۔ کسی سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ یہاں فلاں شخص کی شادی فلاں لڑکی سے ہو رہی ہے۔ میں بھی وہاں بیٹھ گیا۔ مگر بیٹھتے ہی اللہ تعالیٰ نے میرے کانوں سے قوتِ سماعت چھین لی اور میں وہیں سو گیا۔ پھر مجھے وہاں سے سورج کی گرمی نے ہی اٹھایا۔ جب میں واپس گیا تو ساتھی نے محفل کا حال پوچھا تو میں نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

ایسے ہی ایک مرتبہ پھر ہوا کہ میں مکہ کو چلا اور شہر میں داخل ہونے کے بعد میرے ساتھ وہی معاملہ پیش آیا جو پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے دوبارہ کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا۔''

یہ واقعہ متعدد کتبِ حدیث میں موجود ہے۔ امام حاکم نے ''المستدرك'' (٤/ ٢٤٥) میں نقل کرنے کے بعد یہاں تک کہا ہے:

''هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ عَلَىٰ شَرْطِ مُسْلِمٍ''

''یہ حدیث مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔''

امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اس تصحیح پر ان کی **موافقت** کی ہے۔ جبکہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''یہ تصحیح دونوں کا وہم ہے'' اور اس کی دو جوہات ہیں:

أوّلاً: یہ کہ یہ روایت ابن اسحاق کے طریق سے ہے اور امام مسلم ان کی روایت بیان کرتے ہیں مگر اس شرط پر جبکہ ابن اسحاق کے علاوہ کسی دوسرے طریق سے بھی ثابت

ہو، جیسا کہ خود امام ذہبی رحمہ اللہ نے میزان الاعتدال میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہاں امام حاکم نے صرف ابن اسحاق سے روایت بیان کی ہے۔ دوسرے کسی طریق سے یہ ثابت نہیں کی۔ لہٰذا یہ شرطِ مسلم پر پوری نہ ہوئی۔

ثانیاً: اس روایت میں جو ایک راوی محمد بن عبداللہ بن قیس ہے وہ عدالت میں مشہور نہیں اور ابن حبان کے سوا اس کی کسی نے توثیق نہیں کی۔ جب ابن حبان کسی کی توثیق میں منفرد ہوں تو وہ غیر موثوق ہوتی ہے۔ کیوں کہ ابن حبان مجہولین کی بھی توثیق کر دیتے ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے "لسان المیزان" میں لکھا ہے۔ لہٰذا جب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان ابن قیس کو "التقریب" میں ذکر کیا تو ان کی توثیق نہیں کی، بلکہ صرف مقبول کہا ہے۔ یعنی وہ لیّن الحدیث ہے، جیسا کہ تقریب کے مقدمہ میں مذکور ہے۔ پھر یہ ابن قیس رجالِ مسلم میں سے بھی نہیں ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البدایة والنهایة" میں بیہقی سے یہی روایت اسی سند کے ساتھ نقل کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:

"هٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ جِدًّا. وَقَدْ يَكُونُ عَنْ عَلِيٍّ نَفْسِهِ (يَعْنِي مَوْقُوفاً عَلَيْهِ) وَيَكُونُ قَوْلُ «حَتَّى أَكْرَمَنِي اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ بِنُبُوَّتِهِ» مُقْحَمًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ"

''یہ حدیث انتہائی غریب ہے اور ممکن ہے کہ یہ واقعہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا ہو۔ اور یہ الفاظ: ''یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت سے سرفراز کیا'' اس روایت کے نہیں بلکہ کسی دوسری روایت کے ہیں جو غلطی سے اس میں درج ہو گئے ہیں۔ واللہ اعلم''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے مزید لکھا ہے:

''ابن اسحاق کے شیخ محمد بن عبداللہ بن قیس کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا اور بعض کا خیال ہے وہ رجال الصحیح میں سے ہے۔ حالانکہ ہمارے شیخ نے اپنی ''تہذیب'' میں اس کے بارے میں یہ کہا ہے: مگر مجھے اس چیز کا علم حاصل نہیں ہوا۔ واللہ اعلم''[1]

---

[1] البدایة والنهایة (٢/ ٢٨٨)

آگے چل کر شیخ البانی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد یہ حدیث میں نے ''تاریخ مکہ للفاکہی'' (ص: ۷) اور ''تاریخ ابن جریر'' (۳۴/۲) میں بھی اسی طریق سے مذکور پائی۔ طبرانی نے ''معجم الصغیر'' (ص: ۱۹۰) میں بھی عمار بن یاسر کی حدیث سے یہ روایت نقل کی ہے مگر اس روایت کی سند میں کتنے ہی ایسے راوی ہیں جنھیں میں نہیں جانتا اور ایسے ہی حافظ ہیثمی نے "مجمع الزوائد" (۸/ ۲٦٦) میں ذکر کیا ہے۔[1]

سیرت امام الانبیاء ﷺ بعد از بعثت

طلوعِ آفتابِ رسالت اور بعثتِ نبوی ﷺ:

نبیِ رحمت ﷺ نے جس زمانے میں جنم لیا اور پروان چڑھے، اس وقت مکہ مکرمہ بت پرستی کا مرکزِ اعظم تھا۔ خود کعبہ شریف میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کا خاندان اس صنم کدہ کا متولّی وکلید بردار تھا۔ بایں ہمہ نبی ﷺ نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔ طوافِ عُریاں جیسی دیگر رسومِ جاہلیت میں بھی کبھی شریک نہیں ہوئے اور نہ کبھی ان باتوں میں اپنے خاندان والوں کا ساتھ دیا۔ یہ فطرتِ سلیمہ کا تقاضا تھا۔ جوں جوں زمانۂ نبوت کا وقت قریب آتا گیا، نبیِ اکرم ﷺ کو ایک روشنی اور چمک نظر آنے لگی،[2] جسے دیکھ کر آپ ﷺ کو ایک گونہ مسرت سی محسوس ہوتی۔[3] اُس چمک میں کوئی آواز یا صورت نہیں ہوتی تھی۔

آپ ﷺ کو بہت سے دنیاوی امور سے نپٹنا پڑتا تھا۔ کاروبارِ تجارت تھا، اولاد تھی، لیکن دستِ قدرت نے آپ ﷺ سے جو کام لینا تھا وہ تمام مشاغل ومصروفیات سے بالاتر تھا۔ دنیا کے تمام کام آپ ﷺ کو ہیچ نظر آنے لگے۔ تاہم مطلوبِ حقیقی کا اب تک پتا نہ تھا۔

آپ ﷺ کے مزاج شریف میں خلوت گزینی کی عادت بڑھتی جا رہی تھی۔ آپ ﷺ اکثر پانی اور ستو لے کر شہر سے تین میل باہر جبلِ نور کی چوٹی پر پائی جانے والی ''غارِ حرا'' میں جا بیٹھتے جس کا طول چار گز اور عرض پونے دوگز ہے۔ وہاں آپ ﷺ کئی کئی دن تک رہتے اور قدرتِ الٰہیہ پر

---

[1] تعليقات و تخريج شيخ ألباني علىٰ فقه السيرة محمد غزالي (ص: ٧٢۔ ٧٣)

[2] صحيحين عن ابن عباس رضي الله عنهما.

[3] سفر السعادة (ص: ٣١)

تدبّر وتفکّر کیا کرتے۔ جب تک پانی اور ستو ختم نہ ہو جاتے، واپس گھر تشریف نہیں لایا کرتے تھے۔[1]

جیسے جیسے آفتابِ رسالت کے طلوع ہونے کا وقت قریب آتا گیا، آپ ﷺ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے۔ آپ ﷺ کو خواب نظر آنے لگے، اور خواب بھی ایسے سچے ہوتے تھے کہ آپ ﷺ جو کچھ رات کو خواب میں دیکھ لیا کرتے تھے دن کو ویسا ہی واقعہ ظہور میں آجاتا۔ یہ سلسلہ چھے ماہ تک جاری رہا۔

پھر جب آپ ﷺ کی عمرِ شریف چالیس سال ہوئی تو آپ ﷺ حسبِ عادت غارِ حرا میں ہی مشغولِ ذکر وفکر تھے کہ ۹ ربیع الأول بمطابق ۱۲ فروری ۶۱۰ء بروز پیر اور بعض اہلِ علم کے نزدیک ۲۱ رمضان بمطابق ۱۰ اگست ۶۱۰ء کو حضرت جبرائیلِ امین علیہ السلام تشریف لائے۔

تاریخِ نزولِ وحی میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تاریخِ اول ہم نے قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی رحمۃ للعالمین سے نقل کی ہے۔ بعض اہلِ علم نے ۲۱ رمضان بمطابق ۱۰ اگست ۶۱۰ء لکھی ہے جبکہ آپ ﷺ کی عمر قمری حساب سے ٹھیک چالیس سال چھے ماہ اور بارہ دن تھی اور شمسی حساب سے تقریباً ۳۹ سال تین ماہ اور بارہ دن تھی۔ آغازِ وحی رات کو ہوا۔[2]

آغازِ وحی پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا:

''اے محمد! (ﷺ) بشارت قبول فرمائیے۔ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرائیل ہوں۔''[3]

پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا:

«اِقْرَأْ» ''پڑھو'' تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا أَنَا بِقَارِئٍ» ''میں نہیں پڑھ سکتا ہوں۔''

پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو پکڑ کر بھینچا اور پھر چھوڑ کر کہا:

«اِقْرَأْ» ''پڑھو۔'' ایسے جب تین مرتبہ کیا تو پھر کہا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٩٥٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٠) عن عائشة رضي الله عنها.

[2] تفصیلاً دیکھیں: الرحیق المختوم (ص: ٧٥ـ ٧٦ معه حاشیه) رحمة للعالمین (١/ ٤٨)

[3] سفر السعادة (ص: ٣٥)

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسٰنَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ [العلق:۱۔ ۵]

''پڑھو (اے نبی!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جس نے جمے ہوئے خون (کے لوتھڑے) سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

یہ تیسویں پارے کی سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات ہیں جو پہلی وحی کے طور پر نبیِ اکرم ﷺ پر نازل ہوئی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد نبیِ اکرم ﷺ فوراً واپس گھر لوٹ آئے۔ آکر لیٹ گئے اور اپنی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

«زَمِّلُوْنِي۔ زَمِّلُوْنِي» ''مجھ پر کوئی کپڑا ڈال دو، مجھ پر کوئی کپڑا ڈال دو''

جب طبیعت میں ذرا سکون آیا تو اپنی زوجۂ طاہرہ سے فرمایا:

«قَدْ خَشِیْتُ عَلَیٰ نَفْسِيْ» ''مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہو گیا ہے۔''

صحیح بخاری و مسلم اور ترمذی شریف میں ہے کہ اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا:

« کَلَّا، اَبْشِرْ، فَوَاللّٰهِ لَا یُخْزِیْكَ اللّٰهُ اَبداً، اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَصْدُقُ الْحَدِیْثَ وَتَحْمِلُ الْکَلَّ وَتُکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتُقْرِی الضَّیْفَ وَتُعِیْنُ عَلَیٰ نَوَآئِبِ الْحَقِّ»[1]

''ہرگز نہیں، آپ مطمئن رہیں۔ آپ اقرباء پر شفقت کرتے، سچ بولتے، بیواؤں، یتیموں اور بے کسوں کی خبر گیری کرتے، مہمان نوازی فرماتے اور مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی اندوہ گین نہیں کرے گا۔''

ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کی شہادت:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جب نبی ﷺ سے پہلی وحی کے نزول پر اپنی جان کے خطرے کی بات

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۹۰۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٦۰) سنن الترمذي، رقم الحدیث (..........) سنن النسائی، رقم الحدیث (..........) عن عائشه رضی اللہ عنہا۔ الفتح الرباني (۲۰/ ۲۰۸۔ ۲۰۷) فقه السیرۃ (ص: ۸۸۔ ۸۹) زاد المعاد (۱/ ۱۹، ۲۰) رحمة للّعالمین (۱/ ٤٦۔ ٤۷) سیرت النبی ﷺ (۱/ ۱۹۹ تا ۲۰۲)

سنی تو فوری طور پر اپنے یقین کا اظہار کر دیا کہ جس شخص میں آپ ﷺ جیسی صفاتِ عالیہ پائی جاتی ہوں اسے اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا، آپ مطمئن رہیں۔ مگر اب خود حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کو اطمینانِ قلبی کی ضرورت محسوس ہوئی کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ لہٰذا وہ آپ ﷺ کو ساتھ لے کر اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں جو زمانۂ جاہلیت میں ہی بت پرستی سے بیزار ہو کر تلاشِ حق میں سرگرداں رہے اور بالآخر اپنی دانست کے مطابق اس وقت کے صحیح مذہب ''نصرانیت'' کو قبول کر لیا تھا۔ وہ عبرانی زبان میں پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے اور انجیل سے عبرانی میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ انتہائی عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کی بینائی کھو چکے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: اے میرے چچیرے بھائی! اپنے بھتیجے کی بات تو سنیں۔ ورقہ نے نبی ﷺ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا: اے بھتیجے! بتاؤ کیا ماجرا ہے؟ آپ ﷺ نے کیا دیکھا ہے؟ تو نبیِ اکرم ﷺ نے نزولِ جبرائیل علیہ السلام، وحی اور جو کچھ دیکھا، مِن وعَن سنا دیا۔

صحیح بخاری شریف میں یہ واقعہ بالتفصیل موجود ہے۔ ورقہ نے کہا:

« هَذَا النَّامُوسُ الَّذِيْ نَزَّلَهُ اللّٰهُ عَلَىٰ مُوسَىٰ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) يَا لَيْتَنِيْ فِيهَا جَذَعاً يَا لَيْتَنِيْ أَكُونُ حَيّاً، إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ »[1]

''یہی وہ ناموس ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب قوم آپ کو (شہر سے) نکال دے گی۔''

یہ باتیں اسے اس لیے معلوم تھیں کہ انجیل کے جزء یسعیاہ (باب۴۲) میں نبیِ رحمت ﷺ کی ہجرت کا ذکر موجود ہے۔ وہ چونکہ انجیل کا عالم تھا، لہٰذا جھٹ کہہ دیا کہ کاش میں اس وقت تمھارے کام آ سکتا جب تمھاری قوم تمھیں شہر سے نکال دے گی۔[2]

ورقہ بن نوفل کی یہ بات سن کر آپ ﷺ نے بڑے تعجب سے پوچھا:

« اَوَمُخْرِجِيَّ هُمْ؟ » ''کیا میری قوم کے لوگ ہی مجھے (شہر سے) نکال دیں گے؟''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠)

[2] رحمة للّعالمين (١/ ٤٨ حاشيه)

تو اس نے جواب دیا، ہاں۔ اور کہا:

«لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ اِلَّا عُوْدِيَ، وَاِنْ اَدْرَكَنِيْ يَوْمُكَ اَنْصُرْكَ نَصْراً مُؤَزَّراً»

''اس دنیا میں جس کسی نے بھی ایسی تعلیم پیش کی ہے جو آپ ﷺ پیش کریں گے تو (شروع میں) اس کے ساتھ عداوت ہی ہوتی رہی ہے۔ کاش میں یومِ ہجرت تک زندہ رہوں، اور اگر مجھے وہ دن دیکھنا نصیب ہوگیا تو میں آپ ﷺ کی نمایاں خدمت ومدد کروں گا۔''

مگر اس واقعے کے چند دن بعد ہی یہ بزرگ ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ وفات پا گئے۔[1]

پھر وحی کی آمد بھی بند ہوگئی۔ دوسری وحی کی آمد تک کے درمیان والا عرصہ ''فترتِ وحی'' کہلاتا ہے۔ اور یہ عرصہ صرف چند دنوں پر مشتمل تھا۔[2] اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ عرصہ ڈھائی یا تین سال کا تھا، صحیح نہیں۔[3]

جب آپ ﷺ کی طبیعت اچھی طرح پر سکون ہوگئی تو چند دنوں کے بعد پھر دوسری مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور بروایت صحیح بخاری وہ سورۃ المدثر کی ابتدائی پانچ آیات تھیں:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴾

[المدثر:١۔ ٥]

''اے کپڑا اوڑھنے والے، اٹھو (کھڑے ہو جاؤ) اور (لوگوں کو) آگاہ کرو، اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ اور گندگی (وناپاکی) سے دور رہو۔''

بخاری شریف میں اس روایت کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وحی کے رک جانے کی حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٣٠٢) و قد أخرجه في التفسير والتعبير أيضاً مع اختلاف يسير، حديث (٦٩٨٢) مختصر صحيح مسلم (١/ ٢٥)

[2] فتح الباري (١/ ٢٧، ١٢/ ٣٦٠)

[3] الرحيق المختوم (ص: ٧٨) شرح المواهب للزرقاني (١/ ٢٣٦) وغيره.

«فَبَيْنَا اَمْشِيْ سَمِعْتُ صَوْتاً مِنَ السَّمَآءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِيْ قِبَلَ السَّمَآءِ فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِيْ جَآءَنِيْ بِحِرَآءَ قَاعِدٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ، فُجُئِثْتُ مِنْهُ حَتّٰى هَوَيْتُ إِلَى الْأَرْضِ فَجِئْتُ إِلٰى اَهْلِيْ فَقُلْتُ: زَمِّلُوْنِيْ، زَمِّلُوْنِيْ، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ إِلٰى قوله: ﴿فَاهْجُرْ﴾، ثُمَّ حَمِيَ الْوَحْيُ وَتَتَابَعَ»[1]

''میں چلا جا رہا تھا کہ ناگہاں میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، پھر میں نے آسمان کی طرف اپنی نظر اٹھائی تو دیکھا کہ جو فرشتہ غارِ حراء میں میرے پاس آیا تھا وہ آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں مارے گھبراہٹ اور ڈر کے زمین کی طرف جھک گیا۔ پھر گھر آتے ہی میں نے اپنے اہل (بیوی) کو کہا: ''مجھ پر کوئی چادر ڈال دو۔ مجھ پر کوئی چادر ڈال دو۔'' تب اللہ تعالیٰ نے سورۃ مدثر کی ابتدائی (پانچ) آیات ﴿فَاهْجُرْ﴾ تک نازل فرمائیں۔ پھر برابر گرما گرمی سے وحی آنے لگی۔''

ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کی تصدیق اور ایمان

ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ بھی ایمان لائے تھے۔ ان کے ایمان لانے کا ثبوت وہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ان کے وفات پاجانے کے بعد نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں خواب میں بڑی اچھی شکل وصورت میں دیکھا۔ جو اس بات کی گواہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ان کا درجہ معزز ومکرّم شخص کا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«قَدْ رَأَيْتُهٗ، فَرَأَيْتُ عَلَيْهِ ثِيَابَ بَيَاضٍ فَاَحْسِبُهٗ لَوْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهِ بَيَاضٌ»

''تحقیق میں نے اُس [ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ] کو خواب میں سفید کپڑوں میں دیکھا ہے۔ میں گمان کرتا ہوں کے اگر وہ [ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ] اہلِ نار [دوزخ] میں سے ہوتا تو ان پر سفید کپڑے نہ ہوتے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٢٦)

اس حدیث کے دو طریق ہیں اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البداية والنهاية" (۳/ ۹) میں ان دونوں کو حسن قرار دیا ہے۔ اُن دونوں میں سے ایک کو امام احمد اپنی مسند میں عن عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے کو ابو یعلیٰ اپنی مسند میں عن جابر رضی اللہ عنہ لائے ہیں اور بقول شیخ البانی مجموعی طور پر یہ حدیث درجۂ حسن سے کم نہیں۔[1]

امام حاکم "المستدرك" میں ایک روایت لائے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَسُبُّوا وَرَقَةَ فَإِنِّي رَأَيْتُ لَهُ جَنَّةً أَوْ جَنَّتَيْنِ»[2]

''ورقہ کو برا مت کہو۔ میں نے اس کے لیے ایک جنت یا دو جنتیں دیکھی ہیں۔''

امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"صَحِيحٌ عَلٰى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ" ''یہ بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔''

امام ذہبی نے بھی اس بات پر ان کی موافقت کی ہے اور شیخ البانی نے ان دونوں کی تصدیق کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے:

"وَإِسْنَادُهُ جَيِّدٌ"[3] ''اس کی سند جید ہے۔''

خلاصہ:

دعوت و تبلیغ کے کام کو مخفی طور پر انجام دینے کے باوجود اسلام قبول کرنے والے اہلِ ایمان کی ایک مختصر سی جماعت بن گئی اور آہستہ آہستہ اس نئے دینِ اسلام کی خبر قریشِ مکہ تک پہنچ گئی، مگر انھوں نے سرِ دست اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ دَرپردہ تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ تین سالہ دور مکمل ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبیِ اکرم ﷺ کو علانیہ تبلیغ کرنے اور قریش کے باطل نظریات اور بت پرستی کی کھلے طور پر تردید کرنے کا حکم دے دیا۔[4]

---

[1] مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٣٦٧)

[2] البداية (٣/ ٩) المستدرك (٢/ ٤٠٩) مسند بزار في الأحكام الشرعة الكبرىٰ (٤/ ٤٦٩) سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث (٤٠٥) وصححه على شرط الشيخين في فقه السيرة (ص: ٩٥) ابن عساكر.

[3] تعليق شيخ البانى علىٰ فقه السيرة (ص: ١١٠) تصدیق و ایمانِ ورقہ بن نوفل کے بارے میں دیگر احادیث کے لیے دیکھیں: البداية (٣/ ٩، ١٠)

[4] رحمة للّعالمين (١ / ٤٩)

مکی دور میں دعوت کا پہلا مرحلہ...خفیہ تبلیغ

نبیِ رحمت ﷺ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی اور سیرت کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ بعثت سے لے کر مکی دور، دعوت، اس کی مشکلات، لوگوں کا قبولِ اسلام، کفار ومشرکین کی ایذا رسانی، اسراء ومعراج، ہجرتِ مدینہ، معاہدات، غزوات وسرایا، معجزات، خصائص، شمائل اور معمولاتِ مصطفیٰ ﷺ اور ایسے ہی کتنے دیگر عنوانات ہیں کہ ہر عنوان ایک ضخیم کتاب لکھنے کا متقاضی ہے۔ آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت یا تعلیماتِ مصطفیٰ ﷺ ایک ایسا عنوان ہے کہ چودہ سو سال سے اہلِ علم اسی موضوع پر لکھتے آر ہے ہیں اور قیامت تک لکھتے رہیں گے۔ آج اصولِ ستہ کے علاوہ اسلامی کتب خانوں میں پائی جانے والی تمام کتبِ حدیث کا موضوع، نبیِ اکرم ﷺ کا حسین نامۂ اعمال واقوال ہی تو ہے۔

منصبِ نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے کے بعد نبیِ اکرم ﷺ نے ۲۳ سالوں کے دوران میں دعوت الیٰ اللہ کا جو کام شروع فرمایا، ان میں سے پہلے مکی دور کے تیرہ سالوں کو ہم تین مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جن میں سے پہلا مرحلہ ''خفیہ اور دَر پردہ دعوت'' کا تھا جو ابتدائی تین سال کے عرصے پر مشتمل ہے۔

اس مرحلے میں آپ ﷺ نے علانیہ دعوت وتبلیغ کا کام نہیں کیا، بلکہ خفیہ طور پر ہی لوگوں کو دعوتِ توحید دیتے اور شرک کی برائی بیان کر کے اس سے روکتے تھے۔ اس مرحلے میں اسلام قبول کرنے والے سابقینِ اوّلین میں سے آپ ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، آپ ﷺ کے غلام حضرت زید بن حارث رضی اللہ عنہ، آپ ﷺ کے چچیرے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اور آپ ﷺ کے گہرے دوست حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ تمام حضرات دعوت وتبلیغ کا آغاز کرنے کے پہلے دن ہی مسلمان ہو گئے تھے اور ان قریبی حضرات کا ایمان لانا جو نبی ﷺ کی چالیس [۴۰] سالہ زندگی کی حرکات وسکنات تک سے واقف تھے، آپ ﷺ کی اعلیٰ صداقت اور راست بازی کی قوی دلیل ہے۔[1]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ایک معزز کاروباری آدمی تھے، انھوں نے بھی تبلیغِ اسلام کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح حضرت عثمانِ غنی، زبیر بن عوام، عبد الرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ

[1] فقه السيرة (ص: ١٠٠) الرحيق المختوم (ص: ٨٨)

اور عمرِ فاروق کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہم اور عورتوں میں سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی اُمّ فضل، اسماء بنت عمیس، اسماء بنت ابی بکر اور حضرت فاروقِ اعظم کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا مسلمان ہوئیں۔ یہ سب حضرات وخواتین اسلام کا ہراوّل دستہ ثابت ہوئے اور ان کے علاوہ بھی کثیر تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے جن میں ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔

دوسرا مرحلہ... علانیہ تبلیغ

جب سورۃ الشعراء (آیت: ۲۱۴) ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ نازل ہوئی جس میں حکم تھا: ''اپنے خاندان کے لوگوں اور قرابت داروں کو نارِ جہنم سے ڈرائیں۔'' تو اس آیت کے نزول کے ساتھ ہی حکمِ ربانی پر عمل کرتے ہوئے آپ ﷺ نے تبلیغ کا کام شروع کردیا۔ یہ علانیہ دعوت وتبلیغ کا مرحلہ بعثت کے چوتھے سال کے آغاز سے شروع ہوکر دسویں سال تک جاری رہا۔ معروف محدث و مورخ امام ابن اثیر رحمہ اللہ اپنی تاریخ ''الکامل'' میں لکھتے ہیں:

''ایک دن نبیِ اکرم ﷺ نے خاندانِ بنی ہاشم کو جمع کیا، تاکہ انھیں تبلیغ کریں، جب وہ جمع ہوگئے تو ابولہب نے الٹی سیدھی ہانکنی شروع کر دی جس کی وجہ سے آپ ﷺ اپنا مدّعا بیان نہ کر سکے۔ اگلے دن پھر سب کو دعوت دی اور چالیس پینتالیس آدمی جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے انھیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں تمھارے لیے بالخصوص اور عامتہ الناس کے لیے بالعموم رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

آپ ﷺ نے ذکرِ موت، فکرِ آخرت اور اعمالِ خیر وشر کے انجام اور جنت ودوزخ کا ذکر کیا اور پوچھا کہ اس دعوت میں تم میں سے میرا ساتھ کون دے گا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو ابھی نوعمر ہی تھے وہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں آپ ﷺ کا ساتھ دوں گا۔''

قبولِ اسلام کے وقت ان کی عمر کل نو یا دس سال تھی اور ان میں تین سال جمع کریں تو اس وقت ان کی عمر کل بارہ یا تیرہ سال بنتی ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: البداية والنهاية (٣/ ٢٤ تا ٢٦)

آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے بھی کہا کہ یوں تو آپ ﷺ کا سارا خاندان یہاں جمع ہے اور میں بھی اس میں سے ایک ہوں۔ البتہ میں اپنی طرف سے حلفیہ یقین دہانی کراتا ہوں کہ میں تاحینِ حیات آپ ﷺ کا ساتھ دیتا رہوں گا۔ آپ ﷺ جو کہنا چاہیں، کہیں۔ میں آپ ﷺ کے دشمنوں کا راستہ روکوں گا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے:

«اِنَّ نَفْسِیْ لَا تُطَاوِعُنِیْ عَلٰی فِرَاقِ دِیْنِ عَبْدِ الْمُطَّلَبِ»

''میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ میں اپنے باپ عبدالمطلب کا دین چھوڑ دوں۔''

واقعی ابو طالب نے عمر بھر دینِ اسلام کو قبول تو نہیں کیا، نہ ایمان لائے۔ مگر نبی ﷺ کی حمایت کا حق ادا کر دیا۔[1]

بخاری اور مسلم شریف میں ہے کہ جب آیت: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ نازل ہوئی تو نبی ﷺ کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور مختلف خاندانوں کے نام لے لے کر آوازیں دیں، جب وہ جمع ہو گئے تو فرمایا:

''اگر میں تمھیں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم مان جاؤ گے؟ ان سب نے کہا: "مَا جَرَّبْنَا عَلَیْكَ كِذْباً" ''ہم نے آپ (ﷺ) کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔'' تب آپ ﷺ نے فرمایا: « فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ» ''میں تمھیں عذابِ شدید سے ڈرانے والا ہوں۔''

یہ سنتے ہی ابولہب اٹھا اور بھڑک کر کہا:

"تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْیَوْمِ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا"

''تو ہلاک ہو جائے، کیا تو نے ہم سب کو صرف اسی لیے جمع کیا تھا؟''

اس کے جواب میں تیسویں پارے کی سورۃ اللہب ﴿تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ نازل ہوئی۔[2] جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] الكامل لابن الأثير كما نقله محمد الغزالي في فقه السيرة (ص: ٣-١٠٢) رحمة للّعالمين (١/ ٥٢)

[2] صحيح البخاري (٨/ ٤٠٠، ٤٠٨، ٥١٠) صحيح مسلم (١/ ١٣٤)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿ تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ ؕ‏ ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ؕ‏ ﴿۲﴾ سَيَصۡلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۖۚ‏ ﴿۳﴾ وَّامۡرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ‌ ۚ‏ ﴿۴﴾ فِىۡ جِيۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ﴾

''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ (خود بھی) ہلاک ہوا۔ اس کا مال اور اس کی کمائی کچھ اس کے کام نہ آئی۔ وہ عنقریب شعلہ مارتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ اور اس کی جورو بھی (ام جمیل) جو لکڑیاں اٹھائے پھرتی ہے۔ اس کی گردن میں چھال کی رسی ہے۔''[1]

بخاری و مسلم شریف میں ہی ہے کہ جب آیت ﴿ وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴾ نازل ہوئی تو آپ ﷺ اٹھے اور فرمایا:

''اے قریش کے لوگو! اپنی جانوں کو جہنم کی آگ سے بچالو، حکمِ الٰہی کے سامنے میں تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے بنی عبد المطلب! میں حکمِ الٰہی کے سامنے تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے میرے چچا عباس! میں حکمِ الٰہی کے سامنے تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اے میری پھوپھی صفیہ! میں حکمِ الٰہی کے سامنے تمھارے کسی کام نہ آسکوں گا۔ آخر میں اپنی بیٹی کو مخاطب کر کے فرمایا:

«يَا فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ! سَلِيْنِيْ مِنْ مَالِي مَا شِئْتِ، لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً»[2]

''اے میری پیاری بیٹی فاطمہ بنت رسول اللہ (ﷺ)! مجھ سے میرے مال میں سے جو کچھ چاہو مانگو، اور لے لو۔ لیکن (قیامت کے دن) حکمِ الٰہی کے سامنے میں تمھارے کسی کام نہیں آسکوں گا۔''

لمحۂ فکریہ:

بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں پائے جانے والے اس ارشادِ نبوی ﷺ کو بغور پڑھیں اور اندازہ کریں کہ آپ ﷺ نے کس طرح کھل کر فرما دیا ہے کہ میں ''مختارِ کل'' نہیں ہوں، بلکہ

---

[1] تفصیل کے لیے کتبِ تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] حوالہ جات سابقہ.

حکمِ الٰہی کے سامنے کسی کے کام نہیں آسکوں گا۔ یہ ارشادِ نبوی ﷺ ہمارے ان بھائیوں کے لیے خاص طور پر لمحۂ فکریہ ہے جو آپ ﷺ کی شفاعت کے بھروسے پر عملی میدان سے ہٹے بیٹھے ہیں۔ وہ سوچ لیں کہ آپ ﷺ اپنی سب سے پیاری بیٹی کو دنیاوی مال دینے کا تو فرما رہے ہیں، مگر آخرت میں صرف اپنے عمل ہی سے نجات کا پیغام سنا رہے ہیں۔ رہا مسئلہ شفاعت کا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف آپ ﷺ کو ضرور بخشا ہے مگر ہوگا اسی کے حکم سے، جیسا کہ آیت الکرسی میں ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾

''اس کے حکم کے بغیر کوئی شخص کسی کی سفارش نہیں کر سکے گا۔''

اور جس شخص نے زندگی بھر اللہ کے احکام وفرامین کی نافرمانی کی ہوگی تو کیا اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت کرنے کی بھی اجازت دیں گے؟ یہ نظریہ نہ صرف یہ کہ قرینِ قیاس نہیں، بلکہ جنت الحمقاء میں رہنے والی بات ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا أُولِی الْأَبْصَارِ.

کفار ومشرکین کی ایذا رسانی

علانیہ دعوت وتبلیغ کا حکم ملتے ہی نبیِ رحمت ﷺ نے نہ صرف اہلِ خاندان وقبیلہ بلکہ عام لوگوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دینا شروع کر دی تھی اور خاص طور پر جب سورۃ الحجر آیت (۹۴) ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ نازل ہوئی تو اس میں حکم تھا کہ ''آپ (ﷺ) کو جو حکم دیا گیا ہے وہ کھول کر لوگوں کو سنا دیں۔'' لہٰذا اب آپ ﷺ میدانِ دعوت وتبلیغ میں مزید سرگرمِ عمل ہو گئے، حتیٰ کہ آپ ﷺ عُکاظ، مجنّہ اور ذی المجاز نامی میلوں میں جانکلتے جہاں دور دراز سے لوگ آتے تھے۔ وہاں انھیں توحید ورسالت کی دعوت دیا کرتے تھے۔[1]

یہی وہ دَور ہے جس میں کفار نے حضرت عمار بن یاسر اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا۔[2] بلال وخباب اور

---

[1] رحمة للّعالمين (١/ ٥٤)

[2] انہی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما اور سمیہ رضی اللہ عنہا کو تکلیفیں برداشت کرتے دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: ''اے آلِ یاسر! صبر کرو، تمھارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔'' سيرة ابن إسحاق (١/ ٢٠٣) المستدرك للحاكم (٢/ ٨٩۔ ٣٨٨) وقال: صحيح علىٰ شرط مسلم، ووافقه الذهبى وحسنه وصححه الألباني، فقه السيرة (ص: ١٠٧۔ ١٠٨)

دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو دل گداز تکلیفیں دیں اور خود نبیِ رحمت ﷺ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں۔ آپ ﷺ کے راستوں میں کانٹے بچھائے گئے۔ گھر کے سامنے گندگی پھینکی، عفونت پھیلائی، دورانِ نماز و سجدہ آپ ﷺ کی پشتِ مبارک پر اونٹ کی غلاظت بھری اوجڑی ڈالی گئی۔ آپ ﷺ کو (نعوذ باللہ) دیوانہ، شاعر، کاہن اور جادوگر کہا گیا اور آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازشیں کی گئیں۔ مگر وہ کیا جانیں ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

موسمِ حج آیا تو مشرکین نے ابولہب کی سربراہی میں پچیس سرداروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی،[1] جس کا مقصودِ وحید نبی ﷺ کی تکذیب و استہزاء تھا، انھوں نے مکہ میں داخل ہونے والے تمام راستوں پر اپنے آدمی مقرر کر دیے کہ باہر سے آنے والے حجاج و زائرین کو بہکائیں، اکسائیں اور کردارکشی والزام تراشی کے ذریعے ان لوگوں کو آپ ﷺ سے متنفر کر دیں، مگر آپ ﷺ نے اپنا کام جاری رکھا۔ جیسا کہ ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ موسمِ حج میں میدانِ عرفات میں کھڑے ہو جاتے اور فرماتے:

«أَلَا رَجُلٌ يَحْمِلُنِيُ اِلَىٰ قَوْمِهٖ فَاِنَّ قُرَيْشاً مَنَعُوْنِيُ اَنْ أُبَلِّغَ كَلَامَ رَبِّيُ»[2]

''کوئی آدمی مجھے اپنے ساتھ اپنی قوم کے پاس لے جائے کیوں کہ قریش نے مجھے کلامِ الٰہی کی تبلیغ سے روک رکھا ہے۔''

مشرکین نے اپنے تمام اوچھے ہتھکنڈے ناکام ہوتے دیکھے تو دوسرا حربہ استعمال کیا۔ کہنے لگے: آؤ کچھ لو اور کچھ کمپرومائیز یا مصالحت کر لیں، کچھ باتیں ہم اپنے آبائی دین کی چھوڑ دیتے ہیں، کچھ آپ چھوڑ دیں۔

---

[1] اس کمیٹی کے افراد اور ان کی کارکردگی کی تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''حقوقِ مصطفی ﷺ اور گستاخِ رسول ﷺ کی شرعی سزا''

[2] سنن أبي داود (٢/ ٢٧٨) سنن الترمذي (٤/ ٥٧) سنن ابن ماجه (١/ ٧٨) المستدرك للحاكم (٢/ ١٣۔ ٦١٢) وقال: صحيح علىٰ شرط الشيخين ووافقه الذهبي وصححه الألباني فقه السيرة (ص: ١١١) پچیس سرداروں اور ابولہب کی سربراہی کا ذکر ''رحمة للّعالمين'' (١/ ٥٧) میں ہے۔

﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ [القلم: ٩]

''یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نرمی اختیار کرو تو یہ بھی نرم ہو جائیں۔''

ابن جریر طبری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ پیش کش کی کہ ایک سال آپ ﷺ ہمارے معبودوں کی پوجا کریں اور ایک سال تک ہم آپ ﷺ کے معبود کی عبادت کریں گے۔ جبکہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہنے لگے:

''آپ ﷺ صرف ہمارے معبودوں کو برحق تسلیم کر لیں، تب بھی ہم آپ ﷺ کے معبود کی پوجا شروع کر دیں گے۔''

امام ابن اسحاق بیان کرتے ہیں:

''نبی ﷺ ایک دن طواف کر رہے تھے کہ چند سردارانِ قبائل اسود بن مطلب بن اسد، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف اور عاص بن وائل سہمی نے آپ ﷺ سے کہا کہ ہم مل جل کر ایک دوسرے کے معبودوں کی عبادت کیوں نہ کر لیا کریں؟''[1]

اسی قسم کے دیگر مطالبات کے جواب میں تیسویں پارے کی سورت کافرون ﴿قُلْ يَآاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ...الخ﴾ نازل ہوئی۔ جب اسی طرح علانیہ تبلیغ کو دو سال گزر گئے اور بعثت کو پانچ سال ہو گئے تو آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرتِ حبشہ کی اجازت دے دی۔ پہلا قافلہ بارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل تھا، جن میں نبی ﷺ کی بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور آپ ﷺ کے داماد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔[3]

دوسرا قافلہ تراسی مردوں اور اٹھارہ عورتوں پر مشتمل تھا جن میں سے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کا دربارِ نجاشی میں دیا گیا تاریخی خطبہ معروف ہے۔ اس نجاشی کا نام اصحمہ تھا وہ ۹ ہجری کو فوت ہوئے۔ صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ

---

[1] الرحيق المختوم (ص: ٩٦)

[2] یہ نام سیرت ابن هشام (١/ ٣٦٢) اور الرحيق المختوم (ص ٩٨) میں ہیں۔ اور سورۃ الکافرون کے نزول کے سبب کے لیے دیکھیں: تفسير زاد المسير لابن الجوزي (٩/ ٥٣۔ ٢٥٢) تفسير القرطبي (١٠/ ٣٠/ ٢٢٥)

[3] زاد المعاد (١/ ٢٤) رحمة للعالمين (١/ ٥٨) فقه السيرة (ص: ١١٥)

نبی ﷺ نے ان کی نمازِ جنازہ غائبانہ ادا فرمائی تھی۔[1]

اس سے قبل نبی ﷺ کو ذہنی کوفت پہنچانے کے لیے ابولہب ملعون نے اپنے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو زبردستی حکم دے دیا کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں، کیوں کہ ان دونوں کی بیویاں نبی ﷺ کی بیٹیاں (حضرت رقیہ و اُم کلثوم رضی اللہ عنہا) تھیں جو بعد میں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔[2]

ترغیب وترہیب:

نبیِ اکرم ﷺ کی شبانہ روز تبلیغی مساعی کی برکت سے نورِ اسلام پھیلنے لگا اور صدائے اسلام مکہ سے نکل کر حبشہ تک جا پہنچی تو قریشِ مکہ بوکھلا گئے۔ ایذا رسانی کے تمام حربے ناکام ہوتے دیکھے تو ترغیب وترہیب کا ہتھکنڈہ طے کیا۔ مکہ کے مالدار سردار عتبہ کو آپ ﷺ کے ساتھ مذاکرات کے لیے بھیجا، اس نے کہا:

اے میرے بھتیجے محمد (ﷺ)! گر آپ اپنی اس تبلیغی کارروائی سے دولت سمیٹنا چاہتے ہیں تو ہم سارے ملکِ عرب کے اموال آپ (ﷺ) کے قدموں میں ڈھیر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر عزت اور نام ونمود کی طلب ہے تو ہم آپ (ﷺ) کو اپنا رئیس وسردار مان لیتے ہیں۔ اگر حکومت کی تمنا ہے تو ہم آپ (ﷺ) کو سارے ملکِ عرب کا بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ بس یہ تبلیغ چھوڑ دو۔

آپ ﷺ نے ان تمام چیزوں کو نوکِ پا سے ٹھکراتے ہوئے سورت حم السجدۃ ﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کی پہلی آٹھ آیات کی تلاوت کر کے اصل حقیقت واضح کر دی جن میں ارشادِ الٰہی ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٣٩) سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٣٥) مسند أحمد، رقم الحديث (١٩٨٩٠) وصححه الأرناؤوط.

[2] في ظلال القرآن (٣٠/ ٢٨٢) تفهيم القرآن (٦/ ٥٢٢)

أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَآ إِلَيْهِ وَفِىٓ ءَاذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَٱعْمَلْ إِنَّنَا عَٰمِلُونَ ﴿٥﴾ قُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَىَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ فَٱسْتَقِيمُوٓا۟ إِلَيْهِ وَٱسْتَغْفِرُوهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ﴿٦﴾ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ وَهُم بِٱلْءَاخِرَةِ هُمْ كَٰفِرُونَ ﴿٧﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴾

’’حٰمٓ ۔ اس بے حد رحم والے، نہایت مہربان کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔ ایسی کتاب جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی قرآن ہے، ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا، تو ان کے اکثر نے منہ موڑ لیا، سو وہ نہیں سنتے۔ اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں ایک بوجھ ہے اور ہمارے درمیان اور تیرے درمیان ایک حجاب ہے، پس تو عمل کر، بے شک ہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔ کہہ دے میں تو تمھارے جیسا ایک بشر ہی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، سو اس کی طرف سیدھے ہو جاؤ اور اس سے بخشش مانگو اور مشرکوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔ وہ جو زکات نہیں دیتے اور آخرت کا انکار کرنے والے بھی وہی ہیں۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے ختم نہ کیا جانے والا اجر ہے۔‘‘

عتبہ یہ سب سن کر واپس لوٹا تو سردارانِ قریش کو جا کہا کہ میں وہ کلام سن کر آیا ہوں جو کہانت ہے نہ شعر اور جادو ہے نہ منتر۔ تو وہ کہنے لگے: لو! عتبہ پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔[1]

سوشل بائیکاٹ:

جب ترغیب و لالچ کا یہ تیر بھی نہ چلا تو وہ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے پاس گئے اور یہ دھمکی دے دی کہ اپنے بھتیجے کو باز کر لو ورنہ ہم اسے قتل کر دیں گے اور تم اکیلے ہم سب کا کچھ نہیں بگاڑ

[1] سیرت ابن هشام (١/ ١٠٠) تفسير ابن كثير (٤/ ٩٠، ٩١) رحمة للعالمين (١/ ٥٩، ٦٠) وحسنه الألباني، فقه السيرة (ص: ١١٣)

سکو گے۔ مشرکین کے اس بدلتے ہوئے تیور کو دیکھ کر ابو طالب نے آپ ﷺ کو بلا بھیجا اور فہمایش کرنا چاہی تو ایک متکلّم فیہ روایت میں ہے کہ آپ (ﷺ) نے فرمایا:

«يَا عَمَّاهُ، وَاللّٰهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَالْقَمَرَ فِيْ شِمَالِيْ عَلَىٰ أَنْ أَتْرُكَ هَذَا الْأَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أَوْ أُهْلَكَ فِيْهِ مَا تَرَكْتُهُ»[1]

''چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں اور چاہیں کہ میں تبلیغِ اسلام چھوڑ دوں تو بھی میں نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا دین غالب ہو جائے یا میری جان جاتی رہے۔''[2]

اسی دوران میں نبوت کے چھٹے سال حضرت حمزہ اور عمرِ فاروق رضی اللہ عنہما مسلمان ہو گئے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے دعا مانگی تھی:

«اَللّٰهُمَّ أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِأَحَبِّ الرَّجُلَيْنِ بِأَبِيْ جَهْلٍ أَوْ بِعُمَرَ فَكَانَ أَحَبُّهُمَا إِلَيْهِ عُمَرُ»

''اے اللہ! دو آدمیوں، ابو جہل اور عمر میں سے جو تجھے زیادہ پسند ہو اس کے ساتھ اسلام کو عزت دے۔ پس اللہ تعالیٰ کو ان دونوں میں سے حضرت عمر زیادہ پسند تھے۔''

یعنی ان کا مسلمان ہونا زیادہ محبوب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے۔[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''اَللّٰهُمَّ أَعِزَّ بِالْإِسْلَامِ، لِأَنَّ الْإِسْلَامَ يُعِزُّ وَلَا يُعَزُّ''

''اے اللہ! (عمر یا ابو جہل کو) اسلام کے ساتھ عزت بخش۔ کیوں کہ اسلام عزت دیتا

---

[1] یہ حدیث ابن اسحاق کے طریق سے ابن جریر (۲/ ۶۷) نے بھی بیان کی ہے اور اس کی سند معضل ہے۔ طبرانی کبیر واوسط میں بھی قدرے اختصار کے ساتھ یہ روایت موجود ہے اور علامہ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' (٦/ ١٥) میں لکھا ہے: رواه أبو يعلى باختصارٍ يسيرٍ من أوله، ورجال أبي يعلى رجال الصحيح۔ البتہ شیخ البانی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (فقه السيرة، ص: ١١٤، ١١٥)

[2] سيرت ابن هشام (١/ ٨٥) فقه السيرة (ص: ١١٤۔ ١١٥) رحمة للعالمين (١/ ٦٠)

[3] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨١) مسند أحمد، رقم الحديث (٥٦٩٦) وصححه أحمد شاكر (٨/ ٦٠) فتح الباري (٧/ ٥٩)

ہے۔کوئی شخص اسلام کے لیے باعثِ عزت نہیں ہوتا۔‘‘

ابوبکر تاریخی نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:«اَللّٰھُمَّ أَیِّدِ الْإِسْلَامَ...» کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: معاذ اللہ۔ اس سے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ کی ہی تائید ہوتی ہے۔[1]

حضرت حمزہ اور عمرِ فاروق رضی اللہ عنہما کے اسلام لانے کے بعد چھپ چھپ کر نمازیں پڑھنے والے، بیت اللہ میں نمازیں ادا کرنے لگے،تو مشرکینِ مکہ نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی پھینک دیا کہ نبوت کے ساتویں سال ماہِ محرم میں بنی ہاشم سے مکمل سوشل بائیکاٹ کر دیا اور اس معاہدے کی تحریر بابِ کعبہ پر لٹکا دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلے کے ساتھ خرید وفروخت، لین دین اور اٹھنا بیٹھنا ترک کر دیا تو بنی ہاشم ناچار شعبِ ابی طالب میں محبوس ومحصور ہوگئے۔مشرکین نے اشیائے خوردنی بند کردیں۔ یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس بائیکاٹ کی تحریر کا لکھنے والا بغیض بن عامر تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دعا کی وجہ سے اس کا (تحریر لکھنے والا) ہاتھ شل ہوگیا تھا۔[2]

امام سہیلی رحمہ اللہ نے اس بائیکاٹ کے دوران میں پیش آمدہ مشکلات بھی ذکر کی ہیں کہ اشیائے خوردنی نہ ہونے کی وجہ سے پتے کھاتے اور پائخانے کے بجائے مینگنیاں کرتے۔حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک رات چلتے ہوئے کوئی تر چیز میرے پاؤں کو لگی تو میں نے بھوک کے مارے فوراً پکڑ کر نگل لی اور مجھے آج تک معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز تھی؟ نیز فرماتے ہیں کہ ایک رات میرے ہاتھ اونٹ کا کوئی سوکھا ہوا چمڑہ لگ گیا۔ میں نے اسے دھویا، آگ پر بھونا اور پانی میں بھگو کر تین دن تک کھایا۔[3]

شعبِ ابی طالب کا یہ سارا عرصہ بڑی مشکل کا وقت تھا،مگر بنی ہاشم کے پائے استقلال میں لرزش نہ آئی۔ اشارۂ الٰہی سے اس معاہدے کو دیمک چاٹ گئی اور صرف اللہ تعالیٰ کا نام باقی رہ گیا۔

---

[1] الروض الأنف (۳/ ۲۷۲)

[2] زاد المعاد (۲/ ٤٦)

[3] الروض الأنف (۳/ ۳٥٤)

ادھر قریش نے خود ہی اس معاہدے کو ختم کر دیا۔ اس طرح نبوت کے دسویں سال ماہِ محرم میں ہی یہ قبیلہ شعبِ ابی طالب سے نکل آیا۔[1]

اس بائیکاٹ کو ختم ہوئے ابھی چھے ماہ ہی گزرے تھے کہ آپ ﷺ کے شفیق چچا ابو طالب فوت ہو گئے جو آپ ﷺ کے لیے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتے تھے، مگر مرتے دم تک دولتِ ایمان نصیب نہ ہوئی، جیسا کہ بخاری شریف میں ہے کہ ابو طالب کی وفات کے وقت یہ الفاظ ان کی زبان پر تھے: ''عَلٰی مِلَّۃِ عَبْدِ الْمُطَّلَبِ'' ''میں عبد المطلب کے دین پر (مررہا) ہوں۔'' کیوں کہ ابو جہل (ملعون) وغیرہ اسی بات پر کوشاں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ نے منع نہ کیا میں تمھارے لیے استغفار کروں گا۔ تو سورۃ التوبہ (آیت: ۱۱۳) نازل ہوگئی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾

''پیغمبر اور مسلمانوں کو شایان نہیں کہ جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ مشرک اہلِ دوزخ ہیں تو اُن کے لیے بخشش مانگیں، گو وہ اُن کے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں۔''

سورۃ القصص آیت (۵۶) بھی نازل ہوئی جس میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾

''(اے نبی!) تم جس کو دوست رکھتے ہو اُسے ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے، اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔''

ان آیات میں آپ ﷺ کو ان کے لیے استغفار کرنے سے منع کر دیا گیا تھا، لیکن آپ ﷺ کی حمایت کی وجہ سے ان کے عذاب میں کافی تخفیف ہوگی۔ جیسا کہ بخاری شریف میں ہے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٢١٦) باب تقاسم المشركين على النبيﷺ(١/ ٥٤٨) زاد المعاد (١/ ٢٩٩) طبقات ابن سعد اردو (١/ ٣٩٩ـ ٣٩٨) الرحيق المختوم (ص: ١٢٥ تا ١٢٨)

[2] انظر صحيح البخاري (١/ ٥٤٨) باب قصة أبي طالب.

ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات اور آپ ﷺ کی دوسری شادی

ابو طالب کی وفات کے صرف دو ہی ماہ بعد اور بعض کے نزدیک صرف تین دن بعد آپ ﷺ کی جلیل القدر زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا بھی وفات پا گئیں۔ جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں، نبی ﷺ نے دوسری کوئی شادی نہیں کی۔ ان کے وفات پا جانے کے بعد ۱۰ عہد نبوت میں ماہِ شوال میں ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔[1] وفات کے وقت حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کی عمر پینسٹھ سال اور نبی ﷺ کی عمر پچاس برس تھی۔[2]

عام الحزن:

شفیق چچا اور زوجۂ محترمہ کی وفات سے آپ ﷺ کو اس قدر صدمہ اور غم ہوا کہ اس سال کا نام ہی عام الحزن ''سالِ غم'' رکھ دیا گیا۔ یہ سال تاریخِ اسلام میں اسی نام سے معروف ہے۔

دعوت و تبلیغ کا تیسرا مرحلہ اور سفرِ طائف

نبیِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے مشرکین نے مکہ کی زمین تنگ کر دی اور ایذا رسانی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ مگر اہلِ ایمان کے پائے صبر و ثبات میں لرزش نہ آئی، بلکہ ہر طرف سے یہی جواب آیا: ع

یہ وہ نشہ نہیں کہ تُرشی جسے اتار دے

نبیِ رحمت ﷺ اپنے قدسی نفوس صحابہ رضی اللہ عنہم کی کشتِ ایمان کی آبیاری کرتے رہے اور کھلے عام عرب و عجم پر حکومت کی بشارتیں دیتے ہوئے فرماتے:

«يَأَيُّهَا النَّاسُ: قُوْلُوْا لاَ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا وَ تَمْلِكُوا الْعَرَبَ وَتَدِيْنُ لَكُمْ بِهَا الْعَجَمُ فَاِذَا مِتُّمْ كُنْتُمْ مُلُوْكاً فِي الْجَنَّةِ»[3]

---

[1] تلقیح (ص: ۱۰) رحمة للعالمین (۲/ ۱۵٦) الرحیق المختوم (ص: ۱۳٤)

[2] تلقیح (ص: ۷) رحمة للعالمین (۲/ ۱٦٤) الرحیق (ص: ۱۳۲) طبری اُردو (۱/ ۱۰۷)

[3] سنن الترمذي بحواله الرحیق المختوم (ص: ۱٤۰)

”اے لوگو! لا الٰہ الّا اللہ کہہ دو فلاح پا جاؤ گے۔ عرب وعجم کے مالک بن جاؤ گے اور اسی اسلام کی حالت میں مرنے پر جنت کے بادشاہ بنو گے۔“

اسی مشکل دور میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصّٰفّٰت (آیات: ۱۷۱ تا ۱۷۳) نازل فرما کر اہلِ اسلام کی ڈھارس بندھائی اور یقین دہانی کرائی کہ عنقریب آپ لوگ ہی غالب آئیں گے۔ چنانچہ سورۃ الصّٰفّٰت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾

”اور ہم تو پہلے ہی اپنے بھیجے ہوئے بندوں (پیغمبروں) کے باب میں فرما چکے ہیں کہ (آخر ایک روز) ضرور ان کو (ہماری) مدد پہنچے گی اور ضرور ہمارا لشکر غالب ہوگا۔“

اب نبیِ اکرم ﷺ نے مکہ سے باہر کے علاقوں میں بھی دعوت وتبلیغ کا آغاز کر دیا جسے مکی زندگی میں آپ ﷺ کی تبلیغِ اسلام کا تیسرا مرحلہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کا آغاز نبوت کے دسویں سال ماہِ شوال (اواخرِ مئی یا اوائلِ جون ۶۱۹ء) میں ہوا۔ یہ مرحلہ ہجرت تک جاتا ہے۔ بیرونِ مکہ تبلیغ کرنے کے لیے آپ ﷺ نے ماہِ شوال میں طائف کا رخ فرمایا۔[1] اس سفر میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ آپ ﷺ راستے میں آنے والے تمام قبائل کو اسلام کی دعوت دیتے گئے، مگر کسی نے بھی قبول نہ کی۔ آخر پچاس (۵۰)، ساٹھ (۶۰) میل (تقریباً ۸۰ کیلومیٹر) کی مسافت پیدل طے کر کے آپ ﷺ طائف پہنچے۔ بنی ثقیف کے سرداروں عبد یالیل، مسعود اور حبیب کو جمع کیا جو سگے بھائی اور عَمر و بن عمیر ثقفی کے بیٹے تھے۔ انھیں اسلام کی دعوت دی مگر انھوں نے قبول نہ کی۔ آپ ﷺ دس دن تک طائف میں رکے رہے، ہر کہہ و مہہ کو تبلیغ کی۔ ان لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بجائے آپ ﷺ کو شہر سے نکال دیا اور بچوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا جو اُول فول بکتے اور آپ ﷺ کو کنکر پتھر مارتے شہر سے تین میل باہر تک چھوڑ گئے۔

طائف سے تین میل باہر ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا باغ تھا۔ وہاں آپ ﷺ انگوروں کی

---

[1] تاریخ اسلام نجیب آبادی (۱/۱۲۲)

بیلوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔ عتبہ وشیبہ نے جب آپ ﷺ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کو کچھ انگور دے کر بھیجا۔ اس غلام کا نام عدّاس تھا جو عیسائی تھا اور اصلاً حضرت یونس علیہ السلام کے شہر نینویٰ کا رہنے والا تھا۔ جب آپ ﷺ بسم اللہ پڑھ کر انگور کھانے لگے تو اس نے کہا کہ یہ کلمہ تو یہاں کے لوگ نہیں کہتے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''تُو کہاں کا رہنے والا ہے؟'' تو اس نے بتایا: نینویٰ کا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جہاں کے حضرت یونس بن متّٰی علیہ السلام تھے؟'' اس نے پوچھا: آپ ﷺ کو کیسے معلوم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ بھی میرا بھائی پیغمبر تھا اور میں بھی اللہ کا رسول ہوں۔'' اس پر وہ آپ ﷺ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ ادھر عتبہ وشیبہ دیکھ کر کہنے لگے: لو یہ گیا کام سے۔ جب عدّاس ان کے پاس گیا تو کہنے لگے کہ تم اسے ایسے کیوں چوم رہے تھے؟ تو اس نے کہا: اس وقت کرۂ ارضی پر ان سے بڑھ کر بہتر کوئی شخص نہیں۔ اُس نے مجھے ایسی بات بتائی ہے جو کوئی نبی ہی بتا سکتا ہے، تو انھوں نے اسے ڈانٹ دیا اور کہا کہ تمھارا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔ کہیں اپنا دین نہ چھوڑ بیٹھنا۔[1]

صحیح بخاری ومسلم شریف میں ہے کہ جب نبی ﷺ مکہ سے آتے ہوئے قرن الثعالب (موجودہ نام قرن المنازل) پہنچے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور فرمایا:

«اِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ وَمَا رَدُّوْا عَلَيْكَ»

''اللہ تعالیٰ نے تیری قوم کا رویہ دیکھ لیا ہے اور جو جواب انھوں نے دیا ہے، وہ بھی سن لیا ہے۔''

نیز فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے۔ آپ اسے جو حکم دیں گے تعمیل ہوگی۔''

اتنے میں پہاڑوں کے فرشتے نے کہا:

«اِنْ شِئْتَ اَنْ اُطْبِقَ عَلَيْهِمُ الْاَخْشَبَيْنِ لَفَعَلْتُ»

''اگر آپ حکم دیں تو ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ملا دوں اور ان لوگوں کو پیس کر رکھ

---

[1] رحمة للعالمين (١/ ٦٦۔ ٦٧) طبری اردو (١/ ١٠٨ تا ١١٠)

دوں۔ (جنھوں نے آپ کا یہ حال کیا ہے)۔''

لیکن نبیِ رحمت ﷺ نے فرمایا:

«بَلْ أَرْجُوْ أَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَحْدَهٗ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا»[1]

''(انھیں ہلاک نہ کرو کیونکہ) مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ان لوگوں کی نسلوں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''

اسی راستے میں وادیِ نخلہ بھی پڑتی ہے۔ واپسی پر آپ ﷺ نے وہاں بھی چند دن قیام فرمایا۔ اسی قیام کے دوران میں جنوں نے آپ ﷺ سے قرآن سنا اور ایمان لائے، جیسا کہ سورۃ الأحقاف (آیت: ۲۹ تا ۳۱) اور سورۃ الجن کی آیت ﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ...﴾ میں مذکور ہے۔

اس طویل وشاق سفر میں کوئی بنی بشر مسلمان نہ ہوا۔ صرف عدّاس نے آپ ﷺ کی نبوت کو تسلیم کیا، مگر مالکوں کے ہاتھوں دب گیا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کو بھیج دیا اور انھوں نے قرآن سنا تو مسلمان ہوگئے۔ اس طرح یہ سفر بھی کلیتاً لا حاصل نہ رہا۔ ماہِ ذو القعدہ میں (۱۰ نبوت۔ اواخرِ جون یا اوائلِ جولائی ۶۱۹ء) آپ ﷺ واپس مکہ مکرّمہ پہنچ گئے اور موسمِ حج پر آپ ﷺ نے دور دراز سے آنے والے قبائل وافراد کو اسلام کی دعوت دی۔[2]

تیسری شادی:

نبوت کے گیارھویں سال ماہِ شوال میں آپ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بنت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) سے نکاح کیا جبکہ ان کی عمر صرف چھے برس تھی۔ پھر ہجرت کے پہلے سال ماہِ شوال میں مدینہ منورہ جا کر ان کی رخصتی عمل میں آئی، جبکہ ان کی عمر نو برس ہوچکی تھی۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۳۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۹۵)

[2] طبقات ابن سعد اردو (۱/ ۳۱۱۔ ۳۱۰) طبری اردو (ص: ۱۰۸ تا ۱۱۰)

[3] صحيح البخاري (۱/ ۵۵) صحيح مسلم (٤/ ۱٤۰) مسند أحمد (٥/ ۲۸۰) تلقيح (ص: ۱۰) الرحيق المختوم (ص: ۱٥٤)

یہ صرف واحد زوجۂ محترمہ تھیں جو آپ ﷺ سے نکاح کے وقت کنواری تھیں۔ ورنہ باقی سب بیوہ تھیں۔ آپ ﷺ کے کثرتِ ازدواج میں گونا گوں مصلحتیں پوشیدہ تھیں جنھیں ہم نے اس کتاب کے حصہ دوم کے آخر میں قدرے تفصیل سے ذکر کردیا ہے۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ.

شقِ صدر اور اسراء ومعراج

جب نبیِ رحمت ﷺ کو بارِ رسالت اٹھائے تقریباً نصف عہدِ نبوت گزر گیا اور کفار ومشرکین کی طرف سے ایذا رسانی کی حد ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے کفّار کی طرف سے نبی ﷺ کو دیے جانے والے مصائب و آلام کا اثر کم کر نے، میدانِ دعوت وتبلیغ میں لگنے والے ذہنی وجسمانی زخموں کو مندمل کر نے، آپ ﷺ کی دل جمعی وحوصلہ افزائی اور عزّت نوازی وشرف افزائی کے لیے ایک ایسی عظیم ومبارک سیاحت کا انتظام فرمایا جو نہ صرف ایک سیاحت وزیارت تھی، بلکہ آپ ﷺ کے نبی ورسولِ برحق ہونے پر دلالت کرنے والے کثیر معجزات میں سے ایک عظیم الشان معجزہ بھی تھی، جو قرآن وسنت اور کتبِ تاریخ وسیرت میں اسراء ومعراج کے نام سے معروف ہے۔ یہ معجزہ نبوت کے بارھویں سال ماہِ رجب کی ستائیس تاریخ اور بدھ کی رات کو پیش آیا، جبکہ آپ ﷺ کی عمرِ شریف باون سال ہوچکی تھی۔[1]

علامہ منصور پوری نے محققین کی تحریروں اور اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے ماہ وسال کی یہ تعیین کی ہے۔[2]

عالمِ ملکوت کے اس سفر پر روانگی سے قبل آپ ﷺ کی شایانِ شان تیاری کرائی گئی تا کہ جہاں آپ ﷺ کی عزّت واکرام دو چند ہوں، وہیں مناجاتِ الٰہی کی استعداد میں بھی اضافہ ہو، اور یہ خاص تیاری تھی۔ آپ ﷺ کا ایک مرتبہ پھر شقِ صدر کیا جانا اور دلِ اقدس میں ایمان وحکمت بھرنا رونما ہوا تھا۔[3]

---

[1] الرحیق (ص: ۱۵۵)

[2] تفصیل کے لیے: رحمة للّعالمین (۳/ ۱۲۵۔ ۱۲۶) امام طبری (۱/ ۸۰ اردو) نے نبوت کے پہلے سال اور امام نووی وقرطبی نے پانچویں سال اور بعض نے تیرھویں سال میں معراج کا ذکر کیا ہے۔

[3] قاله الحافظ في الفتح كما نقله عنه البنا في بلوغ الأماني من أسرار الفتح الرباني (۲۰ / ۱۹۶)

اسراء ومعراجِ مصطفےٰ ﷺ کا یہ واقعہ اٹھائیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بخاری ومسلم، بلکہ کتبِ ستہ اور دیگر کتبِ حدیث میں سے پچیس تیس کتابوں میں مذکور ہے۔[1] اس سفر پر روانگی کے وقت آپ ﷺ کہاں اور کس حالت میں تھے؟ اور کیسے کیسے پہنچے؟ کس کس سے ملے؟ کیا کیا دیکھا؟ اور اس سفرِ مبارک میں کیا کیا پایا؟ یہ سب امور بڑے تفصیل طلب ہیں۔[2]

مختصر یہ کہ بروایت صحیح بخاری ومسلم، آغازِ سفر سے قبل بیت اللہ شریف کے پہلو میں ملائکہ نے آپ ﷺ کا سینہ چاک کیا۔ قلبِ اقدس کو نکال کر سونے کے ایک طشت میں رکھا اور اسے آبِ زمزم سے دھونے اور اس میں ایمان وحکمت بھرنے کے بعد اسے واپس اسی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر آپ ﷺ کی سواری کے لیے براق لایا گیا جس کا ہر قدم اتنی دور پڑتا تھا جہاں تک نظر جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ اس پر سوار ہو کر بیتُ المقدس پہنچے۔ وہاں امام الانبیاء ﷺ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی اور مسند احمد میں مذکور ایک حدیث کی رو سے تمام انبیائے کرام (علیہم السلام) نے آپ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ یہ الفاظ صحیح بخاری ومسلم کے نہیں، یہ ہم نے مسند احمد سے نقل کیے ہیں۔[3]

بیتُ اللہ شریف سے بیتُ المقدس تک کے اس سفر کو اسراء کہا جاتا ہے جس کا ذکر پندرھویں پارے کی پہلی ہی آیت میں موجود ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ۚ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾

''وہ (خداند ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے جو اپنے بندے (محمد ﷺ) کو راتوں ادب والی مسجد (خانہ کعبہ) سے دور کی مسجد کی (بیت المقدس میں لے گیا جس کے گرد ہم نے برکت کر رکھی ہے اس لیے کہ ہم محمد کو اپنی قدرت کی) نشانیاں دکھلائیں، بے شک وہی اللہ ہے جو (ہر بات کو اور ہر چیز کو) سنتا اور دیکھتا ہے۔''

---

[1] اسمائے صحابہ رضی اللہ عنہم اور کتب کے نام دیکھنے ہوں تو رحمة للّعالمین (۳/ ۱۲۶ تا ۱۲۸) ملاحظہ فرمائیں۔

[2] تفصیلات کے لیے کم ازکم صرف تفسیر ابن کثیر اردو اور بخاری ومسلم ہی ملاحظہ فرمائیں، اور زاد المعاد وسیرت ابن ہشام پر بھی نظر ڈال لیں۔

[3] دیکھیں: الفتح الرباني (۲۰ / ۲۵۵)

بیتُ المقدس سے آپ ﷺ حضرت جبرائیلِ امین علیہ السلام کی معیّت میں آسمانوں کی طرف لے جائے گئے۔ آپ پہلے، دوسرے حتیٰ کہ ساتویں آسمان اور اس سے بھی آگے سدرۃُ المنتہیٰ تک گئے۔ پھر اس سے بھی آگے لے جاکر قربِ الٰہی اور شرفِ ہمکلامی ومناجات سے نوازے گئے۔ ساتوں آسمانوں پر آپ ﷺ نے آٹھ انبیائے کرام علیہم السلام سے بھی ملاقات کی، جن کے نام ومقام بخاری ومسلم میں مذکور ہیں کہ پہلے آسمان پر آپ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے، دوسرے پر حضرت عیسیٰ وحضرت یحییٰ علیہما السلام سے، تیسرے پر حضرت یوسف علیہ السلام، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام، پانچویں پر حضرت ہارون علیہ السلام، چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ [1]

تمام عبادات تو بذریعۂ وحی فرض کی گئیں مگر نمازِ پنج گانہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر بلا واسطہ فرض کی گئیں۔ یہی اس سفرِ معراج کا بڑا تحفہ ہیں۔ بیتُ المقدس سے لے کر آسمانوں کے اس سفر کو ہی معراج کہا جاتا ہے جس کا ذکر قرآنِ پاک کی سورۃ النجم میں موجود ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝۲ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝۶ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝۹ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝۱۰ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝۱۱ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝۱۲ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝۱۳ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝۱۴ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝۱۵ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝۱۶ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝۱۷ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى﴾

''قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے! کہ تمھارا ساتھی (رسول) نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے۔ اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔ اسے نہایت مضبوط قوتوں والے (فرشتے) نے سکھایا۔ جو بڑی طاقت والا ہے، سو وہ بلند ہوا۔ اس حال میں کہ وہ آسمان کے مشرقی کنارے پر تھا۔ پھر وہ نزدیک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤)

ہوا، پس اتر آیا۔ پھر وہ دو کمانوں کے فاصلے پر ہو گیا، بلکہ زیادہ قریب۔ پھر اس نے وحی کی اس (اللہ) کے بندے کی طرف جو وحی کی۔ دل نے جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا۔ پھر کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو وہ دیکھتا ہے۔ حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اترتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ آخری حد کی بیری کے پاس۔ اسی کے پاس ہمیشہ رہنے کی جنت ہے۔ جب اس بیری کو ڈھانپ رہا تھا جو ڈھانپ رہا تھا۔ نہ نگاہ ادھر ادھر ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

اس سفر میں آپ ﷺ نے جنت و دوزخ بھی دیکھے اور اہلِ عذاب کے مختلف گروہ دیکھے:

1. یتیموں کا مال کھانے والوں کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ آگ کے انگارے منہ سے کھاتے ہیں اور وہ آگ ان کی دُبروں سے نکلتے ہیں۔
2. سود خوروں کو دیکھا کہ ان کے پیٹ اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر پاتے۔
3. زانیوں کو دیکھا کہ وہ پاکیزہ گوشت کو چھوڑ کر بدبودار گوشت کھا رہے ہیں۔
4. غیر محرم لوگوں کے سامنے بے پردہ جانے والی عورتوں کو اس حال میں دیکھا کہ وہ پستانوں کے بل لٹکائی ہوئی ہیں۔

امام زہری فرماتے ہیں:

جب نبی ﷺ نے راتوں رات سفرِ بیتُ المقدس اور آسمانی سفیرِ معراج کا واقعہ بیان کیا تو کچھ لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہنے لگے: کیا تم اس بات کی تصدیق کرو گے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ میں تو اس سے بھی بڑی بات کی تصدیق کرتا ہوں، تو یہ کیا ہے؟ اگر آپ ﷺ نے ایسے فرمایا ہے تو میں تصدیق کرتا ہوں۔ پھر اسی وجہ سے انھیں ''صدیق'' کا خطاب ملا۔[1]

کچھ وقت پہلے تک معراج کی حقیقت کو سمجھنا شاید قدرے مشکل اور محض ایمان کی بات تھی، مگر

---

[1] الفتح الرباني (٢٠/ ٢٦٤)

آج جبکہ انسان اپنے مصنوعی ذرائع سے ہواؤں میں اڑتا اور ستاروں پہ کمندیں ڈالتا پھر رہا ہے، ان حالات میں اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ کو بحالتِ بیداری اور جسم وروح کے ساتھ معراج کرانا نہ محال نظر آتا ہے اور نہ یہ بعید از قیاس رہا ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ تو کب کے کہہ گئے ہیں: ؎

سبق ملا ہے معراجِ مصطفیٰ ﷺ سے یہ مجھے
کہ بشریت کی زد میں ہے یہ گردوں

ہجرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سوئے حبشہ و مدینہ

اسلامی سالِ نو کی آمد اپنے ساتھ جو پیغام اور یادیں لاتی ہے، اُن میں سے تاریخِ اسلام بلکہ پوری تاریخِ انسانی کا اہم واقعہ ''ہجرتِ رسول ﷺ'' بھی ہے جس نے اسلامی تاریخ کو ایک نیا سنہری موڑ دیا۔ ہر نیا سال نبیِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کو ہجرت کی یادیں تازہ کر دیتا ہے۔

یہ واقعۂ ہجرت ساڑھے چودہ سو برس پہلے رونما ہوا تھا، جبکہ نبیِ اکرم ﷺ کو مبعوث ہوئے تیرہ برس ہو چکے تھے۔ نبوت ملنے کے بعد جب آپ ﷺ نے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینا شروع کی ۔ اہلِ قبیلہ، اہلِ مکہ اور قرب و جوار کے لوگوں کو بتایا کہ ہر قسم کی عبادت اور نذر و نیاز کا مستحق صرف ایک اللہ ہے۔ حاجت روائی اور مشکل کشائی کرنے والا بھی صرف وہی ایک مختارِ کُل ہے، تو فطرتِ سلیمہ کے مالک سعادت مند لوگ مسلمان ہونا شروع ہوگئے۔ اُدھر مشرکینِ مکہ نے جب اسلامی تعلیمات کے اس سیلِ نور کو پھیلتے دیکھا تو بگڑ گئے ۔ نبی ﷺ کو بُرا بھلا کہا، تکلیفیں پہنچائیں، دھمکیاں دیں اور لالچ کے ذریعے دعوتِ اسلام کی راہ روکنا چاہی۔ لیکن آپ ﷺ نے ان کی تکلیفوں اور دھمکیوں سے دبنے کے بجائے تبلیغِ دین کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور ان کے ہر لالچ کو نوکِ پا سے ٹھوکر ماردی۔

طبرانی کبیر و اوسط، ابن جریر اور مسند ابی یعلی کی ایک متکلّم فیہ روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا:

« وَاللّٰهِ لَوْ وَضَعُوْا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِىْ وَ الْقَمَرَ فِيْ يَسَارِىْ عَلٰى أَنْ أَتْرُكَ

هَذَا الْأَمْرَ، حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أَوْ أَهْلَكَ فِيهِ مَا تَرَكْتُهُ» [1]

''اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھ دیں اور کہیں کہ میں اسلام کی دعوت وتبلیغ چھوڑ دوں، تب بھی یہ ممکن نہیں یہاں تک کہ اللہ کا دین غالب ہو جائے یا اس کی راہ میں مجھے موت آجائے۔''

قریشِ مکہ نے اپنے ہتھکنڈوں کے باوجود مسلمانوں کو روز بروز بڑھتے دیکھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایذائیں پہنچانا شروع کر دیں اوران پر ظلم وستم کے وہ پہاڑ توڑے کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مشرکین کی اس ہٹ دھرمی اور ایذا رسانی کے پیشِ نظر نبی اقدس ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ہجرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ واقعہ بعثتِ نبوی ﷺ کے پانچ سال بعد ماہِ رجب میں رونما ہوا۔ اس ہجرتِ اولیٰ میں نبی ﷺ کے دو ہرے داماد ذوالنورین حضرت عثمان غنی بن عفان اور نبی ﷺ کی لختِ جگر زوجۂ عثمان رضی اللہ عنہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔

ہجرتِ حبشہ کے پہلے مہاجرین کی تعداد طبقات ابنِ سعد (۱/۲۰۴) اورتاریخ طبری کے مطابق گیارہ آدمی اور چار عورتیں تھیں جبکہ معروف سیرت نگار ابنِ ہشام نے دس مرد اور چار عورتیں لکھا ہے۔

ابنِ کثیر، ابنِ ہشام اور ابن قیم رحمہ اللہ کے مطابق پہلی اور دوسری مرتبہ ہجرت کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ملا کر کُل تعداد تراسی ہوگئی۔عورتیں اور بچے ان پر مستزاد تھے۔ [2]

قریشِ مکہ نے جب دیکھا کہ اسلام کی دعوت مکہ سے نکل کر قُرب و جوار اور حبشہ تک پہنچ گئی ہے تو خاندانِ نبوت کا سوشل بائیکاٹ کر کے انھیں ایک پہاڑی گھاٹی شِعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا

---

[1] یہ حدیث ابن جریر (٢/ ٦٧) میں معضل سند کے ساتھ مروی ہے اور طبرانی کبیر و اوسط میں بھی قدرے اختصار سے موجود ہے۔ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' (٦/ ١٥) میں لکھا ہے کہ اس روایت کو شروع سے تھوڑے سے اختصار کے ساتھ ابویعلیٰ نے روایت کیا ہے اور ابویعلیٰ کی روایت کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ و انظر البداية (٣/ ٤٨) عظیم محدّث علامہ البانی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (تعليقات الألباني على فقه السيرة، ص: ١١٤، ١١٥)

[2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٩) زاد المعاد (٢/ ٤٤) سیرت ابنِ ھشام (جلد اول)

جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو کھانے کی جگہ پتوں سے پیٹ بھرنا پڑا۔ بچے بھوک سے بلبلاتے اور ظالم قہقہے مارتے رہے۔ یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔[1] اس سوشل بائیکاٹ کی تفصیلات بڑی جانگداز ہیں۔ اس ظالمانہ بائیکاٹ لکھنے والے شخص منصور بن عکرمہ اور زاد المعاد میں علامہ ابن القیّم کے بقول بغیض بن عامر بن ہاشم کو اللہ تعالیٰ نے یہ سزا دی کہ اس کا دستاویز لکھنے والا ہاتھ شل ہوگیا۔[2]

اسلام کی صدائے بازگشت مدینہ منورہ تک جا پہنچی۔ قبیلہ اوس وخزرج کے کچھ لوگوں نے حج کے موقع پر اسلام قبول کر کے نبی ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی جو تاریخِ اسلام میں بیعتِ عَقبہ اُولیٰ اور بیعتِ عَقبہ ثانیہ کے عنوان سے منسوب ہے۔ اُنہی ایام میں نبیِ اکرم ﷺ نے ایک خواب دیکھا۔ صحیح بخاری ومسلم میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اُهَاجِرُ اِلٰى أَرْضٍ بِهَا نَخْلٌ، فَذَهَبَ وَهْلِيْ اِلٰى أَنَّهَا الْيَمَامَةُ أَوْ هَجَرُ، فَإِذَا هِيَ يَثْرِبُ»

''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں ایسے علاقے کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جہاں کھجوریں ہیں۔ پہلے میرا خیال یہ ہوا کہ شاید یہ علاقہ یمامہ یا ہجر (الاحساء) ہے، مگر ظاہر ہوا کہ یہ یثرب یعنی مدینہ منورہ ہے۔''

دوسری روایت میں ہے:

«قَدْ اُرِيْتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ»[3] ''میں تمھارا دارِ ہجرت دکھایا گیا ہوں۔''

پھر آپ ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر جانے کی عام اجازت دے دی اور فرمایا:

«اِنَّ اللّٰهَ قَدْ جَعَلَ لَكُمْ اِخْوَاناً وَّ دَاراً تَأْمَنُوْنَ بِهَا»[4]

---

[1] البداية و النهاية (٣/ ٨٤) سيرت ابنِ هشام (جلد اوّل)

[2] زاد المعاد لابن القيم (٢ / ٤٦)

[3] صحيح البخاري (٧/ ١٨٦) المستدرك للحاكم (٣/ ٣۔ ٤) سنن البيهقي (٩/ ٩) عن عائشه رضي الله عنها و صحيح البخاري (١٢/ ٣٥٤۔ ٣٥٥) صحيح مسلم (٧/ ٥٧) سنن ابن ماجه (٢/ ٤٤٥) عن أبي موسى نحوه۔ تعليق الألباني على فقه السيرة (ص: ١٦٨)

[4] سیرت ابن ہشام (٢/ ٨٠) خاتم النبيين ﷺ، ابو زهره (١/ ٦١٠)

''تمھیں اللہ نے ایسے بھائی اور ایسی جگہ دی ہے کہ جہاں تم پُر امن رہو گے۔''

اس طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ہجرت شروع کر دی۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے خفیہ ہجرت کی، سوائے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''مَا عَلِمْتُ أَحَداً مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ هَاجَرَ اِلَّا مُخْتَفِياً اِلَّا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ!''

''تمام مہاجرین نے خفیہ طور پر ہجرت کا سفر اختیار کیا سوائے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے۔''

آگے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہجرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وہ جب ہجرت کے لیے تیار ہوئے تو گلے میں تلوار کا نیام لٹکایا۔ کندھے پر تیروں سے بھرا ترکش اور کمان لٹکائی۔ بیت اللہ کا طواف کیا۔ مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی اور مشرکینِ مکہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''مَنْ أَرَادَ أَنْ تُثْكِلَهُ أُمُّهُ أَوْ يُيَتَّمَ وَلَدُهُ أَوْ تُرْمَلَ اِمْرَأَتُهُ فَلْيَلْقَنِيْ وَرَآءَ هٰذَا الْوَادِيّ''[1]

''جو چاہے کہ اس کی ماں اسے گم پائے یا اس کے بچے یتیم ہوں یا اس کی اہلیہ بیوہ ہو، وہ مجھے اس وادی کے پار ملے۔''

سبحان اللہ! ایسے قدسی نفوس انسان اور شاہکارِ رسالت کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی اور مشرکین کو للکارتے ہوئے سفرِ ہجرت پر چل پڑے، ایسے قدسی نفوس لوگوں کے ایمان میں شک کرنے والے اور اُنھیں بُرا بھلا کہنے والے اپنے ایمان کی خیر منائیں۔

یثرب نہیں طابہ:

یہ تو تھا ہجرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا مختصر تذکرہ۔ جس کے ضمن میں ''یثرب'' کا لفظ بھی گزرا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ صحیح بخاری و مسلم، مسند احمد اور معجم البلدان (۸/ ۴۹۸) پر لکھا ہے کہ یثرب مدینہ کا جاہلی نام ہے۔ یعنی قبل از اسلام مدینہ طیبہ کا نام یثرب تھا اور نبیِ رحمت ﷺ نے بعثت کے بعد اس کا نام بدل دیا تھا۔[2]

---

[1] أشهر مشاهير الإسلام مؤلّفه رفيق العظم.

[2] صحيح البخاري (٤/ ٧١) صحيح مسلم (٤/ ١٢١) مسند أحمد (٥/ ٨٩، ٩٤، ٩٦ تا ٩٨، ١٠١، ١٠٦، ١٠٨)

مسند طیالسی میں مذکور ہے کہ ''نبیِ رحمت ﷺ نے یثرب کا نام ''طیبہ'' رکھا تھا اور مسلم شریف میں تو یہاں تک مذکور ہے: «اِنَّ اللّٰهَ سَمَّی الْمَدِيْنَةَ طَابَه»[1] ''اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام طابہ رکھا ہے۔''

ان احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ مدینہ منورہ، مدینہ طیبّہ یا مدینہ طابہ کو اس کے پرانے جاہلی نام سے پکارنا مکروہ و ناپسندیدہ فعل ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے شاعر اور نعت خواں حضرات اکثر یثرب ہی لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ جبکہ مسند احمد و ابویعلٰی میں ایک حدیث ہے:

«مَنْ سَمَّی الْمَدِيْنَةَ يَثْرِبَ فَلْيَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ هِیَ طَابَه هِیَ طَابَه»[2]

''جس نے مدینہ کو یثرب کے نام سے پکارا وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرے۔ کیوں کہ وہ [یثرب نہیں بلکہ] طابہ ہے طابہ۔''

یہ احادیث شعراء اور نعت خواں حضرات سے بالخصوص اور عام مسلمانوں سے بالعموم توجّہ چاہتی ہیں۔

ہجرتِ رسول اللہ ﷺ

ہجرتِ مدینہ کا حکم ملنے کے بعد تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ہجرت کر گئے سوائے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض مجبور مسلمانوں کے۔ حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اجازت چاہی تو صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«عَلٰی رِسْلِكَ، فَاِنِّیْ أَرْجُوْ أَنْ يُّؤْذَنَ لِیْ»[3]

''جلدی نہ کرو، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بھی ہجرت کی اجازت ملنے والی ہے۔''

سیرت ابن ہشام میں یہ الفاظ ہیں:

''لَا تَعْجَلْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ لَكَ صَاحِباً فَيَطْمَعُ أَبُوْ بَكْرٍ رضی اللہ عنہ أَنْ يَّكُوْنَهٗ''

---

[1] صحيح مسلم (٤/ ١٢١)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٨٥) و عزاه الهيثمي في المجمع (٣/ ٣٠٠) لأبي يعلىٰ ايضاً كما في تخريج الألباني على فقه السيرة لمحمد الغزالي (ص: ١٥٠ـ ١٥١) انظر أيضاً إعلام الساجد للزركشي (ص: ٢٣٦)

[3] صحيح البخاري (٧/ ١٨٣ تا ١٩٧) و الفتح الرباني (٢٠/ ٢٧٩ـ ٢٨٠)

''جلدی نہ کرو، شاید اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کسی کو ساتھی بنا دے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہی آرزو رکھتے تھے کہ آپ ﷺ ہی میرے ساتھی بنیں۔''

اسی قسم کے حوصلہ افزا اشاروں کی بنا پر انھوں نے دو سواریوں کو خصوصی خوراک دینا اور پالنا شروع کر دیا اور جب ہجرت کا دن آیا تو فرمایا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے اسی دن کے لیے یہ دو سواریاں یعنی اونٹنیاں پال رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک آپ ﷺ پسند کر لیں۔ آپ ﷺ نے سواری پسند کرتے ہی فرمایا: ((بِالثَّمَنِ)) ''قیمت ضرور ادا کروں گا۔''

اس طرح انھیں شرفِ رفاقت بخشنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے انھیں روک لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم ملا کہ میرے پاس لوگوں کی جو امانتیں ہیں وہ واپس کر کے آ جانا۔ ادھر قریشِ مکہ پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ مدینہ میں مسلمانوں کی جمعیّت بن رہی ہے۔ اگر محمد (ﷺ) بھی اُن سے جا ملے تو پانی سر سے گزر جائے گا۔

لٰہذا انھوں نے قصیّ بن کلاب کے گھر، جو اُن کا دار الندوہ یا پارلیمینٹ ہاؤس تھا، اجتماع کیا۔ جس میں کسی نے کہا: آپ ﷺ کو زنجیروں میں جکڑ کر کسی کوٹھڑی میں ڈال دیا جائے۔ کسی نے کہا: ملک بدر کر دیا جائے۔ ابو جہل ملعون نے کہا: تمام قبیلوں کا ایک ایک نوجوان مسلّح ہو کر ان کے گھر کا گھیراؤ کر لیں۔ صبح جونہی نکلیں تو ایک ہی وار سے ان کا کام تمام کر دیں۔ اس طرح ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور دیت دے کر سب کی جان چھوٹ جائے گی۔ شیطانِ لعین جو ایک بوڑھے کے بھیس میں شریکِ اجتماع تھا، اس نے اسی رائے کو پسند کیا اور بات طے ہوگئی۔[1]

سورۃ الانفال (آیت: ۳۰) میں اسی سازشِ قتل کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

﴿ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴾

''اور جس وقت کافر لوگ تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ کو باندھ دیں، یا قتل کر دیں، یا

---

[1] الفتح الرباني (۲۰ / ۲۷۷۔ ۲۷۸) سیرت ابن هشام (۲/ ۸۹۔ ۹۱)

ملک بدر کردیں، وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی تدبیر کر رہا تھا، جبکہ اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ان کی سازش کی خبر دے دی اور حکم فرمایا کہ آج رات اپنے گھر نہ سونا۔ آپ ﷺ خلافِ عادت دوپہر کو حضرت ابو بکر الصدّیق رضی اللہ عنہ کے گھر گئے۔ ہجرت کی اجازت اور انھیں اپنا رفیقِ سفر ہونے کی خوشخبری دی، تو حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ اس عظیم سعادت پر فرطِ مسرّت سے رو پڑے۔ حضرت عائشہ اور اسماء رضی اللہ عنہما زادِ راہ کی تیاری میں لگ گئیں۔ جس رات آپ ﷺ کے قتل کا پروگرام تھا، آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وہ سبز حضرمی چادر عنایت فرمائی جسے اوڑھ کر آپ ﷺ سویا کرتے تھے اور فرمایا: یہ چادر لے کر میرے بستر پر سو جانا:

«فَإِنَّهٗ لَنْ يَّخْلُصَ إِلَيْكَ شَيْءٌ تَكْرَهُهٗ مِنْهُمْ»

''دشمنوں کی طرف سے تمھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔''

پھر آپ خود دروازہ روک کر کھڑے دشمنوں کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے اپنے گھر سے نکل گئے اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ عازمِ مدینہ ہوئے۔ یہ روانگی یکم ربیع الاول ۱ھ بمطابق ۱۳/ ستمبر ۶۲۲ء بروزِ پیر سحری کے وقت ہوئی۔[2]

ایک ضعیف و متکلم فیہ سند سے مسند احمد میں بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد مروی ہے:

«وُلِدَ نَبِيُّكُمْ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَ نُبِّئَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَ خَرَجَ مِنْ مَكَّةَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ، وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ، وَ تُوُفِّيَ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ»[3]

''تمھارے نبی ﷺ کی پیدایش، بعثت، ہجرت، دخولِ مدینہ اور وفات پیر کے دن کو ہوئی تھی۔''

علامہ منصور پوری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب رحمۃ للعالمین میں ۲۷/ صفر ۱۳ نبوت بروزِ جمعہ [۱۲/ ستمبر ۶۲۱ء] کو روانگی لکھی ہے۔

---

[1] الفتح الرباني (۲۰/ ۲۷۹) سيرت ابن هشام (۲/ ۹۱) و اللفظ لهٗ.

[2] الهجرة، أحمد عطّار مكه مكرمه (ص: ۵ مقدمه)

[3] مسند أحمد (۲/ ۹۳) تفسير ابن كثير (۳/ ۲۵)

دورانِ سفر حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کبھی آپ ﷺ کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے۔ کبھی دائیں اور کبھی بائیں، آپ ﷺ نے پوچھا: ابوبکر! کیا بات ہے؟ تو حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! جب پیچھا کرنے والوں کا خیال آتا ہے تو پیچھے ہو جاتا ہوں اور جب یہ خدشہ سامنے آئے کہ راستے میں کوئی گھات لگا کر نہ بیٹھا ہو تو آگے ہو جاتا ہوں۔ اسی طرح دائیں بائیں بھی چلتا ہوں کہ خدانخواستہ کوئی دشمن وار کرے تو مجھ پر ہو اور آپ ﷺ سلامت رہیں۔[1]

دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے مدینہ طیبہ کے راستے جانے کے بجائے آپ ﷺ نے اُلٹے رخ کو سفر شروع کیا اور چار میل (٦ کلومیٹر) دور جا کر غارِ ثور میں اُترے۔ غار کے کنارے پر پہنچے تو صدیقِ اکبر صنے عرض کیا: آپ ﷺ یہیں رکیں، پہلے میں غار کا داخلی جائزہ لے کر حفاظتی اقدامات کرلوں کہ اندر کوئی درندہ یا زہریلا کیڑا نہ ہو۔ جب وہ اطمینان کر بیٹھے تو فرمایا: اب تشریف لے آئیں۔ یہ واقعاتِ سفر بیان کرنے کے بعد حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتِلْكَ اللَّيْلَةُ خَيْرٌ مِّنْ آلِ عُمَرَ»[2]

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ صرف اس رات کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نیکیاں سارے خاندانِ عمر رضی اللہ عنہ کی کُل نیکیوں سے بھی زیادہ ہیں۔''

اس غار میں نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے یارِ غار حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تین دن قیام فرمایا۔ اس دوران میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما روزانہ رات کو کھانا، حضرت عامر مولیٰ ابی بکر رضی اللہ عنہما وہاں بکریاں لے جا کر دودھ اور حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما قریش کی خبریں آپ ﷺ تک پہنچایا کرتے تھے۔ قریشِ مکہ تلاش میں سرگرداں غار کے منہ تک بھی پہنچ گئے۔

مشہور ہے کہ غارِ ثور کے منہ پر مکڑی نے جالا بُن دیا تھا اور دو جنگلی کبوتروں نے گھونسلا بنا کر انڈے دے دیے اور درخت کی ٹہنیاں غار کے منہ تک آ گئی تھیں۔ شیخ محمد غزالی نے اپنی کتاب فقہ السیر ۃ (ص: ١٧٣) میں امام احمد کی روایت، جس میں جالے کا ذکر ہے، کے بعد لکھا ہے کہ

---

[1] سنن البيهقي كما في البداية و النهاية (٣/ ١٨٠)

[2] المستدرك للحاكم، رقم الحديث (٤٢٣٥) و صححه، البداية (٣/ ١٨٠)

امام احمد کی روایت حسن ہے۔ اگرچہ یہ صحاح میں موجود نہیں۔ اور کبوتریوں کے انڈے والے قصّے کی نفی کی ہے۔ جبکہ اسی کتاب کی تخریج میں حاشیہ پر شیخ البانی نے "البداية والنهاية" (۳/ ۱۸۸) اور "فتح الباري" (۷/ ۱۸) کے حوالے سے ابن کثیر اور حافظ ابن حجر کی بھی تحسین ذکر کر کے امام عقیلی، ابنِ معین، نسائی اور خود ابن حجر کے حوالے دے کر اس کبوتروں والی روایت کو ضعیف ثابت کیا ہے۔[1]

بخاری و مسلم شریف میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اگر اُن [کفار] میں سے کوئی اپنے قدموں کے نیچے دیکھ لیتا تو ہمیں پالیتا اور قسم اٹھا کر فرمایا: مجھے اپنی جان کا کوئی خطرہ نہیں، مجھے ڈر ہے تو صرف یہ کہ آپ ﷺ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا» "ڈرو نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔"

نیز فرمایا:

«يَا أَبَا بَكْرٍ! مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا»[2]

"اے ابو بکر! تمھارا ان دو ساتھیوں [کے محفوظ و مامون ہونے] کے بارے میں کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ تعالیٰ ہو۔"

مقامِ ابو بکر اور شانِ صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے یہی کیا کم ہے کہ سورۃ التوبہ (آیت: ۴۰) میں اللہ تعالیٰ نے ان کے شرفِ صحابیّت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾

"دو میں سے دوسرے جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جس وقت اپنے ساتھی سے کہتے تھے کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

سبحان اللہ! ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جسے مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

---

[1] فقه السيرة للغزالي، تحقيق و تعليق شيخ الباني (ص: ۱۷۳)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳٦۵۳) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۳۸۱)

جن کے شرف کی شہادت خود قرآنِ پاک دے، ایسے پاک طینت و پاک باز لوگوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے، اُن پر کیچڑ اچھالنے اور زبانِ لعن وطعن دراز کرنے والوں کو قہرِ الٰہی سے ڈرنا چاہیے۔

وصولِ مدینہ

نبیِ رحمت ﷺ اور حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ سفرِ ہجرت سے پہلے تین دن غارِ ثور میں رکے رہے۔ جب قریشِ مکہ کا جوشِ تلاش کچھ ٹھنڈا ہوا تو حسبِ پروگرام راستوں کا ماہر گائیڈ عبد اللہ بن اُریقط دونوں سواریاں لایا، جن پر نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے رفیقِ سفر حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ سوار ہو کر مدینہ منورہ کو روانہ ہوگئے۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے لکھا ہے کہ غارِ ثور سے مدینہ کی جانب روانگی یکم ربیع الاول بروزِ پیر، ۱۶ر ستمبر ۶۲۲ء کو ہوئی۔[1]

(1) اُسی دن مکہ والوں نے انعام کا اعلان کر دیا کہ جو شخص مسلمانوں کے نبی ﷺ کو زندہ یا مُردہ حالت میں لے کر آئے گا، اُسے ایک سو اُونٹ دیے جائیں گے جو اُس زمانے کا تصور سے بھی بڑا انعام تھا۔ لہٰذا انعام کے لالچ میں کئی لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہی میں سے ایک سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ بھی تھے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ خود اُن کا اپنا بیان بخاری و مسلم میں ہے:

''جب میں تلاش کرتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا تو میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں گر پڑا۔ پھر اُٹھا، سوار ہوا، گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ جب اُن کے قریب پہنچا تو اُس کی اگلی دونوں ٹانگیں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئیں۔ میرے زجر کرنے (ڈانٹنے) پر وہ بمشکل زمین سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ جہاں وہ دھنسا تھا، وہاں کوئی گڑھا نہیں تھا۔ صرف ایک دُھواں سا وہاں سے نکلا اور آسمان کی طرف اُڑ گیا تو میں سمجھ گیا کہ رسول اللہ ﷺ نبیِ برحق ہیں۔ لہٰذا میں نے اُنہیں آواز دے کر پناہ طلب کی تو آپ ﷺ رُک گئے۔ میں نے سارا ماجرا سنایا اور اپنا زادِ راہ اُنھیں پیش کیا، مگر آپ ﷺ نے کچھ نہ لیا۔ صرف اتنا فرمایا: «أَخفِ عَنَّا الطَّلَبَ»

---

[1] رحمة للعالمین (۱/ ۸۷)

''ہمارے بارے میں پوچھنے اور ہمیں تلاش کرنے والوں کو اِدھر نہ آنے دو۔''

پھر میں نے ''امن نامہ'' طلب کیا تو آپ ﷺ نے عامر بن فہیرہ مولیٰ ابوبکر رضی اللہ عنہما سے لکھوا کر مجھے عطا کر دیا۔ میں واپس ہوگیا اور دوسرے تعاقب میں جانے والے لوگوں کو اُدھر جانے سے یہ کہہ کر روکتا گیا کہ اب اِدھر جانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ میں کافی دُور تک ہو آیا ہوں۔''

اس طرح وہ سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ جو جان کے پیاسے تھے، شام کو جاں نثار بن کر لوٹے۔[1]

[2] اس سفرِ ہجرت میں گھوڑے کے پاؤں دَھنسنے کے علاوہ بھی کئی معجزات رُونما ہوئے۔ جیسا کہ ''سیرت ابن اسحاق''، ''مواہب اللدنیہ'' اور ''البدایہ والنہایہ'' وغیرہ میں امّ معبد کی بکری کا واقعہ ہے:

''وہ دودھ نہیں دیتی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کا دودھ دوہنے کی اجازت چاہی اور اس کے تھنوں کو چھوا تو اُس نے دودھ اتار لیا، تب آپ ﷺ نے کئی برتن دودھ دوہیا۔ یہ بکری حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے تک رہی اور صبح و شام دودھ دیتی رہی۔''[2]

[3] تیسرا معجزہ مسند احمد میں مذکور ہے کہ راستوں کے ماہر عبداللہ بن اُریقط نے بتایا:

''اس پہاڑ میں دو ڈاکو رہتے ہیں ورنہ ہم راستہ مختصر کر لیتے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہمیں اسی راستے لے چلو۔ اُنکی جگہ پہنچے تو آپ ﷺ نے انھیں بلایا اور اسلام پیش کیا تو وہ فوراً مسلمان ہوگئے۔ وہ دونوں مُہانانِ [ذلیل] کے نام سے معروف تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «بَلْ أَنْتُمَا الْمُكَرَّمَانِ»[3] ''بلکہ اب تم مُکَرَّمَان [معزّز] ہو۔''

مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے آپ ﷺ ۸/ ربیع الاول ۱۳ نبوت بروزِ پیر [۲۳/ ستمبر ۶۲۲ء قریبی بستی قُباء پہنچے اور وہاں قیام فرمایا۔ وہاں مسجدِ قُباء کی بنیاد رکھی جو اسلام میں سب سے پہلی مسجد تعمیر ہوئی

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۷/ ۳۳۶) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۳٦) المستدرك للحاكم (۳/ ۹۰۷) مسند أحمد (۳/ ۲۱۲) سيرت ابنِ هشام (۲/ ۹٦)

[2] سيرت ابن إسحاق و المواهب اللدنيه كما في الفتح الرباني (۲۰/ ۲۸۳) البداية و النهاية (۳/ ۲۹۰)

[3] البداية و النهاية، الفتح الرباني (۲۰/ ۲۸۸)

جس کے بارے میں قرآنِ پاک نے ﴿ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى ﴾ کے الفاظ میں گواہی دی کہ یہ تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ﴿١٠٨﴾ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ﴿١٠٩﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ [التوبة: ١٠٨۔ ١١٠]

''اس میں کبھی کھڑے نہ ہونا۔ یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی زیادہ حق دار ہے کہ تو اس میں کھڑا ہو۔ اس میں ایسے مرد ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ بہت پاک رہیں اور اللہ بہت پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ تو کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی، بہتر ہے، یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کھوکھلے تودے کے کنارے پر رکھی، جو گرنے والا تھا؟ پس وہ اسے لے کر جہنم کی آگ میں گر گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ان کی عمارت جو انھوں نے بنائی، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے چینی کا باعث بنی رہے گی، مگر اس صورت میں کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ تَطَهَّرَ فِيْ بَيْتِهٖ ثُمَّ أَتَىٰ مَسْجِدَ قُبَاءَ فَصَلّٰى فِيْهِ كَانَ لَهٗ كَأَجْرِ عُمْرَةٍ»

''جو آدمی گھر سے وضو کر کے جائے اور اس مسجد میں (دو رکعت) نماز ادا کرے، اُسے عمرے کا ثواب ملتا ہے۔''[1]

قیامِ قُباء کے بعد آپ ﷺ بارہ ربیع الاول اھ بروزِ جمعہ سوار ہوکر بنی سالم کے گھروں تک

---

[1] صحيح الترغيب و الترهيب للألباني (١١٨١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٦٨) صحيح الجامع الصغير، رقم الحديث (٦١٥٤) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٦٨) صحيح الترغيب و الترهيب، رقم الحديث (١١٨١)

پہنچے تو جمعہ کا وقت ہوگیا۔ آپ ﷺ نے وہیں ایک سو آدمیوں کے ساتھ جمعہ پڑھا۔ یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا [اور وہ مسجد آج تک مسجدِ جمعہ کے نام سے معروف ہے] آپ ﷺ نمازِ جمعہ کے بعد اُسی دن مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے۔[1]

لیکن محمود پاشا فلکی کے مطابق آپ ﷺ ۸/ ربیع الاول ۱ھ بمطابق ۲۰/ ستمبر ۶۲۲ء بروز پیر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔[2]

اہلِ مدینہ نے شہر سے باہر آ کر آپ ﷺ کا پُر جوش استقبال کیا اور آپ ﷺ کی آمد پر جی بھر کر اظہارِ مسرّت کیا۔ مشہور و معروف نعتیہ اشعار:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا * مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا * مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ
أيها المبعوث فينا * جئت بالامر المطاع
جئت شرفت المدينة * مرحباً يا خير داع

ایک ضعیف روایت کے مطابق اِسی استقبال کے وقت پڑھے گئے تھے۔[3]

اب انصارِ مدینہ میں سے ہر صحابی کی یہ خواہش ہے کہ شرفِ میزبانی مجھے نصیب ہو۔ وہ آپ ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑتے ہیں تو آپ ﷺ نے کسی ایک کو راضی اور بقیہ کو ملولِ خاطر کرنے کے بجائے معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا اور فرمایا:

«دَعُوهَا فَإِنَّهَا مَأْمُورَةٌ»[4] ''میری اونٹنی کو چھوڑ دو۔ یہ وہیں بیٹھے گی جہاں اسے حکمِ الٰہی ہوگا۔''

پھر وہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دروازے کے پاس جا بیٹھی اور شرفِ ضیافت اُنہی کے حصے آیا۔

---

[1] رحمة للعالمين (١/ ٩١۔ ٩٤)

[2] التقويم العربي محمود باشا فلكى طبع مصر

[3] اس روایت کو معضل وضعیف قرار دیا گیا ہے۔ دیکھیں: طرح التثريب للعراقي (٢/ ٣٤٢) فتح الباري (٧/ ٣٠٧) و قال: إسناده معضل (٧/ ٧٣٥) و قال: إسناده منقطع، الضعيفة للألباني (٥٩٨)

[4] البداية (٣/ ٢٠٢) طبقات ابن سعد (١/ ٢٣٦۔ ٢٣٧) زاد المعاد (١/ ١٠٠۔ ١٠١) والبيهقي في الدلائل.

دولتِ اسلامیہ کا قیام

بادی النظر میں ہجرتِ رسول ﷺ اہلِ مکہ کے ظلم و استبداد سے فرار نظر آتی ہے، مگر حقیقت اس کے سراسر برعکس ہے۔ یہ ہجرت تو ظلم کے خاتمے اور دنیائے انسانیت میں عدل گُستری کا پیش خیمہ اور عین منشائے الٰہی تھی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک، سورۃ التوبہ (آیت: ۳۳) سورۃ الفتح (آیت: ۲۸) اور سورۃ الصّف (آیت: ۹) میں ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ فرما کر دینِ اسلام کی تمام ادیانِ سابقہ پر فتح و نصرت کی خوشخبری دی تھی۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبة: ۳۳]

''وہی اللہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت کی باتیں (معجزے اور شریعت کے احکام) اور سچا دین (اسلام) دے کر بھیجا اس لیے کہ اس کو (یعنی پیغمبر کو اسلام کے دین) ہر دین پر غالب کرے گا گو مشرک بُرا مانیں۔''

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ [الفتح: ۲۸]

''جس نے پیغمبر (حضرت محمد) کو ہدایت اور سچا دین دے کر اس لیے بھیجا کہ اس کو سب غالب کر دے اور (اسلام کی سچائی کے لیے اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔''

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ [الصف: ۹]

''وہی خدا ہے جس نے اپنے پیغمبر حضرت محمد (ﷺ) کو ہدایت (قرآن) اور سچا دین دے کر بھیجا اس لیے کہ اس کو سب دینوں پر غالب کر دے گو مشرک برا مانیں۔''

اس خوشخبری کو حقیقت کا رُوپ دینے کے لیے کسی ایسے مقام پر استقرار ضروری تھا جہاں شعائرِ دین کی ادائیگی اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت پر کوئی قدغن نہ ہو اور جہاں اسلامی حکومت کا قیام و تشکیل ممکن ہو، جو ظلم کے خاتمے اور عدل و انصاف کی ضامن ہے۔ ان بلند مقاصد کے حصول کے

لیے مکہ جیسی فضائے شرک سے نکلنا ضروری تھا۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے جو جگہ پسند فرمائی وہ مدینہ طیبہ تھی۔ جہاں پہنچتے ہی آپ ﷺ نے دنیا کی پہلی دولتِ اسلامیہ (ریاستِ مدینہ) کے خاکے میں رنگ بھرنا شروع کر دیا اور اس کے بنیادی خد و خال استوار کرنے کے لیے چار اقدام کیے:

1. سب سے پہلے مسجدِ نبوی ﷺ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے والی اس جگہ پر تعمیر کروائی جہاں آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھی تھی جو بیک وقت بشری فرشتوں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے جہاں مرکزِ عبادت تھی، وہاں ساتھ ہی روحانی و مادی علوم کے لیے عظیم یونیورسٹی بھی تھی۔ وہ مسجد جہاں داخلی و خارجی تعلقات سکھلانے والا پولیٹیکل انسٹیٹیوٹ تھی۔ وہیں فوجی و عسکری تربیّت کا ٹریننگ کالج بھی تھی۔ اس مسجد کے سامنے آج کے تمام بڑے بڑے علمی و ثقافتی اور عسکری ادارے ہیچ ہیں۔ اس مسجدِ نبوی ﷺ سے نور کا وہ سیلاب پھوٹا جس کی شعاعوں نے پورے عالَم کو منور کر دیا۔ تعمیرِ مسجدِ نبوی میں آپ ﷺ نے بنفسِ نفیس حصہ لیا تھا۔

2. دوسرا اہم اِقدام یہ فرمایا کہ انصارِ مدینہ اور مہاجرینِ مکہ کے ما بین رشتۂ مؤاخاۃ یا بھائی بندی قائم فرمائی، تا کہ مہاجرین کی آباد کاری کا مسئلہ فوراً حل ہو، وہ معاشی طور پر جلد خود کفیل ہوں اور تمام افرادِ معاشرہ اپنے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔ حضرت سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ جیسے کئی صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایثار و فدائیت کی نا قابلِ یقین مثالیں قائم کیں۔ اپنے مکی مہاجر بھائی پر کُل مال کا نصف نچھاور کیا اور دو بیویوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کے پیشکش کردی، مگر مکی بھائی حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بازار کی راہ پوچھی، محنت کی، چند ہی ماہ بعد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اپنی کمائی سے شادی کی، جیسا کہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے الفاظ امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل فرمائے ہیں کہ انھوں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«اِنِّیُ أَکُثَرُ الْأَنُصَارِ مَالًا فَاقُسِمُ مَالِیُ نِصُفَیُنِ وَلِیُ اِمُرَأَتَانِ فَانُظُرُ أَعُجَبَهُمَا

(1) تعمیرِ مسجدِ نبوی کی تفصیلات کے لیے دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (..........) صحيح مسلم، رقم الحديث (..........) البداية و النهاية (٣/ ٢١٤) ابن هشام (٢/ ١٠١) الطبري (٢/ ٣٩٦) طبقات ابن سعد (١/ ١٦٠) ”فقه السيرة“ محمد غزالى بتحقيق الألباني.

اِلَیْکَ فَسَمِّھَا لِیْ اُطَلِّقُھَا، فَاِذَا انْقَضَتْ عِدَّتُھَا فَتَزَوَّجُھَا »[1]

''میں انصار میں سے سب سے زیادہ مال دار ہوں، میرا مال دو حصے کر کے ایک حصہ تم لے لو اور میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جسے تم پسند کرو اس کا نام لو میں اسے طلاق دے دیتا ہوں، اور جب اس کی عدّت پوری ہوجائے تو تم اس سے شادی کر لینا۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيْ أَهْلِكَ وَ مَالِكَ »

''اللہ تعالیٰ تمھارے اہل و مال میں برکت فرمائے۔''

بازار کا پتا پوچھ کر محنت و مشقّت سے کمائی کی اور سونے کی گٹھلی حقِ مہر کے عوض اپنی شادی کی۔[2] اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم فارغ البال ہوگئے، مگر حاکمِ ریاستِ مدینہ و دولتِ اسلامیہ ﷺ کا یہ عالم کہ ''وفات تک کبھی خستہ روٹی نہیں کھائی۔[3] دو دو تین تین ماہ تک گھر میں آگ تک نہیں جلی، صرف کھجور اور پانی پر گزارہ رہا۔[4] آپ ﷺ نے وفات پائی تو آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی تھی جس کے عوض گھر والوں کے لیے کچھ جَو لیے تھے۔[5]

3 دولتِ اسلامیہ کے قیام کی طرف پیش رفت کے طور پر تیسرا اہم سیاسی اقدام یہ فرمایا کہ اس نئے اسلامی معاشرے کے افراد اور دوسری قوموں خصوصاً یہود کے ما بین معاہدۂ صلح و عدمِ جارحیّت طے کیا جو ایک بنیادی وعبوری دستور کی حیثیّت رکھتا ہے جس میں جانبین کے فوائد کی تفصیلات کے علاوہ ایک شق یہ بھی تھی کہ اگر کوئی قوم مدینہ پر حملہ آور ہوئی تو تمام اہلِ معاہدہ مل کر دفاع کریں گے۔[6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٤٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٥٠) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٦٣) سنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٦٦٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٩٢) مسند أحمد (١٢٣٢٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٧٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٤٥) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٥٦١)

[5] ميزان الاعتدال للذهبي (٢/ ٦٠٧) نیز تفصیل کے لیے دیکھیں: البداية (٥/ ٢٨٢۔ ٢٨٤) الحق المرّ، محمد جلال كشك (ص: ٤٤ تا ٤٨)

[6] البداية (٣/ ٢٢٤) سيرت ابن هشام (٢/ ١٠٦) مجموعة الوثائق محمد حميد الله (ص: ٤١۔ ٤٧)

اس معاہدے نے جزیرۂ عرب کے باسیوں کو پہلی مرتبہ سیاسی شعور، ایک دوسرے کے قانونِ تحفّظ اور قانون کی بالادستی سے روشناس کرایا۔[1]

4 جب آپ ﷺ عقیدہ وعمل کے لحاظ سے تعمیرِ انسانیت اور بنائے جماعت کے مراحل سے فارغ ہوئے تو ﴿أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾ [الحج: ٣٩] اور ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ [الأنفال: ٣٩] اور ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ [الأنفال: ٦٠] جیسی آیات میں اجازت واذنِ جہاد مل گیا، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ﴾ [الحج: ٣٩]

''اب جن (مسلمانوں سے کافر) لڑتے ہی ان کو بھی (لڑنے کی) اجازت ہے، کیوں کہ ان پر ظلم ہورہا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔''

نیز ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ [الأنفال: ٣٩]

''(مسلمانوں) کافروں سے لڑو اس غرض سے کہ شرک (دنیا میں) نہ رہے اور سارا حکم اللہ ہی کا چلنے لگے، پھر اگر یہ لوگ (کفر سے) باز آجائیں (اور مسلمانوں کو نہ ستائیں) تو اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔''

اسی طرح فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ [الأنفال: ٦٠]

''اور (اے مسلمانوں) تم کافروں کے (مقابلے کے لیے جہاں تک تم سے ہوسکے اپنا

---

[1] الإسلام و حركة التاريخ، أنور الجندي (ص: ٣٣۔ ٣٤)

زور تیار رکھو اور گھوڑے باندھے رکھو اس سامان سے اللہ تعالیٰ کے دشمن اور تمھارے دشمن پر دھاک رہے گی اور ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے اور تم جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو گے (تھوڑا ہو یا بہت) تم کو پورا ملے گا اور تمھارا حق مارا نہ جائے گا۔''

اس اِذن وحکمِ قتال و جہاد کی خاطر آپ ﷺ نے چوتھا اہم کام یہ کیا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جہاد کی ترغیب دی اور دشمن سے بوقتِ ضرورت دفاعی مقابلہ کرنے کے لیے اُس وقت کے حربی فنون، تیراندازی، شمشیر زنی، اور گھوڑ سواری کی طرف توجّہ دلائی۔ پھر جب واقعی اُن فنون کی ضرورت پیش آئی تو بدر و اُحد اور حُنین و خیبر جیسے معرکوں سے سرخرو ہوتی ہوئی یہ چھوٹی سی مدنی ریاست نقشۂ عالَم کی عظیم قوّت بن گئی، جس کے سامنے قیصر و کسریٰ بھی گھٹنے ٹیک گئے اور مسلم و غیر مسلم مؤرخین کو اعتراف کرنا پڑا کہ ہجرتِ رسول ﷺ ظلم سے فرار نہیں، بلکہ ظلم کے خاتمے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایک اہم ضرورت تھی۔

کیلنڈر کا آغاز و ارتقا

تذکرۂ ہجرتِ نبوی ﷺ کی مناسبت ہی سے اب ہم آپ کو یہ بتانے جا رہے ہیں کہ کیلنڈر یا تقویم یا عام الفاظ میں جنتری کا آغاز کب ہوا اور اس نے ارتقاء کی کون کون سی منازل طے کیں؟

تاریخِ عالَم کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انسان نے جب سے زمانۂ تہذیب میں قدم رکھا اور لکھنا پڑھنا سیکھا ہے، تبھی سے اُن میں زمانے کی ماہ و سال اور ایام میں تقسیم کا رواج چلا آ رہا ہے۔ جن ممالک میں تقویم زمانۂ قدیم سے متعارف ہے، ان میں عراق، شام، مصر، یمن، چین، ایران اور انڈیا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بالخصوص عراق میں اگر سب سے پہلے نہیں تو کم از کم اکثر اقوام سے پیشتر اس کا رواج ہوا، جبکہ مؤرخین نے سومری اور حمورابی تہذیبوں میں بھی اس کے استعمال کا پتا دیا ہے جو تین ہزار سال قبل مسیح [۳۰۰۰ ق م] کے زمانے میں تھے۔[1]

---

[1] تاریخِ عالم (۳/ ۷٤) و ما بعدها.

جازر میں آثارِ قدیمہ میں کی جانے والی کھدائیوں میں پتھر کی کچھ ایسی سلیں ملی تھیں جن میں بارہ ماہ کا کیلنڈر نقش تھا اور اس کا تعلق حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے ہے۔ بنی اسرائیل میں بھی اس کا پتا چلتا ہے جیسا کہ سِفر الخروج، باب: ۱۳ فقرہ: ۴ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے ماہِ ابیب کا ذکر آیا ہے جو ان کی تقویم کا ایک مہینہ تھا۔[1]

سِفر تکوین، اِصحاح ۷، ۸ میں مذکور ہے کہ طوفانِ نوح علیہ السلام کا زور دوسرے مہینے کی سترہ تاریخ سے لے کر ساتویں مہینے کی دس تاریخ تک یعنی ایک سو پچاس دن تک رہا۔ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ لیل ونہار اور ماہ وسال پر مبنی تقویم کا رواج طوفانِ نوح علیہ السلام سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔

بخت نصری، قبطی جدید یا سکندری تقویم کا آغاز ۲۹ / اگست ۲۵ ق م بروزِ جمعہ سے ہوتا ہے، جبکہ بعض علماء نے اس کا نقطۂ آغاز ۲۸۴ء بتایا ہے۔[2]

ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''منوسمرتی'' (فقرہ: ۶۴، ۶۵) میں لکھا ہے:

''ایک روز ایک دن اور رات کا ہوتا ہے۔ اور تیس [مہورت] کے برابر ہوتا ہے۔ [اور ایک مہورت ۴۸ منٹ کا ہوتا ہے] رات آرام کے لیے اور دن کام کے لیے ہے۔''

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ہندی تہذیب میں بھی تقویم کا رواج منوسمرتی کی تالیف سے قبل کا ہے، جبکہ منوسمرتی کا زمانۂ تالیف دوسرے ہزار قبل مسیح کا اوائل ہے۔

اہلِ فارس وایران میں جب کوئی بادشاہ تخت نشین ہوتا تو اس دن سے تاریخ کا حساب لگایا جاتا اور اس کی وفات کے ساتھ ہی یہ سلسلہ ختم ہو جاتا۔ مگر یزدگرد بن شہریار بن پرویز خسرو کی تخت نشینی سے لے کر فارسی یا نوشیروانی تقویم مسلسل چلی آرہی ہے جس کے ہر ماہ کے تیس اور سال کے ۳۶۰ دن ہوتے ہیں اور ہر ایک سو بیس سال کے بعد ان کا ایک سال تیرہ ماہ کا ہوتا ہے۔ جسے ''سہرک'' کہتے ہیں اور اس زائد تیرھویں مہینے کو ''شہرزاذ'' کا نام دیا جاتا ہے۔[3]

رومانی تقویم ۴۵ ق م میں جولیس قیصر نے وضع کی جبکہ رومی اور سریانی کیلنڈر اس سے ملتے

---

[1] قاموس كتاب المقدس (١٩٦٨) كما في الهجرة أحمد عطّار (ص: ١٢١)
[2] الزيج الصبائی للبتاني وكشاف اصطلاحات الفنون للتهانوي.
[3] سفينة راغب، تاليف محمد راغب پاشا (ص: ٢٤٨) كما نقله العطار.

جلتے ہیں، البتہ آج کل کا معروفِ عالَم عیسوی کیلنڈر، رومانی تقویم کی تہذیب وترمیم شدہ کاپی ہے۔

عربوں میں رواج تھا کہ وہ بعض اہم واقعات وحوادث کو بنیاد بنا کر تاریخ لکھا کرتے تھے۔ اہلِ مکہ حروب الفجار، حلف الفضول [۵۷۰ء، ۵۸۵ ء] یا عام الفیل [۵۷۰ ءتقریباً] سے آغاز کیا کرتے تھے۔ عام الفیل کا استعمال سب سے زیادہ معروف تھا، جیسا کہ مؤرخین نے نبی اکرم ﷺ کی پیدایش عام الفیل میں لکھی ہے۔

دنیا میں عام طور پر جو کیلنڈر استعمال ہوتے رہے، ان کی مجموعی تعداد پندرہ ہے: ہجری، جولین پیریڈ، عبرانی، طوفانِ نوح علیہ السلام، کل جُگ، ابراہیمی علیہ السلام، بختِ نصری، سکندری، بکرمی بروشٹہ، بکرمی قمری شمسی، عیسوی قدیم، عیسوی جدید، قبطی جدید، نوشیروانی، عام الفیل۔

ان تمام تقاویم میں سے صرف ہجری واسلامی تقویم کو چھوڑ کر باقی سب میں ترمیم واضافہ اور تہذیب واصلاح ہوتی رہی ہے۔ کوئی بھی اپنی پہلی صورت پر قائم نہیں رہ سکی۔ مگر ہجری تقویم زمانۂ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے آغاز ہونے سے لے کر آج تک اپنی مجوزہ صورت پر چلی آرہی ہے۔ یہ فضیلت دوسرے کسی بھی کیلنڈر کو حاصل نہیں۔ ہجری تقویم کی دوسری خصوصیّت یہ ہے کہ دنیا کے اکثر مروجہ کیلنڈروں میں سے یہ ہجری کیلنڈر قدیم تر ہے اگرچہ دیگر کیلنڈر اپنے اعداد کے لحاظ سے قدیم اور پرانے لگتے ہیں۔ مثلاً: ''یکم محرّم ۱ھ بمطابق، ۱۶ر جولائی ۵۳۳۵ جولین'' بظاہر جولین ۵۳۳۴ سال قدیم نظر آتا ہے مگر درحقیقت یہ ہجری کیلنڈر سے ۹۸۹ سال بعد ۱۵۸۲ء میں وضع ہوا۔ ''یکم محرّم ۱ھ، بمطابق ۳ رآب ۴۳۸۲ عبری'' اس سے بظاہر عبرانی تقویم ۴۳۸۱ سال قدیم لگتی ہے۔ مگر دراصل یہ بھی ۹۸۹ سالِ ہجری کے بعد ۱۵۸۲ء میں وضع ہوئی۔''[1]

کل جُگ ہجری تقویم سے ۳۷۲۳ سال پہلے معلوم ہوتا ہے مگر یورپی مؤرخین اور ہیئت دان اعتراف کرتے ہیں کہ یہ چوتھی صدی عیسوی میں وضع کیا گیا۔ گویا اپنے حساب سے ۳۴ صدیاں گزرنے کے بعد خود اس کا اپنا جنم ہوا۔ اسی طرح: یکم محرم ۱ھ بمطابق ۲۶ ساون ۶۷۹ سمت بروشٹہ سے بظاہر بروشٹہ ہجری تقویم سے ۶۷۸ سال پرانا معلوم ہوتا ہے جبکہ ہندو اور یورپی محقّقین کی تحقیق

---

[1] ملاحظہ فرمائیں: انسائیکلوپیڈیا (ج: چہارم، طبع نہم لندن)

سے ثابت ہوتا ہے کہ ۸۹۸ء بروشٹہ کا پہلا سال ہے۔ چونکہ یکم ببار [طرہ اوّل] ۹۹۸ء۲۳ ر جمادیٰ الاولیٰ ۲۲۶ھ کے مطابق ہے۔ اس حساب سے معلوم ہوا کہ سمت بروشٹہ کیلنڈر، ہجری کیلنڈر سے ۲۲۵ سال بعد شروع ہوا تھا۔ اصل سالِ آغاز میں ایک بڑے عدد کا اضافہ کردیا جاتا ہے، تاکہ عدد بڑا معلوم ہو جیسے آجکل بڑے ہوٹلوں کے روم نمبرز میں کیا جارہا ہے۔ مگر سالِ ہجری جب سے کیلنڈر بنا ہے تب سے گنا گیا ہے۔[1]

ہجری کیلنڈر کا آغاز

تاریخِ انسانیت کے مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے کم وبیش پندرہ کیلنڈر مروج رہے ہیں جن میں سے چند اہم اور معروف کیلنڈروں کے آغاز و ارتقا کا مختصر تعارف کروایا جا چکا ہے، ان تمام میں مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ مختلف تبدیلیاں، ترمیم وتہذیب اور اضافے ہوتے رہے ہیں، کیوں کہ وہ تمام انسانی دماغوں کی اختراع تھے اور ان کی بنیاد بھی کسی مضبوط چیز پر نہ تھی، جبکہ ان سب کے بر عکس اسلامی یا ہجری تقویم کو یہ شرف اور فضیلت حاصل ہے کہ وہ جب سے تجویز ہوئی ہے، اس میں ایسی کوئی ایک بھی تبدیلی نہیں لائی گئی جو دوسروں میں متعدد بار رونما ہوئیں اور نہ ہی رہتی دنیا تک اس میں کسی ترمیم وتہذیب کی ضرورت پیش آنے والی ہے، کیوں کہ اس تقویم کی بنیاد منشائے الٰہی کے عین مطابق چاند پر ہے اور چاند کو اللہ تعالیٰ نے سِن وسال کی تعیین کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ سورت یونس (آیت: ۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾

”اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے سورج کو ضیا و روشنی اور چاند کو اجالے اور چاندنی کے لیے بنایا ہے اور چاند کی منزلیں مقرر فرمائیں، تاکہ اس کے ذریعے تم سالوں کی تعداد اور حساب وکتاب معلوم کرسکو۔“

---

[1] اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی معرکہ آرا کتاب رحمۃ للعالمین (۲/ ۱۶، ۳۴۸ تا ۳۶۸) کا مطالعہ بڑا مفید ہے۔

دوسری جگہ سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۹) میں فرمایا:

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾

''لوگ آپ سے [اے میرے نبی!] چاند کی مختلف حالتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، انھیں بتادیں کہ یہ لوگوں کے لیے، [کاروبار کے] اوقات اور حج کا وقت معلوم کرنے کے لیے ہیں۔''

اس ہجری کیلنڈر کے بارہ مہینے ہیں اور خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ (آیت: ۳۶) میں یہی فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ﴾

''اللہ تعالیٰ نے جب سے زمین و آسمان بنائے ہیں، اس کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔''

اس آیت سے اور پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ سال کے بارہ ماہ اور ہر ماہ کے آغاز اور تاریخ کا پتا چلانے کا ربانی ذریعہ چاند [ہلال] ہے اور تمام شرعی امور مثلاً: رمضان، حج، یومِ عرفہ، ایّامِ تشریق اور ایّامِ بیض چاند ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس ہجری، قمری، یا اسلامی تقویم کی بنیاد اِسی فطرتی اور قدرتی نظام پر قائم ہے۔

ایسے ہی اس ہجری کیلنڈر کی ایک فضیلت وصفت یہ بھی ہے کہ اس میں عدل و انصاف اور مساوات و ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ مثلاً: اگر شمسی یا عیسوی تقویم کے حساب سے گرمی یا سردی کے کسی مہینے کو رمضان کی جگہ روزے کا مہینہ قرار دے دیا جاتا ہے تو یقیناً آدھی مسلم دنیا کو آسانی اور آدھی ہمیشہ کے لیے مشکل میں مبتلا ہوجاتی۔ کیوں کہ جغرافیہ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ دسمبر جو نصف شمالی دنیا کے لیے سب سے سرد اور چھوٹے دنوں والا ہوتا ہے، یہی مہینہ نصف جنوبی دنیا کے لیے سب سے گرم اور طویل دنوں والا ہوتا ہے، مگر اسلام کی ہمہ گیری کا تقاضا یہ تھا کہ تمام عالَم کے مسلمانوں کو اس سلسلے میں برابری میسر آئے اور ہجری کیلنڈر کے ماہِ رمضان کے روزوں سے یہ سہولت میسّر ہے کہ پورے

عالَم کے مسلمانوں کوکبھی گرمی اورکبھی سردی،کبھی بہار اورکبھی خزاں میں پورے روزے رکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔[1]

ان خصوصیات اور امتیازات کی مالک ہجری تقویم یا اسلامک کیلنڈر کے آغاز کے بارے میں امام زہری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:

"اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ هُوَ الَّذِیْ أَمَرَ بِذٰلِكَ [عِنْدَ نُزُوْلِهٖ بِقُبَاءَ] فَكَتَبَ فِیْ رَبِیْعِ الْأَوَّلِ"[2]

''خود نبی ﷺ نے ہجری تقویم کا حکم دیا تھا جبکہ آپ ﷺ قباء میں پہنچ گئے تھے تو ربیع الاول میں لکھا گیا۔''

امام سیوطی کے بقول جب نبی ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کو خط لکھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس میں یہ لکھنے کا حکم دیا:

«اِنَّهٗ كُتِبَ لِخَمْسٍ مِّنَ الْهِجْرَةِ»[3] ''یہ خط پانچ ہجری کولکھا جارہا ہے۔''

مگر جمہور اہلِ علم کا فیصلہ یہ ہے کہ ہجری تقویم کا دن، ماہ اور سال کے ساتھ باقاعدہ آغاز عہدِ فاروقی ۱۲ھ میں ہوا۔ پہلی دونوں روایتوں اور جمہور کے فیصلے میں اس طرح بھی تطبیق ممکن ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں دن اور ماہ و سال کا باقاعدہ رواج نہیں ہوا تھا۔صرف سال لکھنے پر اکتفا کیا جاتا تھا اورعہدِ فاروقی میں یہ باقاعدہ شکل تجویز ہوئی۔

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے اجرائے تاریخ کا مشورہ طلب کیا، جیسا کہ ابونعیم رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "البداية والنهاية" میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کو لکھا:

"اِنَّهٗ یَأْتِیْنَا مِنْكَ كُتُبٌ لَیْسَ لَهَا تَارِیْخٌ"

---

[1] الهجره أحمد عبد الغفور عطار (ص: ١٠٣ـ ١٠٨) مفصّلًا، رحمة للعالمين، قاضى منصور پورى (٢/ ٣٥٢) مختصراً.

[2] رواه الحاكم في الإكليل كما في فتح الباري (٧/ ٢٦٨) و قال: معضل.

[3] تدريب الراوي (ص: ٢٥٦) كما في آيات للسائلين وهجرة سيّد المرسلين (ص: ٧٦) وائل محمد القبيصي

''ہمیں ملنے والے آپ کے خطوط میں تاریخ نہیں ہوتی۔''

ایک ایسا معاملہ سامنے آیا کہ جس کا تعلق شعبان سے تھا تو پوچھا گیا:

''أَيُّ الشَّعْبَانَيْنِ أَهُوَ الَّذِيْ مَضَىٰ أَمِ الَّذِيْ يَأْتِيْ''

''کیا اس سے گزرا ہوا شعبان مراد ہے یا آیندہ شعبان؟''

لٰہذا حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ تاریخ وتقویم مقرر کرنے کا ارادہ کیا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں مشورہ طلب کیا۔[1] جب حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اجرائے تاریخ کا مشورہ طلب کیا، تو کئی ایک آرا سامنے آئیں۔ کسی نے ولادتِ رسول ﷺ، کسی نے بعثت، کسی نے ہجرت اور کسی نے آپ ﷺ کی وفات سے آغاز کا مشورہ دیا۔ مگر حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی رائے پر دولتِ اسلامیہ کا پیش خیمہ بننے والے واقعہ ''ہجرتِ رسول ﷺ'' کو نقطۂ آغاز بنایا گیا، اور ہجرت اگرچہ ماہِ ربیع الاول میں ہوئی تھی، تاہم آپ ﷺ کا عزمِ ہجرت بیعتِ عقبہ کے وقت ذوالحجہ ہی میں ہو چکا تھا اور اس عزم کے بعد پہلا چاند محرّم کا ہی طلوع ہوا۔ یہی عربوں میں پہلا مہینہ مشہور ومعروف تھا، لٰہذا اسے ہی ہجری کیلنڈر کا پہلا مہینہ قرار دیا گیا۔ بخاری شریف میں ہے:

''مَا عَدُّوْا مِنْ مَبْعَثِ النَّبِيِّ ﷺ وَ لَا مِنْ وَفَاتِهٖ، مَا عَدُّوْا اِلَّا مِنْ مَقْدَمِه الْمَدِيْنَةَ''[2]

''صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کی بعثت یا وفات کے بجائے آپ ﷺ کی ہجرتِ مدینہ سے تاریخ کا آغاز کیا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں بڑی نفیس بحث کی ہے اور کئی آثار نقل کیے ہیں کہ محرّم سے آغازِ سال کی رائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تھی اور ہجرت کو نقطۂ آغاز بنانے کی رائے کے بارے میں بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تھی۔[4]

---

[1] الهجره للعطار (ص: ١٢٦) آيات للسائلين (ص: ٧٧) نقلًا عن أبي نعيم في تاريخه، البداية و النهاية (٣/ ٧ـ ٢٠٦ـ ٢٠٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٣٤)

[3] البداية و النهاية (٣/ ٢٠٦) الفتح الرباني للبنّا (٢١/ ٢ـ ٣) فتح الباري (٧/ ٢٦٧ـ ٢٦٩)

اب ہر مسلمان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اُس ہجری کیلنڈر کو زندہ و جاری رکھے اور اپنے دفاتر و مکاتب اور گھروں میں ہجری تاریخوں پر عمل کرے۔

اسلامی تقویم کا واقعۂ ہجرت سے آغاز کیوں؟

اسلامی کیلنڈر یا ہجری تقویم کے بارے میں تفصیل ذکر کر دی گئی ہے کہ اس کا باقاعدہ اجرا حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں انہی کی رائے سے ہوا۔ حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کو جن امور میں شرفِ فوقیّت حاصل ہے، انھیں میں سے ایک انتہائی اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی تقویم کا آغاز واقعۂ ہجرت سے کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کی ابتدا کے لیے اُس وقت کو مناسب و موزوں سمجھا، جب رسول اللہ ﷺ نے یہ خیال فرمایا کہ اب مکہ کی فضا مسلمانوں کے قیام اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ناسازگار ہوگئی ہے، لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخِ اسلام کے صفحاتِ پُر ثروت میں اور بھی بہت سے ایسے واقعات موجود ہیں جو شان و شکوہ اور مسرّت و شادمانی کے اعتبار سے انتہائی لائقِ اعتناء اور قابلِ توجہ ہیں۔ آخر اُن میں سے کسی واقعہ کو اسلامی تقویم کے آغاز کے لیے کیوں منتخب نہ کیا گیا؟ پھر نبی ﷺ کے عہدِ مسعود میں بعض ایسے سانحات و حوادث بھی رونما ہوئے جنھیں شدّت و تلخی اور حزن و ملال کے اعتبار سے تاریخِ اسلامی کا ایک نہایت نازک موڑ اور انتہائی تکلیف دِہ باب گردانا گیا۔ آخر ایسے واقعات میں سے کسی کو تاریخِ اسلام کا مبدا کیوں نہیں بنایا گیا اور واقعۂ ہجرت کو اولیّت کیوں دی گئی؟

① اسلامی نقطۂ نگاہ سے تاریخ کا سب سے عظیم واقعہ خود نبی ﷺ کا افقِ وجود پر جلوہ گر ہونا ہے۔ رفعت و عظمت کے اعتبار سے یہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ جس نے انسانیّت کی پوری تاریخ کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ یہی وہ ساعتِ پُر سعادت ہے جو اس جہانِ خاکی میں صبحِ امید کے طلوع کا باعث بنی اور یہی وہ وقتِ انبساط آگیں ہے جس سے عالَمِ امکان میں نئے نئے علوم وفنون کی شعاعوں کے ضوفشاں ہونے کے آثار اُبھرے، لیکن مسلمانوں نے اپنی تاریخ کا آغاز اُس سے نہیں کیا۔

② اس کے بعد وہ نقطۂ نور آیا جب نبی ﷺ کو خلعتِ نبوت سے سرفراز کیا گیا، یہ وہ صبحِ مبارک تھی

جب پہلے پہل آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔ یہ تاریخِ عالَم کا ایک نرالا موڑ تھا۔لیکن مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے آغاز کے لیے اس موقعے کو بھی مناسب نہ سمجھا۔

③ پھر واقعۂ معراج رونما ہوا جس سے نبی ﷺ کے لیے زمان و مکان کی بے پناہ وسعتیں کلیتاً سمٹ گئیں۔ اس واقعے سے بھی مسلمانوں نے اپنی تقویم کے لیل و نہار کو شروع نہیں کیا۔

④ غزوۂ بدر کو اسلام میں ایک اہم بنیادی حیثیّت حاصل ہے جس کی فتح صرف اِسی حیثیّت سے فتح نہیں تھی کہ نبی ﷺ کے صرف تین سو تیرہ مخلص فِدا کار صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک ہزار مسلّح لشکر پر غلبہ حاصل کیا۔ بلکہ یہ کفر کے مقابلے میں اسلام کی فتح تھی۔ سچائی و صداقت نے جھوٹ کو زیر کیا۔ صحیح اصولوں اور بلند قدروں کی جیت ہوئی۔صحت مند عقیدے نے کامیابی حاصل کی۔ نئے اندازِ حیات نے آبا و اجداد کے پُرانے خود ساختہ طریقِ زندگی کے حاملین کو شکست دی، بلکہ فتحِ بدر سے بے شمار نئے باب وا ہوئے، لیکن اس کے باوجود اسلامی تاریخ کو اس فتحِ عظیم سے بھی شروع نہیں کیا گیا۔

⑤ فتح مکہ اہمیّت و عظمت کے اعتبار سے ایسی انفرادیت لیے ہوئے ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، جبکہ کفر نے ہمیشہ کے لیے اسلام کے آگے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے اور نبی ﷺ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ اس شہرِ مکہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوئے جہاں کبھی اُن کے لیے چند لمحات کا قیام بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

⑥ اسلامی تقویم کے آغاز کے لیے غم و اندوہ اور حزن و ملال کے انفرادی و اجتماعی مواقع کو بھی مناسب نہیں سمجھا گیا۔ نبی ﷺ کے عمِّ محترم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ظالمانہ و وحشت ناک شہادت تاریخِ اسلام کا بہت بڑا حادثہ ہے۔

⑦ خود نبی ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کا سانحہ ہے جس پر آپ ﷺ نے آنسو بہائے اور زبانِ مبارک سے حزن و ملال کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا:

«اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ»[1]

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳۰۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۱۵)

''اے ابراہیم! ہم تیرے فراق پر بڑے غمزدہ ہیں۔''

⑧ ان انفرادی واقعات کے علاوہ جنگِ حنین کی ابتدائی طور پر بظاہر ہزیمت تاریخِ اسلام کا اندوہناک واقعہ و حادثہ تھا۔ مگر ایسے واقعات کو آغازِ تقویم کے لیے قبول نہیں کیا گیا۔ آخر کیوں؟ اور واقعۂ ہجرت سے آغاز کیا تو کس لیے؟

ان سوالات کا جواب شاہِ علم وادب، امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ نے اپنے اخبار ''الہلال'' میں بڑی تفصیل سے دیا تھا جس کو برِّ صغیر کے ماہرِ آزادیات مولانا غلام رسول مہر نے ''رسولِ رحمت ﷺ'' نامی کتاب میں مرتب کر دیا ہے جو علم و فضل اور زبان و بیان کی چاشنی سے بھرپور اور قابلِ مطالعہ ہے۔[1]

مختصر یہ کہ اسلام شکست و ہزیمت کو زیادہ اہمیّت نہیں دیتا بلکہ وہ اصول اور ضابطے کا مذہب ہے۔ اسلام کی فطرت اور اس کا مزاج یہ ہے کہ وہ حزن و ملال اور رونے دھونے یا آنسو بہانے کا مذہب نہیں ہے۔ اس میں کسی کی وفات و ولادت اگرچہ اپنی جگہ ایک مقام رکھتے ہیں، مگر اس قدر بھی نہیں کہ اُسے اسلامی تقویم کی بنیاد قرار دے دیا جاتا۔

فتحِ بدر، فتحِ مکہ یقیناً پُرعظمت واقعات ہیں۔ لیکن اسلام صرف جنگ و جہاد ہی کا نام نہیں اور نہ ہی معرکہ آرائیوں میں کامیابیاں اس کا اصل مقصود ہیں، بلکہ اسلام ایک پیغام ہے۔ شب و روز کی زندگی کا ایک منضبط پروگرام ہے اور ایک صاف سُتھری دعوت ہے جو انفرادی و اجتماعی طور پر ذہنوں کو بدل کر رکھ دے۔ جہاد اسلام کی منزل نہیں، بلکہ اس دعوت کے طریق اور تسلسل کو قائم رکھنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔

حضرتِ فاروق، حضرت علی اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی فراست کا اندازہ فرمائیں کہ اسلامی کیلنڈر یا تقویم کے آغاز کے لیے اُن کی نظر واقعۂ ہجرت پر پڑی۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہجرت کے وقت مسلمانوں نے اپنے وطن، عزیز و اقارب، کاروبار، گھربار اور زمین و جائیداد کو خیر باد کہا اور حکمِ نبوی کے مطابق ایسی جگہ جانے کو تیّار ہو گئے جہاں جان پہچان کم، ذرائع معاش غیر یقینی

[1] دو صفحات کے بعد اس طویل مقالہ کا خلاصہ مولانا آزاد ہی کے الفاظ میں دیا جا رہا ہے۔

اور مستقبل کے معاملات غیر واضح تھے۔ اور مہبطِ نورِ الٰہی، بیت اللہ شریف سے سینکڑوں میل (ساڑھے چار سو کلومیٹر) کا بُعدِ مسافت بھی ہے۔ لیکن تبلیغِ اسلام، دینی قدروں کی اشاعت، برکاتِ توحید کو عام کرنے اور اسلام کی بتائی ہوئی صاف ستھری تہذیب وثقافت کو وسعتوں سے ہمکنار کرنے کی غرض سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سب کچھ کیا جس کا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حکم دیا۔ اسلام وہ دین نہیں کہ نوحہ و بکا کی تعلیم دے اور لوگوں کو رونے دھونے پر لگا دے، بلکہ یہ تو چاہتا ہے کہ توحید کے قافلے آگے بڑھیں۔ احکامِ الٰہی کی اطاعت کے کارواں ہر حال میں آگے بڑھیں، اپنا سفر جاری رکھیں اور دعوتِ اسلامی کے تقاضے پورے ہوں، اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ حالات چاہے کیسے بھی کیوں نہ ہوں، مسلمانوں کی اطاعت وفرمانبرداری میں قطعی کوئی فرق نہ پڑے۔

ہجرت ہی وہ گھڑی تھی جب مسلمانوں کے شعور نے ایسی انقلابی کروٹ لی کہ وہ اپنی تمام تر ضرورتوں، مصلحتوں اور تمناؤں کو راہِ للہ قربان کر کے مدینہ منورہ کی طرف چل کھڑے ہوئے، تا کہ جماعتی قوّت اور اجتماعی طاقت کو بروئے کار لاکر اسلامی تنظیم کو مستحکم کریں اور ایسے حکومتی نظام کی بنیاد رکھیں جو سرا سر دینی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دنیا نے دیکھا اور تاریخ شاہد ہے کہ مدینے کی وہ حکومت ایک مثالی حکومت تھی۔ اور وہی ہجرت مسلمانوں کے لیے بیداریِ فکر وعمل کی پہلی صبح تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی تقویم کا وہیں سے آغاز کیا جو اُن کی فراست و فطانت کی بیّن دلیل ہے۔[1]

ہجری سَنہ کی ابتدا واقعۂ ہجرت سے کیوں؟

گذشتہ سطور میں یہ بات ذکر کی جاچکی ہے کہ اس سوال پر سیر حاصل بحث شاہِ علم و ادب مولانا ابو الکلام آزادؔ نے اپنے اخبار ''الہلال'' میں کی تھی جس کو برِّصغیر کے ماہر آزادیات مولانا غلام رسول مہرؔ نے ''رسولِ رحمت ﷺ'' میں ''واقعۂ ہجرت اور اسلامی سنہ ہجری'' کے عنوان سے ترتیب دیا تھا۔ لیکن وہ مضمون کافی طویل ہونے کی وجہ سے مستقل رسالہ کی شکل چاہتا تھا، تاہم جامعہ محمدیہ منصورہ [انڈیا]

[1] مختصر اداریہ ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' لاہور (بابت ۲/محرّم ۱۴۰۸ء بمطابق ۲۸/اگست ۱۹۷۸ء جلد ۱۸ شمارہ ۳۵) ازقلم مولانا محمد اسحاق بھٹی.

کے ایک نشریہ بعنوان ''اسلامی سالِ نو اور ماہِ محرّم'' میں مولانا محمد انور جامعی سلفی نے اسے مختصر اور مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کے بقول اس تلخیص میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ملخِّص کا ایک لفظ بھی اس میں شامل نہ ہو، تا کہ زبان و ادب کی چاشنی برقرار رہے۔

واقعۂ ہجرت کی عظمت

مولانا آزاد رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''آج جبکہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں، محرّم کی تیرہویں تاریخ ہے۔ پورے تیرہ دن اس واقعہ پر گزر چکے ہیں کہ پچھلا ہجری سال ختم ہو چکا ہے اور نیا ہجری سال شروع ہو چکا ہے۔ لیکن ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں میں شاید ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس نے غور کیا ہوگا کہ اس سالانہ اختتام و آغاز میں تاریخِ عالَم کے کیسے عظیم اور انقلاب انگیز واقعہ کی یاد پوشیدہ ہے؟ وہ عظیم واقعہ جس کی یاد آوری سے بڑھ کر تاریخِ اسلام کا کوئی بھی واقعہ ہماری یادداشت سے دُور اور ہمارے دِل کی اثر پذیریوں سے مہجور نہیں ہوگا۔

فتح مندیوں کا بیج

تاریخِ عالَم کا یہ عظیم واقعہ جس کی یاد سال کے آغاز و اختتام میں پوشیدہ ہے، ہجرتِ نبوی ﷺ کا واقعہ ہے، کیوں کہ پہلی محرّم سے نیا اسلامی سال شروع ہوتا ہے اور اس واقعہ کی بنیاد واقعۂ ہجرت پر رکھی گئی ہے۔ ہر سال جب ۳۰؍ ذی الحجہ کا دن ختم ہوتا ہے اور پہلی محرّم کا چاند طلوع ہوتا ہے تو اس عظیم واقعے کی یاد ہمارے دِلوں میں تازہ کر دینی چاہتا ہے۔ یہ فی الحقیقت ایک جاری و قائم یادگار ہے۔

یہ دنیا کی تمام قوموں کی یادگاروں کی طرح قوّت کی کامرانیوں کی یادگار نہیں، بلکہ کمزوری کی فتح مندیوں کی یادگار ہے۔ یہ اسباب و وسائل کی فراوانیوں کی یادگار نہیں، بے سروسامانیوں کی یادگار ہے۔ یہ حکومت و طاقت کے جاہ وجلال کی یادگار نہیں، محکومی و بے چارگی کے ثبات و استقلال کی یادگار ہے۔ یہ فتحِ مکہ کی یادگار نہیں جسے دس ہزار تلواروں کی چمک نے فتح کیا تھا۔ یہ فتحِ مدینہ کی یادگار ہے جسے تلواروں کی چمک نے نہیں، بلکہ ایک بے سروسامان انسان کی رُوحِ ''ہجرت'' نے فتح کیا تھا۔

تم نے بدر کی جنگی فتح اور مکہ کے مسلّح داخلے کی شان و شوکت ہمیشہ یاد رکھی۔ لیکن تم نے مدینہ کی بے ہتھیار فتح فراموش کر دی۔ حالانکہ تاریخِ اسلام کی آنے والی ساری فتح مندیاں اسی اوّلین فتح میں ایک بیج کی طرح پوشیدہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ظاہری فتح مندیوں کے اعلان کا وقت آیا تو اس وقت معنوی فتح مندی کی لوگوں کو یاد دلائی گئی تھی:

﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [التوبة: ٤٠]

''دو میں دوسرا [اللہ کا رسول] تھا۔ اور دونوں غار میں چھپے بیٹھے تھے۔ اُس (اللہ کے رسول) نے اپنے ساتھی سے کہا کہ غمگین نہ ہو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے، پس اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا، پھر ایسی فوجوں سے مدد گاری کی جنھیں تم نہیں دیکھتے اور بالآخر کافروں کی بات پست کی۔ اور اللہ ہی کی بات ہے جس کے لیے بلندی ہے۔''

سَنہ ہجری کی ابتدا

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدّن قوموں میں سنہ جاری تھے۔ زیادہ مشہور یہودی، رومی اور ایرانی سنین تھے۔ عرب کی جاہلیّت کی اندرونی زندگی اس قدر متمدّن نہیں تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی۔ اوقات و مواسم کی حفاظت اور یادداشت کے لیے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اس سے وقت کا حساب لگا لیتے۔ من جملہ سنینِ جاہلیّت کے ''عام الفیل'' تھا۔ یعنی شاہِ حبش ''ابرہہ'' کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال۔ عرصے تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطورِ سنہ مستعمل رہا۔

ظہورِ اسلام کے بعد یہ اہمیّت خود عہدِ اسلام کے واقعات نے لے لی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا قاعدہ تھا کہ عہدِ اسلام کے واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اسی سے حساب لگا لیتے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد ہی سورۃ الحج کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی:

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ [الحج: ٣٩]

''اب جن (مسلمانوں سے کافر) لڑتے ہیں ان کو بھی (لڑنے کی) اجازت ہے کیوں کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔''

اس لیے کچھ دنوں تک یہی اذنِ جہاد بطور ایک سنہ کے مستعمل رہا۔ لوگ اسے ''سنہ اذن'' سے تعبیر کرتے اور یہ تعبیر وقت کے ایک خاص عدد کی طرح یاد داشت میں کام آتی۔ اس طرح سورت براءۃ (توبہ) کے نزول کے بعد بول چال میں ''سنہ براءۃ'' کا بھی رواج رہا۔ عہدِ نبوی ﷺ کا آخری سنہ سنہ الوداع تھا۔ یعنی آں حضرت ﷺ کے آخری حج کا واقعہ جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اور ہجرت کے دسویں سال پیش آیا تھا۔ بعض روایات سے اس طرح کے متعدد سنوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً: سنہ المحیص، سنہ الترفۂ، سنہ الزلزال، سنہ الاستیناس۔ بیرونی نے ''آثار الباقیہ'' میں اس طرح کے دس سنوں کا ذکر کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہی حالت جاری رہی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالکِ مفتوحہ کی وسعت اور دفاترِ حکومت کے قیام سے حساب و کتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوئے اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر کوئی ایک سنہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ اس معاملے پر غور کیا گیا اور سنہ ہجری کا تقرّر عمل میں آیا۔ اس وقت واقعۂ ہجرت پر سولہ برس گزر چکے تھے۔

احساسِ ضرورت اور مشورہ

سنہ ہجری کا تصوّر عمل میں آیا تو کیوں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذہن اس طرف گیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا واقعۂ ہجرت سے کی جائے۔ یہ تاریخِ اسلام کا ایک ضروری اور نتیجہ خیز مبحث تھا، لیکن افسوس کہ اس وقت نظر و فکر سے محروم رہا۔ اس بارے میں متعدد روایتیں منقول ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور میمون بن مہران کی روایت ہے جسے تمام مورخین نے نقل کیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے:

''ایک مرتبہ کاغذ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا جس میں شعبان کا مہینہ درج تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: شعبان سے مقصود کون سا شعبان ہے؟ اس برس کا یا آیندہ برس

کا؟ پھر آپ [حضرت عمر رضی اللہ عنہ] نے سر برآوردہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کیا اور ان سے کہا: اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہوجاتا۔ لہٰذا ضروری ہے حساب و کتاب کے لیے کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہوسکیں۔ اس پر لوگوں نے کہا: ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہیے کہ اُن کے یہاں اس کے کیا طریقے تھے؟ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر مزان کو بلایا۔ اُس نے کہا: ہمارے یہاں ایک حساب موجود ہے جسے ماہ روز کہتے ہیں۔ اِسی ماہ روز کو عربی میں مورّخہ بنا لیا گیا ہے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کی تاریخ کے لیے جو سنہ اختیار کیا جائے اس کی ابتدا کب سے ہو؟ سب نے اتفاق کیا کہ ہجرت کے برس سے کی جائے، چنانچہ ہجری سنہ قرار پایا۔'' (تاریخ کبیر ذہبی و تاریخ مقریزی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے

ابو ہلال عسکری نے الاوائل میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ واقعۂ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

"جَمَعَ عُمَرُ النَّاسَ فَسَأَلَهُمْ: مِنْ أَيِّ يَوْمٍ يُكْتَبُ التَّارِيْخُ؟ فَقَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ: مِنْ يَوْمٍ هَاجَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَتَرَكَ مَكَّةَ فَفَعَلَهُ عُمَرُ"[1]

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ کس دن سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اُس دن سے جس دن آنحضرت ﷺ نے ہجرت کی اور مکہ سے مدینہ آئے۔''

یعقوبی نے بھی اسے من جملہ ان امور کے قرار دیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے سے انجام پائے۔ ۱۶ھ کے باب میں لکھا ہے:

[1] كتاب الأوائل للمقريزي (٢/ ٥٦)

''اسی زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ ضبطِ کتابت کے لیے ایک تاریخ قرار دے دی جائے، پہلے انھیں خیال ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت سے شروع کریں۔ پھر خیال آیا کہ آپ ﷺ کی بعثت کے واقعے سے ابتدا کی جائے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ ہجرت سے شروع کرنا چاہیے۔'' (۲/ ۱۶۶)

قومی سنہ کی ضرورت و اہمیت

ان روایات کے مطالعہ کے بعد ضروری ہے کہ بعض امور پر غور کیا جائے:

سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے، یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ ضرورت محسوس کیوں کی کہ ایک نیا سنہ قرار دیا جائے؟

امام شعبی رحمہ اللہ کی روایت میں ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ تاریخ کے تعیّن وتقرّر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن پسند نہیں کر رہے تھے کہ دوسری قوموں کی تاریخ اختیار کریں۔

پہلی روایت جس میں ہرمزان کو بلانے اور مشورہ کرنے کا ذکر ہے، یہ خوزستان کا بادشاہ تھا اور مسلمان ہو کر مدینہ میں آباد ہو گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلسِ شوریٰ میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے۔ بیرونی لکھتا ہے:

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے نہ صرف ایرانیوں کا طریقہ بتلایا بلکہ روسیوں کے طریقے کی بھی تشریح کی۔ ایرانیوں کے یہاں سنہ یزدگر کا سنہ تھا۔ اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدایش سے شروع ہوتا ہے۔ بعض اصحاب کو خیال ہوا کہ انہی دونوں میں سے کوئی سنہ اختیار کرلیا جائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور لوگ اس سے متفق نہ ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایرانیوں اور رومیوں کے سنین مجمع میں زیرِ بحث رہے اور بعض نے اسے اختیار کرنے کی رائے بھی دی، لیکن عام رجحان اس طرف تھا کہ نیا سنہ مقرر کرنا چاہیے۔

اجنبی سنہ سے اجتناب کیوں؟

اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ سنہ کی ضرورت اور استعمال کی بڑی جگہ حساب کتاب کے دفاتر

تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باتفاقِ صحابہ رضی اللہ عنہم دفاتر کے لیے وہی زبانیں اختیار کر لی تھیں جو بیشتر مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں۔ ایران کے لیے فارسی، شام کے لیے سریانی اور مصر کے لیے قبطی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب دفاتر کے لیے ایران و شام کی زبانیں اختیار کر لی گئیں تو قدرتی طور پر سنہ بھی وہی اختیار کر لینا چاہیے تھا جو ان زبانوں کے حساب وکتاب میں رائج تھا اور اس کے قواعد بندھے چلے آتے تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا نہیں کیا کہ ایران اور روم ومصر کی زبانیں تو اختیار کر لیں، مگر سنہ اپنا قائم کرنا چاہا۔ غور کرنا چاہیے کہ اس اجتناب کی علت کیا تھی؟

صحابہ رضی اللہ عنہم کے دماغ کا سانچہ

اس کی اصل علت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم وتربیت نے صحابہ رضی اللہ عنہم کا دماغ جس سانچے میں ڈھال دیا تھا وہ ایسا سانچہ تھا جس میں دوسرے درجے کا کوئی خیال سما ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ صرف اول درجہ کے خیالات کے لیے تھا۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا کے تمدنی علوم وفنون کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علموں، طریقوں اور مصطلحہ نقطوں میں ادا نہ کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل وصورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے۔ لیکن ان کی طبیعت کی افتاد اور ذہنیت کی روش کچھ اس طرح بن گئی تھی کہ جب کبھی کسی معاملے پر سوچ بچار کرتے تھے تو خواہ علت وموجب سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں لیکن دماغ جاتا اسی طرف تھا جو علم وحکمت کے لیے بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند پہلو ہو سکتے تھے۔ یہی معنیٰ ہیں انبیائے کرام کے مقامِ ''تزکیہ'' کے: ﴿ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ [الجمعة: ٢]

''ان کو (شرک اور کفر گندگی سے) پاک کرتا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی) کتاب اور سمجھ کی باتیں سکھلاتا ہے (دانائی اور عقلمندی کی)۔''

یعنی دل ودماغ کی اس طرح تربیت کر دی جاتی ہے کہ وہ ایک موزوں ومستقیم سانچے کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ اب جب کبھی کوئی ٹیڑھی چیز اس میں رکھی جائے گی وہ قبول نہیں کرے گا۔ صرف موزوں چیز ہی اس میں سما سکتی ہے۔

قومی زندگی کی بنیادی اینٹ:

اسلام کی تربیت نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل ودماغ میں قومی شرف اور خود داری کی روح پھونک دی تھی، قومی زندگی کی بنیادیں جن اینٹوں پر استوار ہوتی ہیں ان میں سے ایک ایک اینٹ کے لیے ان کے اندر پہچان اور لگاؤ تھا، اگر چہ وہ لفظوں میں اور تعبیروں میں انھیں بیان نہ کر سکیں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنہ اور تاریخ کی ضرورت محسوس کی تو اگر چہ متمدن اقوام کے سنین رائج و مستعمل تھے، لیکن ان کی طبیعت مائل نہ ہوسکی، اس لیے کہ ایسا کرنا نہ صرف قومی شرف وخود داری کے خلاف تھا بلکہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ کھو دینا تھا۔

قومی زندگی کی بنیادی چیزوں میں سے ایک نہایت اہم چیز سنہ اور تاریخ ہے۔ جو قوم سنہ نہیں رکھتی وہ گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سنہ اس کی پیدایش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے۔ یہ اس کی قومی زندگی کی روایت قائم رکھتا اور صفحۂ عالَم پر اس کے اقبال وعروج کا عنوان ثبت کر دیتا ہے۔ یہ قومی زندگی کے ظہور وعروج کی ایک جاری وقائم یادگار ہے۔ ہر طرح کی یادگاریں مٹ جاتی ہیں لیکن یہ نہیں مٹ سکتی۔ کیوں کہ سورج کے طلوع وغروب اور چاند کی غیر متغیر گردش سے اس کا دامن بندھ جاتا ہے اور دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عمر بھی بڑھتی رہتی ہے۔ آج گسٹس، بکر ماجیت، جلال الدین، ملک شاہ اور اکبر اعظم کے نام ان کے سنین کے اندر ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمارا حافظہ ان سے گردن نہیں موڑ سکتا۔

سنہ اپنا ضروری تھا:

ممکن نہ تھا کہ قومی زندگی کا ایک ایسا اہم معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے آتا اور ان کا دماغ غلط فیصلہ کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام کی دماغی تربیت غلط ہو جاتی۔ کچھ ضروری نہیں کہ انھوں نے اپنے اس احساس کی کوئی توجیہ وتعلیل بھی کی ہو۔

نتائج تعبیر اور تعلیل سے نہیں بلکہ فعلِ صحیح سے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے خلاف میلان پیدا نہ کر سکے۔ وہ باوجود غیر قوموں کی ہر طرح کی عملی اور تمدنی چیز قبول کر لینے کے ان کا سنہ قبول نہ کر سکے۔ خود بخود ان کی طبیعت کا فیصلہ یہی ہوا کہ قومی سنہ سب سے الگ اور

ایسا ہونا چاہیے جس کی بنیاد اپنی تاریخ کے کسی قومی واقعہ پر ہو۔ انھوں نے اپنے دفتر دں کے لیے ایرانیوں اور رومیوں کی زبان لے لی۔ ان کے حساب وکتاب کے قواعد قبول کر لیے۔ ان کے حساب کی مصطلحات اور اشارات سے بھی انکار نہیں کیا، لیکن سنہ اور تاریخ لینے پر آمادہ نہ ہوسکے۔ یہ قومی زندگی کی بنیادی اینٹوں میں سے ایک اینٹ تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ اپنی ہو اور اپنے ہی ہاتھ سے رکھی جائے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اسلام نے جو ذہنیت ان کی پیدا کردی تھی، اسے یہی کرنا تھا۔

واقعۂ ہجرت کا اختصاص

سب سے اہم نقطۂ نظر واقعۂ ہجرت کا اختصاص ہے۔ اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ سنہ کی ابتدا قرار دینے کے لیے جس قدر بھی سامنے کی چیزیں ہوسکتی تھیں، ان میں سے کسی چیز کی طرف ان کی نگاہ نہ گئی۔ ہجرتِ نبوی کا واقعہ جو آغازِ اسلام کی بے سروسامانیوں اور کمزوریوں کی یادتازہ کرتا تھا، اختیار کیا گیا، آخر اس کی علت کیا تھی؟

مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لیے قدرتی طور پر جو چیزیں سامنے تھیں وہ اسلام کا ظہور تھا، داعیِ اسلام کی پیدایش تھی، نزولِ وحی کی ابتدا تھی، بدر کی تاریخی فتح تھی، مکہ کا فتح مندانہ داخلہ اور حجۃ الوداع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل وفتح کا آخری اعلان تھا، لیکن ان تمام واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی اختیار نہیں کیا گیا۔ ہجرتِ مدینہ کی طرف نظر گئی جو نہ تو کسی کی پیدایش کا جشن ہے نہ کسی ظہور کی شوکت، نہ کسی جنگ کی فتح ہے، نہ کسی غلبہ وتسلّط کا شادیانہ، بلکہ اس زمانے کی یادتازہ کرتا ہے جب آغازِ اسلام کی بے سروسامانیاں اور ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ داعیِ اسلام ﷺ کے لیے اپنے وطن میں زندگی بسر کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ بیچارگی اور مظلومیّت کی انتہا تھی کہ اپنا وطن، اپنا گھر، اپنے عزیز واقارب اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف ایک رفیقِ غم گسار کے ساتھ رات کی تاریکی میں رہ سپار دشتِ غربت ہوا تھا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملات میں قدرتی طور پر دوسری قوموں کے نمونے سامنے آیا کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے بھی یہ نمونے موجود تھے، لیکن وہ ان کی تقلید پر آمادہ نہ ہوسکے اور انھوں نے بالکل ایک دوسری راہ اختیار کی۔

واقعۂ ہجرت کی اہمیت

اس بارے میں قوموں کا طریقہ ان کے سامنے آیا اور خود انھیں بھی یہ بات صاف دکھائی دی کہ داعیِ اسلام ﷺ کی پیدائش یا بعثت کو اپنی قومی تاریخ کی بنیاد ٹھہرائیں، لیکن چونکہ یہ بات اس معیارِ نظر سے ہٹی ہوئی تھی جو اس طرح کے معاملات میں اسلام نے قائم کیا تھا، اس لیے نہایت واضح اور نمایاں ہونے پر بھی ان کی طبیعت کو مطمئن نہ کرسکی۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ کوئی دوسری بات ہونی چاہیے۔ وہ دوسری بات کیا تھی؟ ہجرتِ مدینہ کا واقعہ۔ جونہی یہ بات سامنے آئی سب کے دلوں نے قبول کر لی۔

تاریخ کا یہ مبدا دنیا کی تمام تاریخوں اور یادگاروں کے خلاف تھا۔صرف خلاف ہی نہ تھا بلکہ صریح الٹا تھا۔ دنیا کی تمام قومیں فتح واقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں۔انھوں نے بے چارگی اور درماندگی سے اپنی تاریخ شروع کی۔ دنیا کی تمام قوموں نے چاہا کہ اپنے ظہور کی سب سے بڑی فتح یاد رکھیں، انھوں نے چاہا کہ اپنی تاریخِ ظہور کی سب سے بڑی بے سروسامانی یاد رکھیں۔ دنیا کی تمام قوموں کا فیصلہ یہ ہے کہ ان کی قومی تاریخ اس وقت سے شروع ہو جب ان کی تاریخ کا سب سے بڑا انسان پیدا ہوا اور اس نے جنگ وقتال کے میدان میں فتح حاصل کی۔لیکن ان کا فیصلہ یہ تھا کہ قومی تاریخ کی ابتدا اُس دن سے ہو جب سب سے بڑے انسان کی نہیں بلکہ سب سے بڑے عمل کی پیدائش ہوئی اور جنگ کے میدانوں میں نہیں بلکہ صبروا ستقامت کے میدانوں میں فتح حاصل ہوئی۔ دنیا کی تمام قوموں کا یقین تھا کہ ان کی طاقت وشوکت کی بنیاد اس وقت پڑی جب انھوں نے ملکوں اور سلطنتوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کا یقین یہ تھا کہ طاقت وشوکت کا دروازہ اس دن کھلا جب ملکوں پر انھوں نے قبضہ نہیں کیا، بلکہ اپنا ملک و وطن بھی ترک کر دیا۔

بلاشبہہ یہ ان کی سمجھ دنیا کی ساری قوموں سے الٹی تھی، لیکن اُس سمجھ کے عین مطابق تھی جو اسلام کی تربیت نے ان کے اندر پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر قوموں کی تقلید سے نہیں بلکہ اسلام کی روحِ فکر وعمل سے کرنی چاہتے تھے۔ مصیبت یہ ہے کہ دنیا معنیٰ سے زیادہ لفظ کی اور روح سے زیادہ جسم کی پرستار ہے۔ وہ پھل ڈھونڈتی ہے لیکن تخم کی جستجو نہیں کرتی۔ وہ منارہ ومحراب کی

بلندیاں اور خوش نمائیاں دیکھتی ہے، لیکن زیرِ زمین بنیادوں کے لیے نگاہ نہیں رکھتی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب پیدائش و بعثت کے واقعاتِ عظیمہ ترک کر کے ہجرت کے واقعہ کا انتخاب کیا تو ان کی نظر بھی پیدائش وظہور، فتح و اقبال اور جشن و کامرانی پر ہی تھی۔ وہ کچھ ناکامی ونامرادی کے طلب گار نہ تھے۔ البتہ وہ فتح واقبال کی صورت اور برگ وبار نہیں دیکھتے تھے، حقیقت اور تخم و اساس پر نظر رکھتے تھے۔ ان پر یہ حقیقت کھل چکی تھی کہ اسلام کی پیدائش وظہور اور فتح واقبال کی اصلی بنیاد ان واقعات میں نہیں جو ظاہر ہوتے ہیں، ہجرتِ مدینہ اور اس کے اعمال وحقائق میں ہے۔ اس لیے جو اہمیت دنیا کی نگاہیں پیدائش، بعثت، بدر اور فتح مکہ کو دیتی تھیں، وہ ان کی نظروں میں ہجرتِ مدینہ کو حاصل تھی۔

ہجرتِ مدینہ کی حقیقت:

لیکن واقعۂ ہجرت کیا تھا؟ وہ ایک ہی واقعہ نہ تھا، بے شمار اعمال و وقائع کا مجموعہ تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی حقیقت پر غور کر لینا چاہیے۔ اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عَہدوں میں منقسم ہے۔ ایک عہد مکہ کی زندگی اور اعمال کا۔ دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا۔

پہلا آنحضرت ﷺ کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا غارِ حرا کے اعتکاف سے ہوتی ہے اور تکمیل غارِ ثور کے اِنزوا پر۔

دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔

دنیا کی نظروں میں ظہور واقبال کا اصلی دور دوسرا دور تھا، کیوں کہ اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی اور ظاہری طاقت وحشمت کا سامان شروع ہوا۔ بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی فتح تھی۔ مکہ کی فتح غربت کی فتح کا اعلانِ عام تھی، لیکن خود اسلام کی نظروں میں اس کی زندگی کا اصل دور، دوسرا نہیں پہلا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں، پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا۔ لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں؟ بلاشبہ فتح مکہ،

عرب کی فیصلہ کن فتح تھی، لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی راہ کیونکر کھلتی؟

یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا، لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں، ہجرت اور اس دور کے اعمال سے فتح ہوا تھا۔ پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو گیا ہو لیکن اس کی روح پہلے دور میں ڈھونڈنی چاہیے۔

پہلا دور تخم تھا، دوسرا اس کے برگ و بار تھے۔ پہلا دور بنیاد تھی، دوسرا ستون و محراب تھا۔ پہلا دور نشو و نما کا عہد تھا، دوسرا ظہور و انفجار کا، پہلا معنیٰ و حقیقت تھا، دوسرا صورت و اظہار۔ پہلا روح تھا، دوسرا جسم۔ پہلے نے پیدا کیا، درست کیا اور مستعد کر دیا، دوسرے نے قدم اٹھایا، آگے بڑھایا اور فتح و تسخیر کا اعلان کر دیا۔ دوسرے کا ظہور کتنا ہی شاندار ہو لیکن اولین بنیاد و استعداد کی عظمت پہلے ہی کو حاصل ہے۔

دنیا میں ہر چیز کی تخلیق و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کارخانۂ فیضانِ فطرت سے اکتسابِ فیض کی صحیح استعداد پیدا ہو۔ اس کی استعداد کے ظہور کا پہلا محل اندرونی ہے، دوسرا بیرونی۔ جب تک کوئی چیز اپنے اس پہلے دور میں صحیح استعداد پیدا نہیں کرے گی، دوسرے دور کی استعداد پیدا نہیں کر سکتی۔ خارج کے نشو و نما کے لیے داخل کا نشو و نما بمنزلۂ سبب و علت ہے۔ جب تک سبب موجود نہ ہو گا نتائج ظہور میں نہیں آئیں گے۔ اور یہی خدا کا قانون وجود و زندگی کے ہر گوشے کے لیے ہے۔ چاہے وہ فرد یا جماعت ہو یا نباتات و حیوانات کی مثالیں۔

قرآنِ مجید کی اصطلاح ''تزکیہ''

جس طرح اشیا و افراد کے جسم کی داخلی استعداد کا دار و مدار ان کے اندر ہی نشو و نما پانے اور اندر ہی اندر پکنے پر ہے۔ اسی طرح فرد اور جماعت کی دماغی اور اخلاقی استعداد کا دارو مدار ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر ہے جسے قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں ''تزکیہ'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

''تزکیۂ اخلاق و نفس'' سے مقصود یہ ہے کہ ایک جماعت کو بہ حیثیت ایک جماعت کے جس طرح ذہن و مزاج کی ضرورت ہے وہ اس کے ایک ایک فرد کے اندر پیدا کر دیا جائے اور اس اثر و نفوذ کے ساتھ پیدا کر دیا جائے گویا ایک آہنی سانچہ لے کر ہر شخص کا دماغ اس میں ڈھال دیا گیا

ہے۔ جس طرح عالمِ اجسام میں جسم کی بہتر خِلقت، بہتر نشو ونما، جماعتی طاقت اور برتری کا باعث ہوتی ہے، یہی اخلاق ''جماعت'' کی زندگی کی اصلی استعداد ہے۔ اسی استعداد سے وہ سب کچھ پاتی ہیں اور بغیر اس استعداد کے کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔ تزکیۂ نفس کا عمل یہی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اس کی تولید وتکمیل جماعتوں اور قوموں کی داخلی استعداد ہے۔

داخلی استعداد کا دور

ظہورِ اسلام کا پہلا دور جو بعثت سے شروع ہوکر ہجرت پر ختم ہوا اور جس کا نقطۂ تکمیل ہجرت کا معاملہ تھا، اصل جماعت کی داخلی استعداد کا دور تھا، اس لیے ظہورِ اسلام کی تمام فتح مندیوں اور کامرنیوں کا مبدا یہی دور تھا، نہ کہ مدنی زندگی کا دوسرا دور۔ بلاشبہہ دنیا کی ظاہر بین نگاہوں میں یہ مصیبتوں کا دور تھا، بے چارگیوں اور درماندگیوں کا تسلسل تھا۔ لیکن بہ باطن امتِ مسلمہ کی ہر آنے والی فتح مندی اسی کی مصیبتوں اور کلفتوں کے اندر نشو ونما پا رہی تھی۔ یہی مصیبتیں تھیں جو ''جماعت'' کے ذہن واخلاق کے لیے تعلیم وتربیت کا مدرسہ اور تزکیۂ نفوس وارواح کی امتحان گاہ تھیں۔

بدر کے فتح مند اسی کے اندر سبق لے رہے تھے۔ فتح مکہ کے کامران اسی کے اندر بن اور ڈھل رہے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یرموک و قادسیہ کی پیدایش بھی اسی کی آزمایشوں اور خود فروشیوں میں ہورہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس جہاد کو صرف جہاد کہا جو مدنی زندگی میں اسلحۂ جنگ سے کرنا پڑا۔ لیکن نفس واخلاق کے تزکیہ وتربیت کا جو جہاد اس سے پہلے دور میں ہو رہا تھا اسے ''جہادِ کبیر'' سے تعبیر کیا، کیوں کہ فی الحقیقت بڑا جہاد یہی جہاد تھا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ [الفرقان: ٥٢]

''تو کافروں کا کہنا نہ مان اور قرآن کے زور سے ان سے خوب جہاد کر۔''

بالاتفاق سورۃ الفرقان مکی ہے۔ مکی زندگی میں بڑے جہاد کا حکم دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ قتال کا جہاد نہ تھا بلکہ صبر واستقامت اور عزم وثبات کا جہاد تھا اور انہی اوصاف میں جماعت کی داخلی استعداد کی اصل بنیادیں تھیں۔

تکمیلِ کار کا اعلان:

ہجرت کا واقعہ اس دور کی مصیبتوں کی انتہا تھا۔ اس لیے اس کی برکتوں اور سعادتوں کی بھی آخری تکمیل تھا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے اور کیونکر بے خبر ہو سکتے تھے جب کہ ان کی دفاعی تربیت کی اصل روح اسی معاملے میں مضمر تھی۔ پس جب یہ واقعہ سامنے آیا کہ اسلامی سنہ کی ابتدا کس واقعے سے کی جائے؟ انھیں کسی ایسے واقعے کی جستجو ہوئی جو امت کے قیام و اقبال کا اصلی سرچشمہ ہو۔ آنحضرت ﷺ کی پیدائش کا واقعہ تو یقیناً سب سے بڑا واقعہ تھا لیکن اس کے تذکار میں شخصیت سامنے آتی تھی، شخصیت کا عمل سامنے نہیں آتا تھا۔

بعثت کا واقعہ بھی سب سے بڑا واقعہ تھا، لیکن وہ معاملہ کی ابتدا تھی، انتہا و تکمیل نہ تھی۔ بدر کی جنگ اور مکہ کی فتح عظیم واقعات تھے، لیکن وہ اسلام کی فتح و اقبال کی بنیاد نہ تھے، کسی دوسری بنیاد کے نتائج و ثمرات تھے۔ یہ تمام واقعات ان کے سامنے آئے لیکن ان میں سے کسی پر بھی طبیعتیں مطمئن نہ ہو سکیں۔ بالآخر ہجرت کا واقعہ سامنے آ گیا تو سب کے دلوں نے قبول کر لیا، کیوں کہ انھیں یاد آ گیا کہ اسلام کے ظہور و عروج کا مبدائے حقیقی اسی واقعے میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے یہی واقعہ ہے جسے اسلامی تاریخ کا مبدا بننا چاہیے۔

مدینے کی فتح:

پھر یہ حقیقت کسی درجہ واضح ہو جاتی ہے جب اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ظہورِ اسلام کی تمام فتح مندیوں میں سب سے پہلی فتح مدینے کی فتح تھی اور اس کی تکمیل ہجرت ہی کے واقعے سے ہوئی تھی۔ مدینہ کے ساتھ ''فتح'' کا لفظ سن کر تعجب ہوا ہوگا، کیوں کہ تم صرف اسی فتح کے شناسا ہو جو جنگ کے میدانوں میں حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن تمھیں معلوم نہیں کہ میدانِ جنگ کی فتح سے بڑھ کر دلوں کی آبادیوں اور روحوں کی اقلیموں کی فتح ہے اور اس کی فتح سے میدانِ جنگ کی فتح مندیاں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ عین اسوقت جبکہ اسلام کا داعی اپنے وطن اور اہلِ وطن کی شقاوتوں سے مایوس ہو گیا تھا، باشندگانِ یثرب کی ایک جماعت پہنچتی ہے اور رات کی تاریکی میں پوشیدہ ہو کر اپنی روح کا ایمان اور دل کی اطاعت پیش کرتی ہے۔ اس وقت دنیاوی جاہ و جلال کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ سیف و سنان کی

ہیبت وجبروت کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سرتا سر غربتِ اولیٰ کی بے سرو سامانیاں اور عہدِ مصائب ومحن کی درماندگیاں ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ یثرب کی پوری آبادی اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور ایمان کے ایسے جوش اور عشقِ اطاعت کی ایسی خودفروشیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے تیار ہو جاتی ہے جو تاریخِ عالم کے کسی بڑے سے بڑے فاتح اور بادشاہ کو بھی میسر نہ آئی ہو گی۔ دلوں اور روحوں کی اس فتح وتسخیر سے بڑھ کر بھی کوئی اور فتح ہوسکتی ہے؟ لیکن یہ فتح کیوں کر ہوئی؟ دورِ ہجرت کے آلام ومحن میں اس کا آغاز ہوا اور ہجرت نے اس فتح کی تکمیل کر دی۔

واقعۂ ہجرت اور فتح ونصرتِ الٰہی:

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے واقعۂ ہجرت کا ذکر اس طریقے سے کیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بے سروسامانی اور غربت کے اس عمل میں فتح ونصرتِ الٰہی کی سب سے بڑی معنویت پوشیدہ ہے:

﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [التوبة: ٤٠]

’’غار کے دوساتھیوں میں سے جب ایک نے دوسرے سے کہا: غم ورنج نہ کرو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے اور اس کی حکمت ومشیت ہمارے لیے فتح ونصرت کی راہ باز کرنے والی ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ اللہ نے اپنی تسکین وطمانیت اس پر اتار دی اور فتح ونصرت کے ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں دنیا کی ظاہر بین اور حقیقت نا آشنا آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں، نتیجہ یہ نکلا کہ ان سرکشوں کی بات جو انکار کرتے تھے ہمیشہ کے لیے پست ہوگئی اور کلمۂ حق کو سربلندی اور کامیابی حاصل ہوئی اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔‘‘

یہ آیت سورۃ براءۃ (التوبہ) کی ہے۔ سورۃ براءۃ (التوبہ) بالاتفاق اس وقت نازل ہوئی جب اسلام کی ظاہری فتح مندیاں تکمیل کو پہنچ چکی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تمام فتح مندیوں کے ظہور کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی تھی کہ واقعۂ ہجرت کی معنوی فتح مندی یاد دلائی جائے۔[1]

[1] اسلامی سالِ نو اور ماہِ محرم۔ نشریہ از جامعہ محمدیہ، مالیگاؤں۔ انڈیا

سالِ نو کا آغاز

نئے اسلامی سال کا آغاز ہو تو عرب وعجم، پورب وپچھّم، یورپ وامریکہ، اور ایشیا وافریقہ اس عالَمِ رنگ وبو میں جہاں کہیں بھی مسلمان آباد ہوں، انھیں حقیقی معنوں میں ہجری سالِ نو پر ہی خوشی ومسرت ہوتی ہے، کیوں کہ تاریخِ اسلام کا تمام تر سرمایہ انہی قمری تاریخوں اور ہجری تاریخ سے وابستہ ہے۔ ارکانِ اسلام، حج و روزہ کا حساب اسی اسلامی کیلنڈر سے کیا جاتا ہے اور عید وقربانی جیسے شعائرِ اسلام کا تعلق بھی اسی اسلامی سال کے ساتھ ہے۔ مگر یہ ایک امرِ واقع ہے کہ آج کا مسلمان اپنے ماضی کی شاندار روایت کو نظر انداز کرتا بلکہ بھولتا جارہا ہے اور اپنے نمایاں اسلامی تشخّص کو قائم رکھنے میں ناکام ہورہا ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مگر واضح جھلک ہمارے اس رویے میں موجود ہے۔

آج ہمارے سرکاری وغیر سرکاری دفاتر اور نجی و پبلک اداروں میں انگریزی کیلنڈر کا استعمال اس قدر عام ہو چکا ہے کہ لوگ اپنی اصلی تاریخ سے نا آشنا ہو رہے ہیں۔ آپ کبھی سروے کر کے دیکھیں تو شاید دس فیصد مسلمان بھی ایسے نہ ملیں جنھیں روزِ رواں کی ہجری تاریخ کا پتا تو درکنار ہجری سال کے بارہ مہینوں کے نام ہی آتے ہوں۔ یہ کتنا بڑ المیہ ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ہمارے اجتماعی کردار کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ انگریزی کیلنڈر کے پہلے مہینے کا آغاز ہو تو ہم ''ہپی نیو ائیر'' کہتے ہوئے ایک دوسرے کو ملتے ہیں، گریٹنگ کارڈز تقسیم کیے جاتے ہیں، تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے، عرب اخوان بھی ''كُلُّ عَامٍ وَأَنْتُمْ بِخَيْرٍ'' یا ''كُلُّ سَنَةٍ وَأَنْتَ طَيّبٌ'' کی کئی دن تک رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ اور ''رأس السنة'' یا نیو ائیر کے عنوان سے خالص انگلش طرز کی محفلیں جمتی ہیں اور ان غیر اخلاقی وغیر اسلامی محفلوں کی تشہیر کے لیے بڑے بڑے ہوٹلوں کی طرف سے روزنامہ اخبارات میں عریانی بردوش اشتہارات دیے جاتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس جب ہمارا اپنا اسلامی سال شروع ہوتا ہے تو شرعاً نہ سہی عادات وتقالید کے تحت ہی سہی ''سالِ نو مبارک'' یا ''ہپی نیوائیر'' کہنا تو کجا، یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے اپنے سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس دن کی سرکاری چھٹی، تاریخ کے ایک المناک سانحہ وحادثہ ''شہادتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ'' کی وجہ سے صرف اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ محرم شروع ہو گیا ہے۔

اگر بالفرض اس اجتماعی فقدانِ شعور کو نظر انداز ہی کر دیا جائے تو پھر غور طلب پہلو یہ آتا ہے کہ امتِ مسلمہ کو اس قسم کی محفلیں منعقد کرنے، شراب وشباب سے کھیلنے اور طاؤس ورباب میں مست ہونے کا بھلا کیا حق پہنچتا ہے؟ جبکہ ہمارا قبلۂ اول ''بیت المقدس'' یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ وہ آئے دن مسجدِ اقصیٰ کے تقدس کو پامال کرنے اور اسے گرانے کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ بڑی غیر مسلم حکومتوں کی شعبدہ بازیوں کی وجہ سے'' مسئلہ فلسطین'' ایک عقدۂ لاینحل بن چکا ہے۔ اور ہزاروں فلسطینی خاندان کھلے آسمان کی چھت کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ بعض کی کیمپوں میں بسر ہو رہی ہے اور کچھ در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور اور حالات کے رحم وکرم پر نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔ ہماری یہ بے ہنگم چیخ چنگھاڑ یا خوشیاں کس طرح برمحل ہوسکتی ہیں جبکہ ہمارے ایک برادر ملک یمن میں حوثی شیعہ حکومت بے سروسامان یمنی سرفروشوں کے ساتھ آگ اور خون کی ہولی کھیل۔

ان لوگوں کو سوتے دنوں اور جاگتی راتوں میں یہ رنگ رلیاں منانا کس طرح زیب دیتا ہے، جن کے اپنے برادر اسلامی ملکوں، فلسطین ویمن اور کشمیر وغیرہ میں لاکھوں بچے شفقتِ پدری کو ترس رہے ہیں۔ لاکھوں بیوائیں سسکیوں اور آہوں سے دوچار اور نالہ وشیون سے ہمکنار ہیں۔

اگر اس سب کے باوجود بھی ہم ایسی خوشیاں منانے میں حق بجانب ہیں تو پھر کم از کم ان خوشیوں کو بداخلاقی اور فحاشی کے دائرے سے نکال کر اپنے اسلامی تشخّص کو بحال رکھتے ہوئے عین اسلامی تہواروں کے انداز میں منائیں، تاکہ روزِ محشر کہیں مشابہتِ کفار کے جرم میں نہ دھر لیے جائیں۔

اسلامی سالِ نو کا آغاز بڑے ہی مہذب ومقدس انداز سے ہونا چاہیے، کیوں کہ اسلامی سال کا یہ پہلا مہینہ بڑی فضیلت وعظمت والا ہے۔ جبکہ نبیِ اکرم ﷺ نے ماہِ محرم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہوئے اسے ''شَهْرُ اللّٰهِ''، یعنی ''اللہ کا مہینہ'' قرار دیا ہے۔[1]

خود اللہ تعالیٰ نے اس ماہ کو حرمت والا مہینہ کہا ہے۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ (آیت: ٣٦) میں ارشادِ ربانی ہے:

---

[1] مختصر صحیح مسلم للمنذري تحقیق الباني (٦١٠) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٧٤٢) مشکاة المصباح تحقیق الباني، رقم الحدیث (٢٠٣٩)

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ [التوبة: ٣٦]

''جس دن سے اللہ تعالیٰ نے یہ زمین وآسمان بنائے ہیں، تبھی سے اللہ کی کتاب میں مہینوں کی کل تعداد بارہ ہے اور ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔''

نبی ﷺ کی تعیین کے مطابق اسلامی سال کا یہ پہلا مہینہ، محرم انھی چار حرمت والے مہینوں میں سے ایک ہے، جبکہ دوسرے تین مہینے رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں۔

اسلامی سالِ نو کے ہلالِ محرم کا طلوع ہونا اپنے ساتھ کئی پیغام لاتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری عمر کا ایک اور سال مکمل کر دیا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر تمھاری کل عمر میں سے ایک سال اور کم ہو گیا ہے۔ اس لیے ہمیں شاداں وفرحاں ہونے کے ساتھ ساتھ فکر مند بھی ہونا چاہیے کہ ہماری عمر کا بیلنس کم ہو رہا ہے اور سالِ نو کے آغاز کے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے یہ دعائیں مانگنا چاہیے کہ اے اللہ! اس نئے سال کو ہمارے لیے انفرادی واجتماعی مسرتوں اور قومی وملی خوشیوں کا پیامبر بنا دے۔ اے اللہ! ہمارے الجھے ہوئے پیچیدہ ملکی وعالمی مسائل کو سلجھا دے۔ اے اللہ! ہمیں صحت وعافیت اور جانی ومالی خوشی عطا فرما۔ اے اللہ! اس نئے سال میں ہمیں سالِ ماضی کی نسبت کارِ خیر اور نیکی وتقویٰ کی زیادہ توفیق دے۔ اے اللہ! ہمارے جو بھائی فلسطین ویمن، بلغاریہ، اریٹیریا، فلپائن، چین، روس وکشمیر اور کسی بھی جگہ پر، سروں پر کفن باندھے جان بکف ہو کر عقیدۂ توحید وختمِ نبوت، شعائرِ اسلام اور مشاعرِ مقدسہ کے تحفظ کے لیے برسرِ پیکار ہیں انھیں فتح ونصرت سے سرفراز کر، اور ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ آمین ثم آمین

سالِ نو کے آغاز پر محاسبۂ نفس اور روزے

اسلامی سالِ نو کے آغاز پر ذکرِ الٰہی کی کثرت اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی ہمت وفکر کے مطابق اپنے سالِ ماضی کا بھرپور جائزہ لے کہ اس نے ارکانِ اسلام اور اللہ ورسول ﷺ

---

(1) تفسير ابن كثير (٣/ ٣٩٤) طبع دار الأندلس، صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٩)

کے احکام میں کہاں کوتاہی کی ہے اور کن کن نیک کاموں میں حصہ لیا ہے؟ اس طرح اپنے ماضی کے آئینے میں جھانک کر مستقبل کے لیے بہترین پروگرام مرتب کرے اور تجدیدِ عہد کرے کہ آج سے ہی سابقہ تمام کوتاہیوں کا یکے بعد دیگرے ازالہ کرتا جاؤں گا اور اعمالِ خیر میں بیش از پیش حصہ لوں گا۔

اللہ والے تو ہر رات کو سونے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہیں کہ آج ہم نے کیا کھویا، کیا پایا؟ اور عام دنیا داری اصول بھی ہے کہ ہر تاجر اور کاروباری آدمی اپنی آمد وخرچ اور پرافٹ کے روزانہ وماہانہ حساب کے ساتھ ساتھ سالانہ حساب کر کے کلوز اَپ کرتا ہے۔ اس مالی حساب وکتاب کی طرح ہی ہمیں اپنے نفس کا حساب بھی کرنا چاہیے کہ اس نے نیکیاں کر کے کیا کمایا؟ اور برائیوں میں پڑ کر کیا گنوایا ہے؟ اور جس طرح تجارتی و مالی امور میں ہر نئے سال کا بجٹ تیار کیا جاتا ہے، اسی طرح سالِ نو کے آغاز پر ہمیں اپنا روحانی وعملی بجٹ بھی تیار کرنا چاہیے۔

ماہِ محرم کے ساتھ ہی ہم چونکہ اپنی عمرِ عزیز کے نئے سال کا آغاز کرتے ہیں لہٰذا ہمیں اس نئے سال کا پر جوش اور بھر پور استقبال کرنا چاہیے جس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سالِ نو کا افتتاح روزے رکھ کر کیا جائے جو شکرانِ نعمت بھی ہوں گے اور مسنون طریقہ بھی یہی ہے۔ اور خاص طور پر ماہِ محرم کے روزوں کے بارے میں صحیح مسلم اور سننِ اربعہ میں ہے کہ نبی اقدس ﷺ سے پوچھا گیا:

«اَیُّ الصِّیَامِ أَفْضَلُ بَعْدَ رَمَضَانَ؟»

''رمضان مبارک کے روزوں کے بعد افضل روزے کون سے ہیں؟''

تو آپ ﷺ نے فرمایا: «شَهْرُ اللّٰهِ الَّذِیْ تَدْعُوْنَهُ الْمُحَرَّمَ»[1]

''اللہ کے اس مہینے کے روزے جسے تم محرّم کہتے ہو۔''

اگر زیادہ نہ رکھ سکیں تو کم ازکم ایامِ محرم کے سرتاج دن ''یومِ عاشوراء'' کا روزہ تو ضرور ہی رکھنا چاہیے، کیوں کہ اس کی فضیلت کے بارے میں صحیح مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے: «اَحْتَسِبُ عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ یُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ قَبْلَهُ»[2]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٢٩) سنن النسائي الكبرى (٢٩٠٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٤٢) مسند أحمد، رقم الحديث (٨٥٠٧۔ ١٠٩١٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٤٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٣٠۔ ١٧٣٨) ابن حبان، رقم الحديث (١٦٣٢) مسند أحمد (٢٢٦٥٠)

''میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ یومِ عاشورہ کا روزہ گزشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔''

بخاری و مسلم، ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے یہودیوں کو یومِ عاشوراء کا روزہ رکھتے دیکھا تو پوچھا: «مَا هَذَا الْيَوْمُ الَّذِیْ تَصُوْمُوْنَهٗ؟» ''تم لوگ اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟''

تو انھوں نے بتایا کہ یہی وہ مبارک دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو ان کے دشمن (فرعون اور اس کے لشکر) سے نجات دلائی، اس پر بطورِ شکرانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا تھا۔ لہٰذا ہم بھی روزہ رکھتے ہیں، تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَنَا أَحَقُّ بِمُوْسٰی مِنْكُمْ»[1] ''حضرت موسیٰ علیہ السلام پر (بحیثیت نبی) میرا حق تم سے زیادہ ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ لیکن یہودیوں کی مشابہت دور کرنے کے لیے یومِ عاشوراء کے روزے سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی ایک روزہ رکھنا مسنون ہے۔ کیوں کہ صحیح مسلم، ابو داود اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَئِنْ بَقِيْتُ اِلٰی قَابِلٍ لَأَصُوْمَنَّ الْيَوْمَ التَّاسِعَ»[2]

''اگر میں اگلے سال تک زندہ رہا تو میں نومحرم کا روزہ ضرور رکھوں گا۔''

مسند احمد میں ''لَئِنْ بَقِيْتُ'' کی بجائے ''لَئِنْ عِشْتُ'' کے الفاظ بھی ہیں۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ مسلم شریف والی حدیث میں ہی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشادِ گرامی ہے:

«فَلَمْ يَأْتِ الْعَامُ الْمُقْبِلُ حَتّٰی تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ»[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٠) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٢٨٣٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٣٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٤٤) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٨٣١) مشكاة المصابيح تحقيق الألباني، رقم الحديث (٢٠٦٧)

[2] صحيح مسلم (١/ ٧٩٨، رقم الحديث: ١١٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٣١٢) مسند أحمد (٥/ ٧٦) واللفظ له۔ مشكاة المصابيح تحقيق الألباني، رقم الحديث (٢٠٤١)

[3] صحيح مسلم مع شرحه للنووي (٨/ ١٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٤٥)

''مگر اگلا سال آنے سے پہلے ہی آپ ﷺ وفات پا گئے۔''

بہر حال آپ ﷺ نے خواہش فرمائی تھی، لہٰذا یہ امر مسنون ہے جبکہ مصنف عبدالرزاق اور بیہقی میں بسند صحیح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بایں الفاظ موجود ہے:

«صُوْمُوْا التَّاسِعَ وَالْعَاشِرَ وَخَالِفُوْا الْيَهُوْدَ»[1]

''نو اور دس (محرم) کا روزہ رکھو، اور یہودیوں کی مخالفت کرو۔''

ان احادیث کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ دس محرم کے ساتھ نو محرم کا روزہ رکھنا مسنون ہے اور دس محرم کے روزے کا ثواب ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

مسند احمد (۲۱۵۴) ابن خزیمہ (۲۰۹۵) مسند بزار (۵۲۳۶) اور بیہقی میں مروی ہے کہ یومِ عاشورہ کا روزہ رکھو اور یہود (کے طریقہ) کی مخالفت کرو۔ اور وہ اس طرح کہ «صُوْمُوْا قَبْلَهٗ يَوْماً أَوْ بَعْدَهٗ يَوْماً» اس (دس محرم) سے پہلے یا اس کے بعد بھی ایک روزہ رکھ لیا کرو۔[2] یہ حدیث مختلف فیہ ہے۔ علّامہ احمد شاکر نے اسے حسن قرار دیا ہے اور دیگر محققینِ مسند نے اسے ضعیف کہا ہے، جبکہ یہ ابن خزیمہ (۲۰۹۵) میں بھی ہے اور شیخ البانی نے اسے شیخ ابی لیلیٰ کے سوءِ حافظہ کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے جبکہ عطاء وغیرہ نے اس کی مخالفت کی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کیا ہے (بیہقی و طحاوی) اور وہی صحیح ہے۔[3] حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہی حدیث "إتحاف المهرة" (۲۲۲۵) میں وارد کر کے لکھا ہے کہ اسے احمد و بیہقی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور وہ ضعف محمد بن ابی لیلیٰ کی وجہ سے ہے جبکہ وہ منفرد بھی نہیں بلکہ اس کی متابعت صالح بن ابی صالح بن حی نے بھی کی ہے۔ امام طاؤس تینوں روزے رکھا کرتے تھے۔[4] امام احمد بن حنبل نے امام ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ نو اور دس کا روزہ رکھیں اور اگر رؤیت میں کوئی شک و شبہ نظر آئے تو تینوں کا روزہ رکھ لیں۔[5]

---

[1] مصنف عبد الرزاق، رقم الحديث (٧٨٣٩) سنن البيهقي (٤/ ٢٨٧، رقم الحديث: ٨٤٠٤) و صححه الألباني في جلباب المرأة المسلمة (ص: ١٧٧)

[2] مسند أحمد، رقم الحديث (٢١٥٥) الفتح الرباني (١٠/ ١٨٥)

[3] دیکھیں: ضعيف الجامع الصغير للألباني، رقم الحديث (٣٥٠٦)

[4] مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٣١٣)

[5] المغنى (٦/ ٦٦١) الإسلام سؤال و جواب للمنجّد، سؤال (١٢٨٤٢٣)

یہاں دو باتیں نہایت قابلِ توجہ ہیں:

1 یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ (آیت: ۳۶۰) میں فرمایا ہے:

''جب سے اس نے زمین وآسمان بنائے ہیں تبھی سے اس کی کتاب میں مہینوں کی کل تعداد بارہ ہے اور ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔''

نبی ﷺ کی تعیین کے مطابق متفقہ طور پر محرم بھی ان چار مہینوں میں سے ایک ہے اور صحیح بخاری کی حدیث میں مذکور ہے کہ یومِ عاشوراء کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو اس وقت کے ظالم و جابر حکمران فرعون اور اس کے لشکر سے نجات دلائی تھی جس کے شکرانے کے طور پر انھوں نے روزہ رکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ماہِ محرم یا یومِ عاشوراء نواسۂ رسول ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے متعارف نہیں ہوئے، بلکہ ماہِ محرم تخلیقِ کائنات کے دن سے اور یومِ عاشوراء حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے ہی حرمت والے اور معروف ہیں۔

2 دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یومِ عاشوراء کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا، یہود رکھتے رہے، نبی ﷺ نے اس روزے کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ خود بھی اس دن کا روزہ رکھ کر اسے مسنون ہونے کا درجہ دیا اور اپنی امت کو روزہ رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اب اگر اسی دن روزہ رکھنے کے بجائے سبیلیں لگائی جائیں، دودھ، شربت اور ٹھنڈا پانی خود بھی کھلے عام پیا جائے، اور لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دلاتے ہوئے مفت پلایا جائے تو اس فعل کی کونسی عقلی توجیہ ہوسکتی ہے؟ کیا یہ صحیح بخاری و مسلم میں یومِ عاشوراء کے روزے کی ثابت شدہ سنتِ رسول ﷺ کی صریح نافرمانی اور کھلی خلاف ورزی نہیں؟[1]

یادگارِ ہجرتِ نبوی ﷺ یا مغرب کی نقالی

یومِ بعثت اور خصوصاً سورۃ الشعراء (آیت: ۲۱۴): ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ ''اور اپنے نزدیک کے رشتہ داروں کو ڈرا۔'' اور سورۃ الحجر (آیت: ۹۴) ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ ''تو

[1] سالِ نو کے پیغامات اور مروجہ بدعات کی تفصیل کے لیے دیکھیں ہماری کتاب: ''سالِ نو کا آغاز اور تذکرہ چند بدعات کا''

جو حکم تجھ کو ملا ہے اس کو کھول کر سنا دے اور مشرکوں کا کچھ خیال نہ کر۔'' سے لے کر نبیِ اکرم ﷺ نے لوگوں کو توحید و رسالت کی دعوت جاری رکھی اور جب زمانۂ نبوت کے تیرہ سال مکمل ہو گئے تو نبی ﷺ نے مکہ مکرّمہ کو خیر باد کہا اور مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔

ہجرتِ نبوی ﷺ اور متعلقہ مسائل، راہِ ہجرت میں پیش آنے والے معجزات، آپ ﷺ کا وصولِ قُباء، تعمیر مسجدِ قُباء، اسلامی مواخاۃ یا انصار و مہاجرینِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں رشتۂ اخوت کا قیام، غیر مسلم اقوام کے ساتھ نبی ﷺ کے معاہدے اور دفاعی مقابلے کے لیے فنونِ حرب کی تعلیم وغیرہ امور کی تفصیل میں جانے سے قطع نظر یکم جنوری کو چونکہ عیسوی سالِ نو کا آغاز ہوتا ہے، اسی مناسبت سے ہم صرف اتنی سی بات کا اعادہ کیے دیتے ہیں کہ یہ عیسوی بلکہ عیسائی کیلنڈر کا سالِ نو ہے نہ کہ اسلامی یا ہجری تقویم کا۔ اس لیے جنوری کے آغاز میں مسلمانوں کا گریٹنگ کارڈز تقسیم کرنا، ایک دوسرے کو ''ہیپی نیو ایئر'' یا ''سالِ نو مبارک'' کہنا اور جنوری کے آغاز میں رنگارنگ پروگرام ترتیب دینا اپنے اسلامی تشخّص کو مجروح کرنے کے مترادف ہے اور سراسر تہذیبِ مغرب کی نقالی ہے۔ دانستہ یا نادانستہ ان امور پر عمل پیرا ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ مسلم معاشرے کے ایسے افراد میں اسلامی شعور کا فقدان ہو چکا ہے۔ انھیں اپنے یا پرائے کا فرق یاد ہی نہیں رہا۔ یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ یکم جنوری سے کئی ہفتے قبل ہی اخبارات و رسائل میں نیم عریاں تصویروں سے مزین اشتہارات شائع ہونے شروع ہو جاتے ہیں جن میں درہم و دینار کے غلام اور دولت کے پرستار لچّر و گھٹیا اور اخلاق باختہ وحیا سوز میوزک ڈانسنگ پروگراموں کی باقاعدہ تشہیر کرواتے ہیں۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ہمارا تاریخی اثاثہ کیا ہے؟ اسلامک کلچر یا ہماری تہذیب وثقافت کیا ہے؟ انھیں کچھ بھی یاد نہیں۔ مغرب پرستوں کی نقالی میں ہم لوگ اس طرح بھگٹٹ چلے جا رہے ہیں کہ جن لوگوں کو اسلامی تہذیب کے علمبردار اور مسلم ثقافت کے دعویدار ہونے کا زعم ہے، ان میں بھی بعض ایسے حضرات ہیں کہ روشن خیالی کے زعم میں فرنگی تہذیب کی رَو میں بہتے ہوئے اسے نہ صرف اپنائے جا رہے ہیں بلکہ اس کے جواز میں دلائل پیدا کرنے کی ناکام کوشش بھی کیے جاتے ہیں۔

وہ کون کون سے امور یا افعال ہیں جو دراصل ہیں تو غیر مسلم تہذیب کے شاخسانے، مگر مسلمان بھی ان پر پروانہ وار عمل پیرا ہوئے جا رہے ہیں۔ ان امور کی فہرست قدرے طویل ہے، لیکن ہم نے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ ہمارا اسلامی سال اور ہجری کیلنڈر یکم جنوری سے نہیں بلکہ یکم محرم سے شروع ہوتا ہے، ہمیں اپنا قبلہ صحیح کرنا چاہیے اور اگر شرعی جواز و عدمِ جواز کی پروا کیے بغیر ضرور ہی گریٹنگ کارڈز تقسیم کرنے ہیں، ''ہیپی نیو ائیر'' یا ''سالِ نو مبارک'' کہنا ہے تو یہ مشغلہ یکم جنوری کے بجائے یکم محرم سے شروع کرنا چاہیے۔ اسی طرح جمعہ مبارک کے جواز و عدمِ جواز کے سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ جب تک فیس بوک، وٹس اپ وغیرہ اور میڈیا کی یلغار نہیں ہوئی یہ مبارکیں موجود نہیں تھیں۔ سلف صالحینِ امّت سے یہ امور ثابت نہیں کہ ان میں پہل کی جائے۔ البتہ ایک دعا ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں ایک دوسرے کے لیے کیا کرتے تھے اور وہ بھی ہر نئے مہینے اور ہر نئے سال پر، مگر اسے بھی صرف سالِ نو کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے جو صحیح طرزِ عمل نہیں، وہ دعا یہ ہے:

''اللّٰهُمَّ أَدْخِلْهُ عَلَيْنَا بِالْأَمْنِ وَ الْإِيْمَانِ وَ السَّلَامَةِ وَ الْإِسْلَامِ وَ رِضْوَانٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ وَ جِوَارٍ مِّنَ الشَّيْطَانِ''[1]

تمام اسلامی ملکوں میں حکومتی سطح سے لے کر نجی کاروباری اداروں تک کو چاہیے کہ وہ ہجری کیلنڈر کو رواج دیں، حتیٰ کہ غیر مسلم ممالک میں کاروبار کرنے والے تجّار کی کمپنیوں اور فرموں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی اسلامی آئیڈنٹی کو متعارف کروانے کے لیے اسلامک کیلنڈر چھاپیں اور وہی اپنے دفاتر اور گھروں میں استعمال کریں، کیوں کہ یہ بھی احیائے ثقافت اور اس کی ترویج و اشاعت کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ عریانی کو کافی حد تک لگام دی جا سکے گی، کیوں کہ بعض پرائیویٹ اداروں کے ایڈورٹائزنگ کیلنڈر اتنی فحش اور عریاں تصویروں پر مبنی ہوتے ہیں کہ جنھیں دیکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اس سلسلے میں حکومتِ متحدہ عرب امارات کا یہ اقدام انتہائی لائقِ تحسین و ستایش

[1] المعجم الأوسط (٦/ ٢٢١) و ضعفه الألباني في الضعيفة (٨/ ٦) لأجل رشدين بن سعد و لكن تابعه حيوة بإسناد صحيح رواه البغوي في معجم الصحابة (٣/ ٥٤٣) و صححه الحافظ ابن حجر في الاصابة (٦/ ٤٠٧ـ ٤٠٨)

ہے کہ اس نے اپنے سابقہ رویے کو ترک کر کے بہت سال قبل سرکاری کیلنڈر کا آغاز ہجری تقویم کے حساب سے یکم محرم سے کیا ہے۔ سعودیہ اور بعض دیگر مسلم ممالک میں پہلے ہی یہ مروج ہے۔

اللہ تعالیٰ بقیہ مسلم حکومتوں اور مسلم کاروباری حضرات و اداروں کو بھی اسلامی تاریخ کو ایک نیا سنہرا موڑ دینے والے اس واقعۂ ہجرتِ نبوی کی یاد تازہ کرانے میں اپنا رول ادا کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین ثم آمین.

مشرکین کی دسیسہ کاریاں اور مسلمانوں کو اذنِ جہاد

نبیِ رحمت ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچ کر سب سے پہلے انصار ومہاجرین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں مؤاخاۃ یا اخوتِ اسلامی کا رشتہ عملی طور پر خوب مضبوط کر دیا جس کے نتیجے میں وہاں ایک مسلم معاشرہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد ہجرت کے پہلے ہی سال میں آپ ﷺ نے تمام نوعِ انسانی کے لیے امن وسلامتی اور سعادت وخوشحالی کو عام کرنے کے لیے جملہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ اچھے تعلقات کی بنیاد رکھی اور بین الاقوامی اصول پر عدمِ جارحیت کا معاہدہ کیا، تاکہ نسلی ومذہبی اختلاف کے باوجود بھی قومی وحدت قائم رہے اور سب کو ایک دوسرے سے مدد ملتی رہے۔ معتبر سیرت نگار ابن ہشام وغیرہ نے یہود بنی عوف کے ساتھ آپ ﷺ کے اس معاہدے کی تفصیلات ذکر کی ہیں۔

جب مدینہ منورہ میں آباد تمام قبائل واقوام نے اس معاہدے پر دستخط کر دیے تو پھر آپ ﷺ نے مدینہ کے گردونواح میں آباد قبائل کو بھی اس معاہدے میں شامل کر لیا، تاکہ آئے دن کی جارحانہ جنگوں کا انسداد ہو جائے اور قریشِ مکہ ان اقوام وقبائل کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ نہ کر سکیں۔[1]

مشرکینِ مکہ کو نبیِ اکرم ﷺ اور دیگر اہلِ ایمان سے ایسی اندھی دشمنی تھی کہ ان کے تین سو میل (ساڑھے چار سو کلومیٹر) دور چلے جانے کے باوجود بھی مکہ والوں کو چین نہ آیا۔ انھوں نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبیّ اور اوس وخزرج سے اس کے بعض رفقاء کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنا واکسانا شروع کر دیا اور یہودِ مدینہ کو بھی خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملا لیا۔ تب انھوں نے مسلمانوں کو دھمکیاں دینا

---

[1] سیرت ابن هشام (۱/ ۱۷۸)

شروع کر دیں کہ یہ نہ سمجھنا کہ تم ہم سے بچ کر مدینہ نکل گئے ہو۔ ہم وہاں پہنچ کر بھی تمھارا برا حال کر دیں گے۔

ربیع الاول ۲ھ میں انھوں نے اپنی قوت کا اظہار کرنے کے لیے مختلف شرارتیں شروع کر دیں۔ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ان کی دسیسہ کاریوں کو برداشت کرتے رہے۔ تیر وتلوار اٹھانے کا فن جاننے اور حوصلہ ہونے کے باوجود بھی انھوں نے مشرکین کا منہ توڑ جواب نہ دیا، کیوں کہ اسلام کے مزاج کو جنگ سے تو کوئی نسبت ہی نہیں۔ لیکن جب مسلمانوں کو کفار کے ظلم وستم سہتے اور صبر وہمت سے کام لیتے چودہ سال بیت گئے تو اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کی حالت پر رحم آیا اور ۲ھ میں انھیں جہاد کے لیے تلوار اٹھانے کی اجازت دے دی۔ اس سلسلے میں آسمان سے جو حکم سب سے پہلے نازل ہوا، اس کی تفصیلات سورۃ الحج (آیت: ۳۹، ۴۰ اور ۴۱) میں موجود ہیں جن کا آغاز یوں ہوتا ہے:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۗ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾

''ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے۔ وہ جنھیں ان کے گھروں سے کسی حق کے بغیر نکالا گیا، صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ کا لوگوں کو ان کے بعض کو بعض کے ذریعے ہٹانا نہ ہوتا تو ضرور ڈھا دیے جاتے (راہبوں کے) جھونپڑے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں، جن میں اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا جاتا ہے اور یقیناً اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، سب پر غالب ہے۔ وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم

کریں گے اور زکات دیں گے اور اچھے کام کا حکم دیں گے، برے کام سے روکیں گے اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔''

یہ قتال فی سبیل اللہ کے بارے میں اولین آیات ہیں جو نازل ہوئیں۔ یہاں جارحانہ نہیں، صرف مدافعانہ جہاد کی اجازت دی گئی ہے۔ بعد میں سورۃ البقرہ (آیات: ۱۹۰ تا ۱۹۳ اور ۲۱۶) نازل ہوئیں جن میں جہاد وقتال کا حکم دیا گیا۔ ان احکام میں صرف چند ماہ کا فاصلہ ہے۔ اجازت ذوالحجہ ۱ھ میں نازل ہوئی اور حکم غزوۂ بدر کے کچھ پہلے ماہِ رجب یا شعبان ۲ھ میں نازل ہوا تھا۔[1]

چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٩٢﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ [البقرة: ۱۹۰ تا ۱۹۳]

''اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور انھیں وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو انھیں قتل کرو، ایسے ہی کافروں کی جزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر کوئی زیادتی نہیں۔''

نیز سورۃ البقرہ (آیت: ۲۱۶) میں فرمایا:

[1] رحمة للعالمين (١/ ١٠٠ تا ١٠٤) الرحيق المختوم (ص: ٢٢٤) حاشيه ترجمه قرآن مولانا مودودي (ص: ٨٦٢)

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴾

''تمھیں قتال وجہاد کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمھیں نا گوار ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں نا گوار ہو، اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو، اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو، اور وہی تمھارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔''

یہ آیات نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کا با قاعدہ حکم دے دیا اور جہاد کو مسلمانوں پر فرض قرار دے دیا گیا۔

تحویلِ قبلہ:

شعبان ۲ھ (فروری ۶۲۴ء) میں ہی اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کا حکم نازل فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾ قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴾ [البقرة: ۱۴۲۔ ۱۴۴]

''عنقریب لوگوں میں سے بے وقوف کہیں گے کس چیز نے انھیں ان کے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے؟ کہہ دے اللہ ہی کے لیے مشرق ومغرب ہے، وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر شہادت دینے والا بنے اور ہم نے وہ قبلہ

جس پر تو تھا، مقرر نہیں کیا تھا مگر اس لیے کہ ہم جان لیں کون اس رسول کی پیروی کرتا ہے، اس سے (جدا کر کے) جو اپنی دونوں ایڑیوں پر پھر جاتا ہے اور بلاشبہ یہ بات یقیناً بہت بڑی تھی مگر ان لوگوں پر جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر یقیناً بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔ یقیناً ہم تیرے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں، تو ہم تجھے اس قبلے کی طرف ضرور پھیر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے، سو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے اور تم جہاں بھی ہو سو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر لو اور بے شک وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے یقیناً جانتے ہیں کہ بے شک ان کے رب کی طرف سے یہی حق ہے اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو وہ کر رہے ہیں۔''

اس تحویلِ قبلہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گیا کہ وہ یہود جو منافقانہ روش پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کی صفوں میں گھس آئے تھے وہ کھسک گئے اور مسلمانوں کی صفوف غدار وخائن لوگوں سے پاک ہو گئیں۔ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ شریف کو قبلہ قرار دینے میں مسلمانوں کے لیے اس بات کی طرف بھی ایک اشارہ موجود تھا کہ تمھیں اپنے قبلہ مشرکین سے آزاد کرانا ہوگا۔

ان اوامر و ارشادات کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں جذبۂ جہاد خوب موجزن ہو گیا اور انھوں نے غزوۂ بدر (۱۷ رمضان ۲ ھ) سے لے کر غزوۂ اُحد (۶ شوال ۳ ھ)، غزوۂ احزاب یا خندق (شوال یا ذوالقعدہ ۵ ھ) غزوۂ خیبر (محرم ۷ ھ)، غزوۂ فتح مکہ (رمضان ۸ ھ)، غزوۂ حنین (شوال ۸ ھ) غزوۂ طائف (شوال ۸ ھ) غزوۂ تبوک (رجب ۹ ھ) وغیرہ میں تائید ونصرتِ الٰہی سے شاندار فتوحات کی لائن لگا دی اور مشرکوں کے ہاتھوں سے اپنا قبلہ بھی آزاد کروالیا۔

غزوات وسرایا...ایک جائزہ

سیرتِ رسول ﷺ کا ایک خاص پہلو آپ ﷺ کے غزوات وسرایا ہیں جن کے بارے میں معاندینِ اسلام اور دشمنانِ رسول ﷺ نے مسلمانوں میں بڑی غلط فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ وہ لوگ یہ

---

(1) الرحیق المختوم (ص: ۲۲۵)

باور کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اسلام کی نشر واشاعت اور لوگوں کو زبردستی دین قبول کروانے کے لیے نعوذ باللہ خوب تلوار چلائی اور خون ریزی کی تھی۔ ہم ان کے اس دعوے کا جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ اس میں کہاں تک معقولیت ہے؟

حقیقت یہ کہ نبیِ اکرم ﷺ نے دین کی ترویج واشاعت تلوار سے نہیں بلکہ اپنے اخلاقِ عالیہ اور دعوت وتبلیغ سے کی تھی۔ اور جو جنگیں آپ ﷺ نے لڑی تھیں وہ جنگیں آپ ﷺ پر مسلّط کی گئی تھیں اور آپ ﷺ نے بحکمِ الٰہی مدافعانہ جہاد کر کے اپنا فرض ادا کیا تھا۔

صحیح بخاری شریف ومسلم شریف میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جن مدافعانہ غزوات وسرایا میں بنفسِ نفیس شرکت فرمائی ان کی مجموعی تعداد اُنیس ہے اور ان میں سے بھی کل آٹھ میں قتال کی نوبت آئی۔[1]

وہ غزوات وسرایا جن میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو روانہ فرمایا، ان کی مجموعی تعداد بقول امام ابن اسحاق ۳۸ ہے۔[2] جبکہ ماضی قریب کے محقق سیرت نگار جناب جسٹس علامہ سید سلیمان منصور پوری نے ۲ھ سے ۹ھ تک آٹھ سال کے مابین عہدِ نبوی کے غزوات وسرایا کا بڑی تحقیقِ دقیق اور عرق ریزی سے ایک نقشہ تیار کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات سمیت غزوات و سرایا کی جملہ تعداد ۸۲ تھی۔[3]

بعض لوگ ۸۲ کا عدد سنتے ہی اچھل پڑتے اور فتویٰ داغ دیتے ہیں کہ لو جی ثابت ہو گیا کہ نبی ﷺ نے خوب تلوار چلائی تھی۔ حالانکہ اس عددِ کبیر میں ۳۲ وہ دستے بھی شامل ہیں جو آپ ﷺ نے وقتاً فوقتاً دشمن کی نقل وحرکت سے باخبر رہنے اور راستوں کی نگرانی کرنے کے لیے روانہ فرمائے تھے۔ پانچ دستے تبلیغی سفر پر نکلے تھے۔ انہی میں سے پندرہ دستے وہ بھی ہیں جو قتل وڈکیتی کی وارداتوں اور غداری کے جرم میں ملوث لوگوں کے تعاقب اور گوشمالی کے لیے روانہ فرمائے تھے۔ چھے دستے بعض غلط فہمیوں کے نتیجے میں وجود میں آئے جو نہ صرف کفار ومسلمین بلکہ خود مسلمانوں کے

---

[1] صحيح البخاري (..........) صحيح مسلم (..........)

[2] الفصول في ختصار سيرة الرسول ﷺ لابن كثير (ص: ٢٠٣) سيرت ابن هشام (٢/ ٩/ ٢٠٨)

[3] رحمةٌ للعالمين (٢/ ١٨٥ تا ٢٠٢)

مابین بھی وقوع پذیر ہوئے۔ تین دستے بت شکنی کے لیے نکلے۔ تین دستے دشمن کا تعاقب کرنے کی وجہ سے روپذیر ہوئے اور پانچ مختلف مقامی یا شخصی واقعات بھی سریئے کہلوائے۔

یہ تریسٹھ ایسے واقعات ہیں کہ جو غزوات وسرایا میں تو شمار کیے جاتے ہیں مگر ان میں سے کسی میں بھی کفر و اسلام کا مقابلہ نہیں ہوا۔ اسی طرح کتنے ہی دوسرے واقعات بھی ہیں۔ صرف آٹھ سات غزوات ایسے ہیں جن میں کفر و اسلام کا باقاعدہ مقابلہ ہوا اور ان میں بھی مسلمانوں نے صرف دفاعی مقابلہ کیا، کبھی جارحانہ حملے کی ابتدا نہیں کی۔[1]

جہادِ اسلامی کے تقدّس کو جنگ اور خونریزی کا نام دینے والے یہ معاندین نہ واقعہ کی علّت کو دیکھتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے مدعا کی تلاش کرتے ہیں، بلکہ ہر واقعہ کے بارے میں اپنی یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ یہ بھی لوگوں کو زبردستی دینِ اسلام میں داخل کرنے کے لیے پیش آیا تھا۔ ان عیاروں کی چرب لسانی کے نتیجے میں اللہ کے کچھ سادہ دل مسلمان بندے بھی یہی سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کی وہ ہر نقل وحرکت جنگ ہی کے لیے تھی۔[2] حالانکہ نبیِ اکرم ﷺ کے عدمِ جارحیت کے معاہدے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ آپ ﷺ دنیا میں تلوار چلانے نہیں، بلکہ امن وآشتی اور صلح وسلامتی قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔

اگر انسانی ہمدردی کے ان علمبرداروں کو جائز و ناجائز ہر شکل میں بہائے گئے خون کی سرخی سے ڈر لگتا ہے تو پھر دوسروں کے منہ لگنے سے پہلے اپنے گھر کی خبر تو لیں جس کا ہر در و دیوار خون سے لت پت ہے۔ عہدِ نبوی ﷺ کے غزوات وسرایا میں تو فریقین کے کل ایک ہزار اٹھارہ آدمی جنگ میں کام آئے۔ اگر بالفرض ان ۸۲ غزوات وسرایا کو جنگیں ہی تسلیم کر لیا جائے تو آپ کل مقتولین ۱۰۱۸ کو ۸۲ پر تقسیم کریں۔ صرف ساڑھے بارہ مقتول اوسط نکلتی ہے۔ کیا ایسی لڑائیوں کو عقل سلیم کی روشنی میں صدہا سالہ مذاہب کے جبراً ترک کروانے اور اسلام قبول کروانے میں کافی مؤثر قرار دیا جا سکتا ہے؟

ان تمام لڑائیوں میں کفار کے چھے ہزار پانچ سو چونسٹھ (۶۵۶۴) آدمی قیدی بنائے گئے جن

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: رحمۃ للعالمین (۲/۲۰۶۔۲۰۷)
[2] رحمۃ للعالمین (۲/۱۸۴۔۱۸۵)

میں سے چھے ہزار (۶۰۰۰) صرف غزوۂ حنین میں اسیر کیے گئے۔ باقی جنگوں میں اسیروں کی اوسط صرف سات نکلتی ہے۔ کیا یہ تعداد پورے ملک کو تبدیلیِ مذہب کے لیے مجبور ہونے کا سبب قرار دی جاسکتی ہے؟ اور پھر ہمارے نبیِ رحمت ﷺ کا اخلاقی کارنامہ تو دیکھیں کہ صرف دو قیدیوں کو ان کے سابقہ جرائم کی پاداش میں قتل کیا، باقی تمام کو رہا کر دیا تھا۔ سبحان اللہ!

اب ذرا ان کی جنگوں کی طرف بھی دیکھیں، انڈیا کے اخبار ''ہمدم'' نے اپنی ۱۷ اپریل ۱۹۱۹ء کی اشاعت میں اکیلی جنگِ عظیم کے صرف مقتولین کی تعداد کا اندازہ ۸۳ لاکھ ۳۸ ہزار ذکر کیا تھا اور یہ اس جنگ عظیم کے مقتولین ہیں جو ۱۴ اگست ۱۹۱۴ھ سے لے کر ۳ مارچ ۱۹۱۷ھ تک لڑی گئی تھی۔ زخمیوں، اسیروں اور گم شدگان کی تعداد الگ ہے۔ اس جنگ سے انگلستان کا صرف یہ مقصد بتایا گیا ہے کہ چھوٹی سلطنتوں کی آزادی اور حفاظت کو برقرار رکھا جائے۔ صرف اتنے سے مقصد کے لیے لاکھوں نفوس اور اربوں اشرفیوں کو خاک وخون میں ملا دیا گیا۔ سیکڑوں جہاز سمندر میں غرق ہوئے، عیش و آرام کے سب سامان تباہ ہوئے اور تجارتِ عالَم مخدوش و معطل رہی۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ.

یورپ کی دینی انجمنوں کے ہاتھوں اور مذہبی عدالت کے احکام سے ایک کروڑ بیس لاکھ عیسائی ہلاک کیے گئے، جیسا کہ ایک عیسائی مؤلف ''جان ڈیون پورٹ'' کا اپنا بیان ہے جسے اس نے اپنی کتاب ''اپالوجی آف محمد اینڈ قرآن'' میں ذکر کیا ہے۔[2] اکیلی سلطنت اسپین نے تین لاکھ چالیس ہزار عیسائیوں کو قتل کیا تھا، جن میں سے بیس ہزار آدمی آگ میں جلا کر مارے گئے اور جنگ ''مہا بھارت'' کے مقتولین کی تعداد کروڑوں سے کم نہیں۔[3]

معلوم نہیں، ان اعداد و شمار کی موجودگی میں بھی یہ لوگ اپنی پاکِ داماں کی حکایت کیوں بڑھائے چلے جاتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ انھیں راہِ ہدایت عطا کرے۔

---

[1] رحمۃ للعالمین (۲/ ۲۱۳) غزواتِ نبوی ﷺ کے اسباب اور انواع کے لیے سیرت النبی شبلی (۱/ ۵۸۷ تا ۶۲۲) اور آخری صفحات بھی دیکھیں۔

[2] رحمةٌ للعالمين (٢/ ٢١٤) نقلًا عن اعجاز التنزيل (ص ٤٦١)

[3] المرجع السابق.

حدیثِ افک:

نبیِ اکرم ﷺ کی مکی زندگی کے تیرہ سالوں میں کفار ومشرکین نے آپ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ہرممکن طریقے سے ذہنی و جسمانی تکلیفیں پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، مسلمانوں کی جماعت روز بروز بڑھتی گئی، متعدد غزوات میں فتح یابی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر اسلام اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی تو اب کسی کافر کو کھل کر کھیلنے کی کم ہی جرأت ہوتی تھی۔ البتہ جو لوگ منافق تھے وہ در پردہ اس کوشش میں رہتے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام اور نبیِ اسلام ﷺ کو زک پہنچائی جائے۔

ان منافقین میں سے عبد اللہ بن اُبی کا کردار سب سے گھناؤنا اور شرمناک تھا۔ اس نے نبیِ اکرم ﷺ کی خانگی زندگی کا سکون غارت کرنے کے لیے آپ ﷺ کی زوجۂ محترمہ، صدیقۂ کائنات، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں دریدہ دہنی کی اور ان پر تہمت لگادی۔ یہ واقعہ ''حدیثِ افک'' کے نام سے معروف ہے۔ قرآنِ کریم، کتبِ ستہ اور دیگر کتبِ حدیث اور تاریخِ اسلام و سیرتِ نبوی ﷺ کی تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دیگر محققین کے مطابق یہ واقعہ شعبان ۵ ھ میں پیش آیا تھا۔

نبیِ اکرم ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ بنی مصطلق سے واپس ہوئے تو راستے میں ایک جگہ پر رات کا کچھ حصہ آرام کیا۔ یہاں سے کوچ کرنے سے تھوڑا قبل آپ ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو اس سفر میں آپ ﷺ کے ہمراہ تھیں، قضائے حاجت کے لیے کچھ دور گئیں۔ جب وہ واپس قافلے کے پاس پہنچیں تو معلوم ہوا کہ گلے کا ہار کہیں گم ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے وہ واپس وہیں تک گئیں جہاں بیٹھنے کے دوران ہار کے گرنے کا خیال تھا۔ اور واقعی ہار تو وہاں سے مل گیا مگر جب قافلہ کی جائے قیام پر پہنچیں تو معلوم ہوا کہ قافلہ کوچ کر چکا ہے۔

آپ فرماتی ہیں کہ میں وہیں بیٹھ گئی جہاں قافلہ والوں نے رات بسر کی تھی تاکہ جب قافلہ کہیں رکے اور میں ہودج میں نہ ملوں تو نبی ﷺ آکر مجھے لے جائیں گے۔ حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ جو کسی ضرورت سے قافلہ کے ساتھ رات کو یہاں نہیں پہنچ سکے تھے، جب وہ اس جگہ پہنچے

اور مجھے کپڑے میں سمٹے ہوئے دیکھا تو ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ پڑھا اور کہا کہ یہ تو نبی ﷺ کے گھر والے ہیں۔ انھوں نے اپنا اونٹ بٹھا کر انھیں (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو) سوار کیا اور قافلے کو جا ملے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس تاخیر سے پہنچنے کے معمولی واقعہ کو رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبیّ نے ہوا دے کر افسانہ بنا دیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا دی۔ بات عام ہو گئی حتیٰ کہ چند مسلمان بھی عبداللہ بن اُبیّ کے ہم خیال ہو گئے۔

مسلمانوں میں سے اس تہمت میں ملوث ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک تو نبی ﷺ کی سالی، ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی ہمشیرہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا تھیں۔ دوسرے حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ اور تیسرے شاعرِ رسول ﷺ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے، جنھیں بعد میں تہمت کی حد (اسّی کوڑے) لگائی گئی تھی۔ رضي الله عنهم.

غرض یہ واقعہ جیسے جیسے عام ہوتا گیا، نبیِ اکرم ﷺ اور سارے خاندانِ نبوت کی پریشانی بڑھتی گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خاندانِ صدیق رضی اللہ عنہ کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا سکون لٹ گیا۔ ذاتِ باری تعالیٰ کو نامعلوم کیا کیا حکمتیں منظور تھیں کہ ایک ماہ سے زیادہ عرصہ کوئی وحی بھی نازل نہ ہوئی۔ بے قراری و بے تابی میں نبی ﷺ کبھی اپنی کسی بیوی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں پوچھتے کہ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کبھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو واقعہ کی خبر نہیں مگر نبی ﷺ کے عدمِ التفات سے بے چین ہو کر اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے بلا تأمل اجازت دے دی۔ وہاں کئی دن کے بعد انھیں اپنے بارے میں لگائی گئی تہمت کی خبر ملی تو شدتِ غم سے قریب تھا کہ جگر پاش پاش ہو جائے۔ سخت بخار آ گیا اور دل کے آبگینے کو غیر متوقع، ناگہانی اور سخت چوٹ لگنے کی وجہ سے آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات بہنے لگی، وہ اپنے گوہرِ عصمت پر انگلی اٹھائے جانے کے غم میں ہلکان ہو رہی تھیں اور اصل واقعہ کو ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا تو ایک دن نبیِ اکرم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مائیکے گھر گئے۔ ان کے والد صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، ان کی والدہ اور ایک انصاری عورت ان کی حالتِ زار پر نڈھال ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے عائشہ! جو بات لوگ کہہ رہے ہیں وہ تمھیں بھی معلوم ہو گئی ہو گی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اگر تم نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلو، وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ماں باپ کو خاموش دیکھا تو خود ہی فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں اس بات پر توبہ نہیں کروں گی جو آپ ﷺ نے ذکر کی ہے اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس الزام سے بری ہوں۔''

﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾[1]

براءتِ عائشہ رضی اللہ عنہا

مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمٰوات

جب صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس ناکردہ گناہ سے توبہ کرنے سے ''وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّنِيْ بَرِيْئَةٌ'' کہتے ہوئے انکار کردیا تو خالقِ کائنات، مالکِ ارض وسماء نے ساتوں آسمانوں کے اوپر سے شہادت دے دی کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا دامن پاک ہے اور یہ الزام لگانے والے جھوٹے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ توبہ کا مشورہ دینے کے بعد نبی ﷺ ابھی وہیں بیٹھے تھے کہ آپ ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہوا اور جب حالتِ نزول کا انقطاع ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَبْشِرِيْ يَا عَائِشَةُ! قَدْ أَنْزَلَ اللّٰهُ بَرَاءَتَكِ»

''اے عائشہ! تمھیں بشارت ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تیری براءت نازل فرمادی ہے۔''

میں نے اپنی براءت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ پھر نبی ﷺ خوشی خوشی باہر گئے اور لوگوں کو براءتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نازل ہونے والی آیات سنائیں۔[2]

---

[1] واقعۂ تہمت کی تفصیلات کے لیے دیکھیں: صحيح البخاری مع الفتح (۷/ ٤٣٥۔ ٤٤٧) صحيح مسلم (۸/ ۱۷۳ تا ۱۷۷) سیرت ابن هشام (۳/ ۱۸۷ تا ۱۹٦) الفتح الرباني (۲۱/ ۷۳ تا ۷٦ و ۲۲/ ۱۱٦ تا ۱۲۳) البداية و النهاية (٤/ ۱٦۰ تا ۱٦٤) تفسير الطبري (۱/ ۳۱٦ تا ۳۲۳) زاد المعاد (۲/ ۱۱۲ تا ۱۱٦ طبع قديم)

[2] حواله جاتِ سابقه، وانظر أيضاً، فوائد سلفيه المسمّٰى به أشرف الحواشي للأستاذ محمد عبدهٗ الفلاح.

یہ سورۃ النور کی آیات تھیں جو آیت نمبر ۱۱ سے شروع ہو کر ۲۶ تک تھیں اور ان سولہ آیات پر مشتمل پورے دو رکوعوں میں ہی تہمت اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت مذکور ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١﴾ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ﴿١٢﴾ لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٣﴾ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٤﴾ إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ﴿١٦﴾ يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَن تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٧﴾ وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴾

[النور: ۱۱۔ ۱۹]

''بے شک وہ لوگ جو بہتان لے کر آئے ہیں وہ تمھی سے ایک گروہ ہیں، اسے اپنے لیے برا مت سمجھو، بلکہ یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کے لیے گناہ میں سے وہ ہے جو اس نے گناہ کمایا اور ان میں سے جو اس کے بڑے حصے کا ذمہ دار بنا اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ کیوں نہ جب تم نے اسے سنا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور کہا کہ یہ صریح بہتان ہے۔ وہ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے، تو جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اور اگر دنیا اور آخرت میں تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً اس بات کی وجہ سے جس میں تم مشغول ہوئے، تم پر بہت بڑا عذاب پہنچتا۔ جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لے رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کا تمھیں

کچھ علم نہیں اور تم اسے معمولی سمجھتے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی تھی۔ اور کیوں نہ جب تم نے اسے سنا تو کہا ہمارا حق نہیں ہے کہ ہم اس کے ساتھ کلام کریں، تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے اس سے کہ دوبارہ کبھی ایسا کام کرو، اگر تم مومن ہو۔ اور اللہ تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔ بے شک جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ ان لوگوں میں بے حیائی پھیلے جو ایمان لائے ہیں، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اس سے آگے فرمایا:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۚ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ۝ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۗ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ [النور: ۲۰۔ ۲۶]

''اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ یقیناً اللہ بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے (تو تہمت لگانے والوں پر فوراً عذاب آ جاتا)۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو اور جو شیطان کے قدموں کے پیچھے چلے تو وہ تو بے حیائی اور برائی کا حکم دیتا ہے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی

تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوتا اور لیکن اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور تم میں سے فضیلت اور وسعت والے اس بات سے قسم نہ کھالیں کہ قرابت والوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دیں اور لازم ہے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں بخشے اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔ بے شک وہ لوگ جو پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں لعنت کیے گئے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں ان کا صحیح بدلہ پورا پورا دے گا اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے، جو ظاہر کرنے والا ہے۔ گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔ یہ لوگ اس سے بری کیے ہوئے ہیں جو وہ کہتے ہیں، ان کے لیے بڑی بخشش اور باعزت روزی ہے۔''

حلِ مسائل:

قارئینِ کرام! اس واقعۂ تہمت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو نتیجتاً کتنے ہی مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

1. یہ کہ پیغمبری مل جانے کے باوجود بھی آپ ﷺ بشریت و انسانیت کے وصف سے جدا نہیں ہوئے تھے جیسا کہ اس واقعہ کی تفصیلات سے پتا چلتا ہے۔
2. دوسری بات یہ بھی بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ اس وحی کا نزول کسی نبی کے بس میں نہیں ہوتا بلکہ جب اللہ چاہے تو وہ نازل فرماتا ہے جیسا کہ اس واقعہ سے واضح ہو رہا ہے۔[1]

جب وحی کا نزول کسی نبی کے بس میں نہیں ہوتا تو کشف وکرامات کے دعوے کرنے والوں

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: فقه السیرة ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی (ص: ۲۲۲ تا ۲۲۵)

کے لیے کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ جب چاہیں کرامت دکھا دیں اور اپنے پیر ہونے کا سکہ جما لیں۔

اللہ کے سوا غیب دان کوئی نہیں:

3 تیسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ عقیدہ بنائے بیٹھے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ عالم الغیب یا غیب دان تھے۔ اس واقعہ سے ان کے اس غلط عقیدے کی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ آپ ﷺ غیب دان نہیں تھے بلکہ امورِ غیبیہ میں سے جو کچھ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ بتا دیتا تھا وہ تو آپ ﷺ کو معلوم ہو جاتا۔ اور جو وہ نہیں بتاتا وہ آپ ﷺ کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس واقعے پر نظرِ ثانی کریں اور دیکھیں:

① اگر آپ ﷺ غیب دان تھے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب قضائے حاجت سے فارغ ہو کر قافلے کی طرف آ رہی تھیں تو آپ ﷺ انھیں فرما دیتے کہ جاؤ پہلے اپنا ہار اٹھا کر لاؤ جو فلاں جگہ پر گر گیا ہے۔ یا پھر آپ ﷺ خود جا کر لا دیتے اور اس ''ماہِ غم'' کا واقعہ ہی رونما نہ ہوتا۔

② اگر آپ ﷺ بذاتہٖ غیب دان ہوتے تو قافلے کی روانگی کے وقت ہی قافلے والوں کو روک دیتے اور فرما دیتے کہ ابھی رک جاؤ، کیوں کہ میری اہلیہ اپنے اونٹ کے ہودج میں موجود نہیں، بلکہ اپنا ہار تلاش کرنے گئی ہیں، وہ آلیں، پھر چلتے ہیں۔

③ اگر آپ ﷺ غیب دان ہوتے تو اس تہمت کی نوبت ہی نہ آتی نہ نبی ﷺ اور پورا خاندانِ نبوت پریشان رہتے۔ نہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور خاندانِ صدیق رضی اللہ عنہم کا چین وسکون غارت ہوتا اور نہ ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک کے لیے بے چینی لاحق ہوتی۔

④ آپ ﷺ غیب دان ہوتے تو پھر پریشان رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حسنِ کردار کے بارے میں شہادتیں لینے اور مشورے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ صاف فرما دیتے کہ یہ لوگ جھوٹا الزام لگا رہے ہیں، میری بیوی میں ایسی کوئی قابلِ مؤاخذہ بات نہیں پائی جاتی۔

⑤ اگر آپ ﷺ غیب دان تھے تو پھر کیا وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے سب سے محبوب بیوی کے بارے میں شک کا اظہار فرماتے ہوئے انھیں توبہ کا مشورہ دے

دیا۔ کیا کوئی شخص جانتے بوجھتے ہوئے ایسی بات بآسانی کہہ سکتا ہے؟

⑥ اگر آپ ﷺ غائب دان تھے تو آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ میری بیوی سچی ہیں، اس کے باوجود ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک آپ ﷺ نے الزام لگانے والوں کا منہ بند کرنے کے احکام جاری کیوں نہ فرما دیے؟ اور اگر جان بوجھ کر آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا تھا تو غور کر کے دیکھیں کہ بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے اور خود نبی ﷺ کے بارے میں کون سی بدگمانیوں کے پہلو نکلتے ہیں۔

الغرض یہ واقعہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے۔ کوئی نبی، صحابی، امام یا ولی اس صفت میں اللہ کا شریک ہرگز نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم کی سورۃ الانعام (آیت: ۵۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ۚ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ﴾

[الأنعام: ٥٠]

''(اے نبی!) ان سے کہہ دیں میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ پھر ان سے پوچھیں: کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟''

سورۃ الانعام (آیت: ۵۹) ہی میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾

''اسی (اللہ) کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا۔''

اسی سورت (آیت: ۷۳) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ﴾

''وہ (اللہ ہی) غیب وظاہر ہر چیز کا عالم ہے، اور دانا وباخبر ہے۔''

اسی طرح سورۃ الاعراف (آیت: ۱۸۸) میں ارشادِ گرامی ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۚ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ

لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۸۸]

''(اے نبی!) ان سے کہیں کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے، ہوتا ہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اپنے لیے بہت سے فائدے حاصل کر لیتا۔ اور مجھے کبھی کوئی (تکلیف و) نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک خبردار کرنے والا، اور خوشخبری سنانے والا ہوں، ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔''

اس ارشادِ الٰہی پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے سوا کسی کے مختارِ کل ہونے اور عالم غیب ہونے کی نفی کر دی ہے۔ اور خاص نبیِ اکرم ﷺ کی نسبت خود آپ ﷺ سے یہی کہلوایا ہے کہ میں نہ مختارِ نفع ونقصان ہوں، اور نہ ہی عالمِ غیب ہوں۔

سورت ہود (آیت: ۳۱) میں حضرت نوح علیہ السلام کی زبانی کہلوانے کے لیے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ ﴾ [هود: ۳۱]

''اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔''

اور سورت ہود (آیت: ۴۹) ہی میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد نبی ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [هود: ٤٩]

''(اے نبی!) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمھاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے، اور نہ ہی تمھاری قوم، پس صبر کرو، انجامِ کار متقیوں ہی کے حق میں ہے۔''

سورت ہود (آیت: ۱۲۳) کی آخری میں نبیِ اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [هود: ۱۲۳]

''آسمانوں اور زمین کا علمِ غیب اللہ ہی کو ہے، تمام کاموں کا رجوع بھی اسی کے جانب ہے، پس (اے نبی!) تو اُسی کی بندگی کر، اور اُسی پر بھروسہ رکھ، اور جو کچھ تم کر رہے ہو، تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

سورۃ النمل (آیت: ۶۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ [النمل: ٦٥]

''ان سے کہو: اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ اور وہ (معبودانِ باطلہ تو یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔''

سورت لقمان کی آخری آیت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾

[لقمان: ٣٤]

''اُس (قیامت کی) گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹ میں کیا (پرورش پا رہا) ہے۔ کوئی متنفّس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے۔ اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کی موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا باخبر ہے۔''

ان سب ارشاداتِ الٰہیہ کے بعد کیا اب بھی کوئی شک باقی رہ جاتا ہے کہ اللہ کے سوا نہ کوئی مختارِ کل ہے اور نہ ہی عالمِ غیب؟

علم الغیب

شیخ جیلانی رحمہ اللہ کی نظر میں:

''علم الغیب'' کو نبی ﷺ کے لیے ثابت کرنا بریلوی مکتبِ فکر کے ''نعت گو'' قسم کے علماء کا طُرۂ امتیاز ہے۔ ورنہ ان کے بانی مبانی مولانا احمد رضا خان بریلوی اور اس مکتبِ فکر کے بعض معروف

علماء اس حق میں نہیں ہیں۔ شیخ جیلانی رحمہ اللہ نے اہلِ سنت کے عقائد کی جو تفصیل اپنی کتاب "غنیۃ الطالبین" میں ذکر کی ہے، اس کی رو سے "علمِ غیب" علم جمیع ما کان وما یکون (جو کچھ ہو گیا اور ہونے والا ہے اس سب کچھ کا علم) کسی غیر اللہ کے لیے ثابت کرنا رافضیوں شیعوں کا عقیدہ ہے، اہلِ سنت کا نہیں۔ اور جو شخص یہ ناپسندیدہ عقیدہ رکھے، وہ اہلِ سنت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پیر جیلانی رحمہ اللہ "غنیۃ الطالبین" میں رقم طراز ہیں:

"رافضیوں کا عقیدہ ہے کہ "امام" کو دنیا و دین کی ہر چیز کا علم ہوتا ہے۔ جو ہو چکی ہے اور جو ہونے والی ہے۔ یہاں تک کہ کنکروں، بارشوں کے قطرات اور درختوں کے پتوں کی تعداد و گنتی بھی جانتے ہیں۔"

مذکورہ کتاب ہی کے "باب فضائلِ شب قدر" میں موصوف نے ایک بڑا عجیب نکتہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جہاں نبیِ آخر الزمان ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے جن چیزوں کے متعلق ﴿وَمَا اَدْرٰىكَ﴾ فرمایا ہے ان چیزوں کا علم تو اللہ نے آپ ﷺ کو عطا فرمایا۔ مگر جن چیزوں کے متعلق ﴿وَمَا يُدْرِيْكَ﴾ فرمایا ہے ان چیزوں کی اطلاع آپ ﷺ کو نہیں دی۔ جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۶۳) میں قیامت کے متعلق فرمایا ہے:

﴿وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا﴾ [الأحزاب: ٦٣]

"اور کس چیز نے آپ کو خبر دار کیا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ (یعنی آپ ہرگز نہیں جانتے اس کے آنے کا وقت)۔"[1]

معلوم ہوا کہ شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ بھی نبی ﷺ کو عالمِ غیب نہیں جانتے تھے، بلکہ ان کے نزدیک بھی یہ خاصہ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

بریلوی مکتبِ فکر کی نظر میں:

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نبی، ولی یا پیر عالم الغیب نہیں اور نبی ﷺ نے جن غیبی امور کی بذریعہ

[1] بحوالہ مرشد جیلانی رحمہ اللہ کے ارشادتِ حقانی (ص: ۱۵۵، ۱۷۹)

وحی خبریں دی ہیں انھیں علمِ غیب کہنا کبار بریلوی علماء پیر حمزہ شاہ اور مفتی احمد رضا خان کے نزدیک جہالت وگمراہی ہے۔ چنانچہ بریلوی جماعت کے بانی شاہ احمد رضا خان بریلوی کے ملفوظات (۱/۳۴ اور ۱۳۵) میں مسئلہ علمِ غیب کی تشریح کی گئی ہے جہاں موصوف لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی کتابوں میں تصریح کر دی ہے کہ اگر تمام اولین وآخرین کا علم جمع کیا جائے تو اس علمِ الٰہی سے وہ نسبت ہرگز نہیں ہوسکتی جو ایک قطرے کے کروڑویں حصہ کو کروڑ سمندر سے ہے۔''

فاضل بریلوی ہی اپنی کتاب ''خالص الاعتقاد'' میں لکھتے ہیں:

''ہماری تقریر سے روشن وتاباں ہوگیا کہ تمام مخلوق کے جملہ علوم مل کر بھی علمِ الٰہی کے مساوی ہونے کا شبہ اس قابل نہیں کہ مسلمان کے دل میں اس کا خطرہ بھی گزرے۔ ہم قاہر دلیلیں قائم کر چکے کہ علمِ مخلوق کا جمیع معلوماتِ الٰہیہّ کو محیط ہونا عقل وشرع دونوں کی رو سے یقیناً محال ہے۔

علمِ ذاتی اور علم بالاستیعاب محیط تفصیلی یہ اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہیں۔ بندوں کے لیے صرف ایک گونہ علم بعطائے الٰہی ہے۔ ہم نہ علمِ الٰہی سے مساوات مانیں، نہ غیر کے لیے علم بالذات جانیں، اور عطاء الٰہی میں سے بھی بعض علم ہی مانتے ہیں نہ کہ جمیع۔''

موصوف مزید فرماتے ہیں:

''میرا مختصر فتویٰ: انباء المصطفٰی، بمبئی مراد آباد میں تین بار ۱۳۱۸ھ سے ہزاروں کی تعداد میں طبع ہو کر شائع ہوا۔ ایک نسخہ اس کا رسالہ "الكلمة العلياء" (تالیف مولانا نعیم الدین مراد آبادی) کے ساتھ مطبوعہ ہوا، مرسلِ خدمت ہے۔ اس سے بڑھ کر جس جس امر (علمِ غیب کلی) کا اعتقاد میری طرف نسبت کرے، مفتری وکذّاب اور اللہ کے یہاں اس کا حساب ہے۔''[1]

"الدولة المكية" (ص: ۲۵) میں فاضل بریلوی لکھتے ہیں:

---

[1] خالص الاعتقاد، شائع کردہ مرکزی حزب الاحناف ہند۔ مطبوعہ ۲۸ رمضان ۱۳۶۱ھ

"فَاِنَّا لَا نَدَّعِیْ اَنَّہٗ ﷺ قَدْ اَحَاطَ لِجَمِیْعِ مَعْلُوْمَاتِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَمَحَالٌ لِلْمَخْلُوْقِ"

''ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا علمِ شریف تمام معلوماتِ الٰہیہ کو محیط ہے کیوں کہ یہ مخلوق کے لیے محال ہے۔''

اسی کتاب کے صفحہ نمبر (۸۲) پر لکھتے ہیں:

"وَلَا نُثْبِتُ بِعَطَاءِ اللّٰہِ اِلَّا الْبَعْضَ"

''اور ہم عطائے الٰہی سے بعض علم ہی ملنا مانتے ہیں نہ کہ جمیع۔''

تمہید ایمان میں فرمایا ہے: ''حضور ﷺ کا علم بھی جمیع معلوماتِ الٰہیہ کو محیط نہیں۔''

اپنی کتاب "الأمن والعلی" (ص:۲۰۳ مطبع نظامی بدایوں) پر فیصلہ کن انداز سے لکھتے ہیں:

''علم بالذات اللہ عزوجل کے لیے خاص ہے، کفار اپنے معبودانِ باطل کے لیے مانتے تھے۔ مخلوق کو عالم الغیب کہنا مکروہ، اور یوں کوئی حرج نہیں کہ اللہ کے بتانے سے انھیں امورِ غیب پر اطلاع ہے۔''

مولانا احمد رضا خان بریلوی کے دادا مرشد جناب پیر حمزہ شاہ نے "خزینۃ الأولیاء" (ص: ۱۵) میں فرمایا ہے:

''علم الغیب خاص رب العزت کی صفت ہے جو عالم الغیبِ والشہادۃ ہے۔ اور جو رسول اللہ ﷺ کو ''عالم الغیب'' کہے، وہ بے دین ہے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کو بذریعہ وحی کے امورِ مخفیہ کا علم ہوا تھا جسے علم الغیب کہنا ہی گمراہی ہے۔''

ورنہ جمیع مخلوقات نعوذ باللہ عالم الغیب ہے کیوں کہ رسول ﷺ کو جو بعطائے الٰہی علم ہوا آپ ﷺ نے وہ امت کو پہنچا دیا۔ مثلاً: ''پورا قرآن علمِ غیب ہی ہے جو ہمارے سامنے اور علم میں ہے۔''

دورِ حاضر کے معروف بریلوی عالم مفتی احمد یار گجراتی اپنی کتاب ''جآء الحق'' (ص: ۳۹، طبع ہفتم) میں لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کو ربِ تعالیٰ نے اپنے بعض غیوب کا علم دیا۔''

اور مذکورہ کتاب کے صفحہ (۸۸) پر وہ لکھتے ہیں:

''حضور ﷺ کا علمِ غیب جاننا نہ جاننے کی طرح ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کو اس چیز کے

بدلنے پر قدرت نہیں جو اللہ نے مقرر فرمائی، تو معنیٰ یہ ہوئے کہ اگر مجھ کو علمِ حقیقی ہوتا اس طرح میں اپنی مراد کے واقع کرنے میں قادر ہوتا تو خیر بہت جمع کر لیتا۔"

اور کتابِ مذکور ہی کے صفحہ (۹۱) پر وہ قمطراز ہیں:

"غیب ذاتی کوئی نہیں جانتا، کل غیب ......کوئی نہیں جانتا۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "علم غیب عطائی کو علمِ غیب کہنا ہی جہالت ہے۔"[1]

امہات المومنین حضرت حفصہ و زینب و ام سلمہ رضی اللہ عنہن سے نکاح:

فاروقِ اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا، حضرت خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھیں جو غزوۂ اُحد میں زخمی ہو کر آئے اور مدینہ منورہ میں وفاتِ شہادت پائی۔ شعبان ۳ھ میں نبیِ اکرم ﷺ کی زوجیت میں آئیں اور ام المومنین ہونے کا شرف پایا۔ انھوں نے ۴۱ھ ماہ جمادیٰ الاولیٰ میں بعمر ساٹھ سال وفات پائی۔

۳ھ میں نبی ﷺ نے ام المساکین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جو پہلے طفیل پھر عبیدہ کے نکاح میں تھیں جو نبی ﷺ کے عمزاد بھائی یعنی حارث بن عبدالمطلب کے فرزند تھے۔ ان کا تیسرا نکاح عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ جو آپ ﷺ کے پھوپھی زاد اور آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھائی تھے۔ وہ جنگِ اُحد میں شہید ہوئے تو بعد میں یہ آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ ماں کی جانب سے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھی۔ یہ صرف دو یا تین ماہ آپ ﷺ کی زوجیت میں رہیں اور وفات پا گئیں۔

۴ھ میں آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا (ہند بنت ابو امیہ) سے شادی کی جو آپ ﷺ سے پہلے حضرت ابوسلمہ (عبداللہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ) کے گھر میں تھیں۔ حضرت ابوسلمہ کی والدہ برہ بنت عبدالمطلب نبی ﷺ کی پھوپھی تھیں۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ تینوں رضاعی بھائی بھی تھے۔ وہ غزوۂ اُحد میں زخمی ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ آخر جمادیٰ الاخریٰ ۳ھ میں شہید ہوئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سات سال آپ ﷺ کے نکاح میں رہیں اور پھر وفات پائی۔

---

[1] ملخصاً از تعلیمات شاہ احمد رضا خان بریلوی از مولانا محمد حنیف یزدانی (ص: ۴۲، ۴۵)

حضرت جویریہ اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگنے والے موقع (حدیثِ افک) غزوۂ بنی مصطلق ۵ھ میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا اسیر ہوکر آئیں۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ جو انھیں اسیر بنا کر لائے تھے، انھوں نے انھیں مکاتَب کر دیا۔ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ ﷺ نے زرِ کتابت ادا کرنے اور شادی کر لینے کا کہا تو وہ بخوشی مان گئیں۔ یہ حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔ اس شادی کی خبر سنتے ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دوسرے ایک سو قیدیوں کو بھی یہ کہتے ہوئے رہا کر دیا کہ یہ اب ہمارے نبی ﷺ کے رشتے دار ہو گئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انھیں اپنی قوم کے لیے باعثِ برکت کہا کرتی تھیں۔ شوال ۵ھ کو نبیِ اکرم ﷺ سے ان کی شادی ہوئی اور چھے سال زوجیت میں رہ کر وفات پائی۔

۵ھ میں ہی نبی ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا (پھوپھی زاد) سے شادی کی جو آپ ﷺ کے مولیٰ و متبنّٰی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں رہیں اور انھوں نے طلاق دے دی تھی۔ قرآنِ پاک کی سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۶۔۳۷) میں انہی کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿36﴾ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا﴾

''اور کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے سو یقیناً وہ گمراہ ہوگیا، واضح گمراہ ہونا۔ اور جب تو اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام کیا اور جس پر تو نے انعام کیا کہہ رہا تھا کہ اپنی بیوی اپنے پاس روکے رکھ اور اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپاتا تھا جسے اللہ ظاہر

کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے ڈرتا تھا، حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ تو اس سے ڈرے، پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا، تا کہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جب وہ ان سے حاجت پوری کر چکیں اور اللہ کا حکم ہمیشہ سے (پورا) کیا ہوا ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اپنے برابر والی منزلت کی مانتی تھیں۔ ان سے آپ ﷺ کا نکاح حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے پہلے ہوا تھا۔ چھے برس آپ ﷺ کی زوجیت میں رہ کر وفات پائی۔

ملوک و امراء اور سلاطین و حکّام کو تبلیغ

آج جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اصلاحِ معاشرہ کے بارے میں کوئی بات ہوتی ہے تو عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ بھئی! سب سے پہلے اپنے آپ کو سدھارو، پھر اپنے اہل وعیال اور اعزہ واقارب کے اخلاق وکردار کو سنوارو اور اس کے بعد پھر مقامی وشہری، ملکی وقومی اور عالمی سطح پر معاشرے کی اصلاح کا کام شروع کرو۔ اگر اس طریقۂ کار کو اپنایا جائے تو مقامی وملکی بلکہ عالمی سطح پر بھی اصلاح ممکن ہے، کیوں کہ یہی منہجِ ربانی ہے جو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا اور رسول اللہ ﷺ کا اپنایا اور آزمایا ہوا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو تبلیغ واصلاح کا سب سے پہلے یہ حکم دیا تھا:

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٤]

''اور اپنے قرابت داروں کو (اللہ سے) ڈرائیں۔''

اس کے بعد تمام لوگوں کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا۔ اور بالآخر حکم دے دیا کہ پوری نوعِ انسانی کی اصلاح آپ ﷺ کے ذمے ہے، جیسا کہ سورت سبأ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ [سباء: ٢٨]

''اے نبی! ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔''

نیز سورۃ الانبیاء (آیت: ١٠٧) میں فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾

''(اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

نبی ﷺ نے ان آیات کا مصداق بنتے ہوئے واقعی ثابت کر دکھایا کہ آپ ﷺ پوری نوعِ بشر کے داعی و مبلّغ اور مصلحِ اعظم تھے۔ نبی ﷺ نے دعوت و تبلیغ کے منہجِ ربانی پر عمل کرتے ہوئے پہلے اپنے گھر والوں سے اصلاح کا آغاز کیا، پھر اپنے خاندان و قبیلہ کی طرف متوجہ ہوئے، اس کے بعد اپنے شہر اور گردونواح کے قبائل و اقوام تک دائرۂ کار کو بڑھایا۔ اور بالآخر اپنے اس مقدّس مشن کو اتنی وسعت دی کہ مُصلحِ عالَم کی حیثیت اختیار فرمائی، اور پوری دنیا کے لیے اسلام کو دینِ واحد کہہ کر پیش کیا۔ معروف صحابۂ کرام حضرت بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی اور عدّاس نینوائی رضی اللہ عنہم وہ بزرگوار ہیں کہ جو حبشہ، روم، ایران اور وسط ایشیا کی طرف سے ثمرِ اولین بن کر اسلام میں داخل ہوئے۔

۷ھ کے پہلے ہی مہینے محرم کی پہلی ہی تاریخ کو آپ ﷺ نے تبلیغِ اسلام کی وہ کارروائی فرمائی جس کی نظیر دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے اس وقت کے بڑے بڑے سلاطین و حکّام اور ملوک و امراء کو تبلیغی مکتوبات ارسال فرمائے جن میں انھیں توحید و رسالت اور دینِ اسلام کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا:

> ''اسلام سے انکار کرنے کا وبال نہ صرف اس لیے تم پر پڑے گا کہ تم نے انکار کر دیا، بلکہ تمھارے انکار کی وجہ سے چونکہ تمھاری رعایا بھی ہدایت سے رکے گی، لہٰذا ان کی ضلالت و گمراہی کا وبال بھی تمھیں پر پڑے گا۔ کیوں کہ اس مکتوب میں تمھیں شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ سربراہِ قوم ہونے کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔''

جن لوگوں کی طرف آپ ﷺ نے تبلیغی و دعوتی خطوط ارسال فرمائے، ان میں سے شاہِ قسطنطنیہ یا قیصرِ روم ہرقل، کسرائے فارس یا شاہِ ایران خسرو پرویز، شاہِ مصر و حاکمِ سکندریہ مقوقس، نجاشیِ حبشہ اصحمہ بن ابجر، حاکمِ بحرین ساویٰ، حاکمِ یمامہ ہوذہ بن علی، دمشق کے حاکم اور شام کے گورنر حارث بن ابی شمر غسّانی، عمان کے بادشاہ جیفر جلندی اور اس کے بھائی عبد جلندی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے شاہِ عمان، حاکمِ حبشہ اور فرمانروائے بحرین ایمان لے آئے اور شاہِ مصر وغیرہ بعض ملوک و حکّام ایمان تو نہ لائے مگر قاصدینِ مصطفیٰ ﷺ کا مکمل احترام کیا، آپ ﷺ کے

مکتوبِ گرامی کو پورے اعزاز کے ساتھ شاہی خزانے میں رکھا اور نبی ﷺ کی خدمت میں تحائف ارسال کیے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں لکھا ہے:

مشہور سفید خچر یا دُلدُل شاہِ مصر نے تحفہ بھیجا تھا اور آپ ﷺ کی اُمُّ الولد حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا بھی مقوقس ہی کا ہدیہ تھیں۔

ان میں سے صرف ایک شاہِ ایران خسرو پرویز نے آپ ﷺ کے مکتوبِ گرامی کے ساتھ گستاخی کی اور غصے میں آکر اسے پھاڑ ڈالا۔ قاصدِ رسول ﷺ نے آکر واقعہ بتایا تو آپ ﷺ نے اس کے لیے بددعا فرمائی: «أَنْ يُّمَزَّقُوا كُلَّ مُمَزَّقٍ»[1] ''وہ تباہ و برباد کر دیے جائیں گے۔''

آپ ﷺ کے اس مختصر اور پُر ہیبت جملہ کا اثر دیکھیں کہ چار پانچ ہزار سال سے نصف دنیا پر حکومت کرنے اور روم و یونان کو نیچا دکھانے والی وہ قومِ زردشت چودہ سو برس سے تاریخ کے اوراق میں ایسی دفن ہوئی ہے کہ آج صفحۂ ہستی سے اس کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔

سرکاری مُہر:

اپنے خطوط پر لگانے کے لیے آپ ﷺ نے مہر بھی بنوائی تھی جس کی تین سطریں اور تین ہی الفاظ تھے۔ وہ چاندی کی تھی اور اس کا نقش اوپر نیچے یوں تھا: محمد رسول اللہ۔ نیچے محمد اوپر رسول اور اس کے بھی اوپر اللہ۔ یہ مُہر والی انگوٹھی حضرت ابو بکر و عثمان و عمر رضی اللہ عنہم اپنے اپنے عہدِ خلافت میں پہنتے رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد کے آخر میں یہ مدینہ کے ایک کنویں ''بئر اریس'' میں گر گئی اور تلاشِ بسیار کے باوجود نہ مل سکی۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤، ٢٩٣٩، ٧٢٦٤) مسند أحمد (٤/ ٢٧٦) سنن الكبرىٰ للنسائي (٥٨٥٩)

[2] مکتوباتِ مصطفیٰ ﷺ کی نقول اور مضامین کی تفصیل بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث کے علاوہ درجِ ذیل کتب میں بھی ملاحظہ فرمائیں: الفتح الرباني (٢٢/ ١٥٧۔ ١٦١) البداية والنهاية (٤/ ٢٦٢۔ ٢٧٣) زاد المعاد (٣/ ٦٠۔ ٦٣ طبع قديم و ٣/ ٦٨٨ تا ٦٩٧ طبع جديد) تفسير الطبري (١/ ٢٤٥۔ ٢٥٦) رحمة للعالمين (١/ ١٤٩۔ ١٦١) سیرت النبی ﷺ، شبلی (١/ ٤٦٢۔ ١٧٤)

حضرت صفیہ اور میمونہ رضی اللہ عنہما سے نکاح:

جمادیٰ الاخریٰ ۷ھ میں ہی نبیِ اکرم ﷺ نے ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جو معرکۂ خیبر میں قیدی ہو کر آئی تھیں۔ یہ بنوقریظہ اور بنونضیر کی سیدہ تھیں۔ وہ جب نبی ﷺ کے حصے میں آئیں تو آپ ﷺ نے انھیں آزاد فرما دیا اور نکاح کر لیا۔ ان کا پہلا نکاح سلام بن مشکم سے اور دوسرا نکاح کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا تھا جو غزوۂ خیبر میں مارا گیا تھا۔ یہ پونے چار سال نبی ﷺ کی خدمت میں رہیں اور ۵۰ھ میں فوت ہوگئیں۔

اُسی سال ۷ھ میں ہی ماہِ ذو القعدہ میں نبی ﷺ نے ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔ وہ پہلے ابو رہم بن عبد العزیٰ اور پھر حویطب بن عبدالعزیٰ کے نکاح میں تھیں اور بیوہ ہوگئی تھیں۔ ام المومنین زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا ان کی ماں کی جانب سے بہن تھیں جن سے ۳ھ میں آپ ﷺ نے نکاح کیا تھا اور صرف تین ہی ماہ بعد وہ وفات پا گئی تھیں۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سوا تین سال خدمتِ نبوی ﷺ میں رہیں اور ۵۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاحِ نبوی:

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سابقہ واقعہ میں مذکور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں۔ ام حبیبہ ان کی کنیت اور رملہ نام تھا۔ ان کا پہلا شوہر عبد اللہ بن جحش تھا جو دائم الخمر تھا اور عیسائیوں میں بیٹھ کر عیسائی ہو گیا تھا، یہ خود قدیم الاسلام تھیں اور ماں، باپ بہن، بھائیوں کو چھوڑ کر صرف شوہر کے سہارے حبشہ میں تھیں۔ اس کے ارتداد سے یہ سہارا بھی جاتا رہا۔ جب نبی ﷺ کو ان کا حال معلوم ہوا تو ایک آدمی بھیج کر پیغامِ نکاح دیا۔ نجاشی نے مجلسِ نکاح منعقد کی، خطبہ پڑھا، نبی ﷺ کی طرف سے چار سو دینار مہر دیا اور تمام حاضرین کو کھانا بھی کھلایا۔

''جلاء الأفهام'' میں ابن قیم رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ ''مدینہ میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ آئے اور وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے چار پائی سے بستر اٹھا لیا اور کہا کہ یہ بستر رسول اللہ ﷺ کا ہے کوئی مشرک اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے ایک دو دن پہلے مسلمان ہوئے اور غزوۂ حنین، طائف اور یرموک میں مسلم مجاہد کی حیثیت سے خوب

استقامت دکھائی تھی۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کا نکاح ۶ ھ میں ہوا اور چھے برس نبی ﷺ کی خدمت میں رہیں۔۴۴ھ میں وفات پائی۔

فتح مکہ اور رحمۃ للعالمین کی رحم گستری

نبی ﷺ کے حکّام وسلاطین کو خطوط ارسال فرمانے سے اتنا فائدہ ضرور ہوگیا کہ نبی ﷺ کے لائے ہوئے دینِ اسلام کی تعلیمات اور وحیِ الٰہی کی بازگشت تمام آباد دنیا کے کونے کونے تک پہنچ گئی اور اسلام کا عام تعارف ہوگیا۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ کے تربیت یافتہ مبلّغین و مصلحین صحابہ رضی اللہ عنہم کی دعوت وتبلیغ کے اثر سے کئی ملکوں اور علاقوں کے حکمران اور والی بھی مسلمان ہوگئے جن میں سے سلطنتِ غسّان کے حاکم جبلہ، ملکِ شام کے گورنر فروہ بن عَمر وخزاعی، دومۃ الجندل کے حکمران اکیدر، قبائلِ حِمیر کے بادشاہ اور یمن وطائف کے بعض اضلاع کے حاکم ذی الکلاع حِمیری کے نام معروف ہیں۔

اتنے مختصر سے عرصے میں اتنے زیادہ سلاطین وحکّام کا اسلام لانا نبی ﷺ کی تبلیغ کا وہ کرشمہ اور آپ ﷺ کا ایسا شرف ہے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ آپ ﷺ اسی طرح غزوات وجہاد اور دعوت وارشاد جیسے مقدّس فرائض کی بھر پور ادائیگی پر مشتمل ماہ وسال گزار رہے تھے کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے وہ دن دیکھنا بھی نصیب فرمادیا کہ وہ مکہ مکرّمہ جہاں سے یہ مٹھی بھر مسلمان شہر بدر ہونے پر مجبور ہوگئے تھے، املاک و جائیداد حتیٰ کہ بعض لوگوں کے اہل وعیال بھی وہیں چھوٹ گئے تھے، آخر ۸ھ کے ماہِ رمضان المبارک میں قدسی نفوس افراد پر مشتمل مسلمان فوج فاتحانہ شان سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئی۔ انھوں نے اپنے قبلے کو مشرکوں سے آزاد کروا لیا اور بیت اللہ شریف کو بتوں کی نجاست سے پاک کر ڈالا۔

فتح مکہ کے دن نبی ﷺ کے ساتھ دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ اس طرح بائبل کے سفرِ استثناء باب:۳۳ کے پہلے اور دوسرے فقرہ میں دی گئی بشارت بھی پوری ہوگئی جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام فرما گئے ہیں:

---

[1] رحمة للعالمين (١/ ١٥٦)

''خداوند سیناء سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دائیں ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔''[1]

یہ وہ دن تھا کہ کوئی ہماشما کی طرح ہوتا تو گن گن کر بد لے لیتا۔ اسلام اور نبیِ اسلام ﷺ کو زک پہنچانے والوں کو چُن چُن کر مارتا، کیوں کہ یہی اہلِ مکہ وہ گردن زدنی و کشتنی لوگ تھے جنھوں نے نبی اور نبی ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہ صرف مکہ کے اندر تکلیفیں دی تھیں، بلکہ تین سو میل (ساڑھے چار سو کلو میٹر) دور مدینہ منورہ چلے جانے کے باوجود پیچھا نہیں چھوڑا تھا، ان کے ساتھ آپ ﷺ جو بھی سلوک کرتے، روا تھا، مگر آپ ﷺ نے کیا سلوک فرمایا تھا؟ اتنے خون کے پیاسے دشمنوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے قریش کے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمھاری جاہلانہ نخوت اور آبا و اجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ سب لوگ ہی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں جنھیں مٹی سے بنایا گیا تھا۔''

پھر آپ ﷺ نے سورۃ الحجرات کی آیت (۱۳) تلاوت فرمائی:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾

''اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد و زن سے پیدا کیا، اور تمھارے خاندان و قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک تم میں سے اللہ کے یہاں سب سے زیادہ معزز و مکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

آخر میں فرمایا:

«اِذْهَبُوْا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ»

''جاؤ تم آزاد ہو اور آج تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔''

---

[1] رحمة للعالمين (١/ ١١١ حاشيه)

یہ خطبہ امام طبری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔[1] جبکہ امام قیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" (۲/ ۱٦۳ طبع قدیم) میں آپ ﷺ کے جانی دشمن مگر حقیقی چچا حارث کے بیٹے ابو سفیان اور حقیقی پھوپھی عاتکہ کے بیٹے عبد اللہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق برادرانِ یوسف علیہ السلام کے الفاظ میں معافی مانگتے ہوئے یہ آیت پڑھی تھی:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ﴾ [یوسف: ۹۱]

"اللہ کی قسم! آپ کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطا کار تھے۔"

تو رسول اللہ ﷺ نے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہی الفاظ دہراتے ہوئے سورت یوسف (آیت: ۹۲) تلاوت فرمائی جس میں ہے:

﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾

"آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ اللہ تمھیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔"

خون آشام دشمنوں کے ساتھ یہ رویہ؟ یہی تو آپ ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کے مظاہر ہیں۔ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ.

دوسری عورتیں اور کنیزیں:

دو عورتیں ایسی بھی تھیں کہ آپ ﷺ نے ان سے نکاح تو کیا، مگر جماع کی نوبت نہیں آئی۔ ان میں سے ایک بنی کلاب اور دوسری بنی کندہ سے تھی۔

آپ ﷺ کی دو کنیزیں بھی تھیں جن میں سے ایک تو آپ کی ام ولد ہو گئیں۔ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا جن کے بطن سے نبی ﷺ کے فرزند ابراہیم رضی اللہ عنہ تھے جو ۲۸ یا ۲۹ شوال ۱۰ھ الموافق ۲۷۔ جنوری ٦۳۲ھ کو فوت ہوئے۔ دوسری ریحانہ بنت زید رضی اللہ عنہا تھیں۔ یہ علامہ ابن قیم کی تحقیق ہے جبکہ بعض نے ریحانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے انھیں آزاد کر کے شادی کر لی تھی۔ یہ آپ ﷺ کی بیوی تھیں۔ ابو عبیدہ نے دو اور کنیزیں ذکر کی ہیں جن میں سے ایک کا نام جمیلہ تھا اور دوسری وہ تھی جو حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو ہبہ کی تھی۔[2]

---

[1] كما في رحمة للعالمين (١/ ١٢٠)
[2] زاد المعاد (١/ ٢٩)

حجۃ الوداع اور تکمیلِ اسلام کی بشارت

نبی ﷺ کی تبلیغی ودعوتی کوششوں اور مساعیِ مشکورہ کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اتنی سی بات کافی ہے کہ حجِ بیت اللہ تو تب سے ہوتا آ رہا ہے جب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تھا، لیکن چشمِ فلک نے اتنا بڑا جمِ غفیر اور انسانوں کا بحرِ بیکراں کبھی حج کرتے نہیں دیکھا تھا جتنا کہ حجۃ الوداع میں نبی ﷺ کے ہمراہ تھا۔

۹ھ میں حج کی فرضیت نازل ہوئی تو اسی سال آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر الحجاج بنا کر بھیجا کہ وہ سب کو حج کرائیں اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا کہ وہ سورۃ براءت یا توبہ کا اعلان کر دیں۔ انھوں نے اس سورت کی پہلی چالیس آیات اور ان میں مذکور احکام پڑھ کر سنائے اور لوگوں کو بتایا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ میں داخل نہ ہونے پائے گا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف نہ کر سکے گا۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی پہلی ہی تین آیات میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ڏ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾

''اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکوں کی طرف بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔ تو اس سرزمین میں چار ماہ چلو پھرو اور جان لو کہ بے شک تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور یہ کہ یقیناً اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے حجِ اکبر کے دن تمام لوگوں کی طرف صاف اعلان ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری ہے اور اس کا رسول بھی۔ پس اگر تم توبہ کر لو تو وہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر منہ موڑو تو جان لو کہ یقیناً تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور جنھوں

نے کفر کیا انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے دے۔''

اگلے سال ۱۰ھ میں خود نبیِ اکرم ﷺ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ فرضیتِ حج کے نزول کے بعد یہ نبی ﷺ کا پہلا اور یہی آخری حج تھا جو ''حجۃ الوداع'' کے نام سے معروف ہے۔ اس سال نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چوالیس ہزار صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم کا مجمع احکامِ الٰہی کی تعمیل کے لیے موجود تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی اونٹی قصواء پر سوار ہو کر حجۃ الوداع کا وہ مشہور خطبہ ارشاد فرمایا جسے بجا طور پر ''انسانی حقوق کا منشور'' یا چارٹر کہا جاسکتا ہے، اس تاریخی خطبے کے مضامین کی تفصیلات بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث کے باب حجۃ الوداع یا حجۃ النبی ﷺ میں دیکھی جاسکتی ہیں اور بخاری شریف میں ہی حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب خطبے سے فارغ ہوئے تو اسی جگہ سورۃ المائدۃ کی تیسری آیت نازل ہوئی جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا ﴾

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کردیا ہے، اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کردیا ہے، اور میں نے تمھارے لیے دینِ اسلام کو پسند فرمایا ہے۔''[1]

اس طرح ایک لاکھ چوالیس ہزار برگزیدگانِ الٰہی کے جلو میں حج کے اعمال سے فارغ ہو کر اپنی محنتوں کے عظیم الشان ثمر کو دیکھتے ہوئے آپ ﷺ شاداں وفرحاں مدینہ طیبہ کو روانہ ہوئے۔ اب کے جو ماہِ محرم آیا تو اس کے ساتھ ہی ۱۱ھ کا آغاز ہوگیا۔ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی عمرِ شریف کے آخری رمضان المبارک (۱۰ھ) میں بیس دن اعتکاف فرمایا حالانکہ آپ ﷺ ہر سال دس دن کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔[2]

آپ ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمۃ الزاہراء رضی اللہ عنہا کو اس طوالتِ اعتکاف کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ مجھے اپنی موت قریب معلوم ہوتی ہے۔[3] اس بات کی طرف آپ ﷺ نے اپنے

---

[1] صحيح البخاري (٤٥/ ٧٢٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠١٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٦٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٥٠)

خطبۂ حجۃ الوداع میں بھی اشارہ فرما دیا تھا:

''اے لوگو! شاید میں اور تم آیندہ کبھی اس مقام پر اکٹھے نہ ہوسکیں۔''[1]

آپ کی رحلت سے چھے ماہ قبل سورۃ النصر نازل ہو چکی تھی جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝﴾

''جب اللہ تعالیٰ کی نصرت آجائے اور (حق وصداقت کو) فتح نصیب ہو جائے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ پھر آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ ساتھ تسبیح کریں اور اس سے مغفرت مانگیں۔ یقیناً وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

اس سورت کے نزول سے بھی آپ ﷺ سمجھ گئے تھے کہ اس میں حیاتِ ابدی کے لیے کوچ کی طرف اشارہ ہے۔[2]

صحیح بخاری میں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی مجلسِ شوریٰ اور اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا لڑکپن میں ہی شامل کر لیا جانا اور دیگر تفصیلات سے بھی اس بات کی گواہی ملتی ہے۔ حتی کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بھی سمجھ گئے تھے کہ اب نبی ﷺ کا آخری وقت آ گیا ہے، اسی لیے آپ ﷺ کو تسبیح وتحمید اور استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔[3]

آغازِ صفر ۱۱ھ میں سرورِ کائنات ﷺ نے سفرِ آخرت کی تیاری شروع فرما دی۔ ایک دن میدانِ اُحد کو تشریف لے گئے اور شہدائے اُحد کے لیے دعا کی۔ واپس آ کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا:

''لوگو! میں تم سے آگے جانے والا ہوں اور تمھاری شہادت دینے والا ہوں، واللہ! میں

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٥٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦١٦) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٢٢٦٠) سلسلة الأحاديث الصحيحة (٧/ ٧٠٨)

[2] سنن الطبراني عن جابر، رحمة للعالمين (١/ ٢٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧٠)

اپنے حوض کو یہاں سے دیکھ رہا ہوں۔‘‘[1]

پھر ایک رات کی نیم شبی میں جنت البقیع تشریف لے گئے اور آسودگانِ بقیع کے لیے دعا فرمائی۔[2] علامہ زرقانی نے ’’شرح المواہب‘‘ میں نقل کیا ہے کہ ایک دن آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ارشاد فرمایا:

’’مرحباً مسلمانو! اللہ تم کو اپنی رحمت میں رکھے، تمھاری شکستہ دلی کو دور فرمائے، تمھیں رزق دے اور تمھاری مدد فرمائے۔ تمھیں با امن وامان رکھے، میں تمھیں تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔‘‘

اس خطبے کے آخر میں فرمایا:

’’سلام تم سب پر اور ان لوگوں پر جو بذریعہ اسلام میری بیعت میں داخل ہوں گے۔‘‘[3]

مرض الموت اور وصیتیں

۲۹/صفر ۱۱ھ بروز پیر کو نبیِ اکرم ﷺ ایک جنازہ پڑھا کر واپس تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں دردِ سر شروع ہو گیا اور پھر شدید بخار آ گیا۔ یہ مرض تیرہ یا چودہ دن مسلسل رہا اور بالآخر یہی بیماری ’’مرض الموت‘‘ ثابت ہوئی۔ اس بیماری کے پہلے گیارہ دن نبی ﷺ تکلیف کے باوجود مسجد میں تشریف لا کر خود نماز پڑھاتے رہے۔ آپ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کا آخری ہفتہ اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی اجازت سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں پورا کیا۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ پہلے جب کبھی آپ ﷺ بیمار ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے اور اپنے ہاتھوں کو جسمِ اطہر پر پھیر لیا کرتے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٤ـ ٤٠٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٩٦) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٣٢٢٤)

[2] صحيح البخاري، الاستذكار (٢/ ٦٤٧) و حسنه ابن عبدالبر، مجمع الزوائد (٩/ ٢٧) و قال الهيثمي: روى بإسنادين و رجال أحدهما ثقات.

[3] شرح الزرقاني (٨) بحواله واحدي، رحمة للعالمين (١/ ٢٤٤ـ ٢٤٥)

«اَذۡهِبِ الۡبَأۡسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشۡفِ اَنۡتَ الشَّافِیۡ، لَا شِفَآءَ اِلَّا شِفَاءُ كَ شِفَآءً لَا یُغَادِرُ سَقَماً»

''اے نسلِ انسان کے پالنے والے! خطر کو دور فرمادے اور صحت عطا کر۔ شفا دینے والا صرف تُو ہی تو ہے۔ اور صرف اسی شفا کا نام شفا ہے جو تو عنایت کرتا ہے۔ ایسی صحت عطا فرما کہ کوئی تکلیف باقی نہ چھوڑے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آپ ﷺ کے مرض الموت کے دنوں میں مَیں نے یہ دعا پڑھی اور نبی ﷺ کے مبارک ہاتھوں پر دم کر کے چاہا کہ وہ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر پر پھیر دوں مگر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ ہٹا لیے اور فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡلِیۡ وَ ارۡحَمۡنِیۡ وَاَلۡحِقۡنِیۡ بِالرَّفِیۡقِ الۡاَعۡلٰی»[1]

''اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما، اور مجھے رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ ملا دے۔''

رحلت سے صرف پانچ دن قبل، بدھ کے روز آپ ﷺ کو بیماری سے کچھ افاقہ ہوا۔ آپ ﷺ نے جب طبیعت ذرا ہلکی محسوس کی تو مسجد میں تشریف لائے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے فرمایا:

''تم سے پہلے ایک قوم گزری ہے جو انبیاء (علیہم السلام) اور نیک لوگوں کی قبروں پر سجدے کیا کرتی تھی، تم ایسا نہ کرنا۔''

آپ ﷺ نے مزید فرمایا:

''یہودیوں اور نصرانیوں پر اللہ کی لعنت ہو جنھوں نے انبیاء (علیہم السلام) کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔''[2]

نیز ارشاد فرمایا:

''اے اللہ! میری قبر کو ایسا نہ بنا دینا کہ اس کی پرستش ہوا کرے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٩١، ٢٤٤٤)

[2] صحيح البخاري (١/ ٦٢، رقم الحديث: ١٣٣٠۔ ٣٤٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٦) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٥١٢٩)

[3] مسند أحمد، رقم الحديث (٧٣٥٢) و صححه الألباني في تخريج المشكاة (٧١٥) مؤطا عن ابن أبي يسار رضي الله عنه (١/ ١٧٢)

نیز یہ بھی فرمایا:

''اس قوم پر اللہ کا سخت غضب و لعنت ہے جس نے قبورِ انبیاء (علیہم السلام) کو مساجد بنایا۔ دیکھو! میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں۔''[1]

اس کے بعد آپ ﷺ نے نماز پڑھائی اور اپنے منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ علامہ زرقانی نے ''شرح المواہب'' (جلد ہشتم) میں نقل کیا ہے کہ منبر پر آپ ﷺ کا یہ آخری جلوہ تھا اور اس وقت آپ ﷺ نے جو مختصر خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں انصارِ مدینہ کے حق میں وصیتیں فرمائیں اور ان کی عزت و قدر کرنے کا حکم دیا۔ بخاری و مسلم شریف اور مسند احمد میں ہے کہ اس خطبے میں ہی آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّ عَبداً عُرِضَتُ عَلَیهِ الدُّنیَا وَزِینَتھَا فَاختَارَ الآخِرَۃَ»[2]

''ایک بندے کے سامنے دنیا و ما فیہا کو پیش کیا گیا، مگر اس نے آخرت ہی کو اختیار کیا۔''

رحلت سے صرف چار دن قبل بروز جمعرات آپ ﷺ نے کچھ لکھ کر دینے کا ارادہ فرمایا جو پورا نہ ہو سکا۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''ایک دن جب شدتِ مرض بڑھ گئی تو گھر میں اہلِ خاندان کے کئی لوگ موجود تھے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«هَلُمُّوا أَكْتُبُ لَكُمْ كِتَاباً بِأَلَّا تَضِلُّوا بَعْدَهُ»

''لاؤ تمھیں کچھ لکھ دوں، تا کہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو جاؤ۔''

حاضرین میں سے بعض نے کہا کہ نبی ﷺ پر شدتِ درد غالب ہے اور قرآنِ کریم تمھارے پاس موجود ہے اور ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے، اس پر آپس میں اختلاف ہوا۔ کوئی کہتا تھا کہ سامانِ کتابت لے آؤ کہ آپ ﷺ ایسا نوشتہ لکھ دیں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے اور کوئی کچھ اور کہتا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣١)

[2] یہ اشارہ آپ ﷺ کی اپنی ذاتِ گرامی کی طرف ہی تھا مگر اس امر کو صرف ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی سمجھے۔ انھوں نے کہا: ہمارے ماں باپ، ہماری جانیں اور ہمارے مال آپ ﷺ پر نثار ہوں۔ الفتح الرباني (٢١/ ٢٢٢) و صححه الألباني في تحقيق المشكاة، رقم الحديث (٥٩١٤) وقال ابن حجر في تخريجه لمشكاة المصابيح (٥/ ٣٧٢): أصله في الصحيحين. مسند أحمد، رقم الحديث (١١٨٦٣) و صححه الأرناؤوط، صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٥٩٣)

جب یہ شور وشغب اور اختلاف رائے بڑھ گیا تو نبی ﷺ نے فرما دیا کہ سب لوگ (میرے پاس سے) اُٹھ جاؤ۔[1]

اس طرح وہ نوشتہ نہ لکھا جا سکا جس میں ناجانے آپ ﷺ کیا لکھنا چاہتے تھے۔ اسی دن آپ ﷺ نے یہ تین وصیتیں فرمائیں:

① یہودیوں کو ملکِ عرب سے باہر نکال دیا جائے۔[2]

② وفود کی عزت ومیزبانی معمولِ نبوی ﷺ کے مطابق بحال رہے۔[3]

③ قرآنِ کریم کے متعلق بھی وصیت فرمائی۔[4]

اس روز مغرب تک کی چاروں نمازیں آپ ﷺ نے خود پڑھائیں، عشاء کے لیے تین مرتبہ عزم فرمایا، ہر دفعہ وضو کے لیے بیٹھتے تو بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ آخر حکم فرمایا، جسے تین مرتبہ دہرایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں۔[5]

اس حدیث کی رو سے آپ ﷺ کی حیاتِ پاک میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی اور نہ صرف ایک بلکہ سترہ نمازوں کی امامت کروائی۔[6]

قارئینِ کرام! نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی رحلت سے پہلے کے ہفتہ، اور بالتحدید رحلت سے صرف پانچ دن پہلے بدھ کے روز صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر پوری امتِ مسلمہ کے افراد کو جو چند نصیحتیں فرمائیں، انہی میں آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣٢)

[2] مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٩١) مجمع الزوائد (٢/ ٣١) و قال: رجاله ثقات (٥/ ٣٢٨) روى من طريقين رجال أحدهما رجال الصحيح، طبراني كبير (٢٣/ ٢٦٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (..........) مسند أحمد (٥/ ٢٦٤) عن شقيق بن سلمه رضي الله عنه وصححه أحمد شاكر.

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٠ـ ٥٠٢٢)

[5] صحيح البخاري (١/ ٩٩، رقم الحديث: ٣٣٨٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٧٢) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٩٢٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٣٢) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٦٣٢٣)

[6] رحمة للعالمين (١/ ٢٤٨) امتاع الأسماع للمقريزي (١/ ٥٤٨) سيرت النبي ﷺ (٢/ ١٧٥)

''تم سے پہلے ایک قوم گزری ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بناتی تھی، مگر تم ایسا ہرگز نہ کرنا۔''[1]

اس کے بعد فرمایا:

''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انھوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔''[2]

آگے فرمایا:

''میرے بعد میری قبر کو ایسا نہ بنانا کہ اس کی پرستش ہوا کرے۔''[3]

آخر میں فرمایا:

''اس قوم پر اللہ کا سخت غضب ہے جس نے قبورِ انبیاء (علیہم السلام) کو مساجد بنایا۔ دیکھو میں تمھیں اس فعل سے منع کرتا رہا ہوں۔ دیکھو میں تبلیغ کر چکا ہوں۔ الٰہی! تو اس بات پر گواہ رہنا۔ الٰہی! تو اس بات پر گواہ رہنا۔''[4]

ان آخری نصیحتوں میں نبی ﷺ نے جس بات کا بار بار اعادہ کیا، جسے بار بار دہرایا، وہ یہ تھی کہ انبیاء (علیہم السلام) اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر اللہ کی لعنت ہو اور اس بات کی سخت تاکید فرمائی کہ تم نیک لوگوں اور اولیاء اللہ کی قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ ان کی پوجا نہ کرنے لگنا۔

یہ وہ باتیں ہیں جنھیں آپ ﷺ عمر بھر دہراتے رہے۔ ساری زندگی قبر پرستی جیسے شرک سے بچنے کی تاکیدیں کرتے رہے۔ قبروں کو پکا بنانے، ان پر عمارتیں تعمیر کرنے، ان پر دیے جلانے اور ان پر مجاور بن کر بیٹھنے سے روکتے رہے، تاکہ آپ ﷺ کی امت کے افراد اس شرک میں مبتلا نہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٠۔ ٣٤٥٣۔ ٥٨١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٦) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٥١٢٩) ابن حبان، رقم الحديث (٦٤٢٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٠۔ ٤٤٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) مسند أحمد، رقم الحديث (٨٧٩٠) تخريج المشكاة للألباني (٨٨٦) و قال: صحيح لغيره.

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٦) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٥١٢٩) مؤطا مالك (١/ ١٧٢) طبقات ابن سعد (٢١٤١) و صححه الألباني في تخريج المشكاة (٧١٥)

ہونے پائیں۔ حیات طیبہ کے آخری ایام میں پھر بطورِ خاص قبر پرستی کے شرک سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ مگر افسوس کہ آج حُب مصطفیٰ ﷺ کے دعوے کرنے اور عشقِ رسول ﷺ کے نعرے لگانے والے بے شمار مسلمان اس شرک میں مبتلا ہیں۔ پکی قبر بنانے کو سعادت سمجھتے ہیں، ان پر دیے جلانے کو واجب بنائے بیٹھے ہیں اور ان پر مجاور بن بیٹھنے کو درجۂ ولایت قرار دیتے ہیں۔ آپ حضرات خود اپنی ایمانداری سے فیصلہ کریں کہ نبی ﷺ کی صریح نافرمانی کرنے والے ایسے لوگوں کو حُب مصطفیٰ ﷺ اور عشقِ رسول ﷺ کے نعرے دعوے بھلا کہاں تک زیب دیتے ہیں؟ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

آخری وصیتیں اور نصیحتیں

۱۱ھ ہجری کا ماہ ربیع الاوّل شروع ہوا۔ وہی ماہ ربیع الاول جس میں تریسٹھ برس پہلے نبیِ رحمت ﷺ کی ولادتِ باسعادت کی وجہ سے اس جہانِ رنگ وبو میں بہار آئی تھی۔ مگر اب کے ماہ ربیع الاوّل مژدۂ بہار نہیں، بلکہ پیغامِ خزاں لے کر آیا تھا۔ اس ماہ کے شروع ہونے سے پہلے ہی نبی ﷺ بیمار ہو گئے تھے۔ دس یا گیارہ ربیع الاوّل تک آتے آتے نقاہت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ آپ ﷺ خود سے چل بھی نہیں سکتے تھے۔ ہفتہ یا اتوار کا دن تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی امامت میں نمازِ ظہر کی جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔

بخاری و مسلم شریف میں یہ واقعہ موجود ہے کہ نبی ﷺ اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور اپنے چچیرے بھائی و داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کندھوں کا سہارا لیے مسجد میں تشریف لے آئے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹنے لگے، نبی ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ پیچھے مت ہٹو بلکہ نماز پڑھاتے رہو۔ پھر آپ ﷺ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک (بائیں) جانب بیٹھ کر نماز میں شامل ہو گئے۔ اب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی اقتدا کرتے تھے اور باقی سب لوگوں نے حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کی تکبیروں پر نماز ادا کی۔[1]

---

[1] صحیح البخاري (۱/ ۹۸۔ ۹۹، رقم الحدیث (٦٨٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤١٨) صحیح ابن حبان، رقم الحدیث (٢١١٦)

رحلت سے صرف ایک دن پہلے اتوار کے روز آپ ﷺ نے اپنے تمام غلام آزاد فرما دیے جن کی تعداد چالیس اور بعض روایات کے مطابق تریسٹھ تھی۔ گھر میں نقد صرف سات دینار موجود تھے۔ وہ غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیے اور آلاتِ حرب مسلمانوں کو ہبہ فرمائے۔[1]

سرورِ عالم ﷺ کے گھر کی مالی حالت یہ تھی کہ اس دن کی شام کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چراغ کے لیے تیل پڑوسن سے عاریتاً منگوایا اور بخاری شریف میں مذکور ہے کہ خود نبی ﷺ کی زِرہ (درع) وفات کے وقت بھی ایک یہودی کے پاس گروی پڑی تھی جس کے عوض گھر والوں کے لیے تیس صاع جو لیے تھے۔[2]

رات گزر گئی۔ ۱۲/ ربیع الاوّل بروز پیر کی نمازِ فجر کا وقت آیا۔ مسجدِ نبوی ﷺ میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت میں جماعت کھڑی ہو گئی۔ نبی ﷺ نے وہ پردہ اٹھایا جو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ اور مسجد میں فاصل تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے آپ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے با جماعت نماز پڑھنے کا منظر ملاحظہ فرماتے رہے جس سے رخِ انور پر بشاشت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اس وقت بھی جمالِ مصطفیٰ ﷺ کا یہ عالَم تھا کہ آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک ''ورقِ قرآن'' معلوم ہوتا تھا۔''[3]

آپ ﷺ کے چہرہ انور کو ورقِ قرآن قرار دینا کس قدر تعجب انگیز اور پاکیزہ ومقدس تشبیہ ہے۔ ورقِ قرآن پر طلائی کام ہوتا ہے ﷺ کے رخِ زیبا اور چہرۂ تاباں پر زردیٔ مرض چھائی تھی لہٰذا تابانی و رنگِ مرض کو طلا سے اور تقدس کو قرآن سے تشبیہ دے کر چہرۂ انور کو ''ورقِ قرآن'' گردانا ہے۔

جاں نثار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا شوقِ دیدار اور فرحت کی بیتابی سے یہ حال ہو گیا کہ جیسے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٣٢١٣) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٧٣٣) السلسلة الصحيحة (٦/ ٣٢١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٦٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢١٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦١٠) مسند أحمد، رقم الحديث (٥/ ١٣٧، رقم الحديث: ١٢٣٦٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٩) الفتح الرباني (٢١/ ٢٤ـ ٤٢)

رخِ مصطفیٰ ﷺ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ شاید آپ ﷺ کا نماز میں آنے کا ارادہ ہے۔ وہ جائے نمازِ امام سے پیچھے سرکنے لگے تو نبی ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اشارہ فرمایا کہ پیچھے مت ہٹو بلکہ نماز پڑھاتے رہو۔ یہی اشارہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی تسکین کا موجب بنا، پھر تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ نے پردہ گرادیا اور یہ نماز بھی حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ نے مکمل فرمائی۔[1]

اس کے بعد رسولِ رحمت ﷺ پر کسی دوسری نماز کا وقت ہی نہیں آیا۔ صحیح بخاری و مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''جب دن چڑھا تو نبی ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو بلایا اور ان کے کان میں سرگوشی کی تو وہ رونے لگیں۔ اور جلد ہی بعد پھر ان کے کان میں کچھ کہا تو وہ ہنسنے لگیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''میں نے حضرتِ زہراء رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی ﷺ نے ان سے رازداری کے ساتھ کیا فرمایا تھا؟ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نبی ﷺ کا بتایا ہوا یہ راز فاش نہیں کرنا چاہتی (اس طرح وقتی طور پر یہ بات آئی گئی ہوگئی) پھر رحلتِ مصطفیٰ ﷺ کے بعد میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے دوبارہ پوچھا کہ نبی ﷺ کی ان سرگوشیوں میں کیا راز تھا کہ پہلے آپ روئیں، اور پھر ہنسیں؟ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: لیجئے! اب میں وہ بھید آپ کو بتائے دیتی ہوں:

نبی ﷺ نے پہلی مرتبہ سرگوشی کے انداز میں مجھے بتایا تھا کہ میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ تم تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنا اور صبر سے کام لینا۔ فراق ووفات کی یہ باتیں سن کر میں رونے لگی۔ اور دوسری مرتبہ مجھے سیدۃ نسآء اہل الجنۃ یا سیدۃ نساء المومنین، [اور مسلم شریف کی ایک حدیث کے مطابق سیدۃ نساء ھذہ الامۃ] یعنی ''خاتونِ جنت'' یا ''خاتونِ امت'' ہونے کی بشارت دی۔''

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٩٨، ٩٩، رقم الحديث: ٦٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٩)

بخاری کی ہی ایک حدیث ہے کہ جب نبی ﷺ نے فرمایا کہ اسی تکلیف کے دوران میں میری روح قبض کر لی جائے گی تو میں رودی اور جب دوسری مرتبہ فرمایا:

«اِنِّیُ أَوَّلُ أَهْلِ بَیْتِهٖ اَتْبَعُهٗ فَضَحِکْتُ»

''میں اہلِ بیت میں سے سب سے پہلے آپ ﷺ سے جا ملوں گی تو میں ہنسنے لگی۔''

۞ اسی دن آپ ﷺ نے اپنی لختِ جگر کو ''سیدۃ نسآء العالمین، سیدۃ نساء المومنین، سیدۃ نساء ہذہ الأمۃ'' ہونے کی بشارت بھی دی۔[2]

۞ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو اور بشارت آخری دن نہیں، بلکہ آخری ہفتہ کا واقعہ ہے۔

۞ شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''مدارج النبوۃ'' میں نقل کیا ہے:

''اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلایا، دونوں کو پیار سے چوما اور پھر ان کے احترام کی وصیت فرمائی۔''

۞ علامہ زرقانی نے ابن سعد کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ ان کے بعد آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو بلایا اور انھیں نصیحتیں فرمائیں۔[3]

آخری لمحات اور سانحۂ ارتحال

۞ صحیح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ رحمت ﷺ نے ''رفیقِ اعلیٰ'' کی طرف انتقال سے تھوڑا قبل جو آخری وصیت فرمائی وہ یہ تھی:

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٦٢٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٥٠) السنن الکبریٰ للنسائي، رقم الحدیث (٨٣٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٦٢١) مشکاة المصابیح تحقیق الألباني، رقم الحدیث (١٧٣١، ١٧٣٢) شرح السنة للبغوي تحقیق الأرناؤوط (١٤/ ١٦٠) الفتح الرباني (٢٢/ ٩٣) رحمة للعالمین (١١/ ١٢٩)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢٨٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٥٠) رحمة للعالمین (١/ ١٢٩)

[3] زرقانی جلد ہشتم میں یہ بھی مذکور ہے کہ پھر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا، ان کا سر اپنی گود میں لے لیا اور ان کو بھی نصیحت فرمائی۔ (رحمة للعالمین: ١/ ٢٥٠) مگر س روایت کی سند میں دوراوی واقدی اور حزام بن عثمان ہیں جو دونوں ہی متروک ہیں۔ اس طرح اس ضعیف روایت کی اسنادی حیثیت تو مخدوش ہوگئی۔

«اَلصَّلَاۃَ، اَلصَّلَاۃَ، وَمَا مَلَکَتْ أَیْمَانُکُمْ»[1]

''نماز کا خاص خیال رکھنا، نماز کا خاص خیال رکھنا اور ان لوگوں (کنیزوں غلاموں) کا بھی خیال رکھنا جو تمھاری ملکیت میں ہیں۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''نبی ﷺ نے اس وصیت کو کئی بار دہرایا اور اس کے بعد ہی آپ ﷺ پر نزع کی حالت طاری ہوگئی۔ اس وقت سرورِ کائنات ﷺ کو سہارا دیتے ہوئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے پسِ پشت اس طرح بیٹھی تھیں کہ آپ ﷺ کا سرِ اقدس ان کے سینے پر تھا۔''[2]

بخاری شریف میں ہی ہے:

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری لمحات میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبد الرحمٰن (رضی اللہ عنہ) آگئے، ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی، نبی ﷺ نے مسواک پر نظر ڈالی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں سمجھ گئی کہ آپ ﷺ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا تو آپ ﷺ نے اثبات میں سرِ اقدس کو ہلایا۔ میں نے عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مسواک لے کر آپ ﷺ کو دی مگر نقاہت کی وجہ سے آپ ﷺ سے وہ چبائی نہیں جاری تھی۔ میں نے پوچھا: اگر ارشاد ہو اور پسند فرمائیں تو میں نرم کردوں؟ آپ ﷺ نے سر کے اشارے سے ہاں فرمایا۔ میں نے (اپنے دانتوں سے) مسواک چبائی اور نرم کر کے دی تو آپ ﷺ نے اچھی طرح مسواک کی۔ اس وقت پانی کا پیالہ آپ ﷺ کے پاس رکھا تھا۔ آپ ﷺ پانی میں ہاتھ ڈبوتے اور اپنے چہرۂ انور پر پھیر لیتے۔ ان آخری لمحات میں آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک کبھی سرخ ہو جاتا اور کبھی زرد پڑ جاتا۔ اور آپ ﷺ زبانِ مبارک سے بار بار یہ فرماتے:

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٦٣٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٥٦) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٧٠٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٠٠) مسند أحمد، رقم الحديث (١٢١٦٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٦١٧)

«لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ»[1]

''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے۔ بے شک یہ سکرات الموت (سب کے لیے) ہیں۔''

نبیِ رحمت ﷺ کا آخری وقت قریب آ گیا۔ جب مسواک فرما چکے تو آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک کو اٹھا کر انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ فرمایا۔ آپ ﷺ کی نگاہیں اوپر کو جم گئیں اور ہونٹ ہلنے لگے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کان لگا کر سنا تو آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے صادر ہونے والے آخری کلمات یہ تھے:

«مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ»

''(اے اللہ!) ان لوگوں کے ساتھ جن پر تو نے انعام کیا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ، اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما۔''

آخر میں تین مرتبہ فرمایا:

«وَاَلْحِقْنِيْ بِالرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى، اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى»[2]

''اے اللہ! مجھے رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ ملا دے۔''

اور ان الفاظ کے ساتھ ہی آپ ﷺ کا اٹھایا ہوا دستِ مبارک گر گیا اور جسمِ اطہر سے روحِ انور پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

اللہ تعالیٰ نے سچ ہی فرمایا ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ اَفَاْئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٣٤]

''اے نبی! ہم نے آپ سے پہلے (بھی) کسی فرد بشر کو دائمی زندگی عطا نہیں کی۔ اگر آپ فوت ہو گئے تو کیا دوسرے ہمیشہ رہیں گے؟''

عظیم مفسرین ومورخین امام طبری و ابن کثیر اور مقریزی و ابن سعد اور ماضی قریب کے محقق

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٦٤٠، رقم الحديث: ٤٤٤٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٦٤٠، ٢/ ٦٣٨ـ ٦٣٩، رقم الحديث: ٦٣٤٨ـ ٦٥٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤٤) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧١١٦)

سیرت نگار علامہ منصور پوری رحمہ اللہ جیسے علماء کے نزدیک نبیِ اکرم ﷺ نے بارہ ربیع الاوّل ۱۱ھ الموافق مئی ۶۳۲ء (اور صحیح بخاری شریف کے مطابق) بروز پیر کو چاشت کے وقت رحلت فرمائی۔ جبکہ آپ ﷺ کی عمرِ شریف قمری یا ہجری کیلنڈر کے حساب سے تریسٹھ سال اور چار دن تھی۔[1]

آپ ﷺ کی وفات کے دل فگار وجگر پاش واقعہ کا اثر اہلِ بیتِ رسول ﷺ کے علاوہ عام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی بڑا گہرا پڑا، جو صرف ایک ہی مثال سے محسوس کیا جا سکتا ہے:

''سیرت ابن ہشام'' (۴/۲۲۴) میں نقل کرتے ہیں کہ حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ (جیسے شیر دل اور صاحبِ جلال شخص) کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ نبی ﷺ فوت ہو گئے ہیں، بلکہ سراسیمگی کے عالَم میں فرمانے لگے کہ آپ ﷺ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح چالیس دن کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس گئے ہیں جیسے وہ تورات لینے کے لیے طورِ سیناء پر گئے تھے۔ آپ ﷺ واپس آ جائیں گے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے ہیں، ان کی گردنیں مار دیں گے۔ اور کہا:

"لَا يَتَكَلَّمُ أَحَدٌ بِمَوْتِهٖ اِلَّا ضَرَبْتُهُ بِسَيْفِيْ هَذَا"[2]

''نبیِ اکرم ﷺ کی موت کے بارے میں کوئی نہ کہے ورنہ میں اس تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔''

آپ ﷺ کی وفات کے صدمے کا اثر دیکھیں کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسا مدبر انسان ہوش کھو بیٹھا۔ بخاری شریف وغیرہ میں مذکور ہے کہ اتنے میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوئے، آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے کپڑا ہٹایا۔ جبینِ اقدس کو بوسہ دیا، آنسو بہائے اور فرمایا:

«بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ، لَا يَجْمَعُ اللّٰهُ عَلَيْكَ مَوْتَتَيْنِ، اَمَّا الْمَوْتَةُ الَّتِيْ كُتِبَتْ عَلَيْكَ فَقَدْ مُتَّهَا»[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٨٧) طبرى (١/ ٥٤٤) الفصول في اختصار سيرت الرسول لابن كثير (ص: ١٩٦) امتا ع الاسماع للمقريزي (١/ ٥٤٨) طبقات ابن سعد (١/ ٥٤٤) رحمة للعالمين (١/ ٢٥١)

[2] سنن الكبرىٰ للنسائي (٧٠٨١) و صححه البوصيرى في الزوائد (٢/ ٥٣٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤١۔ ٤٤٥٢) الفتح الرباني (٢١ / ٢٥٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٤٠۔ ١٨٤١) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٣٠٣٠۔ ٦٦٢٠) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٨٦٣)

''میرے ماں، باپ آپ (ﷺ) پر فدا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر دو موتیں وارد نہیں کرے گا۔ یہی ایک موت تھی جو آپ ﷺ پر لکھی ہوئی تھی اور آ گئی ہے۔''

نبیِ مکرّم سرورِ عالم ﷺ کے جانکاہ مرض پر آپ ﷺ کی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے کہا: ''وَاكَرْبَ أَبَاهُ'' ''ہائے میرے بابا کی تکلیف۔''

نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی لختِ جگر کے جواب میں فرمایا:

《لَيْسَ عَلَىٰ أَبِيْكِ كَرْبٌ بَعْدَ الْيَوْمِ》[1]

''آج کے بعد تیرے بابا کو کوئی تکلیف نہیں رہے گی۔''

''يَا اَبَتَاهُ! اَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ''

''پیارے بابا ﷺ نے دعوتِ حق کو قبول فرما لیا۔''

''يَا اَبَتَاهُ! مَنْ جَنَّةِ الْفِرْدَوْسَ مَاْوَاهُ''

''والدِ گرامی نے فردوسِ بریں میں نزول فرما لیا۔''

''يَا اَبَتَاهُ اِلَى الجِبْرِيْلَ نَنْعَاهُ''

''ہم اپنے والدِ گرامی کی تعزیت جبرائیل علیہ السلام سے کریں گے۔''

آگے فرمایا:

''یا الٰہی! روحِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو روحِ محمد ﷺ کے پاس پہنچا دے۔ یا الٰہی! مجھے دیدارِ رسول ﷺ سے مسرور کر دے۔ یا الٰہی! اس مصیبت کے ثواب سے تو مجھے بے نصیب نہ رکھ اور بروزِ محشر مجھے شفاعتِ مصطفیٰ (ﷺ) سے محروم نہ فرما۔''

زوجۂ رسول ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سرورِ کونین ﷺ کی وفات کے دلفگار موقع پر کہا:

''صد افسوس! وہ نبی ﷺ جس نے فقر کو غنا پر، اور مسکینی کو تونگری پر ترجیح دی۔

صد افسوس! وہ نبی ﷺ دین پرور، جوامت کی فکر میں کبھی پوری رات آرام سے نہ سویا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣٠) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٦٢٢) مسند أحمد، رقم الحديث (١٢٤٣٤) مختصر الشمائل للألباني (٣٣٤)

جس نے ہمیشہ استقامت واستقلال سے نفس کے ساتھ محاربہ ومقابلہ کیا۔
جس نے منہیات کو لمحہ بھر بھی نگاہِ التفات سے نہ دیکھا۔
جس نے بِر واحسان کے دروازے اربابِ فقر واحتیاج پر کبھی بند نہ کیے۔
جس کے ضمیرِ منیر کے دامن پر دشمنوں کی تکلیفوں اور ایذاؤں کا ذرہ بھر بھی غبار نہ بیٹھا۔
صد حیف! وہ کہ جس کے موتیوں جیسے دانت پتھر سے توڑے گئے۔
جس کے رخِ انور کو زخمی کیا گیا۔
آج وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔"[1]

وفاتِ مصطفیٰ ﷺ

غسل اور تکفین وتدفین:

رسولِ رحمت ﷺ کی وفات کے صدمے کی وجہ سے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سراسیمگی، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی وفات کا یقین نہ آنے کا واقعہ جو ہم نے ذکر کیا ہے، اِسی کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باتیں سنیں، ان کی حالت دیکھی، تو فرمایا: "عمر رضی اللہ عنہ! بیٹھ جاؤ۔" مگر وہ غم وکرب سے اس قدر مغلوب تھے کہ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے سامنے پا کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ان کی طرف لپک آئے۔ تب انھوں (صدیق رضی اللہ عنہ) نے وفاتِ مصطفیٰ ﷺ کے اعلان کا خطبہ ارشاد فرمایا جو بخاری شریف میں یوں مذکور ہے کہ حمد وثنا کے بعد فرمایا:

"اَلَا مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ"

"تم میں سے جو شخص حضرت محمد ﷺ کی عبادت کیا کرتا تھا (وہ سمجھ لے) وہ تو وفات پا گئے ہیں اور جو کوئی اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا، اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے، اسے ہرگز موت نہیں آئے گی۔"

---

[1] مدارج النبوة بحواله رحمة للعالمين (١/ ٢٥١)

اس کے بعد سورت آل عمران کی آیت (۱۴۴) تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾

''محمد بھی تو ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی کتنے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو کوئی الٹا پھرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گزار بن کر رہیں گے، انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔''

بخاری شریف میں ہی حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! جب میں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ آیت تلاوت کرتے سنا تو میری ٹانگوں میں سکت نہ رہی، میرے پاؤں میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو گئے اور مجھے یقین آ گیا کہ نبی ﷺ وفات پا گئے ہیں۔''[1]

الغرض بارہ ربیع الاول کو خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا غم سے نڈھال ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اشکبار ہیں، حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ سراسیمہ و پریشاں بلکہ سرگرداں ہیں، اہلِ بیت رضی اللہ عنہم پر مصیبتوں کا پہاڑ آ گرا، ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بحرِ غم میں ڈوبی ہوئی ہیں، صحابۂ رسول ﷺ کا یہ عالَم ہے کہ مدینے کی گلیوں میں کہرام مچا ہوا ہے، ایک وہ لوگ تھے، اور ان کی یہ حالت!

اور دوسرا آج کا یہ ''عاشقِ رسول'' و فدائے مصطفیٰ ﷺ ہے کہ اسی بارہ ربیع الاول یا ''بارہ وفات'' کو جشن مناتا ہے۔ خدارا کچھ تو عقل و فکر سے کام لیں۔

حیات و ممات؟

یاد رہے کہ امتِ اسلامیہ میں سب سے پہلا اختلاف یہی رونما ہوا تھا کہ نبی ﷺ فوت ہو گئے

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٦٤٠۔ ٦٤١: ١٢٤١۔ ١٢٤٢، ٣٦٦٧، ٤٤٥٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٦٢٠) شرح السنة للبغوي (٥/ ٣٢٣)

ہیں یا زندہ ہیں؟ اور قرآنِ پاک سے استدلال کرتے ہوئے حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ نے واضح کر دیا کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے ہیں جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ نے تسلیم کر لیا تھا۔ اسی طرح سب سے پہلے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا جس مسئلے پر اجماع و اتفاق ہوا وہ یہی تھا کہ نبی ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ اس اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے باوجود اگر کوئی شخص آج یہ کہے کہ نبی ﷺ نے وفات نہیں پائی بلکہ آپ ﷺ زندہ اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں تو ایسا شخص گویا قرآن کی آیات کا انکار کرتا ہے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآن فہمی بلکہ ان کی عقل و دانش پر بدظنی کا ارتکاب کرتا ہے۔

الغرض پیر کے روز آپ ﷺ نے وفات پائی مگر آپ ﷺ کی تجہیز و تکفین کا کام اگلے دن منگل کو شروع ہوا۔ اس تاخیر کی متعدد وجوہات ہیں مثلاً:

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس ناگزیر واقعہ پر عدمِ یقین۔
- حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کا خطاب اور حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ سمیت تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس امرِ حق پر یقین۔
- ثقیفہ بنی ساعدہ میں امرِ خلافت کا واقعہ اور خلیفۂ بلافصل حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعتِ عام، اور غروبِ آفتاب سے پہلے تجہیز و تکفین کے لیے وقت کا ناکافی ہونا وغیرہ۔

لہٰذا منگل کے روز آپ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا۔ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے پردہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غسل دیا۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہما بھی اس موقع پر موجود تھے۔ بلکہ بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے بھی پردہ کیا۔ غسل دینے کے بعد آپ ﷺ کو تین سفید سوتی کپڑے کی چادروں میں کفن دیا گیا۔ بخاری و مسلم شریف میں ہے کہ ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا۔[1]

غسل اور کفن سے فارغ ہوئے تو سوال پیدا ہوا کہ آپ ﷺ کو دفن کہاں کیا جائے؟ تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٩٦) سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٦٩) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٨٦٩)

«لَنْ يُّقْبَرَ نَبِيٌّ اِلَّا حَيْثُ يَمُوْتُ»[1]

''کوئی نبی جہاں بھی فوت ہوا اسے وہیں دفن کیا جاتا ہے۔''

لہٰذا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں آپ ﷺ کے بسترِ مرگ کے مقام پر ہی قبر کھودنا تجویز ہوا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے لحد والی قبر کھودی۔ جنازہ تیار ہو گیا جو حجرہ کے اندر ہی رکھا تھا۔ لہٰذا پہلے گھر والوں اور اہلِ خاندان نے اور پھر مہاجرین وانصار مردوں، عورتوں اور بچوں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ میں امام کوئی نہ تھا۔ حجرہ کی تنگ دامانی کی وجہ سے دس دس شخص اندر جاتے اور نماز پڑھ کر نکل آتے۔ یہ سلسلہ لگاتار شب و روز جاری رہا۔ اس لیے تدفینِ مبارک منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو یعنی رحلت سے تقریباً بتیس گھنٹے بعد عمل میں آئی۔[2]

سنن ابو داود میں ہے کہ آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کو حضرت علی، فضل بن عباس، اسامہ بن زید اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم نے قبرِ شریف میں اتارا تھا۔[3]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

قارئینِ کرام! رسولِ رحمت ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا یہ ایک انتہائی مختصر سا خاکہ تھا جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے، ورنہ بقولِ شاعر ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

---

[1] یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠١٨) سنن ابن ما جه، رقم الحديث (١٦٢٨) مسند أحمد (١/ ٣٥: ٢٧) وقال الأرناؤوط: قوى بطُرقه، أحمد شاكر و ضعفه حديث (٢٧) و قواه الأرناؤوط، یہ ''أبي يعلىٰ'' اور ''البداية والنهاية'' وغیرہ میں بھی موجود ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الفتح الرباني مع بلوغ الأماني (٢١/ ٢٥٥۔ ٢٥٦)

[2] رحمة لّلعالمين (١/ ٢٥٣)

[3] مرض الموت، امرِ خلافت، غسل اور تکفین و تدفینِ مصطفیٰ ﷺ کی تفصیلات کے لیے بخاری و مسلم باب مرض النبی ﷺ اور وفات النبی ﷺ وغیرہ، اور ''البداية والنهاية'' (٥/ ٢٢٣تا ٢٧٢) تفسير الطبري (١/ ٥١٥ تا آخر كتاب، ١/ ٥٤٤) طبقات ابن سعد (١/ ٥٢٣۔ ٥٢٤) الفتح الرباني (٢١/ ٢٢٢ تا ٢٦٩) ابن هشام (٤/ ٢١٢، ٢٣٦) ملاحظہ فرمائیں۔

حصہ 2

سیرت امام الانبیاء ﷺ تذکارِ صحابہ و مناقبِ اہل بیت رضی اللہ عنہم کے حوالے سے

کسی شخصیت کی سیرت کے صحیح خد و خال جاننے میں مدد دینے والی ایک چیز یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے دوست و احباب اور اہل خانہ کے حالات بھی معلوم ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی اس اعتبار سے بھی نہایت بلند معیار والی ہے جس کا بہترین ثبوت عنوان بالا کے تحت آپ کے خلفاء و صحابہ اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے مختصر فضائل و مناقب سے مل جائے گا۔

باب 1

سیرت امام الانبیاء ﷺ

تذکارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے تناظر میں

مقامِ صحابیت وشانِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور سبّ وشتم پر وعیدِ شدید

جس ہجرت نے تاریخِ اسلام کا دھارا موڑ کر رکھ دیا، اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا کیا قربانیاں دیں؟ ان کی تفصیلات بڑی ہی ایمان افروز ہیں مگر کس کس کا کیا کیا واقعہ ذِکر کریں۔ اُن انسانی فرشتوں نے جب "لا اِلٰہَ الَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رّسُوْلُ اللّٰہِ" پڑھا تو پھر اپنی دولت وجائیداد اور احباب واولاد تو کیا، اپنی جانیں بھی نبی ﷺ کے قدموں پر نچھاور کردیں۔ وہ آپ ﷺ کے اشارۂ اَبرُو پر اپنا سب کچھ لٹانے پر تیار ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی انہی قربانیوں، یادِ الٰہی میں شب بیداریوں، اطاعتِ الٰہی اور اتباع وحبِّ رسول ﷺ کی بدولت ہی بلند درجات پر فائز ہوئے۔

ہم مجموعی طور پر مقامِ صحابیت اور شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں کچھ آیات اور احادیثِ رسول ﷺ پیش کررہے ہیں۔ چنانچہ ہر وہ شخص جس نے ایمان کی حالت میں نبیِ اکرم ﷺ کا دیدار کیا اور ایمان پر ہی اس کا خاتمہ بھی ہوا، ایسے سعادت مند انسان کو 'صحابی' کہا جاتا ہے۔ یہ شرفِ صحابیت اتنا بلند مقام ہے کہ قرآن وسنت میں اس کی بہت ہی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ سورۃ التوبہ (آیت: ۱۰۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾

''مہاجرین وانصار (صحابہ رضی اللہ عنہم) میں سے سب سے پہلے (اسلام کی طرف) سبقت کرنے والے، اور وہ لوگ جو خلوص کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ اور (اللہ تعالیٰ نے) ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور

یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔''

سورۃ الفتح کا کثیر حصہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہے۔ پہلی اور دوسری آیت میں نبی ﷺ کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴾

''ہم نے آپ کو فتحِ مبین عطا فرمائی تا کہ اللہ (تعالیٰ) آپ کے پہلے اور پچھلے تمام گناہوں کو بخش دے اور آپ پر اپنی نعمت کو مکمل کر دے۔ اور صراطِ مستقیم کی ہدایت سے نوازے۔''

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''جب نبی ﷺ پر اس آیت کا نزول ہوا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج رات مجھ پر وہ آیت نازل ہوئی ہے جو میرے لیے زمین کی تمام دولت سے بھی زیادہ محبوب و عزیز ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت: ﴿ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ... الخ﴾ صحابہ رضی اللہ عنہم کو سنائی تو آپ ﷺ کو انھوں نے مبارکیں دیں اور ساتھ ہی پوچھا کہ یہ تو آپ کے لیے ہے، ہمارے لیے کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح (آیت: ۵) نازل کر کے فرمایا:

﴿ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عِندَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا ﴾

''تا کہ اللہ تعالیٰ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کے گناہوں کو ختم کرے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم کامیابی ہے۔''[1]

اور جب ذو القعدہ ٦ھ میں مقامِ حدیبیہ پر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ قریشِ مکہ نے نبی ﷺ کے قاصد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا ہے تو ان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے نبی ﷺ نے اپنے ساتھ

[1] مختصر تفسیر ابن کثیر للرفاعي (٤/ ٦٩) سورۃ الفتح کی آیت (۱،۲) نبی ﷺ کے بارے میں اور آیت (۴، ۵) صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہے۔

آنے والے چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لی۔ اس بیعت میں شرکت کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح (آیت: ۱۸) میں فرمایا:

﴿ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴾

''(اے پیغمبر) اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے راضی ہو چکا ہے جب وہ (کیکر یا بیری کے) درخت کے تلے (حدیبیہ میں) تجھ سے بیعت کر رہے تھے اللہ تعالیٰ نے جان لیا جو (اخلاص) ان کے دلوں میں تھا تو ان (کے دلوں) پر تسلی اتاری اور ایک نزدیک والی فتح ان کو انعام میں دی۔''

اسی سورت (آیات: ۱۹، ۲۰) میں بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکرِ جمیل ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَیْدِیَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَیَهْدِیَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴾

''(یعنی خیبر کی فتح) اور بہت سی غنیمتیں جو وہ حاصل کریں گے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔ (مسلمانوں) اللہ تم کو بہت سی غنیمتیں دینے کا وعدہ فرماتا ہے جن کو تم حاصل کرو گے سردست تم کو یہ (حدیبیہ کی) (یا خیبر کی فتح) دلا دی اور (ادھر مکہ کے کافر) لوگوں کا ہاتھ تم سے روک دیا (یہ سب اس لیے کہ تم خدا کا شکر کرو) اور اس لیے کہ یہ واقعہ مسلمانوں کے واسطے ایک نشانی ہو جائے اور (تا کہ) وہ تمھیں سیدھی راہ چلائے۔''

اسی بیعتِ رضوان میں شرکت کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں صحیح ابن حبان، ابو داود و ترمذی اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا یَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ بَایَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ»[1]

[1] الفتح الرباني (۲۱/ ۱۰۸) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٦٥٣)، تخریج المسند (١٤٧٧٨) و صححه الأرناؤوط. صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٨٦٠) صحیح ابن حبان، رقم الحدیث (٤٨٠٢)

’’ان صحابہ (رضی اللہ عنہم) میں سے کوئی ایک شخص بھی نارِ جہنم میں (ہرگز) داخل نہ ہوگا جنھوں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی۔‘‘

اور سورۃ الفتح کی آخری آیت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الفتح: ٢٩]

’’اللہ کے رسول اور آپ کے صحابہ کفار کے لیے سخت اور آپس میں بڑے نرم اور مہربان ہیں۔ آپ انھیں رکوع وسجود کی حالت میں دیکھتے ہیں، جس کے ذریعے وہ اللہ کا فضل اور رضا چاہتے ہیں، (سجدوں کی) نشانیاں ان کے چہروں پر ہیں۔ ان کے یہ اوصاف تورات اور انجیل میں مذکور ہیں۔ ان کی مثال اس کھیتی کی طرح ہے جس نے پہلے انگوری نکالی پھر مضبوط ہوئی اور اپنی بالیوں پر سیدھی کھڑی ہوگئی، جو کسان کو تو بھلی لگتی ہے، مگر کفار اس کی وجہ سے جلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کے ساتھ مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔‘‘

اگر صرف انہی آیات پر غور کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اتنے بلند مرتبے کے سعادت مند اولیاء اللہ، صحابۂ رسول ﷺ کے ساتھ بُغض و کینہ رکھنا، انھیں بُرا بھلا کہنا اور لعن وطعن کرنا، کم از کم کسی مسلمان سے تو نہیں ہو سکتا جبکہ مزید برآں صحیح بخاری شریف کی ایک حدیثِ قدسی میں ارشادِ الٰہی ہے:

«مَنْ عَادَىٰ لِيْ وَلِيّاً فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ»[1]

’’جس شخص نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی، اس کے لیے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔‘‘

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٠٢)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑا ولی اور کون ہوسکتا ہے؟ صحیح بخاری و مسلم شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ أَنْفَقَ أَحَدُكُمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَباً مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَ لَا نَصِيْفَهٗ»[1]

''میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالیاں مت دو۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے اگر کوئی شخص اُحد پہاڑ جتنا سونا بھی راہِ للہ خرچ کرے تو ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک مٹھی دانے صدقہ کرنے بلکہ اس سے آدھے ثواب کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''

شرح السنہ بغوی، تاریخ بغداد خطیب، حلیہ الاولیاء اور طبرانی کبیر میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ سَبَّ أَصْحَابِيْ، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ»[2]

''جس (شخص) نے میرے صحابہ کو گالیاں دیں اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔''

ترمذی شریف اور مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے:

«اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ، لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضاً مِنْ بَعْدِيْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ، وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ»[3]

''اللہ سے ڈرو اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو میرے بعد (لعن وطعن کا) نشانہ مت بناؤ، (اور فرمایا:) جس نے ان کے ساتھ محبت رکھی، اس نے میرے ساتھ محبت رکھی۔ اور جس نے ان کے ساتھ بغض رکھا، اس نے میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان کے ساتھ بغض رکھا۔''

تو گویا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بغض یا محبت، نبی ﷺ کے ساتھ بغض و محبت کی علامت ہے۔ نیز اسی حدیث میں ہے:

---

[1] رواه الشيخان، صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠) و الأربعه و أحمد في مسنده، الفتح الرباني (٢٢/ ١٦٩ـ ٧٠) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٤)

[2] صحيح الجامع الصغير و زيادته، الباني (٦٢٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٤٠)

[3] ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٦٢) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٠٥٦٨) شعب الإيمان للبيهقي (٢/ ٦٥٧) و قال: له شواهد، و السلسلة الضعفية، رقم الحديث (٢٩٠١)

«مَنْ اٰذَاهُمْ فَقَد اٰذَانِیْ وَمَنْ اٰذَانِیْ فَقَدْ اٰذَی اللّٰهَ، وَمَنْ اٰذَی اللّٰهَ اَوْشَكَ اَنَ یَّاْخُذَهٗ»[1]

''جس نے (میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو) اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی، اور جس نے مجھے اذیت پہنچائی اس نے اللہ کو اذیت پہنچائی۔ اور جس نے اللہ کو اذیت پہنچائی، تو اللہ اسے ضرور پکڑے گا۔''

مذکورۃ الصدر آیاتِ قرآنیہ اور ان احادیثِ نبویہ کے پیشِ نظر اہلِ علم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو گالی دینا اور لعن طعن کرنا کفر قرار دیا ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''الصارم المسلول'' میں نقل کیا ہے:

''فقہائے کوفہ نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو گالی دینے والے کو قتل کرنے اور رافضہ (شیعہ) کو کافر قرار دینے کا قطعی فتویٰ دیا ہے۔''[2]

محمد بن یوسف فریابی سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گالی دینے والے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

''وہ کافر ہے، اس کا جنازہ نہیں پڑھا یا جائے گا۔ نہ ہاتھ لگا یا جائے گا۔ بلکہ اسے کسی لکڑی کے ذریعے گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا جائے گا۔''[3]

قاضی ابویعلیٰ نے کہا ہے:

''فقہاء کے نزدیک جو شخص حلال سمجھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دے، وہ کافر ہے، اور جو حلال تو نہ سمجھے مگر گالی دے وہ فاسق ہے۔''[3]

اپنا فیصلہ دیتے ہوئے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''جو شخص علی رضی اللہ عنہ کو خدا یا نبی سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام غلطی سے وحی

---

[1] الفتح الرباني (٣٢/ ١٦٩) و حواله جاتِ سابقه.
[2] بحواله تطهير المجتمعات (ص: ٢٧٤_ ٢٧٥)
[3] بحواله سابقه.
[4] أيضاً.

ورسالت نبی ﷺ کو دے گئے تھے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دے، وہ کافر ہے۔ اور اسے کافر کہنے میں توقف کرنے والا بھی کافر ہے۔ اور جو شخص قرآنِ کریم کو ناقص قرار دے یا باطنی تاویلات کا زعم رکھے، جیسا کہ قرامطہ، باطنیہ اور تناسخیہ کا خیال ہے تو وہ بھی کافر ہے۔ جو شخص صحابہ رضی اللہ عنہم پر بخل، بزدلی، کم علمی اور عدمِ زہد کا الزام لگائے وہ کافر تو قرار نہیں دیا جائے گا مگر وہ سزاوارِ تعزیر ہے۔ مطلق لعن طعن کرنے والوں میں سے جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد دس پندرہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوا باقی سب مرتد یا فاسق ہو گئے تھے تو وہ بھی کافر ہے اور ان کے کفر میں شک کرنے والا بھی کافر ہے۔ الغرض گالی دینے والوں میں سے کچھ صاف کافر ہیں۔ بعض کے کفر میں تردد کیا گیا ہے۔ اور بعض پر کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔''[1]

مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے یہی شرف کیا کم ہے کہ انھوں نے حالتِ ایمان واسلام میں نبیِ آخر الزمان ﷺ کے رخِ انور کو دیکھنے کی سعادت حاصل کی۔ وہ چہرۂ انور و رخِ زیبا کہ جس کا ایمان کی حالت میں دیکھ لینا اخری فوز وفلاح اور نارِ جہنم سے نجات کا ضامن ہے، بلکہ اس چہرۂ مبارک کی زیارت کا اثر تو یہاں تک ہے کہ جو شخص کسی صحابی کا چہرہ دیکھ لے (جس نے نبی ﷺ کا چہرۂ انور بحالتِ ایمان دیکھا ہو) اس کی بھی آگ سے نجات ہوگئی، جیسا کہ ترمذی شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تَمُسُّ النَّارُ مُسْلِماً رَاٰنِيْ اَوْ رَاٰى مَنْ رَاٰنِيْ»[2]

''اس مسلمان کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا یا اسے دیکھا جس نے مجھے دیکھا۔''

بخاری ومسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

---

[1] الصارم المسلول بحواله تطهير المجتمعات (ص: ٢٧٤۔ ٢٧٥) مختصراً.

[2] ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٥٨) و ضعّفه، ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦٢٧٧) و ضعّفه، مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٥۔ ١٦٩٦) و حسّنه، الفتاوىٰ الحديثية للوادعي (٢/ ٢٣٠) و حسّنه.

''لوگوں پر وہ زمانہ بھی آئے گا جب مسلمانوں کی ایک جماعت (کسی قوم پر) حملہ آور ہو گی۔ وہ کہیں گے: کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے نبی ﷺ کو دیکھا ہو! وہ کہیں گے ہاں! تو انھیں فتح حاصل ہو جائے گی۔ پھر وہ دور آئے گا کہ غازی جماعت سے پوچھا جائے گا: کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے کسی صحابیِ رسول ﷺ کو دیکھا ہو! وہ کہیں گے ہاں! تو انھیں بھی فتح حاصل ہو جائے گی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ غازیوں سے پوچھا جائے گا: کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے کسی تابعی (جس نے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہو) کو دیکھا ہو؟ جب وہ کہیں گے: ہاں تو انھیں بھی فتح مل جائے گی۔''[1]

مسلم شریف میں تو یہاں تک ہے:

''چوتھی جماعت سے پوچھا جائے گا: کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے تبع تابعین (جنھوں نے تابعین کو دیکھا ہو) میں سے کسی کو دیکھا ہو تو اس جماعت میں ایسا ایک آدمی مل جائے گا اور انھیں اس آدمی کی وجہ سے فتح حاصل ہو جائے گا۔''[2]

قدسی نفوس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«خَيْرُ اُمَّتِيْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ»[3]

''میری امت کے بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ (صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم) ہیں۔ پھر وہ لوگ جو ان کے بعد والے (تابعین رحمہ اللہ) ہیں۔ پھر وہ لوگ جو ان کے بعد والے (تبع تابعین رحمہم اللہ) ہیں۔''

ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و مسند احمد اور مستدرک حاکم میں اسی مفہوم کی ایک حدیث ہے جس کے ابتدائی کلمات میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَكْرِمُوْا اَصْحَابِيْ فَاِنَّهُمْ خِيَارُكُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٤٩) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٥)

يَظْهَرُ الْكَذِبُ ‌»[1]

''میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا احترام و اکرام کیا کرو، کیوں کہ وہ تم سب سے بہتر لوگ ہیں۔ پھر وہ لوگ جو ان کے بعد والے (تابعین رحمہم اللہ) ہیں۔ پھر وہ لوگ جو ان کے بعد والے (تبع تابعین رحمہم اللہ) ہیں۔ ان کے بعد پھر جھوٹ عام ہو جائے گا۔''

مقام و مرتبۂ شہادت اور نوحہ خوانی

اسلامی سالِ نو اپنے ساتھ جو یادیں لاتا ہے انھیں میں سے تاریخِ اسلام کا ایک انتہائی اندوہناک سانحہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ بھی ہے۔ یہاں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں شہادت کے مقام و مرتبے کی وضاحت قرآن و سنت کی روشنی میں کر دی جائے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کے ایک دو نہیں بکثرت مقامات پر جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت و عظمت اور مقام و مرتبۂ شہادت کی رفعت و منزلت بیان ہوئی ہے۔ آپ مترجم قرآن پاک اٹھائیں اور زیادہ نہیں تو کم از کم یہ مقامات پڑھ لیں:

- سورۃ البقرہ (آیات: ۱۵۴، ۱۹۰، ۲۱۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٥٤]

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردے مت کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں۔''

- ﴿ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾ [البقرة: ١٩٠]

''اور جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کی راہ میں (دین کی حمایت میں نہ کہ دنیا کی غرض سے) ان سے لڑو اور زیادتی مت کرو، اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

- ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٥) نسائی في الكبرى (٥/ ٣٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٦٣) مشكاة المصابيح أيضاً وصححه الألباني.

اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۸]

''جولوگ ایمان لائے اور (اللہ کے لیے) اپنا ملک چھوڑا (ہجرت کی) اور خدا کی راہ میں لڑے انھی کو اللہ کی رحمت کی امید ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

❀ سورت آل عمران (آیات: ۱۵۷، ۱۶۹ تا ۱۷۷) میں فرمایا:

﴿ وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَحۡمَۃٌ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴾ [آل عمران: ۱۵۷]

''اور اللہ کی راہ میں اگر تم مارے جاؤ یا مرجاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت (جو تم کو ملے گی) اس سے بہتر ہے جو وہ (کافر) بٹورتے ہیں۔''

❀ ﴿ وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ وَیَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضۡلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَہُمُ الۡقَرۡحُ ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡہُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡہُمۡ فَزَادَہُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡہُمۡ سُوۡٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیۡطٰنُ یُخَوِّفُ اَوۡلِیَآءَہٗ ۪ فَلَا تَخَافُوۡہُمۡ وَخَافُوۡنِ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا یَحۡزُنۡکَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡکُفۡرِ ۚ اِنَّہُمۡ لَنۡ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیۡئًا ؕ یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَلَّا یَجۡعَلَ لَہُمۡ حَظًّا فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَلَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴾ [آل عمران: ۱۶۹ تا ۱۷۷]

''اور تو ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے، ہرگز مردہ گمان نہ کر، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں۔ اس پر بہت خوش ہیں جو انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دیا ہے اور ان کے بارے میں بھی بہت خوش ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ ان کے پیچھے سے نہیں ملے کہ ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ

اللہ کی طرف سے عظیم نعمت اور فضل پر بہت خوش ہوتے ہیں اور (اس بات پر) کہ بے
شک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا، اس کے
بعد کہ انھیں زخم پہنچا، ان میں سے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نیکی کی اور متقی بنے
بہت بڑا اجر ہے۔ وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے
(فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا
اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ تو وہ اللہ کی طرف سے عظیم
نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی برائی نہیں پہنچی اور انھوں نے اللہ کی رضا کی
پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے
ڈراتا ہے، تو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ اور وہ لوگ تجھے غمزدہ
نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، بے شک وہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچائیں
گے، اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے بہت بڑا
عذاب ہے۔ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کو ایمان کے بدلے خریدا، وہ ہرگز اللہ کو کچھ
نقصان نہیں پہنچائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘

نیز سورۃ النساء (آیات: ۷۴ تا ۹۵) میں فرمایا:

﴿ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝74 وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ
اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ڌ وَّاجْعَلْ لَّنَا
مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝75 اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ
فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝76 اَلَمْ
تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ
عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ
وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ

الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿77﴾ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ
الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ
اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ
هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿78﴾ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ
اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿79﴾
مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿80﴾
وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ
وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿81﴾
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿82﴾
وَاِذَا جَاۗءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى
اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿83﴾ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ ۭ
وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا
وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿84﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ
شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿85﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ
بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿86﴾ اَللّٰهُ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿87﴾
فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ
اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿88﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا
فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰي يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿89﴾
اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَاۗءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ
اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ

اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿90﴾
سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ
اُرْكِسُوْا فِيْهَا فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ
وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿91﴾ وَ مَا
كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ
عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ
وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿92﴾ وَ مَنْ يَّقْتُلْ
مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ
عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿93﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا
لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ
مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿94﴾ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ
وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ
بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

''پس لازم ہے کہ اللہ کے راستے میں وہ لوگ لڑیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچتے ہیں اور جو شخص اللہ کے راستے میں لڑے، پھر قتل کر دیا جائے، یا غالب آ جائے تو ہم جلد ہی اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔ اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مدد گار بنا۔ وہ لوگ جو ایمان

لائے وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا وہ باطل معبود کے راستے میں لڑتے ہیں۔ پس تم شیطان کے دوستوں سے لڑو، بے شک شیطان کی چال ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، پھر جب ان پر لڑنا لکھا گیا اچانک ان میں سے کچھ لوگ، لوگوں سے ڈرنے لگے، جیسے اللہ سے ڈرنا ہو، یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! تو نے ہم پر لڑنا کیوں لکھ دیا، تو نے ہمیں ایک قریب وقت تک مہلت کیوں نہ دی۔ کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے اور تم پر ایک دھاگے کے برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔ جو کوئی بھلائی تجھے پہنچے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کافی گواہ ہے۔ جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جس نے منہ موڑا تو ہم نے تجھے ان پر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ اور وہ کہتے ہیں اطاعت ہوگی، پھر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ رات کو اس کے خلاف مشورے کرتا ہے جو وہ کہہ رہا تھا اور اللہ لکھ رہا ہے جو وہ رات کو مشورے کرتے ہیں۔ پس ان سے منہ موڑ لے اور اللہ پر بھروسا کر اور اللہ کافی وکیل ہے۔ تو کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے، اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔ اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان

میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بہت تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔ پس اللہ کے راستے میں جنگ کر، تجھے تیری ذات کے سوا کسی کی تکلیف نہیں دی جاتی اور ایمان والوں کو رغبت دلا، اللہ قریب ہے کہ ان لوگوں کی لڑائی روک دے جنھوں نے کفر کیا اور اللہ بہت سخت لڑائی والا اور بہت سخت سزا دینے والا ہے۔ جو کوئی سفارش کرے گا، اچھی سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہوگا اور جو کوئی سفارش کرے گا، بری سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک بوجھ ہوگا اور اللہ ہمیشہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔ اور جب تمھیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم اس سے اچھی سلامتی کی دعا دو، یا جواب میں وہی کہہ دو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کا پورا حساب کرنے والا ہے۔ اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر صورت تمھیں قیامت کے دن کی طرف (لے جا کر) جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہوا کہ منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے، حالانکہ اللہ نے انھیں اس کی وجہ سے الٹا کر دیا جو انھوں نے کمایا، کیا تم چاہتے ہو کہ اس شخص کو راستے پر لے آؤ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر تو اس کے لیے کبھی کوئی راستہ نہ پائے گا۔ وہ چاہتے ہیں کاش کہ تم کفر کرو جیسے انھوں نے کفر کیا، پھر تم برابر ہو جاؤ، تو ان میں سے کسی طرح کے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کے راستے میں ہجرت کریں، پھر اگر وہ منہ پھیریں تو انھیں پکڑو اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور نہ ان سے کوئی دوست بناؤ اور نہ کوئی مددگار۔ مگر وہ لوگ جو ان لوگوں سے جا ملتے ہیں کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان عہد و پیمان ہے، یا وہ تمھارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل اس سے تنگ ہوں کہ وہ تم سے لڑیں، یا اپنی قوم سے لڑیں اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور انھیں تم پر مسلط کر دیتا، پھر یقیناً وہ تم سے لڑتے۔ تو اگر وہ تم سے الگ رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور تمھاری طرف صلح کا پیغام بھیجیں تو اللہ نے تمھارے لیے ان پر زیادتی کا کوئی راستہ نہیں

رکھا۔عنقریب تم کچھ اور لوگ پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں، وہ جب بھی فتنے کی طرف لوٹائے جاتے ہیں اس میں الٹا دیے جاتے ہیں،تو اگر وہ نہ تم سے الگ رہیں اور نہ صلح کا پیغام بھیجیں اور نہ اپنے ہاتھ روکیں تو انھیں پکڑو اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور یہی لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمھارے لیے واضح دلیل بنا دی ہے۔ اور کسی مومن کا کبھی یہ کام نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن گردن آزاد کرنا اور دیت دینا ہے، جو اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی ہو،مگر یہ کہ وہ صدقہ (کرتے ہوئے معاف) کر دیں۔ پھر اگر وہ اس قوم میں سے ہو جو تمھاری دشمن ہے اور وہ مومن ہو تو ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے، اور اگر اس قوم میں سے ہو کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان ہو تو اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی دیت ادا کرنا اور ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے، پھر جو نہ پائے تو پے در پے دو ماہ کے روزے رکھنا ہے۔ یہ بطور توبہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ ہمیشہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔ اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے اور اللہ اس پر غصے ہوگیا اور اس نے اس پر لعنت کی اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اللہ کے راستے میں سفر کرو تو خوب تحقیق کر لو اور جو تمھیں سلام پیش کرے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں، اس سے پہلے تم بھی ایسے ہی تھے تو اللہ نے تم پر احسان فرمایا۔ پس خوب تحقیق کر لو، بے شک اللہ ہمیشہ اس سے جو تم کرتے ہو، پورا باخبر ہے۔ ایمان والوں میں سے بیٹھ رہنے والے، جو کسی تکلیف والے نہیں اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے

جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت عطا فرمائی ہے۔''

- سورۃ الانفال (آیت: ۷۴) میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا (یعنی مہاجرین) اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی (یعنی انصار) یہی پکّے مسلمان ہیں ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ بخشش ہے (آخرت میں) اور عزت کی روزی (دنیا میں)۔''

- سورۃ التوبہ (آیات: ۲۰، ۴۱، ۱۱۱) میں فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ [التوبة: ۲۰]

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنی جان اور مال سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے نزدیک بڑا ہے (بہت بڑا) اور وہی لوگ (حشر میں) کامیاب ہوں گے۔''

- ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [التوبة: ٤١]

''(مسلمانو) ہلکے ہو یا بھاری نکل کھڑے ہو اور اللہ کی راہ میں اپنے جان اور مال سے جہا کرو یہ تمھارے لیے بہتر ہیں اگر تم علم رکھتے ہو۔''

- ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ؕ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ [التوبة: ۱۱۱]

''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے

بدلے کہ یقیناً ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنے اس سودے پر خوب خوش ہو جاؤ جو تم نے اس سے کیا ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

- سورۃ الحج (آیت: ۵۸) کی تلاوت کریں اور اس کا ترجمہ دیکھیں:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾

''اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں (اس کی رضا مندی کے لیے) ہجرت کی وطن چھوڑ پھر وہ (اسی ہجرت کے زمانے میں) میں مارے گئے یا (اپنی موت سے) مرگئے (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ ان کو اچھی روزی دیگا (بہشت کے میوے اور وہاں کا پانی) اور بے شک اللہ ہی سب روزی دینے والوں میں بہتر روزی دینے والا ہے۔''

کہیں ''انھیں رحمتِ الٰہی کے امید وار فرمایا۔'' اور کہیں ''رحمت و بخشش کو ان کا مقدر بتایا ہے۔'' اور کہیں فرمایا ہے: ''انھیں اللہ کی طرف سے رزق دیا جائے گا۔ وہ اللہ کے فضل واحسان اور نعمت وکرم پر خوش ہوں گے، انھیں کوئی غم یا خوف نہیں ہوگا، ان کے لیے اجرِ عظیم اور بلند درجات ہیں۔ انھیں ہمیشہ کے لیے رضائے الٰہی اور دائمی جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔''

ان قرآنی آیات کے علاوہ بے شمار احادیث میں بھی جہاد و مجاہدین اور شہادت و شہداء کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟''

''اے اللہ کے رسول ﷺ! سب سے افضل عمل کونسا ہے؟''

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« ...وَ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِهٖ »[1] ''...اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۲۸۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۵)

نسائی و مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ و غیرہ متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّ فِیُ الُجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ أَعَدَّهَا اللّٰهُ لِلُمُجَاهِدِیُنَ فِیُ سَبِیُلِ اللّٰهِ»[1]

''جنت میں ایک سو درجاتِ رفیعہ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فی سبیل اللہ جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔''

اسی حدیث میں آگے یہ بھی ہے:

''ہر درجے کے مابین اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان کے مابین ہے۔''

ایک اور حدیث میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ رسالت مآب ﷺ ہے:

«یَغُفِرُ اللّٰهُ لِلشَّهِیُدِ کُلَّ شَیءٍ اِلَّا الدَّیُنَ»[2]

''اللہ تعالیٰ قرض کے سوا شہید کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔''

بخاری شریف میں ہے کہ غزوۂ بدر کے دوران میں شہادت پانے والے ایک صحابی حضرت حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کی والدہ نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ میرا بیٹا حارثہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر کے دوران میں شہید ہوا تھا، اس کا انجام کیا ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے اسے خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا:

«اِنَّ ابُنَكَ أَصَابَ الُفِرُدَوُسَ الُأَعُلٰی»[3]

''تیرا بیٹا جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام کو پا گیا ہے۔''

بخاری شریف میں ایک طویل حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''مجھے دو آدمی اپنے ساتھ لے کر اوپر چڑھ گئے اور ایک ایسے گھر میں داخل کر دیا:

«لَمُ اَرَقَطُّ اُحُسَنَ مِنُهَا»

''میں نے اس سے بڑھ کر خوبصورت کوئی گھر کبھی دیکھا ہی نہیں۔''

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٣٢) الصحيح المسند للوادعي (١٠٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٢٦)

[2] السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٧٨) فتح الباري (١٥/ ٢٠٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٠٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٨٢٣٢)

اور انھوں نے مجھے بتایا:

"اَمَّا هٰذِهِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّهَدَآءِ"[1] "یہ گھر شہداء کے لیے تیار کیا گیا ہے۔"

شہداء کو اللہ تعالیٰ جنت میں بلند مقام اور قربِ خاص سے نوازے گا اور پوچھے گا: کیا تمھیں کسی اور نعمت کی تمنا ہے؟ وہ کہیں گے کہ اے اللہ! ہمیں جو نعمتیں میسّر ہیں ان سے بڑھ کر اور کیا طلب کریں؟ ہاں اگر ممکن ہو تو ہمیں پھر دنیا میں بھیج دے تا کہ ہم دوبارہ تیری راہ میں شہید ہوں۔[2]

شہید کے سوا ایسی تمنا دوسرا کوئی جنتی نہیں کرے گا۔ اور حدیث میں ہے کہ ان کی یہ تمنا صرف اس وجہ سے ہوگی کہ انھوں نے بوقتِ شہادت جو حلاوت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں جو کرم و شرف پایا ہوگا، اسی کے پیشِ نظر وہ دوبارہ شہادت کی خواہش کریں گے۔ نیز بخاری شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« مَا مِنْ مَكْلُوْمٍ يُكْلَمُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِلَّا جَآءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَكَلْمُهٗ يَدْمٰى اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالرِّيْحُ رِيْحُ الْمِسْكِ »[3]

"جہاد فی سبیل اللہ میں زخمی ہونے والا قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کے زخموں سے ایک ایسا رنگین مادہ بہ رہا ہوگا جس کا رنگ خون کا اور خوشبو کستوری کی ہوگی۔"

یہ تو شہید کا مقام و مرتبہ ہے، جبکہ موت شہید کی ہو یا عام مرگ، موت بہر حال موت ہی ہے جو پسماندگان اور عزیز و اقارب کے لیے صدمہ اور دکھ کا باعث بنتی ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ یہ زندگی خوشی و غم اور شادی و مرگ سے عبارت ہے۔ موت و حیات کا نظام کائنات کا ایک جزء ہے اور ہر ذی روح کی موت کا وقت مقرر ہے جس سے کسی کو مفرّ نہیں۔ برگزیدگانِ الٰہی پیغمبر ہوں، ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم یا دیگر اولیاء اللہ رحمہم اللہ ہوں، موت کا جام ہر کسی کے لیے مقرر ہے۔ دشمنانِ دین ہوں، اپنے آپ کو ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ کہلوانے والے ہوں، صاحبِ جبروت وسطوت ہوں، شاہ ہوں یا گدا، امیر ہوں یا فقیر، موت بہر حال سب کا مقدّر ہے۔ کیوں کہ سورت آل عمران (آیت: ۱۸۵)، سورۃ الانبیاء (آیت: ۳۵) اور سورۃ العنکبوت (آیت: ۵۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٩١) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٤٦٥٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (..........) صحيح مسلم، رقم الحديث (..........)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٣٣)

﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ ''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔''

اسی قانونِ الٰہی کے تحت جب کسی کو موت آجائے تو ایسے موقع پر فطرتی امر ہے کہ پسماندگان کو دکھ اور صدمہ پہنچے گا، مگر اس کے اظہار کی کہاں تک اور کس طرح گنجایش ہے؟ اس سلسلے میں بھی شریعتِ اسلامیہ میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ چنانچہ سورۃ البقرہ (آیت: ۱۵۵۔ ۱۵۷) میں اللہ تعالیٰ نے ایسے موقع پر صبر و ہمت سے کام لینے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾

''اور البتہ ہم تم کو کچھ ڈر کچھ بھوک کچھ مال کچھ جانوں کچھ پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیں جو مصیبت کے وقت یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہے اور یہی لوگ (آخرت میں) کامیابی پانے والے ہیں۔''

مصیبت آجائے، دل دکھوں سے بھر جائے اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑے تو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے رونا اور آنسو بہانا بھی جائز ہے۔ کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم میں ایسے کئی مواقع پر خود نبی رحمت ﷺ کا آنسو بہانا ثابت ہے۔ جیسا کہ بخاری و مسلم میں آپ ﷺ کا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ پر۔ بخاری و مسلم اور نسائی میں اپنی بیٹی کے ایک لختِ جگر پر، اور بخاری و مسلم اور ابو داود میں خود اپنے لختِ جگر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آنسو بہانا ثابت ہے۔[1]

بشرطیکہ رونے اور آنسو بہانے کے ساتھ زبان نہ چلائی جائے۔ مرنے والی کی صفات اور اس کی موت کی وجہ پیش آنے والے مصائب کا ذکر نہ چھیڑا جائے۔ کیوں کہ بخاری و مسلم میں

[1] رياض الصالحين مراجعه الأرناؤوط (ص: ٣٨٨۔ ٣٨٩)

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ بِدَمْعِ الْعَيْنِ وَلَا بِحُزْنِ الْقَلْبِ، وَلٰكِنْ يُعَذِّبُ بِهٰذَا اَوْ يَرْحَمُ (وَاَشَارَ اِلٰى لِسَانِهِ)»[1]

''اللہ تعالیٰ آنکھوں سے آنسو بہانے اور دل کے حزن وغم پر عذاب نہیں کرے گا۔ البتہ اس کے عذاب دینے یا رحم فرمانے کا تعلق اس سے ہے، اور یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔''

نوحہ خوانی اورسوگ و ماتم

اسلام میں مقام و مرتبۂ شہادت یا طبعی موت مرنے والوں کے پسماندگان کے صبر وہمت اور ایسے مواقع پر آنسو بہانے کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور آنسو بہانے کی اس شرط کا ذکر بھی ہو چکا ہے کہ اس کے ساتھ زبان سے بَین ونوحہ خوانی، واویلا، اور واہی تباہی جائز نہیں، کیوں کہ نوحہ خوانی آگے جانے والے کے ساتھ خیر خواہی نہیں، بلکہ نادانستہ دشمنی کے مترادف ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم اور ترمذی و نسائی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَلْمَيِّتُ يُعَذَّبُ فِيْ قَبْرِهٖ بِمَا نِيْحَ عَلَيْهِ»[2]

''میت کو اس کے پسماندگان کی نوحہ خوانی کے سبب قبر میں عذاب ہوتا ہے۔''

اس حدیث شریف کا مفہوم بظاہر سورۃ الانعام (آیت: ۱۶۴)، سورۃ الاسراء (آیت: ۱۵)، سورۃ الفاطر (آیت: ۱۸)، سورۃ الزمر (آیت: ۷) اور سورۃ النجم (آیت: ۳۸) کے معارض ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ ''اور کسی کے گناہ کا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا۔''

اہلِ علم نے اس تعارض کو دور کرنے کے لیے کئی آرا ذکر کی ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٤)

[2] رياض الصالحين (ص: ٦٣٣) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٧)

کہ آگے جانے والا اگر پسماندگان کو بَین ونوحہ کرنے کی وصیت کر کے جائے اور وہ اس پر عمل کر گزریں تو اسے ان کے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ اور بعض اہل علم نے اس حدیث میں مذکور لفظ ''عذاب'' کا مفہوم ''احساسِ الم'' بیان کیا ہے۔ جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کچھ بھی ہو، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ (صحیح احادیث میں) رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ پسماندگان کے بَین کرنے سے میت کو عذاب ہوتا ہے: ''فَسَمِعْنَا وَأَطَعْنَا'' ''پس ہم نے آپ ﷺ کا ارشاد سنا اور اطاعت کی۔'' اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں کہتے۔[1]

بعض لوگ اور خصوصاً خواتین غم کے موقعوں پر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہیں اور جائز رونے اور آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ ہی نوحہ خوانی بھی شروع کر دیتی ہیں کہ رونے کے ساتھ مرنے والے کی صفات اور اس کی موت سے پیش آمدہ مصائب کی گنتی شروع ہو جاتی ہے اور ایک راگ کے ساتھ بَین کیے جاتے ہیں۔ اس نوحہ خوانی سے نبی ﷺ نے سختی سے منع کیا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم اور نسائی میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«اَخَذَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عِنْدَ الْبَيْعَةِ اَنْ لَا نَنُوْحَ»[2]

''ہم سے بیعت لیتے وقت نبی ﷺ نے یہ عہد لیا تھا کہ ہم نوحہ خوانی نہیں کریں گی۔''

نیز صحیح مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« اِثْنَتَانِ فِيْ النَّاسِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ: اَلطَّعْنُ فِي النَّسَبِ وَالنِّيَاحَةُ عَلٰى الْمَيِّتِ»[3]

''لوگوں میں دو باتیں ایسی ہیں جن کا ارتکاب کفر ہے: کسی کے نسب میں طعن کرنا اور میت پر نوحہ خوانی کرنا۔''

جو لوگ کسی مرگ پر جوشِ غم میں ہوش کھو دیتے ہیں اور بَین و نوحہ کے ساتھ ساتھ سر کے

---

[1] الفتح الرباني (٧ / ١٢٦۔ ١٢٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٨٠) رياض الصالحين (ص: ٦٣٤)

[3] رياض الصالحين (ص: ٦٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧)

بالوں کو بکھیرنا اور نوچنا، رخساروں کو پیٹنا، سینہ کوبی وماتم کرنا اور کپڑے پھاڑنا شروع کر دیتے ہیں، ایسے افعال کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں صحیح بخاری ومسلم اور ترمذی ونسائی میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوٰى الْجَاهِلِيَّةِ» [1]

''جو اپنے رخساروں کو پیٹے، کپڑے پھاڑے اور زمانۂ جاہلیت کی طرح نوحہ خوانی کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

بخاری ومسلم اور ابو داود ونسائی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَرِيْءٌ مِّنَ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَّةِ» [2]

''بے شک رسول اللہ ﷺ نے بَین کرنے، سر کے بال بکھیرنے، اور مونڈنے اور کپڑے پھاڑنے والی عورتوں سے براءت کا اظہار فرمایا ہے۔''

سنن ابو داود میں ہے کہ نبی ﷺ نے خواتین سے یہ عہد لیا تھا:

«اَنْ لَّا نَخْمِشَ وَجْهاً وَلَا نَدْعُوْ وَيْلًا وَلَا نَشُقَّ جَيْباً وَلَا نَنْشُرَ شَعْراً» [3]

''(کہ) مصیبت میں نہ ہم منہ نوچیں گی، نہ واویلا کریں گی، نہ کپڑے پھاڑیں گی اور نہ بال بکھیریں گی۔''

عورتیں چونکہ مردوں کی نسبت کمزور طبع ہوتی ہیں اور ان سے ایسے امور کا صدور ممکن ہونے کی بنا پر آپ ﷺ نے ان سے یہ عہد لیے، اور اگر اس کے باوجود بھی کوئی عورت فرمانِ نبوی کی نافرمانی کرے تو ایسی عورت کے بارے میں صحیح مسلم، مسند احمد اور طبرانی کبیر میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« اَلنَّائِحَةُ اِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِنْ

[1] صحيح البخاري (٣/ ١٣٣، رقم الحديث: ١٢٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٩٩) سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٨٤) مسند أحمد، رقم الحديث (٤٣٦١) رياض الصالحين (ص: ٦٣٣)

[2] صحيح البخاري (٣/ ١٣١ـ ١٣٢) تعليقاً، رقم الحديث (١٢٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤)

[3] رياض الصالحين (ص: ٦٣٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٣١) طبراني الكبير (٢٥/ ١٨٤) سنن البيهقي، رقم الحديث (٧٣٧٢) و صححه الألباني في أحكام الجنائز (ص: ٤٣)

قَطِرَانٍ وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ》[1]

''نوحہ کرنے والی عورت اگر توبہ کیے بغیر مرگئی تو قیامت کے دن وہ اس حالت میں اٹھائی جائے گی کہ آتش گیر مادے (چقماق) کی قمیص پہنے ہوگی اور اسے خارش کی ذرع پہنائی جائے گی۔''

مسند احمد میں یہ الفاظ بھی ہیں:

《ثُمَّ يُعْلٰى عَلَيْهَا دِرْعٌ مِنْ لَهَبِ النَّارِ》[2]

''(کہ) پھر اس آتش گیر مادے کے اوپر آگ کے شعلے کی ذرع ہوگی۔''

یاد رہے کہ صرف بَین ونوحہ خوانی کرنا ہی نا جائز نہیں بلکہ اس کا (خوشی سے) سننا بھی درست نہیں ہے، کیوں کہ ابو داود، مسند احمد بیہقی، بزار اور طبرانی میں حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک ضعیف حدیث ہے:

《لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ النَّائِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ》[3]

''نبی ﷺ نے نوحہ خوانی کرنے، اور نوحہ سننے والی پر لعنت فرمائی ہے۔''

شریعتِ اسلامیہ ہر معاملے میں چونکہ اعتدال پسند ہے، اس میں نہ خوشی کے موقع پر حدِ اعتدال پھلانگنا جائز ہے اور نہ ہی مرگ کا سوگ منانے پر حدود اور پابندیاں توڑنا روا ہے۔ ایسے مواقع پر عورت کی طبیعت کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام نے اس کے لیے شوہر کے سوا کسی بھی عزیز کی مرگ کا صرف تین دن سوگ منانا جائز رکھا ہے۔ البتہ اگر کسی کے شوہر کی مرگ ہو جائے تو اس عورت کو چار ماہ اور دس دن تک سوگ منانے کی اجازت ہے۔ ان میں وہ نہ زیب وزینت کرے، نہ زیورات اور ریشمی کپڑے پہنے، اور نہ ہی خوشبو، مہندی اور سرمہ وغیرہ لگائے، کیوں کہ صحیح بخاری ومسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

《لَا تُحِدُّ الْمَرْأَةُ فَوْقَ ثَلَاثٍ اِلَّا عَلٰى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْراً وَلَا تَلْبَسُ

---

[1] رياض الصالحين (ص: ٦٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٣١٤٣) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٢٩٥٥) طبرانی الكبير، رقم الحديث (٣٤٢٥)

[2] رياض الصالحين (ص: ٦٣) الفتح الرباني (٧/ ١١٤۔ ١١٥) و حوالہ جاتِ سابقہ.

[3] الفتح الرباني (٧/ ١١٢۔ ١١٣) تفصیل کے لیے دیکھیں: تخريج صلاة الرسول ﷺ، رقم الحديث (٦٦٢) طبع سوم ١٩٩٧ء، إرواء الغليل (٣/ ٢٢٢) تاريخ كبير بخاري (١/ ٦٦) و قال الألباني عن حديث مثله: موضوع، في ضعيف الجامع، رقم الحديث (٤١٢٨)

ثَوْباً مَصْبُوْغاً اِلَّا ثَوْبَ عَصْبٍ، وَلَا تَكْتَحِلُ وَلَا تَمُسُّ طِيْباً اِلَّا اِذَا طَهُرَتْ، نُبْذَةٌ مِّنْ قُسْطٍ اَوْ اَظْفَارٍ »[1]

''کوئی عورت تین دن سے زیادہ سوگ نہ منائے سوائے شوہر کی وفات کے، اس پر وہ چار ماہ دس دن سوگ منا سکتی ہے۔ وہ رنگین کپڑے نہ پہنے سوائے یمنی چادروں کے، نہ وہ سرمہ لگائے اور نہ ہی خوشبو استعمال کرے، سوائے اس دن کے جس دن وہ غسلِ حیض سے فارغ ہو تو عود وغیرہ کے بخور (دھوئیں) کا استعمال کر سکتی ہے۔''

امام نووی رحمہ اللہ کے بقول یہ بھی کوئی خوشبو کی غرض سے نہیں بلکہ محض خون جاری رہنے سے پیدا ہونے والی بدبو کو زائل کرنے کی غرض سے جائز ہے۔

ابو داود ونسائی میں یہ الفاظ بھی ہیں:

« وَلَا تَخْتَضِبُ »[2] ''اور وہ مہندی وخضاب بھی نہ لگائے۔''

نسائی میں ارشادِ نبوی ﷺ کے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

« وَلَا تَمْتَشِطُ »[3] ''اور وہ کنگھی بھی نہ کرے۔''

جبکہ ابو داود، ابن حبان اور مسند احمد میں ((وَلَا الْحُلِيَّ)) کے الفاظ بھی ہیں کہ وہ زیورات بھی نہ پہنے۔[4]

یہ احکام صرف عورتوں کے ساتھ خاص ہیں اور وہ بھی عام عزیزوں کی نسبت صرف تین دن اور شوہر کے لیے چار ماہ دس دن تک۔ مردوں کے لیے ان امور میں سے کوئی ایک بھی ایک دن کے لیے بھی جائز نہیں، سوائے دل کے غم اور آنکھوں کے آنسوؤں کے۔

اس ارشادِ نبوی ﷺ کے پیشِ نظر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو چودہ سو سال پہلے کی موتِ شہادت پر سوگ منا رہے ہیں وہ تعلیماتِ اسلام کے سراسر منافی فعل کا ارتکاب کرتے ہیں جس کا کسی بھی طرح کوئی جواز نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٨) مسند أحمد، الفتح الرباني (٧/ ١٥٠، رقم الحديث: ٢٠٧٤٤)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٠٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٣٧، ٣٥٣٨)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٣٤)

[4] تخريج المسند (٢٦٥٨١) و صححه الأرناؤوط، صحيح أبي داود (٢٣٠٤) تخريج صحيح ابن حبان (٤٣٠٦)

خلاصۃ الکلام:

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو ایک نہیں، بیسیوں مقامات پر جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت و فضیلت اور مقامِ شہادت کی رفعت ومنزلت بیان فرمائی ہے۔ کہیں فرمایا:

''راہِ الٰہی میں جان دینے والوں کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر ان کی اس زندگانی کا تمھیں شعور نہیں۔''

کہیں انھیں ''رحمتِ الٰہی کے امیدوار'' اور کہیں ''رحمت وبخشش کو ان کا مقدّر'' بتایا ہے:

''انھیں اللہ کی طرف سے رزق دیا جائے گا۔ وہ اللہ کے فضل واحسان اور نعمت وکرم پر خوش ہوں گے، انھیں کوئی غم یا خوف نہیں ہوگا۔ ان کے لیے اجرِ عظیم اور بلند درجات ہیں۔ انھیں ہمیشہ کے لیے رضائے الٰہی اور دائمی جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔''

ایسے ہی نبی مکرم ﷺ کی بے شمار احادیث میں جہاد ومجاہدین اور شہادت وشہداء کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ بخاری ومسلم کی ایک روایت گزر چکی ہے، جس میں ہے کہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

«يَا رَسُولَ اللّٰهِ! اَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟»

''اے اللہ کے رسول ﷺ! سب سے افضل عمل کونسا ہے؟''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''...اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''[1]

بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جنت میں ایک سو درجاتِ رفیعہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فی سبیل اللہ جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیے ہیں۔''[2]

ایک اور حدیث میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ارشادِ رسالت مآب ﷺ ہے:

---

[1] حوالہ جات گزر گئے ہیں۔
[2] أیضاً.

«یَغْفِرُ اللّٰہُ لِلشَّہِیدِ کُلَّ شَیءٍ اِلَّا الدَّیْنَ»[1]

''اللہ تعالیٰ قرض کے سوا شہید کے تمام گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔''

بخاری شریف کی ایک طویل حدیث میں ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے دو آدمی اپنے ساتھ لے کر اوپر کو چڑھ گئے اور ایک ایسے گھر میں داخل کر دیا میں نے اس سے خوبصورت کوئی گھر نہیں دیکھا۔ اور انھوں (فرشتوں) نے مجھے بتایا:

«أَمَّا ھٰذِہِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّھَدَآءِ»[2] ''کہ یہ گھر شہداء کے لیے تیار کیا گیا ہے۔''

الغرض شہداء کو اللہ تعالیٰ جنت میں بلند درجات اور قربِ خاص سے نوازے گا اور سوال کرے گا کہ کیا تمھیں کسی اور نعمت کی تمنا ہے؟ وہ کہیں گے کہ اے اللہ! جو نعمتیں ہمیں میسّر ہیں، ان سے بڑھ کر اور کیا طلب کریں۔ ہاں، اگر ممکن ہو تو ہمیں پھر دنیا میں بھیج تا کہ ہم دوبارہ سہ بارہ تیری راہ میں شہید ہوں۔ شہید کے سوا ایسی تمنا دوسرا کوئی جنتی نہیں کرے گا۔ اور حدیث میں ہے:

''یہ صرف اس وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے جو حلاوت بوقتِ شہادت اور جو ''اکرام وشرف'' اللہ تعالیٰ کے ہاں پایا ہوگا، اس کے پیشِ نظر وہ دوبارہ شہادت کی تمنا کریں گے۔''[3]

ان مذکورہ آیات و احادیث کو سامنے رکھ کر مقامِ شہادت کی تعیین بالکل واضح ہوگئی۔ اب یہ سوچنا ہر شخص کا فرض ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شہداء کو اتنا بلند مقام عطا کیا ہے تو ہم شہداء پر ہر سال ماتم ونوحہ خوانی کی مجالس منعقد کر کے کیا خیر خواہی کرتے ہیں؟ جبکہ نبی ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ بَین اور نوحہ و ماتم ان کے لیے تکلیف دہ ہیں۔ اس کے باوجود کالا ماتمی لباس پہن کر ہر نئے اسلامی سال کے آغاز پر شہداء کی یاد تازہ کرنا اور ممنوع افعال کا ارتکاب کرنا عقل ونقل کسی بھی اعتبار سے جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ راہِ راست کی ہدایت فرمائے۔

فضیلتِ ابوبکر وعمر، بزبانِ علی رضی اللہ عنہم

نبیِ رحمت ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد ایک لاکھ (ایک لاکھ چودہ یا چالیس ہزار) سے متجاوز

---

[1] حوالہ جاتِ سابقہ۔

[2] حوالہ جاتِ مذکورہ۔

[3] أیضاً.

ہے اور ان سب میں سے مقام و مرتبے اور عظمت ورفعت کے اعتبار سے کس کا درجہ کونسا ہے؟ اس سلسلے میں صحیح بخاری شریف وغیرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لختِ جگر حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والدِ گرامی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے پوچھا:

«اَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ بَعْدَ النَّبِيِّ ﷺ؟ قَالَ: اَبُوْ بَكْرٍ رضی اللہ عنہ »

''نبی ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے بہتر شخص کون ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔''

''میں نے پوچھا، ان کے بعد کون؟ تو انھوں نے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ۔''

حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر میں ڈرا کہ میرے والد کہیں (میرے سوال پر حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ کا نام نہ لے لیں، لہٰذا میں نے خود ہی کہہ دیا:

''ثُمَّ اَنْتَ'' ''کہ عمر رضی اللہ عنہ کے بعد آپ ہیں۔''

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''مَا اَنَا اِلَّا رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ''[1]

''میں تو مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہوں۔''

سبحان اللہ! نبی ﷺ کے داماد اور چچا زاد بھائی، جگر گوشۂ رسول ﷺ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے شوہر نامدار اور حسنین رضی اللہ عنہما کے والدِ حضرت علی رضی اللہ عنہ صدق شعار نے حقیقت پسندی وصداقت شعاری اور تواضع وانکساری کی بہترین مثال قائم فرمادی۔ ایسے ہی مسند احمد میں حبیب بن ابو ثابت رحمہ اللہ، عبد خیر ہمدانی رحمہ اللہ کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برسرِ منبر یہ فرماتے ہوئے سنا:

«اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ هَذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّنَا ﷺ؟ »

''کیا میں تمھیں نبی ﷺ کے بعد اس امت کے بہترین شخص کے بارے میں خبر نہ دوں؟''

تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ پھر فرمایا:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٢٩) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٨)

"اَلَا اُخبِرُکُمْ بِالثَّانِیْ؟"

''کیا میں تمھیں دوسرے درجہ پر آنے والے شخص کی خبر نہ دوں؟''

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ پھر فرمایا:

''اگر میں چاہوں تو تمھیں تیسرے شخص کی خبر بھی دے سکتا ہوں۔''

لیکن پھر آپ خاموش ہو گئے۔[1]

مسند احمد میں ہی حضرت شعبی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مجھے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی جن کا نام حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ''وہب الخیر'' رکھا تھا، وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اَلَا اُخْبِرُكَ بِاَفْضَلِ هَذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا؟"

''کیا میں تجھے نبی ﷺ کے بعد اس امت کے افضل ترین شخص کے بارے میں خبر نہ دوں؟''

وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ضرور خبر دیں جبکہ میں ان کے سوا کسی کو افضلِ امت نہیں سمجھتا تھا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اَفْضَلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا أَبُوْ بَكْرٍ وَبَعْدَ أَبِيْ بَكْرٍ عُمَرُ، وَبَعْدَهُمَا اٰخَرُ ثَالِثٌ وَلَمْ يُسَمِّهِ"[2]

''نبی ﷺ کے بعد اس امت کے افضل ترین شخص ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ ہیں اور ان دونوں کے بعد ایک تیسرا ہے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تیسرا نام نہیں لیا۔''

زوائد مسند میں حضرت شعبی رحمہ اللہ سے ہی ابو جحیفہ وہب السوائی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے بسندِ صحیح ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہے، اور اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ مزید تعریفی کلمات بھی مذکور ہیں۔[3]

مسند احمد و طبرانی اوسط اور مستدرک حاکم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"سَبَقَ النَّبِيُّ ﷺ وَ صَلّٰى أَبُوْ بَكْرٍ وَثُلِّثَ عُمَرُ ثُمَّ خَبَطَتْنَا اَوْ اَصَابَتْنَا فِتْنَةٌ"

[1] الفتح الرباني ترتيب و شرح مسند أحمد الشيباني (٢٢/ ١٨٠) و صححه الأرناؤوط (٨٣٥)

[2] الفتح الرباني (٢٢/ ١٨١) و صححه الارناؤوط أيضاً.

[3] الفتح الرباني (٢٢/ ١٨١) زوائد المسند (٨٣٧) و قواه الأرناؤوط.

''نبی ﷺ (فضلِ اکبر اور سیرت حمیدہ کی رُو سے) سبقت لے گئے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے (نبی ﷺ کی موجودگی میں ہی) لوگوں کو نماز کی امامت کرائی۔ ان دونوں کے بعد تیسرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر ہم فتنے میں مبتلا ہو گئے۔''

ان الفاظ میں شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ اور جنگِ جمل و جنگِ صفین کی طرف ارشارہ ہے۔

آخر میں فرمایا:

''يَعْفُوَ اللّٰهُ عَمَّنْ يَّشَآءُ''[1] ''اللہ جسے چاہے معاف کرتا ہے۔''

زوائد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چند قریبی عسکری ساتھیوں میں سے حضرت ابو جحیفہ (وہب الخیر رضی اللہ عنہ) سے مروی ایک جیّد سند کی روایت میں بھی ہے:

''نبی ﷺ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت کے بہترین لوگوں میں سے پہلے حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا نام لیا۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان ارشادات سے جو ترتیب سامنے آتی ہے اسی کی صراحت صحیح بخاری و غیرہ میں خود نبیِ اکرم ﷺ کے عہدِ گرامی سے بھی ملتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری شریف میں مروی ہے:

«كُنَّا فِيْ زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ لَا نَعْدِلُ بِاَبِيْ بَكْرٍ أَحَداً، ثُمَّ عُمَرُ، ثُمَّ عُثْمَانُ، ثُمَّ نَتْرُكُ اَصْحَابَ النَّبِيِّ ﷺ لَا نُفَاضِلُ بَيْنَهُمْ»[3]

''نبی ﷺ کے زمانۂ مبارک میں ہم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ہم پلہ و ہمسر کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے بعد حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو درجہ دیتے تھے۔ (ان تینوں کے بعد) پھر ہم اصحابِ نبی (ﷺ) میں سے کسی کو کسی سے افضل قرار نہیں دیا کرتے تھے۔''

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٢١) و صححه أحمد شاكر و طبراني أوسط، رقم الحديث (١٦٣٩) المستدرك للحاكم، رقم الحديث (٤٤٢٦)

[2] أيضاً و زوائد المسند (٨٣٧) و قواه الأرناؤوط.

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٢٧) مشكاة المصابيح تحقيق الباني (٣/ ١٦٩٨)

یہ بخاری شریف کے الفاظ ہیں، جبکہ ابو داود کے الفاظ ہیں:

"كُنَّا نَقُوْلُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَيٌّ، أَفْضَلُ أُمَّةِ النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَهٗ أَبُوْ بَكْرٍ، ثُمَّ عُمَرُ، ثُمَّ عُثْمَانُ رضی اللہ عنہ"[1]

"نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی امت کے افضل ترین شخص حضرت ابو بکر صدیق، پھر حضرت عمر فاروق، اور پھر عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔"

اس حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہ میں حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہی تیسرا نام حضرت عثمان ذو النورین رضی اللہ عنہ کا بھی مذکور ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفۂ چہارم ہونے پر اہلِ سنت کے تمام مکاتبِ فکر کا اجماع ہے اور یہی صحیح و مسنون ترتیب ہے۔[2]

فضائل و مناقبِ صدیق رضی اللہ عنہ

مختصر تعارف:

نبیِ رحمت ﷺ کے سسر اور جلیل القدر صحابی اور پہلے خلیفۂ راشد بلا فصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اسمِ گرامی عبد اللہ بن عثمان ابو قحافہ بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ تیمی تھا۔ ابو بکر کنیت اور صدیق و عتیق لقب تھا۔ ایک ضعیف و حسن اور صحیح کے ما بین متکلم فیہ روایت میں ہے:

«اَنْتَ عَتِيْقُ اللّٰهِ مِنَ النَّارِ، فَيَوْمَئِذٍ سُمِّيَ عَتِيْقاً»[3]

"تم جہنم کی آگ سے آزاد ہو، اسی دن سے ان کا لقب عتیق رکھا گیا۔"

عام الفیل کے دو سال اور چند دن کم چار ماہ بعد پیدا ہوئے۔ مردوں میں سے پہلے مسلمان تھے۔ آپ کے والدین، خود آپ، آپ کی اولاد اور پوتے، مسلسل چار پشتیں صحابۂ رسول ﷺ ہیں۔

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٢٧) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٨)

[2] تحفة الأحوذي (١٠ / ٢٠١ـ ٢٠٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٧٩) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٠) إتحاف الخيرة المهرة (٧/ ١٤٨) و قال: سنده ضعيف، وقال: ضعيف لكن له شواهد.

شرف میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہیں، آپ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ اکیس، بائیس جمادی الآخرہ کی درمیانی منگل کی رات ۱۳ھ کو مغرب وعشاء کے مابین مدینہ طیبہ میں وفات پائی، جبکہ عمر تریسٹھ سال (مسنون) تھی۔ ان کی اپنی وصیت پر ان کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے انھیں غسل دیا۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور نبی ﷺ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

آپ کا دورِ خلافت دو سال چار ماہ تھا۔ آپ ایک سو بیالیس حدیثوں کے راوی ہیں جن میں چھے متفق علیہ ہیں۔ گیارہ صرف بخاری شریف میں اور ایک صرف مسلم شریف میں اور باقی دیگر کتبِ حدیث میں ہیں۔ قلتِ روایتِ حدیث کا سبب آپ کا نبی ﷺ کے بعد قلیل مدت زندہ رہنا اور امورِ حکومت کی ذمے داری ہے۔ آپ تمام غزوات میں نبی ﷺ کے ہمراہ رہے۔ بلکہ عہدِ جاہلیت اور دورِ اسلام میں آپ کی اور نبی ﷺ کی رفاقت کبھی نہیں ٹوٹی۔[1]

فضائل ومناقب:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب اور سیرت وسوانح پر اہلِ علم نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ صرف ''تاریخ الاسلام'' ذہبی میں ان کا تذکرہ سو پچاس صفحات پر نہیں، بلکہ ڈیڑھ جلد حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے ذکرِ جمیل پر مشتمل ہے جبکہ یہ کتاب پچاس جلدوں پر مشتمل ہے اور مطبوع دار الکتاب العربی بیروت ہے۔ لیکن ہم یہاں ان کے فضائل ومناقب کے بارے میں صحیح سند سے ثابت محض چند احادیثِ رسول ﷺ ہی ذکر کر رہے ہیں۔ چنانچہ بخاری ومسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّ مِنْ اَمَنِّ النَّاسِ عَلَيَّ فِيْ صُحْبَتِهٖ وَ مَالِهٖ اَبُوْ بَكْرٍ (وَعِنْدَ الْبُخَارِيِّ: اَبَا بَكْرٍ)»

''تمام لوگوں میں سے صحبت اور مال خرچ کرنے کے اعتبار سے مجھ پر سب سے زیادہ احسانات ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہیں۔''

«لَا تُبْقَيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ خَوْخَةٌ اِلَّا خَوْخَةُ اَبِيْ بَكْرٍ»

---

[1] تحفة الأحوذي (١٠/ ١٣٧۔ ١٣٨) المرعاة شرح مشكاة المصابيح (٢/ ٥٣٤)

''مسجد نبوی میں کھلنے والے تمام دروازوں میں سے کوئی دروازہ باقی نہ رہنے دیا جائے، سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کے۔''

《لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذاً خَلِيْلًا غَيْرَ رَبِّيْ لَا تَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا》[1]

''اگر میں نے اپنے رب کے سوا کسی کو خلیل بنانا ہوتا تو میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی خلیل بناتا۔''

بخاری و مسلم میں ہی حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''نبی ﷺ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے آپ ﷺ سے کسی معاملے میں گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے اسے حکم فرمایا کہ (آیندہ بوقتِ ضرورت) پھر آپ ﷺ کی طرف رجوع کرے۔ اس عورت نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر کبھی میں آؤں اور آپ (ﷺ) کو نہ پاؤں تو؟ گویا آپ (ﷺ) کی وفات کی طرف وہ اشارہ کر رہی تھی تو نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

《فَاِنْ لَمْ تَجِدِيْنِيْ، فَأْتِيْ اَبَا بَكْرٍ》[2]

''اگر مجھے نہ پاؤ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس چلی آنا۔''

یہ دونوں حدیثیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ نبی ﷺ کے نزدیک خلافت کے سب سے پہلے مستحق حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ جبکہ صحیح بخاری و مسلم شریف وغیرہ میں تو اس کی صراحت بھی موجود ہے۔ اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے مرض الموت میں مجھے فرمایا:

''اپنے باپ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بھائی (عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ) کو بلاؤ، تاکہ میں (خلافت کے بارے میں) وصیت نامہ لکھ دوں۔''

آگے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢) مشكاة المصابيح تحقيق الألباني (٣/ ١٦٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٦) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٧ـ ٩٨)

« فَإِنِّي أَخَافُ أَنْ يَتَمَنَّىٰ مُتَمَنٍّ وَيَقُولُ قَائِلٌ: أَنَا وَلَا (وَفِي بَعْضِ نُسَخِ صَحِيحِ مَسْلِمٍ وَكِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ: أَنَا أَوْلَىٰ) وَيَأْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَّا أَبَا بَكْرٍ »[1]

''مجھے ڈر ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہنے والا کہے گا کہ میں ہی مستحقِ خلافت ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اور تمام مومن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کو اس کا اہل نہیں سمجھتے۔''

بخاری و مسلم میں ہی حضرت عَمر و بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے انھیں غزوۂ ذات السلاسل کے لیے فوج کا سالار بنا کر بھیجا، (جانے سے قبل) میں آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، اور پوچھا:

« اَيُّ النَّاسِ اَحَبُّ اِلَيْكَ؟ » ''آپ ﷺ کو لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟''

تو آپ ﷺ نے فرمایا: « عَائِشَةُ رضی اللہ عنہا »

میں نے پوچھا: مردوں سے کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: « أَبُوهَا »

''اس کا والد (یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ) میں نے پوچھا: ان کے بعد؟ تو فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ'' تو پھر آپ ﷺ نے یکے بعد دیگرے کئی نام گنوائے۔ تب میں اس ڈر سے خاموش ہو گیا کہ مجھے آپ ﷺ کہیں سب سے آخر میں نہ کر دیں۔''[2]

صحیح بخاری و مسلم کی ان احادیث میں یہ ارشاداتِ نبویہ ﷺ حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (..........) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٧) سنن النسائی في الكبرىٰ (٧٠٨١) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٥٩٨) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٥١٥٦) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠١) مسند أحمد (٣/ ٣٧٣) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٨٨٥) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٨)

مقامِ صدیق رضی اللہ عنہ بزبانِ فاروق رضی اللہ عنہ:

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ نبی ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا تاثرات ہیں؟ اس سلسلے میں ترمذی شریف میں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"أَبُوْ بَكْرٍ سَيِّدُنَا، وَخَيْرُنَا وَأَحَبُّنَا اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ"[1]

''ابو بکر رضی اللہ عنہ ہمارے آقا و سردار، ہم سب سے بہتر اور ہم سب کی نسبت رسول اللہ ﷺ کو زیادہ محبوب تھے۔''

ایسے ہی ابو داود و ترمذی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں صدقہ کرنے کا حکم فرمایا اور یہ حکم ایسے موقع پر فرمایا کہ میرے پاس بھی مال موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں کبھی ابو بکر رضی اللہ عنہ سے سبقت لے جا سکتا ہوں تو وہ موقع صرف آج ہی ہاتھ آ سکتا ہے، لہٰذا میں اپنے کل مال کا آدھا حصہ بطور صدقہ لے آیا۔ نبی ﷺ نے پوچھا:

« مَا أَبْقَيْتَ لِأَهْلِكَ؟ » ''اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟''

میں نے عرض کیا: جتنا لایا ہوں، اتنا ہی چھوڑ آیا ہوں۔ جبکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے سارا مال ہی لے آئے تھے۔ جب ان سے نبی ﷺ نے پوچھا:

« يَا أَبَا بَكْرٍ! مَا أَبْقَيْتَ لِأَهْلِكَ »

''اے ابوبکر! تم اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟''

تو انھوں نے کہا: "أَبْقَيْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ"

''میں اپنے گھر والوں کے لیے صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ (کی محبت) کو چھوڑ آیا ہوں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے (اپنے دل میں) کہا:

"لَا أُسْبِقُهٗ اِلَى شَيْءٍ أَبَداً"[2]

''میں کبھی کسی بھی معاملے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سبقت نہیں لے جا سکتا ہوں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٥٤) فقره أولىٰ فقط، سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٥٦) وقال: حديث حسن، مشكاة المصابيح (٣/ ١٦٩٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٧٥) وحسنه الألباني، الصحيح المسند للوادعي (٩٩٦) سنن الدارمي (١/ ٤٨٠) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٠)

فضائل ومناقبِ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ

نام ونسب وحالاتِ زندگی:

نبیِ اکرم ﷺ کے سسر، جلیل القدر صحابی اور دوسرے خلیفۂ راشد کا اسم گرامی عمر بن خطاب بن نفیل بن عبد العزّیٰ العدوی القرشی المدنی تھا اور زوجۂ رسول ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے نام کی مناسبت سے ان کی کنیت ابوحفص تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نسب نامہ کعب بن لوی میں نبی ﷺ سے مل جاتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ فقہاء صحابہ اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے۔

سب سے پہلے ''امیر المومنین'' کے نام سے آپ رضی اللہ عنہ ہی پکارے گئے۔ ۵ھ یا ۶ھ میں اس وقت اسلام لائے جبکہ چالیس مرد اور گیارہ عورتیں مسلمان ہو چکی تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا عدد چالیس آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی پورا ہوا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کو بڑی قوت ملی اور آپ رضی اللہ عنہ کو ''فاروق'' کا لقب عنایت ہوا۔

بدر اور تمام غزوات میں نبی ﷺ کی معیت میں جہاد کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ پانچ سو انتالیس احادیثِ رسول ﷺ کے راوی ہیں جن میں سے دس متفق علیہ ہیں۔ نو صرف بخاری شریف میں اور پندرہ صرف مسلم شریف میں ہیں۔ باقی دیگر کتبِ حدیث میں ہیں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے عیسائی غلام ابولؤلؤ نے بروز بدھ ۲۶ ذو الحجہ ۲۳ھ کی نمازِ فجر کے دوران میں آپ رضی اللہ عنہ کو خنجر مارا، جس کے نتیجے میں آپ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ جبکہ عمر شریف تریسٹھ سال (مسنون) تھی۔ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور یکم محرم ۲۴ھ بروز اتوار نبی ﷺ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سمیت عشرہ مبشرہ و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ میں سے خلقِ کثیر نے روایت کی ہے۔[1]

آپ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پانچ سو قلعے فتح ہوئے، پانچ لاکھ کافر مسلمان ہوئے اور پچیس لاکھ مربع میل تک دینِ مبین پہنچا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی حکومت شمال میں اناطولیہ، جنوب میں ہندوکش، مشرق میں چین اور مغرب میں درہ دانیال تک تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے قرآنِ کریم کے دو لاکھ قلمی نسخے تقسیم کیے۔[2]

---

[1] المرعاة (۱/ ۳۲)

[2] بحوالہ روزنامہ ''جنگ'' لاہور (جمعہ اِڈیشن ۴/محرم ۱۴۰۸ھ بمطابق ۲۸/اگست ۱۹۸۷ء)

فضائل ومناقب:

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت وسوانح، ساڑھے دس سال عہدِ خلافت کی فتوحات اور ترویج واشاعتِ دین کے سلسلے میں ان کی خدمات کی تاریخ بھی طویل ہے۔ ان کے فضائل ومناقب کے بارے میں کتبِ حدیث میں بکثرت ارشاداتِ نبویہ ﷺ مذکور ہیں، جیسا کہ بخاری ومسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

''میں جنت میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی بیوی رمیصاء رضی اللہ عنہا میرے سامنے ہے۔ پھر میں نے (اپنے آگے) کوئی آہٹ سنی تو پوچھا، یہ کون ہے؟ تو (حضرت جبرائیل علیہ السلام نے) بتایا کہ یہ بلال (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ پھر میں نے ایک محل دیکھا (جس کے صحن میں ایک لڑکی تھی) میں نے پوچھا کہ یہ محل کس کا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا کہ اس محل میں داخل ہو کر اسے دیکھوں، مگر مجھے تیری غیرت یاد آ گئی۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، کیا میں آپ ﷺ پر غیرت کھا سکتا ہوں؟''[1]

اسی طرح بخاری ومسلم میں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عظیم دینداری کی شہادت دیتے ہوئے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

''میں سویا ہوا تھا کہ میں نے دیکھا، لوگ میرے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں۔ وہ قمیص پہنے ہوئے ہیں، ان میں سے بعض کی قمیصیں صرف چھاتیوں تک پہنچتی ہیں اور بعض کی اس سے بھی چھوٹی ہیں۔ جب میرے سامنے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو پیش کیا گیا تو وہ اتنی بڑی قمیص پہنے ہوئے تھے کہ وہ اسے گھسیٹ کر چل رہے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے

[1] **متفق عليه**: صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٥٧) سنن النسائي في الكبرىٰ (٨١٢٤) مسند أحمد، رقم الحديث (١٥١٨٩) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٢، ١٧٠٣)

اللہ کے رسول ﷺ! اس کی تعبیر کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: دین۔''[1]

اس تعبیرِ نبوی ﷺ کی رو سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سرتا پا مجسمہ و پیکرِ دین تھے۔ بخاری و مسلم میں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم و فضل کی گواہی بزبانِ رسالت مآب ﷺ مذکور ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''میں سویا ہوا تھا کہ مجھے دودھ کا پیالہ دیا گیا۔ میں نے خوب جی بھر کر پیا۔ پھر اپنا بچا ہوا دودھ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اس کی تعبیر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عِلم۔''[2]

یہاں شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے خواب محض خواب و خیال نہیں بلکہ وحی و برحق ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم و فضل کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ جب انھیں دفن کیا گیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ذَهَبَ الْيَوْمَ بِتِسْعَةِ اَعْشَارِ الْعِلْمِ''[3]

''آج علم کے دس حصوں میں سے نو حصے (ہم سے) رخصت ہوگئے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے صاحبِ جلال و جمال تھے۔ ان کی جلالت کا اندازہ صرف اس بات سے ہی کیا جاسکتا ہے کہ صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِيْهِ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ! وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ مَا لَقِيَكَ الشَّيْطَانُ سَالِكاً فَجاً قَطُّ، اِلَّا سَلَكَ غَيْرَ فَجِّكَ»[4]

''اے ابن خطاب! مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠١١) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٣١٧٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩١) مسند أحمد (٩/ ١٠) نفس المرجع.

[3] منهاج السنة لابن تيمية (٦/ ٥٩) و قال: إسناده ثابت، المرعاة (١/ ٣٢)

[4] **متفق عليه،** صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٦) مسند أحمد (٣/ ٤١) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٢)

کسی راستے پر آتے ہوئے تجھے شیطان دیکھ لے تو وہ بھی تیرا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ لے لیتا ہے۔''

ان کی جلالت اور رُعب ودبدبہ کا یہ عالَم تھا کہ شیطانِ لعین جیسی غیر مرئی چیز بھی ان کا سامنا کرنے کی تاب نہیں رکھتی تھی اور وہ انھیں دیکھتے ہی بھاگ جاتا تھا۔

ترمذی شریف اور مسند احمد میں ایک حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّ الشَّیْطَانَ لَیَخَافُ مِنْكَ یَا عُمَرُ!»[1]

''اے عمر! بے شک شیطان تم سے ڈرتا ہے۔''

ترمذی اور نسائی کے ایک واقعے کے ضمن میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنِّیْ لَاَنْظُرُ اِلٰی شَیَاطِیْنِ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ قَدْ فَرُّوْا مِنْ عُمَرَ»[2]

''میں دیکھ رہا ہوں کہ شیاطینِ جن وانس عمر رضی اللہ عنہ کے ڈر سے بھاگ گئے ہیں۔''

ترمذی و مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے دعا فرمائی:

«اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَبِیْ جَھْلِ بْنِ ھِشَامٍ أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَكَانَ أَحَبُّھُمَا اِلَیْ اللّٰہِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ»[3]

''اے اللہ! ابن ہشام کے بیٹے ابوجہل یا عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کو مسلمان کر کے (اس کے ذریعے) اسلام کی عزت کو دو بالا کر دے اور ان دونوں میں سے اللہ کو زیادہ محبوب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تھے۔''

صبح ہوئی تو (نبی ﷺ کی مراد برآئی، دعا قبول ہوگئی۔ اور) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پاس آکر مسلمان ہو گئے۔ اور اس دن سے مسلمانوں نے مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) میں کھلے عام نماز پڑھنا

---

[1] مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٥) سنن الترمذي و صححه الألباني، رقم الحديث (٣٦٩٠) السلسلة الصحيحة (٥/ ٣٣٠) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٣٠٦١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٩١) سنن النسائي الكبرىٰ، رقم الحديث (٨٩٥٧) السلسلة الصحيحة (٧/ ٨١٨) وقال الألباني: إسناده حسن.

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨١) مسند أحمد، رقم الحديث (٥٩٩٦، ٨/ ٦٠) وصححه أحمد شاكر، مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٤)

شروع کر دیا جبکہ اس سے پہلے سب مسلمان چھپ چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔"

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے یہی مقام و مرتبہ اور شرف کیا کم ہے کہ ترمذی شریف و مسند احمد وغیرہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ»[1]

"اگر میرے بعد کوئی نبی آنا ہوتا تو وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہوتے۔"

بخاری و مسلم وغیرہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَقَدْ کَانَ فِیْمَا قَبْلَکُمْ مِّنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَّكُ فِیْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرُ»[2]

"پہلی امتوں میں کچھ لوگ "محدَّث" یا "مُلْهَمْ" ہوتے تھے (جنھیں الہام ہوتا ہو) اگر میری امّت کا کوئی محدَّث ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہے۔"

ابو داود، ترمذی ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَ قَلْبِهٖ»[3]

"اللہ تعالیٰ نے عمر (رضی اللہ عنہ) کی زبان و قلب پر حق کو آشکارا کر دیا ہے۔"

مسند احمد وغیرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«مَا کُنَّا نُبْعِدُ اَنَّ السَّکِیْنَةَ تَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ»[4]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٦) و حسنه، مسند أحمد، رقم الحديث (١٧٤٠٥) وفي تخريج المسند، رقم الحديث (٣٥٩٠) صححه الأرناؤوط علىٰ شرط مسلم، مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٤-١٧٠٥) وحسنه الألباني.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٩؛ ٣٦٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٨) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٨٩٤) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٢٨٥) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٨) مسند أحمد، رقم الحديث (٢١٢٩٥) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٨٩٥) سنن البيهقي (٦/ ٧٩٥) مشكاة المصابيح (٣ / ١٧٠٤) و حسّنه.

[4] مسند أبي يعلىٰ (٥٤٠) و زوائد مسند أحمد (٢/ ١٤٧) و صححه أحمد شاكر، تاريخ دمشق ابن عساكر (٤٤/ ١٠٧) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٤) الفتح الرباني (٢٢/ ١٨١)

''ہم اس بات کو بعید خیال نہیں کرتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر سکینت و وقار اور سکون بولتا ہے۔''

بخاری شریف میں حضرت اسلم رضی اللہ عنہ مولیٰ عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«مَا رَأَيْتُ اَحَدًا قَطُّ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ حِيْنَ قُبِضَ كَانَ اَجَدَّ وَأَجْوَدُ حَتّٰى اِنْتَهٰى مِنْ عُمَرَ»[1]

''میں نے نبی ﷺ کے بعد نشر و اشاعتِ دین میں کوشاں اور بکثرت صدقہ کرنے والا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔''

بخاری و مسلم شریف وغیرہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَافَقْتُ رَبِّىْ فِىْ ثَلَاثٍ: فِىْ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ، وَفِى الْحِجَابِ، وَفِىْ اُسَارَى بَدْرٍ»[2]

''تین امور میں میری رائے میرے رب کے ارشاد کے موافق ثابت ہوئی: مقامِ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں، اور پردے کے بارے میں اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں۔''

اس کی مزید وضاحت بخاری و مسلم وغیرہ کی ہی ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''تین امور میں میری رائے میرے رب کے ارشاد کے موافق ثابت ہوئی:

1. میں نے نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو جائے نماز بنایا جائے تو سورۃ البقرہ: (آیت: ۱۲۵) ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ نازل ہوئی۔
2. میں نے عرض کیا: آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس آنے والے لوگوں میں نیک و بد ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ﷺ انھیں پردے کا حکم فرما دیں۔ تو سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۳) آیتِ حجاب ﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ

---

[1] بحواله مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٦٠) سنن النسائى الكبري (١١٦١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٠٩) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٥٠) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٨٩٦)

حِجَابٍ﴾ نازل ہوگئی۔

3 نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ایک مرتبہ غیرت میں آکر اکٹھی ہوگئیں تو میں نے سوچا:

﴿عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ﴾ [التحریم: ٥]

تو بعینہٖ اللہ تعالیٰ نے یہی آیت نازل فرمادی۔[1]

بدر کے قیدیوں کے بارے میں ان کی رائے کے مطابق جو آیت نازل ہوئی تھی وہ سورۃ الانفال (آیت: ٦٨) ہے جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِیْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾

''اگر اللہ تعالیٰ آگے سے ایک بات نہ لکھ چکا ہوتا تو تم نے جو (مال قیدیوں سے) لیا اس (قصور) میں تم پر بڑا عذاب اترتا۔''

اس آیت کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر کے مشرک قیدیوں کے قتل کی رائے رکھتے تھے مگر بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے پر انھیں فدیہ لے کر زندہ چھوڑ دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ ڈانٹ پلائی۔[2]

بخاری و مسلم کی مذکورہ دونوں حدیثوں میں چار مقامات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پر قرآنِ کریم کی آیات نازل ہونے کا تذکرہ آگیا ہے جو ایک بہت بڑی سعادت ہے۔

بخاری و مسلم کی ایک صحیح حدیث میں نبی ﷺ اپنے ایک خواب کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کیا دیکھتا ہوں:

''میں ایک کنویں پر ہوں جس پر ایک ڈول لٹک رہا ہے۔ پہلے میں نے اس سے جتنا اللہ نے چاہا پانی نکالا۔ پھر ابن ابی قحافہ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) نے وہ ڈول پکڑا اور ایک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٣) باختلاف يسير، صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٦٠) سنن النسائي في الكبرىٰ (١١٦١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٠٩) مسند أحمد، رقم الحديث (١٥٧) و اللفظ له، مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٦)

[2] ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٨٤) مسند أحمد، رقم الحديث (٣٦٣٢) و ضعّفه الأرناؤوط و أحمد شاكر (٢/ ٢٢٧) المستدرك للحاكم، تفسير ابن كثير، أحكام القرآن (١/ ٣٩٠) و صححه. ویسے اسیرانِ بدر کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے سے اللہ تعالیٰ کی موافقت مذکور بخاری و مسلم کی حدیث سے بھی ثابت ہے۔

یا دو ڈول نکالے۔ اور ڈول نکالنے میں کمزوری نمایاں تھی۔ اللہ انھیں ان کی کمزوری معاف کرے۔ پھر وہ ڈول بہت ہی بڑا ہو گیا اور اسے ابن خطاب (حضرت فاروق رضی اللہ عنہ) نے پکڑ لیا۔ میں نے کبھی کسی قوی آدمی کو اتنی آسانی سے ڈول نکالتے نہیں دیکھا جتنی آسانی سے عمر نکال رہے تھے، یہاں تک کہ لوگوں نے اپنے اونٹوں کو پیٹ بھر کر پانی پلایا اور اونٹوں کے بٹھانے کی جگہیں بنالیں۔''[1]

اس حدیث میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی یکے بعد دیگرے خلافت، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی قلیل المدتی (دو، ڈھائی سال) اور خلافتِ عمر رضی اللہ عنہ کا طول (ساڑھے دس سال) اور خلافتِ صدیق رضی اللہ عنہ میں فتنۂ ارتداد وغیرہ کی وجہ سے کمزوری اور عہدِ فاروقی میں قوت و شوکتِ اسلام کے واضح اشارات موجود ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات تک کمالِ ایمان واستقامت اور امیر المومنین ہونے کی شہادت خاندانِ نبوت کے افراد میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دی ہے جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فراشِ مرگ پر تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے امیر المومنین! آپ نبی ﷺ کی صحبت میں رہے اور حقِ صحبت انتہائی خوبی سے ادا کیا، پھر جب آپ ﷺ (وفات پا جانے سے) آپ سے جدا ہوئے تو وہ اس وقت آپ سے راضی تھے۔ پھر آپ نے مسلمانوں کی صحبت میں رہنا شروع کر دیا (یعنی بارِ خلافت اٹھایا) تو اس صحبت و ذمہ داری کو بھی بخیر و خوبی نبھایا۔ اگر آپ ان کا ساتھ چھوڑ کر عازمِ سفرِ آخرت ہو گئے، تو آپ یقیناً ان سے ایسے حال میں جدا ہوں گے کہ تمام مسلمان آپ سے راضی ہیں۔''[2]

یہ فیروز ابولؤلؤہ مجرم کے خنجر مارنے اور حضرتِ فارورق رضی اللہ عنہ کے شہادت پانے کے درمیان کل دو، چار دنوں کے مابین دی گئی گواہی ہے۔ اسی بد بخت فیروز کو شیعہ لوگ ''بابا شجاع'' کا لقب دیتے ہیں اور ایران میں اس کا سالانہ عرس منایا جاتا ہے جسے ''عید بابا شجاع'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ شجاعت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، چھپ کر وار کرنے والا شجاع کیسے کہلا سکتا ہے؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٣) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٨٩٨) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٧)

حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے چند مشترکہ فضائل ومناقب

عمر بھر نبیِ اکرم ﷺ کے شرفِ صحبت میں رہنے والے اور وفات کے بعد بھی آپ ﷺ کے پہلو میں دفن کیے جانے والے حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے الگ الگ فضائل ومناقب کے بارے میں ارشاداتِ نبوی ﷺ اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ نے پڑھ لیے، جبکہ کتبِ حدیث میں بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن میں ان دونوں جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہما کے ایمان وعملِ صالح اور بہترین جزائے اُخروی کی شہادات مذکور ہیں۔ کسی کے ایمان کی صداقت ورفعت اور نبیِ امت کے ان پر اعتمادِ کامل کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ وہ خود تو حاضرِ مجلس نہ ہو، مگر نبیِ امت یہ شہادت دے دیں کہ بظاہر ایک ناقابلِ یقین چیز پر بھی میں اور فلاں فلاں شخص ایمان رکھتے ہیں۔ یہ شرف حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کو نصیب ہوا۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم، ابو داود وترمذی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نبی ﷺ نے (ہمیں ایک نماز پڑھائی پھر جب ہماری طرف رخِ انور کو پھیرا تو (مسند أحمد) فرمایا: کوئی شخص گائے لیے جارہا تھا، جب وہ تھک گیا تو اس گائے پر سوار ہوگیا۔ اس گائے نے کہا: ہم اس سواری کے لیے نہیں بلکہ کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ لوگوں نے کہا: سبحان اللہ! گائے بھی بولتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اس (بظاہر ناقابلِ یقین واقعہ) پر میرا اور ابو بکر وعمر (رضی اللہ عنہما) کا ایمان ہے کہ اللہ کے لیے یہ کوئی ناممکن بات نہیں کہ گائے کو بولنے کی قوت عطا فرمائے۔''

راویِ حدیث کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت صدیق و فاروق (رضی اللہ عنہما) اس مجلس میں موجود نہ تھے۔ پھر نبی ﷺ نے فرمایا:

''کوئی شخص بکریاں چرا رہا تھا کہ ایک بھیڑیے نے حملہ کر کے ایک بکری پکڑ لی۔ چرواہا بر وقت پہنچا اور بکری چھڑا لی تو اس سے مخاطب ہوکر اُس بھیڑیے نے کہا: اس دن اس بکری کا کیا بنے گا جب لوگ اپنے مال مویشی سے بے خبر انھیں درندوں کے حوالے کر دیں گے اور ان کا رکھوالی کرنے والا میرے سوا کوئی نہ ہوگا؟ یہ سن کر لوگوں نے کہا: سبحان اللہ! بھیڑیا بھی بولتا ہے؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا: اس پر بھی میں اور ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما

ایمان رکھتے ہیں۔ جبکہ یہ دونوں وہاں موجود نہ تھے۔''[1]

یہ واقعہ نبیِ اکرم ﷺ کی طرف سے حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کے کمالِ ایمان، قلبی اطمینان اور بلندیِ ادراک کی عظیم شہادت ہے۔[2]

اسی طرح صحیح بخاری میں ان دونوں بزرگوں کے بارے میں نبی ﷺ کی گواہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ خاندانِ نبوت کے عظیم فرد، ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

حضرتِ فاروق جامِ شہادت نوش کر گئے۔ تدفین کے لیے چارپائی پر لٹائے جا چکے تھے، میں بھی وہاں کھڑا تھا کہ لوگوں نے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے دعائیں کرنا شروع کیں۔ اچانک ایک شخص میرے پیچھے سے آیا اور میرے کندھے پر کہنی رکھ کر کہنے لگا (اے عمر! رضی اللہ عنہ) اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے تیرے (پہلے جانیوالے) دونوں ساتھیوں (نبی اکرم ﷺ اور حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ہی ملا دے گا، کیوں کہ میں نے بے شمار دفعہ نبیِ اکرم ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ فلاں جگہ میں تھا اور ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما تھے۔ فلاں کام میں نے کیا اور ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما نے کیا۔ فلاں طرف میں چلا اور ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما چلے۔ فلاں جگہ میں داخل ہوا اور ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے۔ فلاں جگہ سے میں نکلا اور ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما نکلے۔ گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی گہری رفاقت وصحبت اور مسلسل وغیر منقطع معیت کے واقعات کی بنا پر فرمایا:

''اے عمر رضی اللہ عنہ! اللہ تعالیٰ تجھے تیرے ان دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہی ملا دے گا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ سب باتیں سننے کے بعد جب میں کہنے والے کی طرف متوجّہ ہوا تو دیکھا کہ وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔[3]

ترمذی شریف میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٨) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٦٠٤٧) الفتح الرباني ٢٢/ ١٨٣) تخريج المسند للأرناؤوط (١٣/ ٤٣٦، رقم الحديث ٧٣٣١)

[2] للتفصيل: سنن الترمذي مع التحفة (١٠/ ١٨٤ـ ١٨٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٧) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٨)

«اِنِّیْ لَا اَدْرِیْ مَا بَقَائِیْ فِیْکُمْ فَاقْتَدُوْا بِالَّذَیْنِ مِنْ بَعْدِیْ: أَبَا بَکْرٍ وَعُمَرَ» [1]

''میں نہیں جانتا کہ کب تک تمھارے درمیان موجود رہوں۔ تم لوگ میرے بعد ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتدا و اطاعت کرنا۔''

یہ روایت حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی یکے بعد دیگرے خلافت کے استحقاق واہلیت کی روشن دلیل ہے۔ ایسے ہی ابو داود و ترمذی میں ہے:

''کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو بتایا کہ میں نے (خواب میں) دیکھا ہے کہ آسمان سے ایک ترازو اترا، اس میں (پہلے) آپ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو آپ ﷺ کا پلہ بھاری نکلا۔ پھر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا وزن کیا گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پلڑا بھاری نکلا۔ پھر حضرت عمر وعثمان رضی اللہ عنہما دونوں پلڑ وں میں ڈالے گئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ والا پلڑا بھاری نکلا۔ پھر وہ ترازو اٹھا لیا گیا۔'' [2]

اس حدیث میں نبی ﷺ کے بعد ابو بکر، پھر عمر اور پھر عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت کی دلیل موجود ہے بلکہ اسی حدیث کے آخری الفاظ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«خِلَافَةُ نُبُوَّةٍ، ثُمَّ یُؤْتِی اللّٰهُ الْمُلْكَ مَنْ یَّشَآءُ»

''یہ خلافتِ نبوت ہے اور پھر اللہ جسے چاہے گا حکومت دے گا۔''

گو یا یہ حدیث خلافت پر نصِّ صریح ہے۔ فضائل و مناقب کی ان شہادات اور نبی ﷺ کی زبانِ صدق ترجمان سے صادر ہونے والی ان گواہیوں سے بڑھ کر اور کیا چاہیے؟ حضراتِ صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے لیے یہی شرف کیا کم ہے کہ ترمذی شریف کی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک صحیح سند

---

[1] مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٣، ٣٧٩٩) حسنه الترمذي والألباني، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٠) المستدرك للحاكم، شرح السنه للبغوي (١/ ٢٠٨) و حسنه الأرناؤوط، الفتح الرباني (٢٢/ ١٨٢) تخريج المسند، رقم الحديث (٢٣٢٧٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٣٥) و صححه، سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٨٧) سنن النسائي في الكبرىٰ (٨١٣٦) كتاب السنة لابن أبي عاصم (ص: ١١٣١) و صححه الأرناؤوط، تخريج المسند، رقم الحديث (٢٠٥٠٥) سنن البيهقي، رقم الحديث (١٨٣٦) مشكاة المصابيح (٣/ ١٠ ١٧) الفتح الرباني (٢٣/ ١٣۔ ٢٢/ ١٨٧)

والی حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَبُوْ بَکْرٍ وَ عُمَرُ سَیِّدَا کُھُوْلِ أَھْلِ الْجَنَّةِ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ، اِلَّا النَّبِیِّیْنَ وَ الْمُرْسَلِیْنَ»[1]

''حضرت ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) صرف انبیاء و رسل (علیہم السلام) کو چھوڑ کر (پختہ عمر میں فوت ہو کر) جنّت میں جانے والے پہلے، پچھلے تمام انسانوں کے سردار ہوں گے۔''

کسی شخص کے لیے صرف جنتی ہو جانے کی خوش خبری ہی دینا جہان کی تمام سعادتوں اور دولتوں سے بڑھ کر ہے، جبکہ حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کو تو نبی ﷺ نے نہ صرف جنتی ہونے بلکہ اہلِ جنت کے سردار ہونے کی بشارت عطا فرمائی ہے۔ ترمذی شریف میں یہی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کے آخر میں ہے:

«لَا تُخْبِرْھُمَا یَا عَلِيُّ! [یَعْنِي أَبَابَکْرٍ وَ عُمَرُ]»

''اے علی رضی اللہ عنہ! اس بشارت کی خبر انھیں (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کو مت دو۔''

ترمذی وابن ماجہ میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«مَا دَامَا حَیَّیْنِ»[2] ''جب تک وہ زندہ ہیں۔''

زوائد مسند احمد میں ایک جیّد سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَاسْتُخْلِفَ أَبُوْ بَکْرٍ رضی اللہ عنہ فَعَمِلَ بِعَمَلِهٖ وَسَارَ بِسِیْرَتِهٖ حَتّٰی قَبَضَهُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ عَلٰی ذٰلِكَ، ثُمَّ اسْتُخْلِفَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ عَلٰی ذٰلِكَ فَعَمِلَ بِعَمَلِهِمَا وَسَارَ بِسِیْرَتِهِمَا حَتّٰی قَبَضَهُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ عَلٰی ذٰلِكَ»[3]

''رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٨، ١٠٠) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٦٠٥٠) الفتح الرباني (٢٢/ ١٨٤) و صححه أحمد شاكر (٢/ ٣٨) ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٠٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٨) بلوغ الأماني شرح الفتح الرباني (٢٢/ ١٨٤)

[3] الفتح الرباني (٢٢/ ١٨٤)

رسول اللہ ﷺ کے کردار وعمل کو اپنایا اور تا حیات آپ ﷺ کے نہج وطریقے (سیرت) پر چلتے رہے۔ (ان کی وفات کے بعد) پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی ان دونوں کے کردار وعمل کو اپنایا اور تا حیات ان دونوں کے نہج وطریقے پر چلتے رہے۔''

فضائل ومناقب حضرت عثمان ذو النّورین رضی اللہ عنہ

نام ونسب اور مختصر حالاتِ زندگی:

تیسرے خلیفۂ راشد کا اسمِ گرامی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان بن ابو العاص بن امیہ بن عبد شمس اموی قرشی مدنی تھا اور ابو عبد اللہ وابو عَمر وکنیت تھی، جبکہ امیر المومنین، ذو النورین مجہز جیش العُسر ہ اور مشتریِ بئر رومہ آپ کے القاب تھے۔

امام ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ کی کثرتِ عبادت کا یہ عالَم تھا کہ ساری رات ایک ہی رکعت میں گزار دیا کرتے تھے۔ حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کی تدفین کے تین دن بعد یکم محرم ۲۴ھ کو ان کی خلافت پر بیعت لی گئی اور ۳۵ھ میں بیاسی سال کی عمر میں ظلماً شہید کر دیے گئے۔ آپ چند دن کم بارہ سال خلیفہ رہے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے لوگوں نے اپنے آپ پر ایسے فتنے کا دروازہ کھول لیا جو قیامت تک بند ہونے والا نہیں۔

آپ ایک سو چھیالیس حدیثوں کے راوی ہیں جن میں سے تین متفق علیہ، آٹھ صرف بخاری شریف میں اور پانچ صرف مسلم شریف میں ہیں۔ باقی دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ہیں۔[1]

فضائل ومناقب:

رسولِ رحمت ﷺ کی دو صاحبزادیوں حضرت رقیہ وام کلثوم رضی اللہ عنہما کے یکے بعد دیگرے شوہر اور اسی عظیم سعادت کی مناسبت سے ذو النورَین کا لقب پانے والے، ایک یہودی سے منہ مانگی قیمت بیس ہزار دینار دے کر بئر رومہ نامی کنواں خرید کر، جو بعد میں بئر عثمان رضی اللہ عنہ کے نام سے معروف ہوا، وہ کنواں مسلمانوں کے لیے وقف کرنے والے، گرمی کی شدت، پانی، زادِ راہ اور سواریوں کی قلت اور

[1] المرعاة (١/ ١٠٦) تحفة الأحوذي (١٠ / ٨٧- ١٨٦- ١٨٧- ١٩٠)

سخت قحط کے موقع پر پیش آنے والے جیش العسر ہ یعنی غزوۂ تبوک کے مجاہدین کو زرِکثیر خرچ کر کے تیار کرنے والے، بیعتِ رضوان کے موجب، قاصدِ رسول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی، اور چنددن کم بارہ سالہ عہدِ خلافت کی تاریخ پر مورخین اور اہلِ علم نے بہت کچھ لکھا ہے۔خصوصاً تاریخِ دمشق میں تو ان کی سیرت کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہیں۔لیکن ہم یہاں صرف زبانِ رسالت مآب ﷺ سے نکلنے والے چند صحیح اسناد سے مروی ارشادات کی روشنی میں ان کے فضائل و مناقب کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''نبی ﷺ اپنے گھر میں لیٹے ہوئے تھے، آپ ﷺ کی دونوں رانیں یا پنڈلیاں ننگی تھیں کہ باہر سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔آپ ﷺ نے انھیں اجازت دے دی، اور خود اسی حالت میں یعنی کھلی پنڈلیوں سے ہی لیٹے مصروفِ گفتگو رہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی تو انھیں بھی اجازت دی اور خود آپ ﷺ اسی طرح مصروفِ گفتگو رہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی تو نبی ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور آپ ﷺ نے اپنے کپڑوں کو اچھی طرح درست کر لیا۔ پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ باہر نکل گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ (اے اللہ کے رسول ﷺ!) جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تو آپ ﷺ ان کے لیے اپنی جگہ سے نہیں ملے اور نہ ہی آپ ﷺ نے ان کے لیے (پوشاک درست کرنے کی) کوئی پروا کی، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تب بھی آپ ﷺ ان کے لیے نہیں اٹھے اور نہ ہی کوئی پروا کی، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تو اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑوں کو درست فرمالیا۔تو نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَلَا اَسْتَحِيْ مِنْ رَجُلٍ، تَسْتَحِيْ مِنْهُ الْمَلَآئِكَةُ»

''کیا میں اُس آدمی سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں؟''

صحیح مسلم وغیرہ کی اسی حدیث میں اس واقعہ کے بعد ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّ عُثْمَانَ رَجُلٌ حَیِیٌّ، وَاِنِّیْ خَشِیْتُ اِنْ اَذِنْتُ لَهٗ عَلٰی تِلْكَ الْحَالَةِ اَنْ لَّا

يَبْلُغَ اِلَيَّ فِيْ حَاجَتِهٖ»[1]

''عثمان رضی اللہ عنہ بڑے حیا دار آدمی ہیں اور میں ڈر گیا کہ اگر میں نے انھیں اسی حالت میں رہتے ہوئے اندر آنے کی اجازت دے دی تو وہ اپنی ضرورت پیش کرنے کے لیے (مارے شرم کے) مجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

اندازہ فرمائیں کہ بخاری و مسلم میں صفتِ حیا کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ»[2] ''حیا ایمان کا حصہ ہے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نبیِ اکرم ﷺ سراپا حیا قرار دے رہے ہیں کہ جن سے اللہ کے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔ اللہ اکبر! زہے نصیب۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ صحیح بخاری شریف وغیرہ میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے بیعتِ رضوان کے موقعہ پر جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا قاصد بنا کر مکہ مکرّمہ بھیجا ہوا تھا تو اُنہیں اس بیعت کے شرکاء میں شامل کرنے کے لیے نبی ﷺ نے اپنے دائیں دستِ مبارک کو [ہوا میں لہراتے ہوئے] فرمایا: «هٰذِهٖ يَدُ عُثْمَانَ» ''یہ عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ہے۔''

پھر اسے اپنے دُوسرے دستِ مُبارک پر مار کر فرمایا:

«هَذِهٖ لِعُثْمَانَ»[3] ''یہ عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت ہے۔''

سبحان اللہ! کیا نرالی شان ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کہ نبی ﷺ نے اپنے دائیں دستِ مبارک کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نائب و قائم مقام قرار دیا اور خود ان کی طرف سے بیعت کی شرط ادا فرمائی۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٠٦) صحيح الأدب المفرد (٤٦٨) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧١٢) تخريج المسند، رقم الحديث (٢٥٢١٦، ٢٥٣٣٩)

[2] **متفق عليه**. صحيح البخاري، رقم الحديث (٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦١٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٠٥، ٥٠١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨۔ ٤٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٦٧، ١٨١) الأدب المفرد للبخاري، رقم الحديث (٥٩٨) مشكاة المصابيح (٣/ ١٤٠٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٢٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦١١) مشكاة المصابيح (٣/ ١٦ ١٧) تخريج المسند، رقم الحديث (٥٧٧٢) ابن حبان، رقم الحديث (٦٦٠٨، ٦٩١٩) المختاره للضياء (٣٩٥)

بخاری شریف و غیرہ کی اسی حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ غزوۂ بدر کے موقعے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آنے والی (پہلی) دخترِ رسول ﷺ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں۔ نبی ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی تیمار داری پر مامور کرتے ہوئے فرمایا:

«اِنَّ لَكَ اَجْرَ رَجُلٍ مِّمَّنْ شَهِدَ بَدْراً وَسَهْمَهٗ»[1]

''تمھیں بدری صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے برابر اجر وثواب اور مالِ غنیمت کا حصہ ملے گا۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے یہی شرف کیا کم ہے کہ ترمذی و مسند احمد میں حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جیش العُسر ہ (المعروف بہ غزوۂ تبوک) کے مجاہدین کی تیاری کے موقعے پر (اس زمانے کی خطیر رقم) ایک ہزار دینار نبی ﷺ کی خدمت میں لائے۔ نبی ﷺ نے وہ تمام دینار اپنی جھولی میں بکھیر لیے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُقَلِّبُهَا فِيْ حِجْرِهٖ وَيَقُوْلُ: «مَا ضَرَّ عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ»

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ ان دیناروں کو الٹ پلٹ رہے تھے اور زبانِ مبارک سے فرما رہے تھے: آج کے بعد عثمان (رضی اللہ عنہ) جو بھی عمل کرے وہ اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''تحفة الأحوذي شرح ترمذی'' میں ان الفاظ کی وضاحت یوں لکھی ہے کہ آج کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کوئی گناہ بھی کرے تو اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ بلکہ وہ اس عظیم قربانی کی بدولت بخش دیا جائے گا۔[2] نبی ﷺ نے یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے۔

نیز ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«يَا عُثْمَانُ! اِنَّهٗ لَعَلَّ اللّٰهَ يُقَمِصُكَ قَمِيصاً فَاِنْ اَرَادُوْكَ (وَ لَفْظُ ابْنُ مَاجَه:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٢٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠٦) مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (٣/ ١٥ ١٧) تخريج المسند، رقم الحديث (٦٠١١، ٢١٢١٥) شرح السنة للبغوي (٣٥٠٤)

[2] تحفة الأحوذي (١٠/ ٩٣)

فَارَادَكَ الْمُنَافِقُوْنَ) عَلٰى خَلْعِهٖ فَلَا تَخْلَعْ لَهُمْ»[1]

''اے عثمان! ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں (خلعتِ خلافت) قمیص پہنائے، بس اگر منافقوں نے تمھیں معزول کرنا بھی چاہا تو تم معزول نہ ہونا۔''

اس حدیث میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے اور مخالفین کے قطعاً باطل پر ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس کے علاوہ ترمذی و ابن ماجہ میں حضرت مرہ بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو عنقریب واقع ہونے والے فتنوں کا ذکر کرتے سنا۔ اسی دوران قریب سے ایک شخص منہ پر کپڑا لپیٹے گزرا تو نبی ﷺ نے فرمایا:

''اُس (بلوائیوں کے فتنہ کے) دن یہ حق و ہدایت پر ہوگا۔ میں اٹھا اور جا کر دیکھا کہ وہ شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے ان کا چہرہ نبی ﷺ کی طرف پھیر کر پوچھا کہ یہ شخص؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔''[2]

فضائل و مناقبِ صدیق، فاروق اور غنی رضی اللہ عنہم

نبیِ اکرم ﷺ کے کئی ارشاداتِ گرامی ایسے بھی ہیں جن میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمرِ فاروق اور عثمانِ غنی رضی اللہ عنہم تینوں کے فضائل و مناقب یکجا ملتے ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری، ابو داود و ترمذی اور نسائی و مسند احمد میں ملتے جلتے الفاظ کی ایک حدیث ہے اور ان میں بخاری شریف کی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَعِدَ أُحُداً، وَأَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ وَ عُثْمَانُ فَرَجَفَ بِهِمْ، فَضَرَبَهٗ بِرِجْلِهٖ فَقَالَ: «اُثْبُتْ أُحُدُ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَ صِدِّيْقٌ وَ شَهِيْدَانِ»[3]

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١٠/ ٢٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٢) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٥٦٦، ٢٥١٦٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٥ ١٧) و صححه الألباني، صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩١٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠٤) سنن الترمذي مع التحفة (١٠ / ١٩٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٩) تخريج المسند، رقم الحديث (١٨١٢٩) مشكاة المصابيح (٣/ ١٤ ١٧: ٦٠٦٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٥١) سنن الترمذي (١٠ / ١٨٥، ←

''نبیِ اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم جبلِ اُحد پر چڑھے، ان (چاروں حضرات) کو اپنے اوپر پا کر جبلِ اُحد لہرانے لگا۔ (شارحین حدیث لکھتے ہیں، کہ جبلِ اُحد کا یہ لہرانا یا ہلنا ان چاروں حضرات کو اپنے اوپر یکجا پانے کی خوشی و فرطِ مسرت کا اظہار تھا) نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے قدمِ مبارک سے پہاڑ پر ضرب لگائی۔ اور فرمایا: ''اے اُحد! اپنی جگہ پر جم جا، اس وقت تجھ پر ایک نبی ہے، ایک صدیق ہے اور دو شہید ہیں۔''

اس حدیث میں نبی ﷺ کے دو معجزے مذکور ہیں:

پہلا نبیِ اکرم ﷺ کا پہاڑ کو حکم فرمانا کہ حرکت مت کر، اس پر اس کا اپنی جگہ پر ہی جم جانا۔ اور دوسرا معجزہ حضرتِ فاروق اور حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے جامِ شہادت نوش کرنے کی پیش گوئی، جو مِن و عَن پوری ہوئی۔ حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کو (مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے) ایک عیسائی غلام ابولؤلؤ نے نمازِ فجر کے دوران میں خنجر مارا جو ان کی شہادت کا باعث ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلوائیوں نے شہید کر دیا۔

ان معجزات کے علاوہ اس حدیث شریف میں نبی ﷺ کی زبانِ مبارک سے حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت اور حضرت عمرِ فاروق و عثمانِ غنی رضی اللہ عنہما کی موتِ شہادت کی گواہی بھی مل گئی۔

اسی طرح بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث جو صحیحین کے علاوہ ترمذی اور مسند احمد میں بھی ہے۔ بخاری و مسلم میں اس کے راوی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں جبکہ دیگر کتب میں یہ حضرت نافع بن عبد الحارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ باغاتِ مدینہ میں سے کسی باغ میں تھا کہ باہر سے کسی آدمی نے آ کر دروازہ بجایا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے مجھے حکم فرمایا: «اِفْتَحْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ»

''اس کے لیے دروازہ کھول دو اور اس آنے والے کو جنت کی خوش خبری دے دو۔''

میں نے جا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہ آنے والے شخص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ میں

← رقم الحديث: ٣٦٩٧، ٣٧٠٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦١٠) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٨٣) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٢٨٦٢) تخريج المسند، رقم الحديث (٢٦٣٣١) مسند أبي يعلىٰ، رقم الحديث (٧٥١٨) سنن الدارقطني (٤٤٣٧) بتحقيق الأرناؤوط، الفتح الرباني (٢٢/ ١٦٦) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧١٧)

نے انھیں نبی ﷺ کی فرمائی ہوئی جنت کی بشارت دی تو انھوں نے (اس سعادت پر) اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی۔ الحمد للہ وغیرہ کہا۔ پھر کوئی دوسرا آیا اور اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نبی ﷺ نے حکم فرمایا: «اِفۡتَحۡ لَهٗ وَبَشِّرۡهُ بِالۡجَنَّةِ»

''اس کے لیے بھی دروازہ کھول دو، اور اسے بھی جنت کی خوشخبری دے دو۔''

میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) تھے۔ میں نے انھیں نبی ﷺ کی ارشادفرمودہ (بشارتِ جنت کی) خبر دی تو انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔ پھر کسی اور شخص نے بھی دروازہ کھٹکھٹایا تو مجھے نبی ﷺ نے حکم فرمایا:

«اِفۡتَحۡ لَهٗ وَبَشِّرۡهُ بِالۡجَنَّةِ عَلٰى بَلۡوٰى تُصِيۡبُهٗ»

''اس کے لیے بھی دروازہ کھول دو اور جنت کی بشارت بھی دے دو، مگر انھیں (حصول جنت کے لیے) ایک بلوے کا شکار ہونا پڑے گا۔''

(میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ) وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔ میں نے انھیں نبی ﷺ کی فرمائی ہوئی (جنت اور بلوے کی) خبر دی تو انھوں نے (پہلے جنت کی بشارت ملنے پر) اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور پھر فرمایا: «وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ»[1] ''(بلوے یا دیگر مصائب میں) اللہ ہی مدد کرنے والا ہے۔''

شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ نے (شرح مسلم میں اس حدیث کے تحت) لکھا ہے کہ اس میں ان تینوں حضرات کی فضیلت مذکور ہے اور یہ کہ تینوں اہلِ جنت میں سے ہیں۔ اور یہ کہ تینوں حضرات ہی تا دمِ آخر ایمان و ہدایت پر رہیں گے۔ اس حدیث میں نبی ﷺ کا یہ معجزہ بھی ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے ہی فرما دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا جائے گا اور اس بلوہ میں وہ مظلوم شہید کر دیے جائیں گے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٣) الفتح الرباني (٢٢/ ١٨٤۔ ١٨٥) تخريج المسند، رقم الحديث (١٩٥٠٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩١٢) صحيح الأدب المفرد (٧٤٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧ ١٧) سنن الترمذي مع التحفه (١٠ / ٢٠٧۔ ٢٠٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧١٠)

[2] بحواله تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي (١٠ / ٢٠٧۔ ٢٠٨)

اس حدیث میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ارشادِ نبوی ﷺ کی تصدیق کرنا کتنا ایمان افروز اور حیرت ناک ہے کہ بلویٰ کی پیش گوئی سن کر یہ نہیں کہا کہ اے اللہ! مجھے اس آزمایش سے دوچار ہی نہ کرنا بلکہ فرمایا: «وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ»

مسند احمد وغیرہ کی روایت میں «اَللّٰهُمَّ صَبْرًا» کے الفاظ بھی ہیں کہ ''اے اللہ! (تیرے محبوب نبی ﷺ نے جو پیش گوئی کی ہے وہ تو یقیناً پوری ہو کر ہی رہے گی، تو میری مدد کرنا۔ اور) اس آزمایش میں مجھے صبر وہمّت عطا کرنا۔''

یہ دونوں حدیثیں جو دیگر کتب کے علاوہ خاص بخاری ومسلم جیسی بلند پایہ اور مسلّمہ صحت کتب میں موجود ہیں، یہ اصحابِ ثلاثہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمرِ فاروق اور حضرت عثمانِ ذوالنورین رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب کی ایسی شہادتیں ہیں کہ اگر انھیں دوسری کوئی بھی فضیلت میسر نہ آتی تو ان کے لیے یہی کچھ بھی کیا کم تھا؟ مگر ان بزرگوں کے اوصافِ حمیدہ اور فضائلِ سدیدہ سے تو کتابیں بھری پڑی ہیں۔ رضي اللّٰه عنهم۔

فضائل ومناقبِ حضرت علی رضی اللہ عنہ

نام ونسب اور حالاتِ زندگی:

نبی ﷺ کے چوتھے خلیفۂ راشد کا اسمِ گرامی حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم ہاشمی تھا۔ آپ کی کنیت ابو الحسن تھی اور نبی ﷺ نے انھیں ''ابو تراب'' کی کنیت عطا فرمائی۔ راجح روایت کی رو سے دس برس کی عمر کے تھے کہ اسلام قبول کیا اور بچوں میں سب سے پہلے مسلمان ہونے کا شرف پایا۔ ابو تراب کنیت پانے کا واقعہ صحیح بخاری شریف میں حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے اور اس حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی یہ کنیت بہت ہی پسند تھی، کیوں کہ یہ نبی اقدس ﷺ کی عطا کردہ تھی۔[1]

شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے دن بروز جمعہ ۱۸ ذوالحج ۳۵ھ کو خلیفہ ہوئے۔ چار سال نو ماہ اور چند دن

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠٤) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٢٥)

خلافت رہی اور ایک شقی القلب خارجی عبد الرحمٰن بن ملجم مرادی کے ہاتھوں تیرہ رمضان ۴۰ھ کو کوفہ میں تریسٹھ برس کی عمر (مسنون) میں شہادت پائی۔ شہادت کے دن وہ تمام زندہ بنی آدم میں سب سے افضل انسان تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ چھیاسی حدیثوں کے راوی ہیں جن میں سے بیس متفق علیہ، نو صرف بخاری میں، پندرہ صرف مسلم میں اور باقی دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ہیں۔[1]

فضائل و مناقب:

کم سن مسلمانوں میں سے سب سے پہلے اسلام میں داخل ہونے والے، نبیِ رحمت ﷺ کے داماد اور چچا زاد، جگر گوشۂ رسول ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہرِ نامدار، حسنین رضی اللہ عنہما کے والدِ ماجد اور فاتحِ خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب، سیرت وسوانح اور وقائع حیات کی فہرست بھی بڑی طویل ہے۔ کتبِ تاریخ وسیرت کی روایات و حکایات سے قطع نظر، اگر صرف صحیح احادیثِ رسول ﷺ کو ہی دیکھا جائے تو ان کا مقامِ بلند اور مرتبہ عالی معلوم ہو جاتا ہے۔ ان کے مقام و مرتبے کا اندازہ تو صحیح مسلم اور ترمذی شریف وغیرہ میں مذکور اس ارشادِ نبوی ﷺ سے ہی لگایا جاسکتا ہے جس میں نبی ﷺ نے حبِ علی رضی اللہ عنہ کو ایمان کی علامت اور بغضِ علی رضی اللہ عنہ کو نفاق کی نشانی قرار دیا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم و ترمذی وغیرہ میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''مجھے قسم ہے اس ذاتِ الٰہی کی جس نے دانے کو چیر کر انگوری نکالی اور نسلِ انسانی تخلیق فرمائی کہ نبی ﷺ نے میری نسبت وصیت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«لَا یُحِبُّنِيْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا یُبْغِضُنِيْ اِلَّا مُنَافِقٌ»[2]

''میرے ساتھ محبت کرنے والا مومن اور مجھ سے نفرت کرنے والا منافق ہوگا۔''

شارحین نے اس ارشادِ نبوی ﷺ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہاں افراط وتفریط اور غلو سے پاک شرعی محبت مراد ہے جو حقیقت اور واقع کے مطابق

---

[1] تحفة الأحوذي (١٠/ ٢٠٩) المرعاة (١/ ١٦٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٣٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٢٤) تخريج المسند، رقم الحديث (٦٤٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧١٩) سنن الترمذي (١٠/ ٢٣٩) واللفظ لمسلم.

ہو۔ اس طرح نُصَیری وخارجی جو حبِ علی رضی اللہ عنہ میں افراط وتفریط کا شکار ہوئے وہ محبانِ علی رضی اللہ عنہ سے خارج ہو گئے۔ ایسے ہی جو شخص حب علی رضی اللہ عنہ کے دعوے کے پہلو بہ پہلو بغضِ ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما (اور بغضِ صحابہ رضی اللہ عنہم) میں مبتلا ہو، اس کی حبِ علی رضی اللہ عنہ بھی حبِ مشروع شمار نہیں کی گئی اور وہ شخص جو دعوائے مسلمانی کے باوجود بغضِ علی رضی اللہ عنہ کا شکار ہو، وہ اس ارشادِ نبوی ﷺ کی رو سے حقیقی یا حکمی منافق ہوگا۔''[1]

کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حبیبِ الٰہ اور حبیبِ مصطفیٰ ﷺ تھے، جیسا کہ بخاری ومسلم وغیرہ میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''غزوۂ خیبر پر روانگی کے دن نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کل یہ جھنڈا میں اس آدمی کو عطا کروں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ خیبر کی فتح دے گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھنے والا ہو گا۔ اور جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ محبت کرتے ہیں۔''

جب صبح ہوئی تو تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور ہر صحابی رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ یہ جھنڈا اسے ہی ملے۔ نبی مکرم ﷺ نے پوچھا:

''علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہاں ہے؟''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے بتایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ان کی آنکھیں خراب ہیں۔ فرمایا:

''اسے پیغام بھیجو۔''

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم جا کر انھیں لے آئے، نبیِ اکرم ﷺ نے ان کی آنکھوں پر اپنا لعابِ دہن یعنی تھوک لگایا جس سے ان کی آنکھوں کی تکلیف ایسے غائب ہوگئی کہ گو یا کوئی تکلیف تھی ہی نہیں، پھر انھیں وہ جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (جھنڈا ہاتھ میں لے کر) فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں ان (اہلِ خیبر یہود) سے اس وقت تک جہاد کرتا رہوں گا جب تک وہ بھی ہماری طرح (مسلمان) نہ ہو جائیں۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] تحفة الأحوذي (١٠ / ٢٣٩۔ ٢٤٠)

''آرام وسکون سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤ اور جب ان (اہلِ خیبر) کے علاقے میں پہنچ جاؤ تو پہلے انھیں اسلام کی دعوت دینا، اور بتانا کہ ان پر اسلام کی رو سے کیا کیا حقوق اللہ واجب ہیں۔ اور آگے فرمایا:

«فَوَ اللّٰهِ لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِداً خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمُرُ النَّعَمِ»[1]

''اللہ کی قسم! اگر تمھارے ذریعے اللہ تعالیٰ کسی ایک انسان کو راہِ ہدایت پر لگا دے تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے۔''

صحیحین وغیرہ کی اس حدیث میں فتحِ خیبر کی پیش گوئی ہے اور وہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں۔ اسی مناسبت سے وہ ''فاتحِ خیبر'' کے لقب سے بھی معروف ہیں۔ اور اس ارشادِ نبوی ﷺ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے دوسری بشارت یہ بھی مذکور ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے، اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ ان سے محبت رکھتے ہیں۔ بخاری ومسلم میں تو یہاں تک ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَنْتَ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْكَ»[2] ''اے علی (رضی اللہ عنہ)! تم مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباري'' میں اس ارشادِ نبوی ﷺ کے تحت لکھا ہے:

''حسب ومصاہرت اور محبت ومسابقت میں ہم دونوں ایک دوسرے سے ہیں۔''[3]

اس واضح مفہوم کے علاوہ کوئی من چاہا مطلب لینا اس لیے صحیح نہیں کہ ایسے ہی الفاظ نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ کے علاوہ اشعریوں اور بنی ناجیہ کے بارے میں بھی ارشاد فرمائے ہیں، جیسا کہ صحیح مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں مذکورہ احادیثِ صحیحہ سے پتا چلتا ہے۔[4]

---

[1] **متفق عليه**. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٦١) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٣٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٩ ١٧)

[2] **متفق عليه**. صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨٣) مشكاة المصابيح (٢/ ١٠٠٧)

[3] بحواله تحفة الأحوذي (١ / ٢١١)

[4] انظر: تحفة الأحوذي (١٠ / ٢١٢) صحيح مسلم (٤/ ١٨- ١٩)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے یہی شرف کیا کم ہے کہ بخاری ومسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسَىٰ إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ»[1]

''اے علی رضی اللہ عنہ! میری نسبت تمھارا مقام وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت حضرت ہارون علیہ السلام کا تھا، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔''

اس ارشادِ نبوی ﷺ کا صحیح مفہوم سمجھنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحیح مقام متعیّن کرنے کے لیے چند امور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً:

1. حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سگے بھائی تھے۔
2. حضرت ہارون علیہ السلام بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ سے مطالبے پر انھی کی طرح نبی بنا دیے گئے تھے۔
3. حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چالیس سال پہلے ان کی زندگی میں ہوگئی تھی۔
4. نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب نبیِ اکرم ﷺ انھیں اپنے پیچھے مدینہ منورہ چھوڑ کر خود غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہونے لگے تھے۔
5. امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اپنی زندگی میں ہی کوہِ طور پر مناجات کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو پیچھے چھوڑ گئے تھے۔[2]

ان پانچوں نکات کو سامنے رکھا جائے تو کوئی غلط مفہوم اخذ کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے اور فضیلت و منزلت کا بھی پتا چل جاتا ہے۔

ترمذی و مسند احمد وغیرہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ»[3]

---

[1] **متفق عليه**. صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨٣) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٦٤٣) مشكاة المصابيح (٣/ ١٩ ١٧)

[2] تحفة الأحوذي (١٠ / ٢٢٩_ ٢٣٥، ٢٣٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٣١٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٨٤٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٨) مسند أحمد (٢/ ١٩٩) و صححه احمد شاكر و تخريج المسند، رقم الحديث (٩٦١) و حسنه الأرناؤوط و ١٩٣٢٨ و صححه، صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٣١) السلسلة الصحيحة (٤/ ٣٣١) و صححه ←

''جس کا میں دوست ہوں اسی کے علی رضی اللہ عنہ بھی دوست ہیں۔''

ترمذی میں ہے:

«اِنَّ عَلِيًّا مِنِّيْ وَ اَنَا مِنْهُ وَهُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ»[1]

''بیشک علی مجھ سے ہے، اور میں اس سے ہوں، اور وہ تمام اہلِ ایمان کا دوست ہے۔''

ان ارشادات میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے، البتہ جو غلط مفہوم اخذ کیا جاتا ہے، اس کی تفصیلی وجوہات کے لیے ملاحظہ ہو: تحفة الأحوذي (١٠ / ٢١١۔ ٢١٦)

فضائل و مناقبِ علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت جو بڑی معروف ہے:

«اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا»[2]

''میں حکمت کا گھر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں۔''

یہ روایت خود امام ترمذی اور ان کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ البانی، علامہ عبد الرحمٰن مبارک پوری اور دیگر محدثین کے نزدیک سخت ضعیف اور نا قابلِ استدلال ہے۔[3]

ایسے ہی ایک اور روایت میں ہے:

«اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا»[4] ''میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں۔''

یہ حدیث بھی من گھڑت ہے۔[5]

← وقال: رواه علي بن أبي طالب و زيد بن أرقم و ثلاثون من الناس، ابن أبي شيبة، رقم الحديث (٣٢٧٣٥) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٢٠) وصححه الألباني.

[1] السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٢٣) والمرجع السابق.

[2] سنن الترمذي مع التحفة (١٠ / ٢٢٦) ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٢٣) مشكاة المصابيح (٢/ ١٧٢١)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: تحفة الأحوذي (١٠ / ٢٢٦۔ ٢٧) مشكاة المصابيح و تحقيقه (٣/ ١٧٢١) و رسالة ملحقة بالمشكاة لابن حجر عسقلاني (٣/ ٨٨ ٧۔ ٧٨٩)

[4] الكامل في الضعفاء لابن عدي (١/ ٣١١) تاريخ ابن عساكر (٤٥/ ٣٢١) موضوعات ابن الجوزي (٢/ ١١٦) مجمع الزوائد للهيثمي (٩/ ١١٧) الفوائد المجموعه للشوكاني (٣٤٨) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٩٥٥) و قال: موضوع.

[5] تفصیل کے لیے دیکھیں: ماہنامہ ''محدّث'' لاہور (جلد ١٧، شمارہ ٣، ٤، ٥، مشترکہ ٦، ٧ از ربیع الاول ١٤٠٧ تا رجب ١٤٠٧ھ بمطابق نومبر ١٩٨٦ تا مارچ ١٩٨٧ء) مضمون مولانا غازی عزیر صاحب، ینبع، السعودیہ/ حالیاً و حوالہ جاتِ مذکورہ سابقہ)

فضائل و مناقبِ عشرہ مبشرہ و خلفائے راشدین اربعہ وغیرہم رضی اللہ عنہم

نبی ﷺ کی سیرتِ طیبہ، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بالترتیب اور یکے بعد دیگرے چاروں کے فضائل و مناقب مختصر انداز سے آپ کے سامنے رکھے جا چکے ہیں جو ہم نے صرف ان احادیث سے اخذ کیے ہیں جنھیں اہلِ علم نے صحیح اور حسن قرار دیا ہے۔ اس باب میں ضعیف اور موضوع و من گھڑت روایات بھی بکثرت ہیں جن سے ہم نے عمداً گریز کیا ہے اور کوئی ایک روایت بھی منتخب کر کے براہِ استدلال آپ کے سامنے نہیں رکھی، کیوں کہ جب صحیح و ثابت احادیثِ رسول ﷺ کا وافر ذخیرہ موجود ہے تو اسی پر اکتفا کرنے میں برکتیں اور دین و ایمان کی سلامتی ہے۔ اور یہ اصول نہ صرف اِن فضائل و مناقب کے سلسلے میں ہے بلکہ ہر موضوع کے لیے ہمارا طریقِ کار یہی ہونا چاہیے کہ حتیٰ المقدور کوشش اور تلاش کے بعد صرف صحیح وحسن درجہ کی احادیث سے استدلال کیا جائے۔ وَالْعِصْمَةُ لِلّٰهِ وَ بِيَدِهِ التَّوْفِيْقُ.

کتنی ہی احادیثِ رسول ﷺ ایسی بھی ہیں جن میں ان چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب یکجا ہیں اور ان میں سے بعض میں چھے دیگر جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں جو مجموعی طور پر ''عشرہ مبشرہ'' کے نام سے معروف ہیں۔ اُن دس صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بخاری و مسلم کی حدیث میں نبی ﷺ نے اپنا ''حواری'' قرار دیا۔[1] اور « فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ » فرما حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی عظمت کو چار چاند لگا دیے۔[2]

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بخاری و مسلم کے ایک ارشادِ نبوی ﷺ میں ''أَمِيْنُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ'' کے لقب سے نوازا۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٤٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٩) تخريج المسند، رقم الحديث (١٦١١٣) و صححه الأرناؤوط.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١١) تخريج المسند الحديث (٧٠٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٩١) سنن النسائي في الكبرىٰ (٨٢٤٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٣، ١٥٤) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٢٥٢) تخريج المسند، رقم الحديث (١٢٧٨٩) انظر المشكاة المصابيح (٣/ ١٧٢٥_١٧٢٦)

جبکہ ترمذی و ابن ماجہ اور مسند احمد کی ایک صحیح حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے دس صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنتی ہونے کی خوش خبری سنائی، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«أَبُوْ بَكْرٍ فِيْ الْجَنَّةِ، وَعُمَرُ فِيْ الْجَنَّةِ، وَعُثْمَانُ فِيْ الْجَنَّةِ وَعَلِيٌّ فِيْ الْجَنَّةِ، وَطَلْحَةُ فِيْ الْجَنَّةِ، وَالزُّبَيْرُ فِيْ الْجَنَّةِ وَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِيْ الْجَنَّةِ، وَ سَعَدُ بْنُ اَبِيْ وَقَاصٍ فِيْ الْجَنَّةِ، وَسَعِيْدُ بْنُ زَيْدٍ فِيْ الْجَنَّةِ، وَاَبُوْ عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فِيْ الْجَنَّةِ»[1]

''ابو بکر جنتی ہیں، عمر جنتی ہیں، عثمان جنتی ہیں، علی جنتی ہیں، طلحہ جنتی ہیں، زبیر جنتی ہیں، عبد الرحمٰن بن عوف جنتی ہیں، سعد بن ابی وقاص جنتی ہیں، سعید بن زید جنتی ہیں اور ابو عبیدہ بن جراح بھی جنتی ہیں۔''

ایک حدیث میں یہ نام لینے سے پہلے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

«عَشَرَةٌ فِيْ الْجَنَّةِ»[2] ''یہ دس اشخاص جنتی ہیں۔''

بہر حال اس حدیثِ شریف میں ایسے دس سعادت مند صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی ہیں جنھیں اس دنیا میں ہی جنت کا پروانہ مل گیا تھا۔

بخاری شریف کے ایک ارشادِ نبوی ﷺ میں حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کو بھی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرح ''فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ'' کہنے کے اس شرف سے نوازا گیا۔ غزوۂ اُحد کے دن ان سے مخاطب ہوکر فرمایا:

«يَا سَعَدُ! اِرْمِ فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ»[3]

''اے سعد! تیراندازی کرتے جاؤ، تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔''

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٤٧) سنن النسائی في الكبریٰ (٥/ ٥٦) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٠٠٢) تخريج المسند، رقم الحديث (١٦٧٥) مشكاة المصابيح (٣/ ٢٦ ١٧) و صححه، سنن الترمذي مع التحفة (١٠/ ٢٤٩) الفتح الرباني (٢٢/ ١٨٩)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٤٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٣) مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٢٩) تخريج ابن حبان، رقم الحديث (٧٠٠٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١١)

بخاری و مسلم کی ایک حدیث جس میں حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کو جنت میں ایک محل ملنے کی بشارت دی گئی ہے، اسی میں یہ بھی مذکور ہے کہ میں نے جنت میں اُمِّ انس حضرت رُمَیصاء رضی اللہ عنہا کو دیکھا۔ اسی حدیث میں ہے کہ میں نے ایک آہٹ سی سنی، پوچھا یہ کون ہے؟ تو حضرت (حضرت جبرائیل علیہ السلام نے) بتایا کہ یہ (آپ ﷺ کے موذن) بلال رضی اللہ عنہ ہیں۔[1]

ترمذی شریف وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنَّهٗ عَاشِرُ عَشَرَةٍ فِیُ الْجَنَّةِ»[2]

''یہ بھی دس جنتی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں، یعنی ان کی طرح ہی جنتی ہیں۔''

بخاری و مسلم شریف میں ہے کہ زمین پر چلتے پھرتے ہی حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی ﷺ نے یہ بشارت دے دی: «اِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ»[3] ''وہ اہلِ جنت میں سے ہیں۔''

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں حضرت قیس بن عباد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی داخل ہوا جس کے چہرے پر خشوع کے آثار نظر آرہے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ یہ شخص اہلِ جنت میں سے ہے۔ اس تفصیلی حدیث کے آخر میں ان کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ منقول ہے:

«اَنْتَ عَلَی الْاِسْلَامِ حَتّٰی تَمُوْتَ»[4]

''موت آنے تک تم اسلام پر رہو گے۔''

آگے یہ بھی مذکور ہے کہ وہ شخص حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تھے۔''

غالبًا اسی بشارت کی بنا پر اور دوسری جنت کی بشارتوں کے پیشِ نظر صحابہ رضی اللہ عنہم نے یقین سے کہا کہ یہ شخص اہلِ جنت میں سے ہے۔ صحیح بخاری و مسلم شریف وغیرہ میں ہے:

نبی ﷺ کو ریشم کا ایک حلہ ہدیہ دیا گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے چھونا اور اس کی نرمی پر تعجب

---

[1] مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٠٢ و ١٧٤٨) تفصیلی تخریج فضائلِ فاروق رضی اللہ عنہ میں گزر چکی ہے۔

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٠٤) وصححه الأرناؤوط، تخريج المسند، رقم الحديث (٢٢١٠٤) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧١٦٥) مشكاة المصابيح (٢/ ١٧٥٧) سنن الترمذي مع التحفة (١٠ / ٣٠٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨١٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧١٦٣) تاريخ دمشق (٢٩/ ١١٨) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٤)

کرنا شروع کیا، تو نبی ﷺ نے فرمایا:

''تم اس کی نرمی پر تعجب کر رہے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو جنت میں ایسے رومال دیے جائیں گے جو اس سے کہیں زیادہ بہتر اور نرم ہوں گے۔''[1]

مسند احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ان حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی بشارت مذکور ہے، چنانچہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کو ریشم کا ٹکرا ہدیے میں ملا جس کی نرمی و حسن پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم عش عش کر اٹھے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«..... لَمَنَادِيْلُ سَعْدٍ فِيْ الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِّنْهَا»[2]

''..... جنت میں سعد بن مالک (رضی اللہ عنہ) کے رومال اس سے بھی اچھے ہوں گے۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہی صحیح بخاری و مسلم شریف میں ہے:

«اِهْتَزَّ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ لِمَوْتِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ»[3]

''سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کی موت پر عرشِ الٰہی ہل گیا۔''

نسائی شریف میں ہے:

«هٰذَا الَّذِيْ تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَشَهِدَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفاً مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ»[4]

''یہ وہ (سعادت مند) شخص ہے کہ جس کے لیے عرش بھی حرکت میں آ گیا، آسمان کے دروازے

---

[1] مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٩) الفتح الرباني (٢٢/ ٢٥٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٦٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣١٧) سنن البيهقي (٣/ ٢٧٤) تخريج المسند، رقم الحديث (١٣٤٥٥، ١٣٦٢٦) الفتح الرباني (٢٢/ ١٨٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٦٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٠٣١) مسند أحمد، رقم الحديث (١١٢٠٠) مشكاة المصابيح (٣/ ٧٤٩)

[4] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٥٤) مشكاة المصابيح (١/ ٤٩) وصححه الألباني

اس کے لیے کھول دیے گئے اور اس کے جنازے میں ستر ہزار فرشتے شریک ہوئے۔''

علامہ عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی روح کی آمد پر خوشی و مسرت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے مقام و مرتبہ اور اکرام و احترام پر عرشِ الٰہی حرکت میں آیا۔ عرش کے جمادات میں ہونے کے باوجود یہ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں نیک ارواح اور ان کے کمالات میں تمیز کی قوت و ادراک پیدا کر دیا ہو۔''[1]

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''اہلِ علم کے مذکورۃ الصدر حدیث کے مفہوم میں مختلف اقوال ہیں: ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اس کے ظاہری معنیٰ مراد ہیں کہ عرشِ الٰہی ہی ہلا، اور اس کا ہلنا حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی روح کی آمد پر اظہارِ مسرت تھا اور یہی زیادہ صحیح بات ہے۔''[2]

اور صرف یہی نہیں کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے جنازے میں ستر ہزار فرشتے شریک ہوئے بلکہ فرشتوں نے ان کے جنازے کو کندھا بھی دیا، جیسا کہ ترمذی شریف و صحیح ابن حبان وغیرہ میں ہے: جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو بعض منافقین نے طنزیہ کہا کہ کتنا ہلکا ہے ان کا جنازہ، اور یہ ہلکا پن ان کے بنی قریظہ میں حَکم بننے کی وجہ سے ہے۔ یہ خبر نبی ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنازہ اس وجہ سے ہلکا نہیں بلکہ اس کی وجہ ہے:

«اِنَّ الْمَلٰٓئِکَةَ کَانَتْ تَحْمِلُهٗ»[3] ''فرشتے ان کے جنازے کو اٹھائے ہوئے تھے۔''

صحیح مسلم شریف میں خطیبِ انصار حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے: «هُوَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ»[4] ''وہ اہلِ جنت میں سے ہیں۔''

---

[1] المرعاة (١/ ٢٣١) طبع مكتبه اثريه سانگله هل.

[2] بحواله الفتح الرباني (٢٢/ ٢٥٤) فتح الباري (٧/ ٢٤۔ ١٢٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٤٩) مسند البزار (٧٢٥٤) شرح السنة للبغوي (١٤/ ١٨٢) و صححه الأرناؤوط، ابن حبان، رقم الحديث (٧٠٣٢) السلسلة الصحيحة (٧/ ١٠٥١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩) تخريج المسند، رقم الحديث (١٢٣٩٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧١٦٨) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٥٠)

مسلم شریف میں ہی مروی ہے: حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے غلام نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی شکایت کی اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ وہ ضرور جہنم میں داخل ہوگا تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«كَذَبْتَ، لَا يَدْخُلُهَا، فَإِنَّهُ قَدْ شَهِدَ بَدْراً وَ الْحُدَيْبِيَّةَ»[1]

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ (ہرگز) جہنم میں داخل نہیں ہوں گے، کیوں کہ وہ تو غزوۂ بدر و حدیبیہ میں شریک تھے۔''

فضائل و مناقبِ اہلِ بدر رضی اللہ عنہم

نبی ﷺ کے وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے اسلام کے پہلے معرکۂ حق و باطل غزوۂ بدر میں شرکت کی، ان کا ذکرِ خیر نہ صرف احادیث میں بلکہ خود قرآنِ کریم میں بھی آیا ہے۔ چنانچہ سورت آل عمران کی (آیت: ۱۲۳) ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ﴾ سے لے کر آیت ۱۲۶ تک اہلِ بدر کے بارے میں نازل ہوئیں، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٢٣﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿١٢٤﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ [آل عمران: ۱۲۳۔ ۱۲۶]

''اور البتہ اللہ تعالیٰ (ایک سال پہلے) بدر میں تمھاری مدد کر چکا تھا اس وقت تم تھوڑے سے تھے (یا بے سامان تھے) پس ڈرو اللہ سے تو کہ تم احسان مانو۔ جب تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کیا تم کو بس نہیں اللہ تین ہزار فرشتوں کو تمھاری مدد کے لیے بھیج دے وہ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٦٤) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨٢٩٦) مسند أحمد، رقم الحديث (١٤٤٨٤) السلسلة الصحيحة (٥/ ١٩٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٥٩)

آسمان سے اتریں۔ کیوں نہیں (یہ تم کو بس ہیں) اگر تم (میدان جنگ میں) جمے رہو اور (میری بات نہ سننے اور بھاگنے سے) بچے رہو اور دشمن اسی دم تم پر چڑھ آئیں تو تمھارا مالک پانچ ہزار فرشتوں سے جن پر نشان ہوگا تمھاری مدد کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ مدد اس لیے بھیجی کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمھارے دلوں کو اس سے تسلی ہو ورنہ فتح تو اللہ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست ہے حکمت والا (دوسرا مطلب یہ تھا)۔''

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول پوری سورۃ الانفال[1] یا پھر اس کا اکثر حصہ اور بالخصوص آیت ۹ تا ۱۲ تو غزوۂ بدر اور بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئیں۔[2] چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴾ [الأنفال: ۹۔ ۱۲]

''جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کر لی کہ بے شک میں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرنے والا ہوں، جو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں۔ اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر ایک خوش خبری اور تاکہ اس کے ساتھ تمھارے دل مطمئن ہوں اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے۔ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔ جب وہ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا، اپنی طرف سے خوف دور کرنے کے لیے اور تم پر آسمان سے پانی اتارتا تھا، تاکہ اس کے ساتھ تمھیں پاک کر دے اور تم سے شیطان کی گندگی دور کرے اور تاکہ تمھارے دلوں پر مضبوط گرہ باندھے

---

[1] بحواله فتح الباري (٧/ ٢٨٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ٢٨٤)

اور اس کے ساتھ قدموں کو جما دے۔ جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، پس تم ان لوگوں کو جمائے رکھو جو ایمان لائے ہیں، عنقریب میں ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا، رعب ڈال دوں گا۔ پس ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ۔''

وہ غزوۂ بدر جس میں بخاری شریف کے مطابق تین سو دس اور کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم اور مورخین کے بقول تین سو تیرہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت فرمائی۔[1] جن میں سے پینتالیس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی خود بخاری شریف میں ہی مذکور ہیں۔[2]

میدانِ بدر میں حاضر ہونے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نبی ﷺ کا ایک ارشادِ گرامی بخاری و مسلم اور ابو داود وغیرہ میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرمایا:

«اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ فَقَدۡ وَجَبَتۡ لَکُمُ الۡجَنَّةُ»[3]

''آج کے بعد تم جو بھی عمل کرو تمھارے لیے جنت واجب ہو گئی۔''

ایک روایت میں ہے: «قَدۡ غَفَرۡتُ لَکُمۡ»[4] ''میں نے تمھیں بخش دیا۔''

بخاری شریف میں ہے کہ نبی ﷺ کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور آکر پوچھا کہ اہلِ بدر کا تمھارے یہاں کیا مقام ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مِنۡ اَفۡضَلِ الۡمُسۡلِمِیۡنَ»[5] ''ان کا شمار افضل مسلمانوں میں سے ہوتا ہے۔''

اور ساتھ ہی جبرائیل علیہ السلام نے بھی فرما دیا کہ جو فرشتے میدانِ بدر میں آئے تھے، ان کا بھی یہی مقام ہے (کہ وہ فرشتوں میں سے افضل ہیں)۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ٢٩١۔ ٢٩٢)

[2] نفس المرجع (ص ٣٢٦) و مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٦٣)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ٣٠٥، رقم الحديث: ٦٩٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٥٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٠٥) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (١١٥٨٥) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧١١٩) مسند أحمد، رقم الحديث (١٤٣١٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٥٤) الفتح الرباني (٢٢/ ١٩٣)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ٣٠٥) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٥٤) الفتح الرباني (٢٢/ ١٩٣)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٩٢)

فضائل و مناقبِ اہلِ حُدیبیہ رضی اللہ عنہم

غزوۂ بدر کی طرح ہی حدیبیہ اور بیعتِ رضوان میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کی تعداد بخاری و مسلم کے مطابق ایک ہزار چار سو تھی۔[1] ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت و رفعت کا انداز بھی اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ سورۃ الفتح اول تا آخر پوری انتیس آیات ہی نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہیں۔ اور بطورِ خاص آیت نمبر (۱۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾

''اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے یقیناً راضی ہوگیا ہے جو (ببول کے) ایک درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔''

آخری آیت (۲۹) میں فرمایا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾

''محمد اللہ کا پیغمبر ہے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں (یعنی صحابہ) وہ کافروں پر سخت ہیں آپس میں (ایک دوسرے پر) رحم دل ہیں (اے دیکھنے والے!) تو ان کو دیکھتا ہے (کبھی) رکوع کر رہے ہیں (کبھی) سجدہ کر رہے ہیں) اللہ کے فضل اور اس کے رضامندی کی فکر میں رہتے ہیں ان کی نشانی ان کے منہ پر ہے یعنی سجدے کی نشانی یہ تو ان کا حال تو رات شریف میں بیان ہوا ہے اور انجیل شریف میں ان کی مثال ایک کھیتی کی سی بیان کی گئی ہے جس نے زمین سے اپنی کونپل نکالی (مولکہ یا پٹھا) پھر اسے زور دار کیا وہ موٹی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۵۷۷) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸۵٦) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٤٨٧٥) مشكاة المصابيح (۳/ ۱۷٥٤)

ہوگئی اب نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی کسانوں کو بھلی لگنے لگی اللہ تعالیٰ نے یہ (اس لیے) کہ کافر ان کو دیکھ کر جلیں ان لوگوں میں جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان سے اللہ تعالیٰ نے بخشش کا اور بڑے نیگ کا وعدہ کیا ہے۔''

صحیح مسلم، ابوداود، ترمذی اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِنِّیْ لَارْجُوْ اَنْ لَّا یَدْخُلَ النَّارَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اَحَدٌ شَهِدَ بَدْراً وَالْحُدَیْبِیَّةَ»[1]

''مجھے امید ہے کہ بدر وحدیبیہ کے میدان میں حاضر ہونے والے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ان شاء اللہ کوئی شخص بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔''

مسلم، ابوداود، ترمذی اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جنھوں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی ان میں سے ان شاء اللہ ایک شخص بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔''[2]

بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم حدیبیہ کے دن چودہ سو آدمی تھے اور نبیِ رحمت ﷺ نے ہم سے فرمایا:

«اَنْتُمُ الْیَوْمَ خَیْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ»[3]

''آج تم روئے زمین پر سب سے بہترین لوگ ہو۔''

فضائل ومناقبِ انصار ومہاجرین رضی اللہ عنہم

بخاری و مسلم شریف میں بلاتفریق تمام انصارِ مدینہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«آیَةُ الْاِیْمَانِ حُبُّ الْاَنْصَارِ وَآیَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْاَنْصَارِ»[4]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٩٦) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣٤٧٣) کتاب السنة (٨٦٠) و صححه الألباني علىٰ شرط مسلم، مشکاة المصابیح (٣/ ١٧٥٤) الفتح الرباني (٢١/ ١٠٨ و ٢٢ / ١٩٤) تخریج المسند، رقم الحدیث (٢٦٤٤٠)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٩٦) مشکاة المصابیح (٣/ ١٧٥٤) الفتح الرباني ٢١/ ١٠٨ و ٢٢ / ١٩٤)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١٥٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٥٦) مشکاة المصابیح (٣/ ١٧٥٤)

[4] صحیح البخاري (٧/ ١١٣: ٣٧٤٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٤) سنن النسائي، رقم الحدیث (٥٠١٩ و في الکبرىٰ: ١١٧٥٠) تخریج المسند، رقم الحدیث (١٣٦٠٧) مشکاة المصابیح (٣/ ١٧٥١)

''انصار سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور انصار سے بُغض و عداوت نفاق کی نشانی ہے۔''

بخاری ومسلم میں ہی فرمایا:

«مَنْ اَحَبَّهُمْ اَحَبَّهُ اللّٰهُ وَ مَنْ اَبْغَضَهُمْ اَبْغَضَهُ اللّٰهُ»[1]

''جس نے (انصار سے) محبت کی، اس سے اللہ نے محبت کی اور جس نے ان سے بُغض ونفرت کی، اس سے اللہ نے بُغض ونفرت کی۔''

بخاری ومسلم شریف میں ہے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَاَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ وَاَبْنَاءِ اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ»[2]

''اے اللہ! انصار، ان کی اولاد، اور ان کی اولاد کی اولاد کی مغفرت فرما۔''

بخاری شریف میں یکے بعد دیگرے دو حدیثیں ایسی ہیں جن کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ نبی ﷺ نے قسم کھا کر دو تین مرتبہ انصار کے بارے میں فرمایا:

«إِنَّكُمْ أَحَبُّ النَّاسِ اِلَيَّ»[3] ''تم مجھے سب لوگوں سے زیادہ عزیز ہو۔''

سورۃ الحشر (آیت: ۸) فضائلِ مہاجرین اور (آیت: ۹) فضائلِ انصار پر ہی مشتمل ہے۔

چنانچہ سورۃ الحشر (آیت: ۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَ اَمْوٰلِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾

''(اور) ان مفلسانِ تارکینِ وطن کے لیے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٠٠) سنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨٣٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٣) مسند أحمد، رقم الحديث (١٨٥٠٠) حواله سابقه.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٠٩) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (١٠١٤٦) مسند أحمد، رقم الحديث (١٢٤٣٧) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٢٨٠) مشكاة المصابيح (٣/ ٧٥٣)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١١٣، ١١٤، رقم الحديث: ٣٧٨٦) تخريج المسند، رقم الحديث (١٢٣٠٦)

جدا) کر دیے گئے ہیں (اور) اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار اور اللہ اور اس کے پیغمبر کے مددگار ہیں یہی لوگ سچے (ایماندار) ہیں۔''[1]

نیز اس سے اگلی آیت نمبر (۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

''اور (ان لوگوں کے لیے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے (اور) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور) خلش نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدّم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو اور جو شخص حرصِ نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔''[2]

سورۃ التوبہ (آیت: ۱۰۰) میں تو اہلِ بیت وزوجاتِ رسول ﷺ سمیت تمام صحابہ رضی اللہ عنہم و صحابیات رضی اللہ عنہن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کا پروانہ عطا کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسٰنٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾

''مہاجر و انصار میں سب سے پہلے (اسلام کی طرف) سبقت کرنے والے، اور وہ لوگ جنھوں نے خلوص کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا، اور وہ اللہ پر راضی ہو گئے۔''

جبکہ بخاری و مسلم شریف وغیرہ میں انصارِ مدینہ کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِصْبِرُوْا حَتّٰى تَلْقَوْنِيْ عَلَى الْحَوْضِ»[3]

---

[1] نیز دیکھیں: صحیح البخاري مع الفتح (۷/ ۸) باب مناقب المهاجرین وفضلهم.

[2] نیز دیکھیں: صحیح البخاري مع الفتح (۷/ ۱۱۔ ۱۹) باب مناقب الأنصار.

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۳۳۰) و مع الفتح (۷/ ۱۱۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۶۱) ←

''تم صبر کرو یہاں تک کہ تم مجھے حوض پر ملو گے، یعنی حوضِ کوثر پر ہماری ملاقات ہوگی۔''

ایک روایت میں ہے:

«اِصۡبِرُوۡا حَتّٰی تَلۡقَوۡنِیۡ وَ مَوۡعِدُکُمُ الۡحَوۡضُ»[1]

''تم صبر کرو، میری اور تمھاری ملاقات کا موعد ومقام حوضِ کوثر ہے۔''

یہ ارشاداتِ نبویہ ﷺ، تمام انصار رضی اللہ عنہم کے اہلِ جنت ہونے کی شہادت ہیں۔

بخاری ومسلم شریف میں نبی ﷺ کی یہ دعائیں مذکور ہیں:

«اَللّٰھُمَّ اَصۡلِحِ الۡاَنۡصَارَ وَالۡمُھَاجِرَۃَ»[2]

''اے اللہ! انصار ومہاجرین کی اصلاح فرما۔'' (اور انھیں نیک وصالح بنادے)۔''

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَللّٰھُمَّ لَا عَیۡشَ اِلَّا عَیۡشُ الۡآخِرَۃِ... فَاَصۡلِحِ الۡاَنۡصَارَ وَ الۡمُھَاجِرَۃَ»[3]

''اے اللہ! بس حقیقی زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے۔ پس تو مہاجرین وانصار کی اصلاح فرما۔''

بخاری ومسلم وغیرہ میں ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر قولِ انصار یہ تھا:

«نَحۡنُ الَّذِیۡنَ بَایَعُوۡا مُحَمَّداً ......عَلٰی الۡجِھَادِ مَا بَقِیۡنَا أَبَداً»

''ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے زندگی بھر (تاحیات) حضرت محمد (ﷺ) کی جہاد پر بیعت کی۔''

ان کے لیے جوابِ رسول ﷺ یہ تھا:

«اَللّٰھُمَّ لَا عَیۡشَ اِلَّا عَیۡشُ الۡآخِرَۃِ... فَاَکۡرِمِ الۡاَنۡصَارَ وَالۡمُھَاجِرَۃَ»[4]

← سنن الكبرىٰ للنسائي (٨٣٤٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٩٨) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٢٧٧) مسند أحمد، رقم الحديث (١١٥٤٧) تخريج المسند، رقم الحديث (١٨٥٨٢)

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١١٧، رقم الحديث ٧٣٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٥٩) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨٣٣٥) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٧٤٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠٥)

[3] حوالہ جاتِ سابقہ۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٥٧) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٥٧٨)

''اے اللہ! آخرت کی زندگی کے سوا کوئی زندگی (پائیدار) نہیں، تو تو پھر انصار ومہاجرین کو اِکرام بخش۔''

بخاری ومسلم وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خندق کی مٹی ڈھوتے دیکھ کر فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةِ ... فَاَغْفِرْ لِلْمُهَاجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارَ»[1]

''اے اللہ! آخرت کی زندگی ہی زندگی اصل ہے، پس تو مہاجرین وانصار کی بخشش فرما۔''

یہ تمام ارشاداتِ نبویہ ﷺ انصار ومہاجرین (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ حبِ رسول ﷺ کا مظہر ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١١٨، رقم الحديث: ٤٠٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠٤ـ ١٨٠٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٥٦) سنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨٣١٤) تخريج المسند، رقم الحديث (١٣٢٥٨)

اہلِ بیت کون کون؟

گذشتہ صفحات میں ہم نے نبی ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں مقام وشرفِ صحابیت کا ذکر کیا اور پھر آپ ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے علاوہ چند دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب بھی ذکر کیے، جن میں بطورِ خاص اُن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکرِ جمیل آیا جو خلفائے راشدین تھے یا پھر جنھیں اللہ کے نبی ﷺ نے دنیا ہی میں جنّت کی بشارتیں دی تھیں اور وہ قدسی نفوس صحابہ رضی اللہ عنہم بھی جنھیں خود اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اپنی رضا کا پروانہ عطا فرمایا ہے جن میں غزوۂ بدر و حدیبیہ اور بیعتِ رضوان کے شرکائے صحابہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مقام وشرفِ صحابیت جس طرح دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے ایک نہایت بڑی نعمت اور اعزاز ہے، اسی طرح وہ نبی ﷺ پر ایمان لانے والے آپ ﷺ کے قرابت داروں کے لیے بھی سرمایۂ افتخار ہے، بلکہ آپ ﷺ کے قرابتداروں یا اہلِ بیت یا اہلِ خانہ کو شرفِ صحابیت کے ساتھ ساتھ جو شرفِ قرابت حاصل ہے اس میں تو ان کا کوئی ثانی ہی نہیں، کیوں کہ ان کی پاکدامنی و پاک بازی اور تطہیر کا اہتمام خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴾

''اللہ یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کے گھر والو! تم سے ہر قسم کی گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔''

اب رہا مسئلہ یہ کہ نبی ﷺ کے گھر والوں، یا اہلِ خانہ یا اہلِ بیت میں کون کون لوگ شامل ہیں تو اس سلسلے میں اہلِ علم کی تین آرا ہیں:

1 اہلِ علم کی ایک جماعت جس میں ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباس اور انھی کے آزاد

کردہ غلام اور شاگرد امام عکرمہ رحمہ اللہ کے علاوہ عطاء کلبی، مقاتل اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ جیسے مفسرینِ قرآن اور سرکردہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس آیت میں مذکور اہلِ بیت سے مراد خاص نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ہیں۔

2 دوسری جماعت جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، قتادہ، اور ایک روایت میں کلبی رحمہم اللہ شامل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس آیت میں مذکور اہلِ بیت سے مراد خاص حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہم ہیں۔

3 محققین علمائے تفسیر کی تیسری جماعت جس میں امام ضحاک، امام قرطبی، امام ابن کثیر اور امام شوکانی رحمہم اللہ جیسے اساطینِ علم ومعرفت شامل ہیں، ان سب نے درمیانہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس آیت کے سیاق وسباق کی رو سے نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرت تو اہلِ بیت ہیں ہی، جبکہ قرابت اور نسبی تعلق کی بنا حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم بھی اہلِ بیت میں شامل ہیں۔ صحیح مسلم ومسند احمد کی ایک صحیح حدیث کی رو سے نسبی قرابت کی بنا پر آلِ علی رضی اللہ عنہ کی طرح ہی آلِ عقیل، آلِ جعفر اور آلِ عباس رضی اللہ عنہم کا اہلِ بیت ہونا بھی ثابت ہے۔

ان سب کے شاملِ اہلِ بیت ہونے کی صراحت کئی صحیح احادیث میں موجود ہے اور کثیر علمائے تفسیر وحدیث اور اہلِ تحقیق نے اسی تیسر سے موقف کو ترجیح دی ہے۔ سیاقِ قرآنی اور ارشاداتِ نبویہ ﷺ سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ نبی ﷺ کے اہلِ بیت یا اہلِ خانہ میں آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بھی شامل ہیں اور حضرت علی مرتضیٰ، حضرت فاطمۃ الزہراء، حضرت حسن وحسین اور آلِ عقیل وآلِ جعفر وآلِ عباس رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ عرفِ عام بھی اسی کا مؤید ہے کہ بچوں کے ساتھ بیویاں بھی اہلِ خانہ میں شامل ہوتی ہیں۔

نبیِ اکرم ﷺ کے اہلِ بیت میں کون کون حضرات شامل ہیں؟ اس موضوع کا یہ لبّ لباب یا خُلاصہ ہے جو ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اگر تفصیلات مطلوب ہوں تو کتبِ تفسیر میں سے امام قرطبی کی ''الجامع لاحکام القرآن المعروف تفسیر قرطبی'' (۷/۱۴/۱۸۲ تا ۱۸۴) امام ابن الجوزی کی تفسیر ''زاد المسیر فی علم التفسیر'' (۶/ ۳۸۱ و۳۸۲) تفسیر ابن کثیر عربی (۳/۴۸۲ تا ۴۸۷) یا تفسیر ابن

کثیر اردو (۴/ ۲۷۹ تا ۲۸۴) امام سیوطی کی تفسیر ''درِّ منثور'' (۵/ ۱۶۸۔ ۱۶۹) امام شوکانی کی تفسیر ''فتح القدیر'' (۴/ ۲۷۸ تا ۲۸۰) اور علامہ آلوسی کی تفسیر ''روح المعانی'' (۱۱/۲۲/۱۲ تا ۲۰)۔ اور کتبِ شروحِ حدیث میں سے علامہ عبد الرحمٰن مبارک پوری کی ''تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی'' (۹/ ٦٦۔ ٦٧) اور علامہ احمد عبد الرحمٰن البنّا کی ''الفتح الربانی''، ترتیب و شرح مسند احمد الشیبانی (۱۸/ ۲۳۷۔ ۲۳۸) کا مطالعہ فرمائیں۔[1]

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے خطابِ الٰہی

نبیِ اکرم ﷺ کے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم، خصوصاً آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا تذکرہ اور چند خاص ہدایات کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی سورۃ الاحزاب میں فرمایا ہے، اور اس سورت مبارکہ کا آغاز رئیسِ اہلِ بیت یا سربراہِ خاندانِ نبوی آخر الزماں، امام الانبیاء والرسل حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہوکر کیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ [الأحزاب: ١]

''اے میرے نبی! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور کفار ومنافقین کی باتوں میں نہ آؤ، بے شک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور بڑی حکمت والے ہیں۔''

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ [الأحزاب: ٢]

''جو کچھ تیری جانب تیرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کی پیروی کرتا رہ، یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہر ایک عمل سے باخبر ہے۔''

تیسری آیت میں فرمایا:

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴾ [الأحزاب: ٣]

---

[1] جو حضرات صرف آلِ علی رضی اللہ عنہ کے اہلِ بیت ہونے کے قائل اور اسی پر مصرّ ہیں۔ ان کا نقطہ نظر شیعی تفسیر ''الکافی، للفیض الکاشانی'' (۴/ ۱۸۷ تا ۱۸۹) میں مذکور ہے۔

’’تو اللہ تعالیٰ ہی پر توکّل رکھ، وہی کارسازی کے لیے کافی ہے۔‘‘

ان آیات میں تقویٰ و پرہیز گاری اختیار کرنے، اطاعتِ الٰہی پر کاربند رہنے اور توکّل و بھروسا کی تعلیمات ہیں۔ تنبیہ کی ایک مؤثر صورت یہ بھی ہے کہ بڑے کو کہا جائے تا کہ چھوٹا خود ہی چوکنّا ہو جائے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو کوئی بات تاکید سے کہے تو ظاہر ہے کہ دوسروں کے لیے وہ تاکید اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ سورۃ الاحزاب کی ہی اگلی دو آیتوں میں ظِہار یعنی اپنی بیوی کو ماں کہہ بیٹھنے اور متبنّٰی بنانے یعنی کسی کے بیٹے کو اپنا منہ بولا یا لے پالک بنانے کی شرعی حیثیت اور احکام بیان کرنے کے بعد چھٹی آیت میں نبیِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا مقام و مرتبہ اور حیثیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ﴾ [الأحزاب: ٦]

’’نبی تو اہلِ ایمان پر خود ان کی اپنی ذات سے بھی زیادہ حق رکھنے والے اور مہربان ہیں اور نبی کی ازواج مومنوں کی مائیں ہیں۔‘‘

آیاتِ خیار (۲۸۔ ۲۹) میں دیے گئے اختیار میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے سرخرو نکلنے کے بعد اُن کی نبی ﷺ سے ابدی رفاقت کا منہ بولتا ثبوت موجود ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴾ [الأحزاب: ۲۸۔۲۹]

’’اے پیغمبر اپنی بی بیوں سے کہہ دے اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دوں اور اچھی طرح تو کو رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کو (وہاں کی بھلائی) چاہتی ہو تو جو تم میں نیک بی بیاں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بڑا ثواب رکھا ہے۔‘‘

آگے چل کر آیت نمبر (۵۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ ﴾

''اس کے بعد تمھارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ، اگرچہ ان کا حسن تمھیں بھلا ہی لگے۔''

ان میں تبدیلی لانے کا اختیار خود نبی ﷺ سے بھی واپس لے لیا گیا ہے۔

اگلی آیت (۵۳) میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴾

''اور تمھارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے کبھی نکاح کرو۔ یقیناً یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔''

اس آیت میں نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے امت پر ہمیشہ حرام ہونے کا (یعنی حرمتِ دوام کا) اعلان کیا گیا ہے۔ کلامِ الٰہی کے اُن کلمات پر ذرا ٹھنڈے دل اور گہرائی سے غور کریں جن میں خالقِ ارض وسماء کا ارشاد ہے:

﴿ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [الأحزاب: ٦]

''اے مومنو! تمھاری ذات پر خود تمھارا اپنا اتنا حق نہیں جتنا کہ نبی کا ہے۔''

لہٰذا امورِ دنیا ودین میں اپنے لیے تم خود کوئی لائحۂ عمل تجویز نہ کرو، بلکہ نبیِ اکرم ﷺ جو حکم فرمائیں، اسے دل وجان سے تسلیم کرتے جاؤ اور اسی تسلیم ورضا میں تمھاری دین ودنیا کی بھلائی اور فوز وفلاح ہے۔

نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں ارشاد فرمایا:

''وہ (حرمت واحترام، عزت واکرام اور بزرگی واعظام میں) تمام اہلِ ایمان کی مائیں ہیں۔''

تاہم حرمتِ نکاح اور تعظیم وتکریم کے سوا دیگر احکام مثلاً خلوت، پردہ اور ان کی اولاد سے شادی وغیرہ امور میں وہ ماں کی طرح نہیں ہیں۔[1]

قرآنِ کریم کی اسی آیت اور اسی حکمِ الٰہی کے پیشِ نظر نبی ﷺ کی بیویوں کو ''امہات المومنین''

[1] تفصیل کے لیے تفسیر کی کتب ملاحظہ فرمائیں۔

یعنی مومنوں کی مائیں کہا جاتا ہے۔ جیسے ام المومنین حضرت خدیجہ ام المومنین حضرت عائشہ، ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہن۔

اسی سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۲۸ سے لے کر ۳۴ تک مسلسل نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے خطاب ہے اور اس خطاب کے دوران میں ''اہلِ بیت'' کا لفظ آیا ہے۔ اس لفظ والی آیت سے پہلے والی پانچ آیتوں میں خطاب نبی ﷺ کی بیویوں سے ہے، خود اس لفظ والی آیت کے پہلے دو تہائی حصے میں خطاب نبی ﷺ کی بیویوں سے ہی ہے، اور اس لفظ پر مشتمل آیت کے بعد والی آیت میں بھی خطاب نبی ﷺ کی بیویوں سے ہی ہے، اس طویل و مسلسل خطاب کے دوران ہی لفظِ اہلِ بیت کی آمد اور قرآنِ کریم کے اسی سیاق وسباق کے پیشِ نظر ہی اہلِ تحقیق علمائے تفسیر کا کہنا ہے نبی ﷺ کی بیویوں کو اہلِ بیت سے خارج قرار دینا ہرگز درست نہیں۔ الغرض نبیِ اکرم ﷺ کے توسّط سے اس خطابِ الٰہی کا آغاز یوں ہوتا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿28﴾ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ [الأحزاب: ۲۸-۲۹]

''اسے میرے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دوں اور اچھائی کے ساتھ تمھیں رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ، اس کے رسول اور آخرت کے (نعمتوں والے) گھر کو چاہتی ہو تو یقین مانو کہ تم میں سے نیک کام کرنے والی (ازواجِ رسول) کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجرِ عظیم (یعنی زبردست ثواب) تیار کر رکھا ہے۔''

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت نبی ﷺ کے نکاح میں نو بیویاں تھیں جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حضرت عائشہ، حفصہ، امِّ حبیبہ، سودہ، اُمِّ سلمٰی، صفیّہ، میمونہ، زینب اور جویریہ رضی اللہ عنہن۔

بخاری و مسلم میں مذکور ہے کہ امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سب سے پہلے

نبی ﷺ نے یہ بات مجھ سے کی، تو میں نے کہا: میں اللہ، اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہوں۔ اور پھر باقی سب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے بھی یہی بات کہی۔[1]

یعنی سب امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے اللہ، اس کے رسول ﷺ اور دارِ آخرت کو پسند کر لیا۔ یہ واقعہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ نبی ﷺ کی سبھی بیویاں ساری عمر نیک ہی رہیں۔ دنیا و زینتِ دنیا یا پھر اللہ، رسول ﷺ اور دارِ آخرت میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کر لینے میں اختیار دیے جانے پر ان سب نے اللہ و رسول ﷺ اور دارِ آخرت کو اختیار کیا۔ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ''اختیار'' دے دے اور عورت خاوند کو پسند کر لے تو طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ہاں اگر عورت علاحدگی پسند کرے تو ایک رجعی طلاق واقع ہو جائے گی جبکہ خاوند نے مطلق طلاق کی نیت کی ہو۔[2]

جب امہات المومنین رضی اللہ عنہن تاحینِ حیات با رضا و رغبت نبی ﷺ کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں اس بلند مقام و مرتبے کو برقرار رکھنے کے لیے ایک لائحہ عمل دیا اور سمجھایا کہ تمھارا معاملہ عام عورتوں جیسا نہیں ہے۔ اگر بالفرض تم نے نبی ﷺ کی فرمانبرداری سے سرتابی کی یا پھر بالفرض تم سے تمھارے مقام و مرتبے کے منافی کوئی بداخلاقی سرزد ہوئی تو تمھیں دوہرا عذاب وعقاب ہوگا۔ اسی طرح ہر نیک عمل کا ثواب بھی عام عورتوں کی نسبت دوگنا ہی ہوگا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴾ [الأحزاب: ۳۰]

''اے (میرے) نبی کی بیویو! تم میں سے جس کسی نے کسی کھلی بداخلاقی کا ارتکاب کیا تو اسے (دوسری عورتوں کی نسبت) دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ (دوگنا عذاب دینا) بہت آسان سی بات ہے۔''

آگے فرمایا:

---

[1] ابن کثیر (۳/ ٤٨١) قرطبی (١٤/ ١٧١)

[2] فتح القدير للشوكاني، تفسير آية التخيير سورة الأحزاب.

﴿وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صٰلِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا﴾ [الأحزاب:٣١]

''اورتم میں سے جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی اور نیک کام کرے گی۔ تو ہم اسے دوہرا اجر عطا کریں گے۔ اور اس کے لیے ہم نے عزت کی روزی (جنت کی نعمتیں) تیار کر رکھی ہیں۔''

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی نسبت نافرمانی وبدسلوکی کا فرمان بطورِ شرط کے ہے کہ اگر تم ایسا کرو گی تو یہ عذاب ہو گا، جبکہ شرط کا واقع ہونا ضروری نہیں ہوتا، جیسے سورۃ الزمر (آیت: ٦٥) میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾

''(اے نبی!) اگر تم بھی شرک کرو گے تو تمھارے تمام اعمال بھی برباد ہو جائیں گے۔''

مگر نبی ﷺ سے شرک کا صدور ہرگز نہیں ہوا۔ سورۃ الانعام (آیت: ٨٨) میں 18 انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر کر کے فرمایا:

﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

''اگر یہ انبیاء شرک کرتے تو ان کے تمام اعمال بھی بیکار ہو جاتے۔''

لیکن کسی بھی نبی نے شرک کا ارتکاب ہرگز نہیں کیا۔ اور سورۃ الزخرف (آیت: ٨١) میں تو یہاں تک ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ﴾

''(اے میری نبی!) ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر واقعی ربِ رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی، تو میں سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوتا۔''

نیز سورۃ الزمر (آیت: ٤) میں ارشاد فرمایا:

﴿لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾

''اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا بیٹا بنانا ہوتا تو وہ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا برگزیدہ کر لیتا۔''

مگر اِن دونوں مقامات پر خود اللہ تعالیٰ نے ہی اولاد ہونے کی تردید فرما دی ہے۔ چنانچہ سورۃ الزخرف (آیت: ۸۲) میں فرمادیا:

﴿سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾

''پاک ہے ارض و سماوات کا فرمانروا اور عرش کا مالک، ان ساری باتوں سے جو لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔''

سورۃ الزمر (آیت: ۴) ہی میں ارشاد فرمایا:

﴿سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾

''پاک ہے وہ (ذات) اِس سے (کہ کوئی اس کا بیٹا ہو) وہ اللہ ہے یکتا اور غالب قہار۔''

ان پانچوں مقامات پر شرط کے ساتھ بیان ہوا ہے، لیکن کسی ایک مقام کا متعلقہ امر بھی واقع نہیں ہوا اور نہ ہی شرط کا واقع ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح ازواجِ رسول ﷺ، امہاتُ المومنین رضی اللہ عنہن کی نسبت بھی فرمایا کہ اگر تم میں کوئی کھلی نافرمانی و بدسلوکی یا لغو حرکت و بد اخلاقی کرے تو اسے دگنی سزا ہوگی۔ سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۰) سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ان میں سے کسی نے واقعی اپنے مقام و مرتبے سے گری ہوئی کوئی ایسی نازیبا حرکت کی ہو یا اس کا کوئی اندیشہ تھا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔ بلکہ بطورِ شرط کے یہ فرمان نازل فرما کر انھیں یہ احساس دلانا مقصود تھا کہ تم ساری امت کی مائیں ہو، اس لیے اپنے مرتبے سے گرا ہوا کوئی کام نہ کرنا جیسا کہ اگلی ہی آیت میں واضح الفاظ میں فرما دیا ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾

''نبی کی بیویو! تُم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔''

امام الانبیاء والرسل حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے کسی فحش حرکت کا سرزد ہونا تو دور کی بات ہے، خاندانِ نبوت کے معروف فرد، نبی ﷺ کے چچازاد بھائی، امام المفسرین ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا تو ارشاد ہے:

''کسی بھی نبی کی بیوی سے فحاشی کا ارتکاب نہیں ہوا۔ اور اس چیز پر اجماعِ امت ہے۔ البتہ گذشتہ دور میں ایمان واطاعت میں خیانت ثابت ہے، جیسا کہ سورۃ التحریم (آیت:

۱۰) میں حضرت نوح ولوط علیہما السلام کی بیویوں کے بارے میں آیا ہے۔''[1]

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے نبی ﷺ کو کبیدہ خاطر کرنے کے لیے جو تہمت لگائی تھی، اس کی تردید سات آسمانوں کے اوپر سے خود اللہ تعالیٰ نے نازل فرما کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا اعلان فرما دیا تھا۔[2]

شیعہ حضرات ان تمام آیات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بجائے نبی ﷺ کی کسی کنیز سے متعلق قرار دیتے ہیں جو انتہائی دور کی کوڑی اور ٹیڑھی منطق ہے کہ حرمِ نبوی ﷺ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) پر تہمت لگے تو تردید و براءت کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور اگر کسی کنیز پر تہمت لگے تو اس کی تردید و براءت نازل ہو جائے۔ ''بباید سوخت ایں عقل و دانش را۔''

امہات المومنین رضی اللہ عنہن

قرآنِ کریم کی سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۲) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے مخاطب ہو کر مخصوص ہدایات نازل فرمائی ہیں۔ اِسی سلسلے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسۡتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾

''اے نبی کی بیویو! تم تمام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔''

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو ان کا بلند مقام و مرتبہ یاد دلا دیا اور پھر فرمایا:

﴿ اِنِ اتَّقَيۡتُنَّ فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ فَيَطۡمَعَ الَّذِىۡ فِىۡ قَلۡبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلۡنَ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ﴾ [الأحزاب ٣٢]

''اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو، تاکہ جس کے دل میں روگ ہے وہ کسی لالچ میں مبتلا نہ ہو، بلکہ صاف سیدھی بات کیا کرو۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/ ٢٧٧۔ ٢٧٨۔ اردو) فتح القدير، قرطبی، أشرف الحواشي مولانا محمد عبدہؒ.

[2] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: ترجمہ وتفسیر سورۃ النور (آیت: ۱۱ تا ۲۶) نزولِ براءت ۱۰ آیات اور آگے متعلقاتِ واقعہ، الفتح الرباني (١٨/ ١١٨ و ٢٢/ ١٢١ أيضاً)

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ ۖ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ [الأحزاب: ٣٣]

''اور اپنے گھروں میں باوقار طریقے سے ٹکی رہو، اور سابق دورِ جاہلیت کی طرح اپنے بناؤ سنگھار کا اظہار نہ کرو، نماز قائم کرو، زکات ادا کرو، اور اللہ، اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کرو۔ اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبی سے ہر قسم کی لغویات وگندگی کو دور کردے اور تمھیں پوری طرح پاک کردے۔''

اس سے اگلی آیت میں بھی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے مخاطب ہوکر ہی فرمایا:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا﴾ [سورة الأحزاب: ٣٤]

''تمھارے گھروں میں اللہ تعالیٰ کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں (ارشادات و احادیثِ رسول ﷺ) پڑھی جاتی ہیں، انھیں یاد رکھو، یقیناً اللہ تعالیٰ لطیف (باریک بین ومہربان اور) ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔''

یہاں آکر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے متعلق یہ مسلسل خطابِ الٰہی ختم ہو جاتا ہے اور اسی خطاب کے دوران ہی اہلِ بیت کا ذکر بھی آیا ہے۔ جس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہاں اہلِ بیت سے مراد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ہی ہیں، جبکہ نبیِ اکرم ﷺ نے آلِ علی رضی اللہ عنہ کو بھی اہلِ بیت میں شامل فرمالیا تھا، جیسا کہ صحیح احادیث سے پتا چلتا ہے جن کی نصوص اور ترجمہ آگے ذکر ہوگا۔ اِنْ شَآءَ اللّٰه.

تذکرۂ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

نبیِ اکرم ﷺ کی زندگی مبارک میں آنے والی سب سے پہلی زوجۂ محترمہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد، حضرت خدیجہ الکبریٰ، خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اب ہم ان کا ذکرِ جمیل اور ان کے

فضائل و مناقب کا تذکرہ کر رہے ہیں چنانچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح عتیق بن عائد مخزومی سے ہوا تھا اور اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اس کے فوت ہو جانے کے بعد دوسرا نکاح ابو ہالہ ہند بن بناس تمیمی سے ہوا جس سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تین بیٹے تھے جن میں سے ایک ہالہ رضی اللہ عنہ تھے اور یہ صحابی تھے۔ ان کا ذکر صحیح بخاری شریف میں آیا ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ سے اندر حاضر ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے ان کا نام سن کر خوشی سے فرمایا تھا:

«اَللّٰهُمَّ هَالَه» ''اے اللہ! ہالہ آیا ہے۔''

علامہ سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے اسی طرح ''رحمۃ للعالمین'' (۲/ ۱۴۶) میں ذکر کیا ہے۔

جبکہ صحیح بخاری اور مسلم "باب تزویج النبی ﷺ بخدیجه رضی اللہ عنہا و فضلها" اور ''باب فضائل خدیجہ رضی اللہ عنہا'' میں «اَللّٰهُمَّ هَالَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ» آیا ہے۔[1] جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ الفاظ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن کے بارے میں فرمائے تھے۔ اور "فتح الباري" (۷/ ۱٤٠) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مستغفری کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں آپ ﷺ کے الفاظ: « هَالَة هَالَة » ہیں جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نقل ہوئے ہیں اور پھر خود مستغفری نے ہی لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ہالہ سے مراد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہے نہ کہ بیٹا۔ البتہ امام ابن حبان اور ابن عبد البر نے ہالہ ابن خدیجہ رضی اللہ عنہا (ہالہ بن ابو ہالہ تمیمی) کو صحابہ رضی اللہ عنہم میں ذکر کیا ہے جس سے ہالہ کے صحابی ہونے کا پتا بھی چلتا۔

دوسرے بیٹے کا نام طاہر رضی اللہ عنہ تھا۔ وہ بھی صحابی تھے اور نبی ﷺ نے انھیں ایک چوتھائی یمن کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ تیسرے بیٹے کا نام ہند رضی اللہ عنہ تھا، وہ بھی صحابی تھے، بلکہ ان کا بچپن اور پرورش بھی نبی ﷺ کے گھر میں ہوئی۔ بڑے فصیح وبلیغ اور نبی ﷺ کا حلیۂ مبارک بڑی خوبی وصحت سے بیان کرتے۔ اسی بنا پر ہی ''وصّاف النّبی ﷺ'' یعنی نبی ﷺ کا حُلیہ اور اوصاف بیان کرنے والے مشہور تھے۔ جنگِ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے اور وہیں شہید ہوئے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ایک بہن کا نام بھی ہالہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا تھا جو صحابیہ تھیں۔ انہی کے فرزند

---

[1] صحيح البخاری مع الفتح (۷/ ۱۳٤) صحيح مسلم مع النووي (۸/ ۳۰۲۱۵)

ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ ہیں جو نبی ﷺ کے لختِ جگر قاسم سے چھوٹی اور باقی تمام اولادِ رسول ﷺ سے بڑی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر اور نبی ﷺ کے پہلے داماد تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک سگے بھائی کا نام عوام تھا جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے والد تھے۔ وہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نسب نامہ پانچویں پشت قصیؔ میں جا کر نبیِ اکرم ﷺ کے شجرۂ نسب سے مل جاتا ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ذاتی شرافت ونجابت کا یہ عالَم تھا کہ عہدِ جاہلیت میں بھی وہ ''طاہرۃ'' یعنی پاکدامن معروف تھیں۔ ادھر نبی ﷺ کی امانت و دیانت اور صداقت کا شہرہ عام ہو گیا۔ آپ ﷺ تو نبوت سے پہلے ہی صادق وامین کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ جب آپ ﷺ کی عمر پچیس سال کی ہوئی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پیغامِ نکاح ملا اور نکاح ہو گیا، جبکہ حضرتِ طاہرہ رضی اللہ عنہا پہلے اور دوسرے دونوں شوہروں سے بھی بیوہ اور چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکی تھیں۔[1]

نبیِ اکرم ﷺ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی شادی کے وقت دونوں کی عمریں تو تمام کُتب و خُطب میں یہی مشہور ہیں، لیکن یہ بات جتنی مشہور ہے اتنی صحیح نہیں اور کسی صحیح سند سے اس کا ثبوت ملنا مشکل ہے۔

فضائل ومناقب:

ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا وہ سعادت مند خاتون ہیں کہ جنھیں نبیِ اکرم ﷺ کے حرمِ زوجیت میں داخل ہونے کا شرف سب سے پہلے حاصل ہوا اور پچیس سال تک یہ شرف مسلسل حاصل رہا، اور جب تک وہ زندہ رہیں نبی ﷺ نے کسی دوسری زوجۂ محترمہ سے نکاح نہیں کیا، جیسا کہ مسلم شریف میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«لَمْ یَتَزَوَّجِ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰی خَدِیْجَۃَ حَتّٰی مَاتَتْ»[2]

''جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں، رسول اللہ ﷺ نے دوسری کوئی شادی نہیں کی۔''

---

[1] مختصر از رحمة للعالمين (٢/ ١٤٣۔ ١٤٧) الفتح الرباني (٢٠ / ١٩٧۔ ١٩٨ و٢٣٦۔ ٢٣٧) فتح الباري (٧/ ١٣٤۔ ١٣٥)

[2] شرح مسلم للنووي (٨/ ١٥، رقم الحديث: ٢٠١، ٢٤٣٦)

انھوں نے دوسری عظیم سعادت یہ حاصل کی کہ نبی ﷺ پر تمام مردوں، عورتوں، بچوں، بڑوں، سب سے پہلے ایمان لائیں اور اس اعتبار سے وہ امتِ اسلامیہ کی پہلی فرد اور پہلی مسلمان تھیں۔ جب نبیِ اکرم ﷺ کو شرفِ نبوت ورسالت سے نوازا گیا اور غارِ حراء میں قیام کے دوران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام پہلی مرتبہ وحی لے کر آئے تو نبی ﷺ سخت گھبرائے ہوئے گھر پہنچے اور حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کو واقعہ کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

«لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ» ''مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔''

تو مشکلاتِ نبوت کو اٹھانے کا حوصلہ اِنہی خاتون کے ہمت افزا الفاظ نے دیا۔

صحیح بخاری شریف کی ابتدائی حدیث ''باب کیف کان بدء الوحي إلیٰ رسول الله (ﷺ)'' میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے وہ ہمت افزا و جان نواز الفاظ یوں ہیں:

« کَلَّا، وَاللّٰهِ مَا یُخْزِیْكَ اللّٰهُ اَبَداً اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْکَلَّ وَ تَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّیْفَ وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ »[1]

''نہیں نہیں (آپ کو ڈر کاہے کا ہے) بخدا اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا، کیوں کہ (میں دیکھتی ہوں کہ) آپ ﷺ اہلِ قرابت سے عمدہ سلوک فرماتے ہیں، کمزور و ناتواں لوگوں کا تعاون کرتے ہیں، تہی دست غریبوں کی امداد کرتے ہیں، مہمان کی میزبانی کرتے ہیں اور حقیقی مصیبت زدوں کی آپ ﷺ امداد کیا کرتے ہیں۔''

یوں نبی ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کا تذکرہ کر کے آپ ﷺ کی ڈھارس بندھائی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« قَدْ اٰمَنَتْ بِیْ اِذْ (حِیْنَ) کَفَرَ بِیَ النَّاسُ وَصَدَّقَتْنِیْ اِذْ کَذَّبَنِیَ النَّاسُ وَاَشْرَکَتْنِیْ فِیْ مَالِهَا حِیْنَ حَرَّمَنِیَ النَّاسُ وَرَزَقَنِی اللّٰهُ عَزَّوَ جَلَّ وَلَدَهَا اِذْحَرَّمَنِیْ اَوْلَادَ النِّسَآءَ [اَوْحَرَّمَ وَلَدَ غَیْرِهَا] »[2]

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (١/ ٢٢، حدیث: ٢٢٩٧، ٣٩٠٥) صحیح ابن حبان، رقم الحدیث (٦٢٧٧) شرح السنة للبغوي (١٠٦/٧)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٨٢١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٣٧) البدایة ١٢٦/٣) ←

''وہ مجھ پر ایمان لائیں جبکہ لوگوں نے کفر اختیار کیا، انھوں نے میری تصدیق کی جبکہ دوسرے لوگوں نے مجھے جھٹلایا، انھوں نے اپنے مال میں مجھے شریک کیا جبکہ دوسرے لوگوں نے مجھے کسبِ مال سے محروم کیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کے بطن سے اولاد دی، جبکہ دوسری بیویوں سے نہیں ہوئی۔''

تاہم حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے فرزند حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تھے، لیکن وہ آپ ﷺ کی کنیز (امّ ولد) تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کا استثنا ضروری نہیں سمجھا ہوگا۔

ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں صحیح بخاری ومسلم اور ترمذی ومسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« وَخَيْرُ نِسَآئِهَا خَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ »[1]

''خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا اپنے زمانے کی تمام عورتوں سے افضل ہیں۔''

نیز ترمذی ومسند احمد، ابن حبان اور مستدرک حاکم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« حَسْبُكَ مِنْ نِّسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَ خَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ وَ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ (ﷺ) وَاٰسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ »[2]

''(مقام ومرتبہ اور فضائل ومحاسن کے اعتبار سے) تمھارے لیے دنیا بھر کی عورتوں میں سے (یہ چار) عورتیں ہی کافی ہیں: (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ) حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام، (ام المومنین حضرت) خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا، (جگر گوشۂ رسول ﷺ حضرت) فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد (ﷺ) اور فرعون کی بیوی حضرت آسیہ علیہا السلام۔''

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ایک ایسا شرف بھی حاصل ہے جس میں ان کا ہمسر دوسرا کوئی نہیں۔

← بحواله رحمة للعالمين (٢/ ١٤٥) الفتح الرباني (٢٠ / ٢٤) وحسنهٗ و مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٨٦٤) فتح الباري (٧ /١٣٧)

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١٣٣) صحيح مسلم للنووي (٨/ ١٥ / ١٩٨) سنن الترمذی مع التحفة (١٠ / ٣٨٨) الفتح الرباني (٢٠ ٢٤٠) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٣)

[2] ترمذی معه التحفة (١٠ / ٣٨٩) الفتح الرباني (٢٠ / ١٣٣، ٢٤٠) مسند أحمد، رقم الحديث (١٢٤٢٤) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٠٠٣) مشكاة المصابيح (٣/ ١٨٤٥) وصححه الترمذی والألباني.

اور وہ شرف ہے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کا سلام بھیجنا۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد وطبرانی وغیرہ میں مذکور ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی طرف آرہی ہیں اور ان کے ہاتھ میں کھانا اور سالن ہے:

«فَإِذَا أَتَتْكَ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنْ رَّبِّهَا وَ مِنِّيْ وَبَشِّرْهَا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ، لَا صَخَبَ فِيْهِ وَلَا نَصَبَ»[1]

''جب وہ آپ ﷺ کے پاس پہنچ جائیں تو انھیں ان کے رب کی طرف سے اور میری طرف سے سلام کہیں اور انھیں جنت میں ایک ایسے گھر کی بشارت وخوشخبری بھی دے دیں جو ہیرے جو ہرات کا بنا ہوا ہے جس میں نہ کوئی شور وشغب ہوگا نہ رنج والم۔''

سبحان اللہ! جسے ربِ ذو الجلال بھیجیں اور حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی سلام کہیں، ان کے تو مقام و مرتبے کا تعین کرنا بھی تصور سے باہر ہے۔ اور اس بلند مقام و مرتبے کو پانے والی ام المومنین سے نبی ﷺ کے تعلقِ خاطر کا یہ عالَم تھا کہ آپ ﷺ انھیں ان کی وفات بعد، متعدد بیویاں ہونے کے باجود بھی بکثرت یاد فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بخاری و مسلم، ترمذی ونسائی اور مسند احمد میں مروی ہے:

''مجھے نبی ﷺ کی بیویوں میں سے کسی پر اتنی غیرت وچڑ نہیں آتی تھی جتنی میں خدیجہ رضی اللہ عنہا پر چڑتی تھی، حالانکہ میں نے انھیں دیکھا ہوا بھی نہیں تھا۔لیکن نبی ﷺ پھر بھی ان کا ذکر بکثرت فرمایا کرتے تھے، اور جب کبھی بکری ذبح کرتے تو گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر ان کی سہیلیوں کی طرف بطورِ ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ (اسی چڑ میں آکر) ایک مرتبہ میں کہہ بیٹھی کہ جیسے دنیا میں تو خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کے سوا کوئی عورت ہی نہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهَا كَانَتْ وَ كَانَتْ وَكَانَ لِيْ مِنْهَا وَلَدٌ»[2]

---

[1] مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٣) صحيح البخاري مع الفتح (٧ / ١٣٣) صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٥/ ١٩٩) الفتح الرباني (٢٠ / ٢٣٩)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١٣٣) مسلم مع النووي (٨/ ١٥ / ٢٠٠۔ ٢٠١) سنن الترمذي مع التحفة (١٠ / ٣٨٦) الفتح الرباني (٢٠ / ٢٤٠) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٣)

''خدیجہ ؓ میں یہ اور یہ اوصاف تھے۔ اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) اس کے بطنِ طاہر سے میری اولاد تھی۔''

مسلم شریف میں تو یہ بھی ارشاد ہے:

«اِنِّیُ قَدُ رُزِقُتُ حُبَّهَا» [1] ''مجھے ان کی محبت خدا کی دین ہے۔''

بخاری ومسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ ؓ سے حضرت خدیجہ ؓ کے بارے میں کچھ ایسے الفاظ بھی نکل گئے:

''عَجُوُزٌ مِنُ عَجَائِزِ قُرَیُشٍ حَمُرَاءِ الشِّدُقَیُنِ''

''وہ تو قریش کی بوڑھی عورتوں میں سے سرخ باچھوں والی ایک بڑھیا تھیں...الخ۔''

حدیث میں آگے یہ بھی ہے:

''یہ سن کر نبی ﷺ کا چہرۂ مبارک ایسے متغیر ہوا کہ کبھی رحمت یا غضب کی خبر پر بھی نہیں بدلا تھا۔'' [2]

امام نووی ؒ نے امام طبری وغیرہ علماء کے حوالے سے لکھا ہے:

''سوتنوں کی یہ باہمی غیرت وچڑ معاف ہے، اس پر انھیں کوئی عقوبت وسزا نہیں ہوگی۔''

کیوں کہ یہ چیز عورت کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عائشہ ؓ کو زجر وتوبیخ نہیں کی۔ قاضی عیاض کا کہنا ہے:

''ایسے کلمات کا صدور حضرت عائشہ ؓ سے کم سنی ونو جوانی کی وجہ سے ہوا اور لگتا ہے کہ اس وقت تک وہ ابھی بالغ نہیں ہوئی تھیں۔'' [3]

جبکہ حضرت عائشہ، حضرت خدیجہ (ؓ) کے فضائل کی معترف تھیں، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عائشہ ؓ خود حضرت خدیجہ ؓ کے جنّت میں گھر ہونے کی بشارت والی بعض روایات کی راوی ہیں۔ [4]

---

[1] مسلم مع النووي (٨/ ١٥/ ٢٠١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٣٧) مسند أحمد (٢٥٢١٠)

[3] صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٥ / ٢٠١)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (٧ / ١٣٣) صحيح مسلم مع النووي (٨ / ١٥ / ٢٠٠۔ ٢٠١)

امّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اولادِ رسول ﷺ

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطنِ طاہر سے اللہ تعالیٰ نے نبیِ اکرم ﷺ کو سب سے پہلے ایک بیٹا عطا فرمایا جن کا نام قاسم تھا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے اسی لختِ جگر کے نام سے اپنی کنیت ''ابو القاسم'' رکھی اور یہ کنیت کتبِ حدیث میں سے صحاح و سنن سبھی کتابوں میں مذکور ہے۔ بعض صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرما دیا تھا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کے نام اور کنیت کو جمع کرے اور ابو القاسم محمد کہلوائے۔ اس طرح اگر کسی کا نام محمد ہوتا تو وہ اپنی کنیت ابو القاسم نہیں رکھ سکتا تھا، جبکہ بعض اہلِ علم نے اس ممانعت کو نبی ﷺ کے عہدِ مسعود تک خاص کر دیا ہے کہ آپ ﷺ کے دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد اس کی ممانعت نہیں رہی۔

آپ ﷺ کے یہ پہلے فرزند ابھی پاؤں پر چلنا سیکھے ہی تھے کہ وفات پا گئے۔ ان کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کی چار بیٹیاں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں۔ ان چاروں بیٹیوں کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے یہاں نبی ﷺ کے دوسرے بیٹے نے جنم لیا جن کا نامِ نامی اسمِ گرامی عبداللہ تھا۔ آپ ﷺ کے یہ لختِ جگر اس وقت پیدا ہوئے جبکہ آپ ﷺ منصبِ نبوت و رسالت پر سرفراز ہو چکے تھے۔ اہلِ علم نے لکھا ہے کہ نبی ﷺ کو نبوت و رسالت مل چکنے کے بعد دورِ اسلام میں پیدا ہونے کی وجہ سے ہی آپ ﷺ کے اس فرزند کو طیب اور طاہر کے القاب سے بھی پکارا جاتا تھا۔ یہ دونوں لقب اس قدر مشہور ہوئے کہ بعض مورخین اور سیرت نگاروں نے طیب و طاہر کو نبی ﷺ کے دو الگ الگ بیٹے شمار کیا ہے، مگر علامہ ابن قیم اور قاضی سلیمان منصور پوری رحمہما اللہ جیسے محققین نے اسے ہی ترجیح دی ہے کہ یہ دونوں لقب ہی تھے۔

الغرض نبی ﷺ کے یہ لختِ جگر بھی بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ انہی کی وفات پر مشرکینِ مکہ نے جب یہ کہنا شروع کیا کہ یہ دم کٹا ہے، اب اس شخص کی کوئی نرینہ اولاد نہیں رہی، لہٰذا اس کے انتقال کرتے ہی اس کا نام دنیا سے مٹ جائے گا تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نبی ﷺ پر سورۃ الکوثر نازل فرمائی جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] زاد المعاد (١/ ٢٥) رحمة للعالمين (٢/ ٩٦) الفتح الرباني (٢٢/ ١٠١۔ ١٠٢)

﴿ اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ۝ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴾

''یقیناً ہم نے آپ کو حوضِ کوثر یا نہرِ کوثر عطا کی۔ پس آپ اپنے رب کی نماز پڑھیں اور قربانی کریں، یقیناً آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان (دم کٹا) ہے۔''[1]

کفار ومشرکین یہ سمجھتے تھے کہ نرینہ اولاد کے باقی نہ بچنے سے اب ان کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ یہ تصور ان کی جہالت و نادانی کا نتیجہ تھا، ورنہ صدیوں پہلے حضرت داود علیہ السلام پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب زبور کے کئی مقامات پر نبی ﷺ کے بارے میں بشارتیں مذکور ہیں اور بعض میں تو اس بات کی صراحت بھی موجود ہے کہ نبیِ آخر الزماں ﷺ کا اسمِ گرامی ابد الآباد تک باقی رہے گا، جیسا کہ زبور کے ایک مقام پر ارشادِ الٰہی ہے:

''میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا، پس سارے لوگ ابد الآباد تک تیری ستائش کریں گے۔'' (زبور: ۴۵۔ ۱۷)

دوسرے مقام پر فرمایا:

''اس کا نام ابد تک باقی رہے گا۔ جب تک آفتاب رہے گا، اس کے نام کا رواج رہے گا۔ لوگ اس کے باعث اپنے آپ کو مبارک کہیں گے۔ ساری قومیں اسے مبارک باد دیں گی۔'' (زبور: ۷۲۔ ۱۷)

زبور ہی کے تیسرے مقام پر فرمایا:

''اس کے حق میں سدا دعا ہوگی، ہر روز اس کی مبارکباد کہی جائے گی۔'' (زبور: ۷۲۔ ۱۵)

سابقہ آسمانی کتابوں کی ان بشارتوں اور قرآنِ کریم کے اعلان کا ہی اثر ہے کہ آج ان کافروں کا اچھے لفظوں میں کوئی نام بھی نہیں لیتا جنھیں اپنی اولاد کا غرور تھا، جبکہ نبی ﷺ کا ذکرِ خیر اور اسمِ مبارک اذانوں میں، اقامتوں میں، نمازوں کے تشہّد میں اور درود شریف وکلمۂ اسلام میں زبانوں پر جاری اور دلوں پر حاوی ہے اور قیامت تک فضائے آسمانی میں عروج واقبال کے ساتھ گونجتا رہے گا۔ بر وبحر میں ہر وقت اس کی منادی ہوتی رہے گی۔[2]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر ابن کثیر اردو (۵/ ۷۰۹۔ ۷۱۲) و دیگر کتب تفسیر۔

[2] رحمة للعالمین (۲/ ۹٦)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ نبی ﷺ کا ایک فرزند آپ ﷺ کی کنیز ام الولد حضرت ماریہ قطبیہ رضی اللہ عنہا سے بھی تھا جن کا نام آپ ﷺ نے جدالانبیاء حضرت خلیل اللہ کے نام پر ''ابراہیم'' رکھا تھا۔ مگر وہ بھی ایامِ رضاعت وشیرخوارگی میں ڈیڑھ سال کے ہوکر ہی وفات پا گئے۔ آپ ﷺ کے اس نورِنظر کی دودھ پینے کی جو مدت باقی تھی اس کی تکمیل کا اہتمام اللہ تعالیٰ نے جنت میں کر دیا جیسا کہ صحیح بخاری شریف میں تین مختلف مقامات پر اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی (ﷺ) ہے:

«اِنَّ لَهٗ مُرْضِعاً فِيْ الْجَنَّةِ»[1]

''بے شک (میرے بیٹے ابراہیم کے لیے) جنت میں ایک دودھ پلانے والی (مقرر کر دی گئی) ہے۔''

نبی ﷺ کے لختِ جگر کا یہ شرف بھی ایسا ہے کہ اس میں اس کا کوئی بھی ثانی نہیں ہے۔ نبی ﷺ کے یہی فرزند ہیں کہ آپ ﷺ نے انھیں ان کے نزع کے عالم میں گود میں لیا، بوسہ دیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ بھی آنسو بہا رہے ہیں؟ تو فرمایا: یہ تو رحمت کی علامت ہیں۔ پھر فرمایا:

«اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَ الْقَلْبَ يَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ»[2]

''آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین ہوتا ہے، مگر ہم صرف وہی بات کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہو۔ اے ابراہیم! ہمیں تیری جدائی کا صدمہ ضرور ہے۔''

یہاں ہم چاہیں گے کہ ایک مرتبہ ذرا باب ''ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے اولادِ رسول ﷺ اور نظریۂ مختارِ کل'' پر پھر سے نظرِ ثانی کرلیں، تاکہ مسئلہ خوب ذہن نشین ہو جائے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٨٢، ٣٢٥٥، ٦١٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٣٦) دون جملة العتق، شرح السنّة (١٤/١٥، حديث: ١٨٧٠٥) مسند أحمد، رقم الحديث (١٨٧٠٥) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٤٥) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ١٧٢، ١٣٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣١٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٠٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٢٩٠٢)

یہی وہ فرزند ہیں جن کی وفات کے دن سورج گرہن واقع ہوا اور لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ نبی ﷺ کے بیٹے کی وفات پر سورج بھی سوگوار ہے۔ تو آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور ان کے اس نظریے کی تردید کرتے ہوئے انھیں بتایا:

«اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰیَتَانِ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰہِ لَا یَنْخَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَیَاتِہٖ»[1]

''بے شک سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ یہ دونوں (سورج و چاند) کسی بھی انسان کی موت و حیات (کی وجہ) سے نہیں گہناتے۔''

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بنات الرسول ﷺ کی تعداد قرآن و سنت اور لغتِ عربی کی رو سے

نبیِ اکرم ﷺ کی زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا سے نبیِ اکرم ﷺ کی چار صاحبزادیاں تھیں جن میں سے پہلی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں جو قاسم سے چھوٹی اور باقی سب بہن بھائیوں سے بڑی تھیں۔ آپ ﷺ کی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ، تیسری حضرت امّ کلثوم اور چوتھی حضرت فاطمۃ الزہراء تھیں۔ رضي الله عنهن.

نبیِ اکرم ﷺ کی تین یا تین سے زیادہ صاحبزادیاں تو نہ صرف کتبِ حدیث یا تاریخ و سیرت سے بلکہ خود قرآنِ کریم سے بھی ثابت ہیں، جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّأَزۡوَٰجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ يُدۡنِينَ عَلَيۡهِنَّ مِن جَلَٰبِيبِهِنَّ﴾

''اے نبی! اپنی بیویوں، اور اپنی بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دیں کہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادریں لٹکا لیا کریں۔''

---

[1] **متفق عليه**. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٦١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٦٣) ابن خزيمه: ١٣٨١) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٢٨٤٢) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٥٧١) سنن الدارقطني، رقم الحديث (١٧٠٦)

اسلامی پردے کے بارے میں نازل ہونے والی سورۃ الاحزاب کی اس آیتِ حجاب میں اللہ تعالیٰ نے عہدِ نبوی ﷺ کی کل مومن عورتوں کی تین قسمیں کر دی ہیں:

پہلی قسم: ازواجِ رسول یا نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن۔

دوسری قسم: بناتِ رسول یا نبی ﷺ کی صاحبزادیاں رضی اللہ عنہن۔

تیسری قسم: مومنوں کی عورتیں، وہ ان کی مائیں ہوں یا بہنیں، بیویاں ہوں یا بیٹیاں، سب کے لیے باپردہ رہنا فرض قرار دے دیا۔

اس آیتِ کریمہ میں بنات کا لفظ جمع کا صیغہ ہے اور لفظِ بنت اسی لفظِ بنات کا واحد کا صیغہ ہے، بنت کا معنیٰ ہے بیٹی اور بنات کا معنیٰ بیٹیاں۔ یہ ایسے بنیادی کلمات ہیں کہ ان کا معنیٰ ومفہوم ان عرب ممالک میں رہنے والے غیر عرب بھی بآسانی سمجھ جاتے ہیں اور اردو لغت کے اعتبار سے تو ایک سے زیادہ کی تعداد کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہو جاتا ہے، جیسے دو بیٹیاں، چار بیٹیاں۔ مگر ایک کے لیے اردو میں بھی جمع کا صیغہ استعمال نہیں ہوتا، مثلاً یہ کوئی نہیں کہتا کہ میری ایک بیٹیاں ہیں، بلکہ ایک بیٹی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اردو لغت کے اعتبار سے بھی قرآنِ کریم سے واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی ایک سے زیادہ بیٹیاں تھیں، جبکہ عربی لغت میں اردو کی نسبت کچھ فرق ہے۔ عربی میں اگر دو بیٹیاں کہنا ہو تو بھی جمع کا صیغہ نہیں آتا کہ دو بیٹیوں کو بنات کہا جا سکے، بلکہ عربی میں دو کے لیے تثنیہ کا صیغہ موجود ہے۔ جیسے دو شخص ہوں تو نفران یا عام مروجہ لہجہ میں نفرین کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہی دو درہم کے لیے درہمان یا درہمین دو ریالوں کے لیے ریالان یا ریالین بھی ہے۔ لہٰذا عربی لغت کے قاعدے سے بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی دو نہیں بلکہ دو سے زیادہ صاحبزادیاں تھیں اور قرآنِ کریم میں بنات یعنی جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو کم از کم تین اور تین سے زیادہ کے لیے ہوتا ہے۔

اس طرح بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں نبی ﷺ کی تین یا تین سے زیادہ بیٹیاں ذکر کی ہیں، لہٰذا آپ ﷺ کی چار صاحبزادیاں ہونا جو کتبِ حدیث اور تاریخ و سیرت میں منقول ہے خود قرآنِ کریم سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اب ایک قیاس آرائی باقی رہ جاتی ہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو لفظِ بنات جمع کا

صیغہ استعمال کیا ہے تو شاید اس سے نبی ﷺ کی ایک اپنی لختِ جگر اور ساتھ ہی بعض ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی سابقہ شوہروں کی بیٹیوں سمیت سب بیٹیاں مراد ہوں۔ لیکن یہ قیاس حقیقت کے خلاف ہے اور اس کا ثبوت خود اسی سورۃ الاحزاب میں ہی مذکور ہے، صرف توجُّہ کی ضرورت ہے۔ سورۃ الاحزاب (آیت: ۴ اور ۵) میں ظِہار یعنی اپنی بیوی کو ماں سے تشبیہ دے بیٹھنے کے احکام اور کسی کی اولاد کو اپنا متبنیٰ بنانے کی شرعی حیثیت جیسے اہم اسلامی مسائل بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیلات اسلامک پرسنل لاء یا شخصی مسائل میں اسلامی احکام کے تحت آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو ان امور کی تفصیلات بھی کبھی ذکر کریں گے۔ سرِدست پانچویں آیت کے چند بنیادی کلمات ہی ہمارا مقصود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کسی غیر کی اولاد کو اپنا متبنیٰ یا منہ بولا بیٹا بنا لینے کی رسمِ جاہلیت کا خاتمہ کرتے ہوئے اور آیندہ مسلمانوں کو مبنی برحق اور صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ أُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [الأحزاب: ٥]

''انھیں ان کے باپوں کی نسبت سے پکارا کرو، یہی اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔''

بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حضرت زید رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ ﷺ کے غلام اور حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے، ان کے بارے میں مروی ہے:

« مَا كُنَّا نَدْعُوْهُ اِلَّا زَيْدَ بْنَ مُحَمَّدٍ حَتّٰى نَزَلَ الْقُرْاٰنُ: ﴿ أُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ ﴾ »

''ہم اسے (زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما) کو زید بن محمد ﷺ کہہ کر پکارتے تھے، یہاں تک کہ آیت: ﴿ أُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ ﴾ نازل ہوئی۔''[1]

جس ذاتِ الٰہی نے سورۃ الاحزاب (آیت: ۵) میں یہ حکم فرمایا ہے کہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارنا زیادہ منصفانہ بات ہے۔ وہی ذات اسی سورت (آیت: ۵۹) میں ان لڑکیوں کو نبی ﷺ کی صاحبزادیاں کہے جو دراصل آپ ﷺ کے خون سے نہ تھیں، تو یہ حق و انصاف سے بعید اور کھلا ہوا تناقض و تضاد ہوتا جس سے کلامِ الٰہی پاک ہے۔

---

[1] **متفق عليه.** صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٠٤٢) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٤)

بیویوں کی بیٹیوں کو مجازاً بنات کہہ دیے جانے کی قیاس آرائی بھی خلافِ حقیقت ہے۔ منطوقِ الٰہی یا قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے سامنے قیاسِ انسانی کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے اور پھر عربی میں بیویوں کی بیٹیوں کے لیے ایک مستقل لفظ ربیبہ اور اس کی جمع ربائب موجود ہیں، اور خود قرآنِ کریم کی سورۃ النساء (آیت: ۲۳) میں ایسی لڑکیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے لفظِ ربائب ہی استعمال فرمایا ہے نہ کہ بنات۔

الغرض قرآنِ کریم کے لفظ ''بناتک'' نے نبی ﷺ کی صاحبزادیوں کے سلسلے میں اہلِ تحقیق علمائے انساب کی تصدیق فرما دی ہے۔

ربائب النبی ﷺ:

نبی ﷺ کی ربائب میں امّ المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادیاں: درہ، زینب اور امّ کلثوم رضی اللہ عنہن ہیں۔ اسی طرح امّ المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی، حبیبہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ دیگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی کے پہلے شوہر سے کوئی لڑکی نہ تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبی ﷺ سے ۴ھ میں ہوا تھا اور حضرت امّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا ۶ھ میں، لہٰذا مذکورہ بالا لڑکیوں کو ۴ھ سے پہلے نبی ﷺ کی ربائب ہونے کا درجہ حاصل نہ تھا، جبکہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت النبی ﷺ کا ذکر اسیرانِ بدر (۲ھ) کے فدیے کے ضمن میں آتا ہے جب انھوں نے اپنے شوہر ابو العاص رضی اللہ عنہ کی رہائی کے لیے اپنی والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا دیا ہوا ہار بطورِ فدیہ بھیجا تھا۔ حضرت امّ کلثوم ورقیہ رضی اللہ عنہما کا ذکر ہجرت سے بھی قبل ابولہب کے خاسرانہ اعمال کے ضمن میں آتا ہے کہ اس نے اپنے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے نبی ﷺ کی ان دونوں صاحبزادیوں کو طلاقیں دلوادی تھیں۔ پھر ان تینوں بناتِ رسول ﷺ کا انتقال آپ ﷺ کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا، جبکہ سب ربائب آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی اپنے گھروں میں آباد رہیں۔ [1]

---

[1] رحمة للعالمين (۲/ ۱۰۰۔ ۱۰۲) حاشیه و متن بالتصرف.

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بناتِ رسول ﷺ کا مختصر تذکرہ

حضرت زینب رضی اللہ عنہا:

نبیِ اکرم ﷺ کی چار صاحبزادیوں میں سے سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں جن کی پیدائش کے وقت مشہور روایات کے مطابق نبی ﷺ کی عمرِ مبارک تیس برس تھی۔ مکہ میں قیام کے دوران ہی آپ ﷺ نے ان کا نکاح ان کے خالہ زاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے، ہالہ بنت خویلد کے بیٹے ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا۔ جب نبی ﷺ کو منصبِ نبوت و رسالت پر سر فراز کیا گیا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ ہی اسلام قبول کر لیا تھا، مگر ان کے شوہر ابو العاص رضی اللہ عنہ کئی سال کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ نبی ﷺ نے ان کے مسلمان ہو کر مدینہ پہنچتے ہی (نکاحِ اوّل ہی سے) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ابو العاص رضی اللہ عنہ کے گھر رخصت فرما دیا تھا۔

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی عطا فرمائے تھے۔ بیٹے کا نام علی تھا جو بالغ ہونے کے قریب وفات پا گئے اور بیٹی کا نام امامہ رضی اللہ عنہا تھا جن سے نبی ﷺ کو خاص اُنس و محبت تھی۔ حضرت امامہ رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کے لاڈ پیار کا اندازہ صحیح بخاری و مسلم، موطا امام مالک اور نسائی وغیرہ میں مذکور اس واقعہ سے ہی لگایا سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں بچپن میں اپنے کندھوں پر اٹھا کر ایک نماز (فجر) ادا فرمائی تھی۔ جب آپ ﷺ سجدہ کرتے تو انھیں زمین پر بٹھا لیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے تھے۔[1]

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا تھا۔

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے سفرِ ہجرت میں بڑی مشقت اٹھائی تھی، حتیٰ کہ اسی دوران میں ان کا سقوطِ حمل ہوا۔ طبرانی کی ایک مرسل صحیح روایت کے مطابق یہ تکلیف آخری دم تک رہی، یہاں تک کہ اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ حضرت عروہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ لوگ انھیں شہید سمجھتے تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٤٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩١٧) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١١٠٩)

امام طحاوی وحاکم کے حوالے سے علامہ زرقانی نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں:

«هِيَ اَفْضَلُ بَنَاتِيَ اُصِيبَتْ فِيَّ»[1]

''یہ (زینب رضی اللہ عنہا) میری صاحبزادیوں میں سے افضل ترین ہے کہ میری خاطر اسے مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔''

بعض ائمہ نے یہ کہا ہے کہ ان کی یہ فضیلت و مرتبہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی ولادت سے پہلے تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا عطا فرمائیں تو انھیں وہ شرف و مرتبہ اور فضیلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی جس میں پوری امت کی عورتوں میں سے ان کا کوئی شریک نہیں۔[2]

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر سے چار سال قبل ۸ھ میں مدینہ طیبہ میں وفات پائی۔[3]

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا:

نبیِ اکرم ﷺ کی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کی ولادت کے وقت مشہور روایات کے مطابق نبیِ اکرم ﷺ کی عمرِ شریف ۳۳ سال تھی۔ معروف مفسر ومحدّث اور مورخِ اسلام امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ اسلام "البداية و النهاية" میں لکھا ہے اور مشہور بات یہی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ابولہب کے بیٹے عتبہ سے کیا تھا، مگر جب قرآنِ کریم میں سورۃ اللہب نازل ہوئی، جس میں ابولہب اور اس کی بیوی کا انجامِ بد بتایا گیا ہے تو ابولہب نے اپنے بیٹے سے کہہ کر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دلوا دی اور یہ طلاق قبل از رخصتی تھی، یعنی ابھی صرف نکاح ہوا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد نبی ﷺ نے اپنی اس صاحبزادی کا نکاح حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے ہجرت فی سبیل اللہ کی سنت کو اپنے شوہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ساتھ دے کر قائم کیا اور اسی ہجرتِ حبشہ کی نسبت سے حضرت عثمان ورقیہ رضی اللہ عنہما

---

[1] فتح الباري لابن حجر (٧/ ١٣٦) تخريج مشكل الآثار طحاوي (١٤٢) و حسنه الأرناؤوط.

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري (٧/ ١٠٥۔ ١٠٦)

[3] مختصر از رحمة للعالمين (٢/ ١٠٢۔ ١٠٤) الفتح الرباني (١٤ / ١٠٠، ٢٢/ ٩٧۔ ٩٩) البداية والنهاية لابن كثير (٢/ ٣/ ٣٣٠۔ ٣٣٣)

کے بارے میں مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے کہ حضرت لوط اور ابراہیم علیہما السلام کے بعد پہلا جوڑا ہے جنھوں نے فی سبیل اللہ میں ہجرت کی۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا ۲ھ میں بیمار ہوئیں جبکہ ان کی عمر اکیس سال تھی اور جس دن غزوۂ بدر میں فتح ونصرت کی بشارت لے کر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما مدینے پہنچے تو حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو دفن کیا جارہا تھا۔ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ طاہر سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا جو چھے برس کی عمر میں اپنی والدہ کے دوسال بعد ہی اللہ کو پیارا ہوگیا۔[1]

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا:

ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ طاہر سے نبی ﷺ کی تیسری صاحبزادی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ مشہور روایات کی رو سے ان کا نکاح بھی ابولہب کے ایک بیٹے عتیبہ سے ہوا تھا اور ان کی طلاق کا سبب اور موقع بعینہٖ وہی ہے جو حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ نبی ﷺ نے اپنی صاحبزادی اور زوجۂ عثمان رضی اللہ عنہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ۳ھ میں اپنی دوسری صاحبزادی حضرت امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کردیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے یکے بعد دیگرے نبی ﷺ کی دو صاحبزادیوں کا شوہر ہونے کے شرف و سعادت کی وجہ سے انھیں ''ذوالنورین'' کا خطاب ملا۔ ''إزالة الخفاء'' (ص: ۲۲۳) سے مستدرک حاکم کے حوالے سے نقل کرتے ہوئے علامہ منصور پوری رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت نبی ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا:

''یہ جبرائیل علیہ السلام ہیں جو کہہ رہے ہیں، حکمِ الٰہی ہے کہ میں اپنی دوسری بیٹی بھی تم سے بیاہ دوں۔''[2]

نیز لکھا ہے: جن دنوں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تھا، انھی دنوں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۳/ ۵۱۵۔ ۱۵۸) مع العمدة للعيني (٤/ ۸/ ۷۵۔ ۷٦) الفتح الرباني (۸/ ۵۷، ۵۹۔ ٦۰، ۲۲ / ۹۹) البداية و النهاية (۳/ ۵ / ۳۰۸۔ ۳۰۹) رحمة للعالمين (۲/ ۱۰۵۔ ۱۰۸)

[2] تاريخ دمشق ابن عساكر (۳۹/ ۳۹) و قال: المحفوظ أن الأولىٰ رقية (لأن هذه الرواية جاء فيها بأنها الثانية)، تاريخ دمشق (۳۹/ ۳۸) و قال: غريب هذا الإسناد، تفرد به ابن لهيعة.

دختر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی بیوہ ہو گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے اپنی لڑکی کا ذکر کیا تو وہ ٹال سے گئے اور حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے رنج کا اظہار نبی ﷺ سے کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''عثمان کو حفصہ رضی اللہ عنہا سے بہتر زوجہ ملے گی اور حفصہ رضی اللہ عنہا کو عثمان رضی اللہ عنہ سے بہتر شوہر ملے گا۔''[1]

اس ارشاد کے بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو امّ المومنین ہونے کا شرف عطا ہوا (کہ ان سے خود نبی ﷺ نے نکاح کر لیا) اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو ''ذوالنورین'' بننے کی عزّت حاصل ہوئی۔ (کہ آپ ﷺ نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت امّ کلثوم رضی اللہ عنہا بھی ان کے نکاح میں دے دی)۔

''نهج البلاغة'' (ص: ۵۳ طبع تبریز ۱۲۶۷ھ) کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''آپ ان دونوں (صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما) سے بڑھ کر نبی ﷺ سے قرابت داری رکھتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ کے دوہرے داماد ہونے کی عزّت حاصل ہے جو ان دونوں کو نہیں ملی۔''[2]

سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ۹ھ میں وہ انتقال کر گئیں۔ صحیح بخاری شریف میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ اپنی ایک بیٹی کی قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«فَرَأَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ»[3]

''میں نے دیکھا کہ نبی ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔''

طبقات ابن سعد، طبری اور طحاوی وغیرہ کے حوالے سے اس حدیث کے شارحین نے لکھا ہے کہ اس بیٹی سے مراد امّ کلثوم ہیں۔ رضی اللہ عنہا۔''[4]

---

[1] الضعفاء الكبير للعقيلي (٣/ ٣٨٦) و تكلم عليه و قال: و روي بإسناد أصلح.

[2] نقلًا عن رحمة للعالمين (٢/ ١٠٦۔ ١٠٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٢) تخريج المسند، رقم الحديث (١٣٣٨٣) مسند أحمد، رقم الحديث (١٢٢٧٥) شرح السنة (٢٩٦/١٣)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ١٥١۔ ١٥٨) مع العمده للعيني (٤/ ٨ / ٧٥۔ ٧٦) الفتح الرباني (٢٢/ ٩٩، ٨/ ٥٧۔ ٥٩۔ ٦٠) البداية والنهاية (٣/ ٥/ ٣٠٨۔ ٣٠٩) رحمة للعالمين (٢/ ١٠٥۔ ١٠٨)

"البداية والنهاية" (٣/ ٥/ ٣٠٩) کی ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''عثمان کو کوئی عورت بیاہ دو، اور فرمایا: «لَوْ كَانَتْ عِنْدِيْ ثَالِثَةٌ لَزَوَّجْتُهَا عُثْمَانَ»

''اگر میری تیسری بیٹی بھی ہوتی تو میں عثمان (رضی اللہ عنہ) سے بیاہ دیتا۔''[1]

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا:

ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کی چوتھی اور سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا تھیں جو الاستیعاب کی روایت کے مطابق نبیِ اکرم ﷺ کی عمرِ شریف کے اکیالیسویں سال میں پیدا ہوئیں، جبکہ نبی ﷺ منصبِ نبوت ورسالت سے سرفراز کیے جا چکے تھے۔

جگر گوشۂ رسول ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابھی بچی ہی تھیں کہ نبیِ اکرم ﷺ ایک دن کعبہ شریف میں نماز پڑھنے گئے۔ وہاں بہت سے کفارِ قریش اور مشرکینِ مکہ موجود تھے۔ جب آپ ﷺ سجدے میں گئے تو عقبہ بن ابی معیط نے اونٹ کی گندی اوجھڑی لاکر نبی ﷺ کی پشتِ مبارک پر ڈال دی۔ آپ ﷺ ابھی حالتِ سجدہ میں ہی تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور اپنے والدِ گرامی کی پشت سے وہ اوجھڑی گرائی، اور عقبہ کے لیے بددعا کی۔[2]

۲ھ میں اسلام اور کفر کے مابین لڑے جانے والے پہلے معرکۂ حق و باطل غزوۂ بدر کے بعد لیکن غزوۂ اُحد سے پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سے ہوگیا۔ اس دوسرے معرکہ غزوۂ اُحد میں تو خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے باقاعدہ حصہ لیا۔ صحیح مسلم شریف میں غزوۂ اُحد کے وقائع میں مذکور ہے کہ مدینہ میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ نبی ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اُحد کے میدانِ کارزار میں پہنچ گئیں، مگر اس وقت تک نبیِ اکرم ﷺ اس غار سے باہر تشریف لا چکے تھے جہاں زخموں سے نڈھال ہوکر کچھ ستانے کے لیے آپ ﷺ جا بیٹھے تھے۔ حضرتِ سیدہ رضی اللہ عنہا نے والدِ محترم کے زخموں کو دھویا اور جب دیکھا کہ خون تھم نہیں رہا تو کھجور کی ایک صف کو جلا کر اس کی راکھ

[1] مجمع الزوائد (٩/ ٨٦) وضعّفه.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (............)

آپ ﷺ کے زخموں پر رکھی جس کے بعد آپ ﷺ کا خون بہنا بند ہو گیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی دوسری بہنوں پر یہ شرف وفضیلت حاصل ہے کہ دوسری بہنوں میں سے کسی کی ذرّیت نہیں چلی۔ اگر اولاد ہوئی بھی تو فوت ہو گئی، جبکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے حضرت حسن، حسین، ام کلثوم اور زینب رضی اللہ عنہم عطا فرمائے۔ بعض مورخین اور سیرت نگاروں نے تو حضرت فاطمہ وعلی رضی اللہ عنہما کی اولاد میں محسن اور رقیہ بھی ذکر کیے ہیں۔ یہ دونوں بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کی نواسی کے ساتھ اپنے نکاح پر چالیس ہزار درہم حق مہر ادا کیا تھا۔ ان کے بطن سے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے دو بچے زید اور رقیہ پیدا ہوئے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد ان کا نکاحِ ثانی حضرت عون بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا جبکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دوسری صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا جن سے ان کے ایک فرزند عدی بن عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ تھے۔ جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بارہ بیٹے اور پانچ بیٹیاں عطا فرمائیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ایک فرزند حضرت زین العابدین علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم تھے جن سے حضراتِ سادات کا سِلسلہ جاری ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی پاکبازی و پارسائی کا اندازہ صرف اسی واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جس کی راوی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ہیں:

''ایک بار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ان سے ذکر کیا کہ عورتوں کا جنازہ جس طرح اب لے جایا جاتا ہے مجھے تو یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ جنازے کے اوپر ایک چادر ڈال دیتے ہیں جس میں سے اس کا پیکر نظر آتا ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں نے ہجرتِ حبشہ کے دوران میں وہاں ایک دستور دیکھا ہے، وہ آپ کو دکھاتی ہوں۔ پھر انھوں نے کھجور کی تازہ شاخیں منگوا کر چارپائی کے اطرف میں لگائیں اور ان کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ بہت ہی اچھا ہے۔''

الغرض ام الحسنین، جگر گوشۂ رسول ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مقام و مرتبے اور فضائل و مناقب کی فہرست بڑی طویل ہے جسے حسبِ سابق صرف صحیح وحسن احادیثِ رسول ﷺ کے حوالے

سے قدرے مختصراً ہم بعد میں درج کریں گے۔ اِن شاء اللہ!

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ سے صرف چھے ماہ بعد ۳ رمضان المبارک ۱۱ھ کو منگل کی رات وفات پائی، جبکہ ان کی کل عمر اور مقامِ تدفین میں مختلف اقوال ہیں۔ خود ان کے پڑپوتے حضرت عبد اللہ بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم نے تیس سال ذکر فرمائی ہے۔ جائے تدفین کے بارے میں بعض نے کہا ہے کہ وہ اپنے ہی گھر میں دفن ہوئیں، لیکن اکثر مورخین کا رجحان اس طرف ہے کہ ان کی قبر مبارک حضرت عباس، حضرت حسن اور حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہم کے پہلو بہ پہلو بقیع میں ہے۔

مسعودی نے مروج الذہب میں ذکر کیا ہے کہ ۳۰۴ھ میں بقیع سے پتھر کی ایک سِل ملی تھی جس پر تحریر تھا:

«هَذَا قَبْرُ فَاطِمَةَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»

''یہ قبر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔''

اس سے بھی بقیع میں مدفون ہونے والوں کے رجحان کی تائید ہوتی ہے۔[1]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فضائل و مناقب، شیعہ کتب و مصنفین کے یہاں تعداد بناتِ رسول اللہ ﷺ ذکر کرنے کے بعد مذکور ہوں گے۔ ان شاء اللہ

شیعہ کتب و مصنفین کے یہاں تعدادِ بناتِ رسول ﷺ

معلوم نہیں کہ شیعہ حضرات نبی ﷺ کی صاحبزادیوں (ما سوا حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا) کی نفی پر کیوں مُصرّ ہیں جبکہ خود کئی شیعہ منصف مزاج مؤلفین نے نبی ﷺ کی چار صاحبزادیوں کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً:

1 کتاب ''حیات القلوب'' مولفہ ملا باقر مجلسی جلد دوم باب (۵۱) اور باب پنجاہ و دوم (۵۲) میں حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ سے معتبر سند سے منقول ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی اولاد یہ تھی: طاہر و قاسم و فاطمہ و ام کلثوم و رقیہ و زینب۔

---

[1] فتح الباري (۷/ ۱۰۵) البداية والنهاية (۵/۳/ ۳۰۹) مختصر از رحمة للعالمين (۲/ ۱۰۸۔ ۱۲۵)

مذکورہ مقام پر یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے پہلے حضرت ام کلثوم اور پھر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا۔ حیات القلوب میں ملا مجلسی نے آپ ﷺ کی صاحبزادیوں کے نکاحِ عثمان رضی اللہ عنہ میں آنے کی جو ترتیب لکھی ہے وہ غلط ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ پہلے حضرت رقیہ اور پھر ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی۔

اس مقام پر ملا مجلسی نے دوسرا مغالطہ دینے کی بھی ایک کوشش کی ہے کہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا رخصتی سے قبل فوت ہو چکی تھیں، حالانکہ حضرت رقیہ، حضرت عثمان کے نکاح میں تقریباً آٹھ سال اور حضرت ام کلثوم تقریباً سات سال رہیں۔ (رضی اللہ عنہم)

بہرصورت نبی ﷺ کی چار صاحبزادیاں ہونا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دوہرا دامادِ رسول ﷺ ہونا تو ثابت ہوا۔

2 کتاب "الأصول من الكافي" تالیف ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی "كتاب الحجة- باب مولد النبی ﷺ" میں رقمطراز ہیں کہ بعثت سے قبل نبی ﷺ کے یہاں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے قاسم، رقیہ، زینب اور ام کلثوم، اور بعثت کے بعد طیب و طاہر (عبد اللہ) اور فاطمہ پیدا ہوئے۔ (رضی اللہ عنہم)

3 کتاب "منتہی الآمال" جلد اوّل، فصل ششم میں مصنفِ کتاب عباس قُمی نے حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے، جس میں طاہر و قاسم، فاطمہ و ام کلثوم اور رقیہ و زینب کے اسمائے گرامی مذکور ہیں۔ (رضی اللہ عنہم)

4 کتاب "تهذيب الأحكام" مصنفہ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی (۳/ ۱۲۰، مطبوعہ ایران) میں قاسم و طاہر اور رقیہ و ام کلثوم (رضی اللہ عنہم) کو اولادِ رسول ﷺ شمار کیا گیا ہے۔

اسی طرح کشف الغمہ، کتاب الخصال از شیخ صدوق ابن بابویہ القمی، الآمالی از شیخ صدوق، مروج الذہب للمسعودی اور الانوار النعمانیہ جلد اوّل مصنفہ سید نعمت اللہ شیعی و غیرہم سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ نبی ﷺ کی حقیقی صاحبزادیاں چار تھیں۔ رضي الله عنهن.

شیعہ کے اعتراضات اور ان کے مختصر جوابات

① جب سورۃ الشعراء کی آیت ﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ نازل ہُوئی تو بخاری ومسلم کی بعض احادیث کے مطابق آپ ﷺ نے بعض قبائل کے نام لیے اور تین افراد حضرت عباس، حضرت صفیہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فرداً نام لے کر بلایا۔ اگر کوئی دوسری بیٹی بھی ہوتی تو اسے کیوں نہ بلایا گیا؟

جواب: مسلّمہ قاعدہ ”عدم الذکر لا یستلزم عدم و جود الشيء“،”کسی چیز کا عدمِ ذکر عدمِ وجود کو لازم نہیں ہوتا“ کی رو سے جب صرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بلایا تو اس سے آپ ﷺ کے دیگر چچوں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، ابو طالب و زبیر وغیرہم کی نفی نہیں کی جا سکتی، بعینہٖ معاملہ آپ ﷺ کی صاحبزادیوں کا بھی ہے۔

② جب سورۃ الشوریٰ کی آیت (۲۳) ﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی﴾ نازل ہوئی تو ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب بعض روایات کے مطابق لوگوں نے پوچھا: ”مَنْ هٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ وَجَبَتْ عَلَیْنَا مَوَدَّتُهُمْ؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”علی وفاطمہ اورحسن و حسین رضی اللہ عنہم“، تو اس روایت سے بھی کسی دوسری صاحبزادی کا کیوں پتا نہیں چلتا؟

جواب: اولاً: تو یہ آیت بلکہ پوری سورت ہی مکی ہے اور اس وقت تک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح ہی نہیں ہوا تھا، تو حسن وحسین کہاں؟

ثانیاً: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”فتح الباری شرح صحیح بخاری“ میں اس روایت پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے: ”وإسناده ضعیف، و إسناده واهٍ، فیه ضعیف و رافضي“ اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو لا اصل قرار دیا اور ثابت کیا ہے۔

③ آیتِ تطہیر ﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا﴾ [الأحزاب: ۳۳] نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ، علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان پر اپنی چادر ڈال کر فرمایا: اے اللہ! یہ میرے اہل ہیں۔ اگر آپ ﷺ کی اور بھی صاحبزادیاں ہوتیں تو آپ ﷺ انھیں بھی چادر کے نیچے جمع کرتے؟

جواب: (ا۔ مذکورہ آیت کا سیاق وسباق اسی بات پر دال ہے کہ اس میں آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا ہی ذکر ہے بیٹیوں کا ذکر ہی نہیں۔ لہٰذا مذکورہ روایت کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

ب۔ چونکہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن تو اہلِ بیت تھیں ہی، لہٰذا آپ ﷺ نے ان چار حضرات کو بھی چادر ڈال کر دعا کے ذریعے اس شرف میں شامل کر لیا۔

اگر مذکورہ آیت سے مراد صرف یہی چار افراد تھے تو ان پر چادر ڈال کر دوبارہ دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ج۔ مسلّمہ قاعدہ "ذکر الشيء ..." کی رو سے دیگر بیٹیوں کی نفی ہر گز نہیں ہوتی اور نہ وہ غیر حقیقی بنتی ہیں۔

د۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کر دے کہ حضرت زینب و اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہما، حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کی حقیقی صاحبزادیاں نہیں اور نہ ہی وہ اہلِ بیت میں سے ہیں، کیوں کہ وہ آپ ﷺ کی چادر کے نیچے نہیں تھیں تو شیعہ حضرات اس استدلال کو کمزور قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح خود شیعہ کا استدلال بناتِ رسول ﷺ (حضرت زینب، رقیہ اور امِ کلثوم رضی اللہ عنہن) کے بارے میں بھی کمزور ہے۔ جس طرح وہ چادر کے نیچے نہ آنے کے باوجود حقیقی اور اہلِ بیت سے ہیں، اسی طرح یہ بھی ہیں۔

(۴) نجران کے نصاریٰ کے مقابلے میں "دعوتِ مباہلہ" کے موقع پر آپ نے ﷺ حضرت علی وفاطمہ اور حسن وحسین رضی اللہ عنہم کو ساتھ لیا، اس سے بھی دوسری صاحبزادیوں کے حقیقی وصلبی ہونے کی نفی ہوتی ہے۔

جواب: شیعہ وسنی کتب کے مطابق مباہلہ کا یہ واقعہ ۹ھ کے آخر میں اور بعض روایات کے مطابق ۱۰ھ میں رونما ہوا، جیسا کہ معتبر شیعہ کتاب "تلخیص الشافعي" میں مذکور ہے، جبکہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا ۲ھ میں، حضرت زینب رضی اللہ عنہا ۸ھ میں وفات پا گئیں۔ جب وہ زندہ ہی نہیں تھیں تو شرکت کا سوال چہ معنیٰ دارد؟ اور اسی طرح کے بعض دیگر بے سروپا اعتراضات کر کے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ بنات سے مراد آپ ﷺ کی ربیبائیں تھیں، جس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اور کبھی کہہ دیتے ہیں کہ کتبِ حدیث وتاریخ میں صرف

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ہی ذکر ملتا ہے، دوسری بنات کا نہیں، جو ان کی کم علمی کا ایک کھلا اعتراف ہے ورنہ ہم ہر ایک بیٹی کا ذکر و فضائل بیان کر آئے ہیں اور کسی کا ذکر نہ ملنا عدمِ وجود کا ثبوت نہیں ہوتا۔ جیسا کہ سورۃ النساء (آیت: ۱۶۴) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾

''اللہ کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے آپ سے بیان کر چکے ہیں اور کئی رسول ایسے ہیں جن کا حال ہم نے آپ سے نہیں بیان کیا۔''

تو جن رسولوں کا تذکرہ قران میں نہیں آیا، اس سے کوئی یہ استدلال نہیں کر سکتا کہ وہ رسول ہی نہیں تھے؟ یا وہ حقیقی نہیں تھے۔ وَاللّٰهُ الْهَادِیْ اِلٰی سَوَآءِ السَّبِيْلِ.

فضائل و مناقبِ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

جگر گوشۂ رسول ﷺ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے فضائل و مناقب پر مبنی ارشاداتِ نبویہ ﷺ بکثرت ہیں جن میں سے صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کی بیویاں آپ ﷺ کے پاس تھیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں:

«مَا تَخْفٰى مَشْيَتُهَا مِنْ مَشْيَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»

''ان کے چلنے کا انداز بالکل نبی ﷺ جیسا تھا، ذرہ برابر فرق نہ تھا۔''

جب نبی ﷺ نے انھیں دیکھ لیا تو فرمایا:

«مَرْحَباً يَا بِنْتِيْ» ''میری بیٹی خوش آمدید۔''

پھر آپ ﷺ نے انھیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ اسی دوران میں اُن سے کوئی سرگوشی کی۔ ان کے کان میں کوئی بات کہی، جس سے وہ رونے لگیں۔ جب انھیں غمناک (روتے) دیکھا تو پھر دوسری مرتبہ بھی کان میں کوئی سرگوشی کی تو وہ خوشی سے ہنسنے لگیں۔ جب نبی اکرم ﷺ اٹھ کر کہیں باہر تشریف لے گئے تو میں نے پوچھا کہ نبی ﷺ نے ان سے رازداری کے ساتھ کیا فرمایا تھا؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نبی ﷺ کا بتایا ہوا راز فاش نہیں کرنا چاہتی۔ (اس طرح بات آئی گئی ہوگئی) پھر جب نبی ﷺ اس دنیا سے رحلت فرما گئے تو نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے دوبارہ کہا کہ میں نے پہلے بھی

ایک مرتبہ آپ سے پوچھا تھا کہ نبی ﷺ کی ان سرگوشیوں میں کیا راز تھا؟ جن سے آپ پہلے روئیں پھر ہنسیں، مگر آپ نے نہیں بتایا تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''لیجیے وہ بھید اب میں آپ کو بتائی ہوں: نبی ﷺ نے پہلی مرتبہ سرگوشی کے انداز سے مجھے بتایا کہ حضرت جرائیل علیہ السلام ہر سال ایک مرتبہ میرے ساتھ قرآنِ کریم کو دہرایا کرتے تھے مگر اس سال انھوں نے دومرتبہ دہرایا ہے اور اس سے میں سمجھتا ہوں کہ میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے، تم تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنا اور صبر سے کام لینا۔ میں تم سے پہلے جانے والا تمھارا بہترین پیش رَو ہوں (نبی ﷺ کی وفات اور فراق کی باتیں سن کر) میں رونے لگی تھی۔ اور جب آپ ﷺ نے مجھے غمناک دیکھا تو دوبارہ سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا:

«یَا فَاطِمَةُ! اَلَا تَرْضَیْنَ اَنْ تَکُوْنِیْ سَیِّدَةَ نِسَآءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ اَوْ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ»[1]

''اے فاطمہ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم اہلِ جنت کی خواتین کی سردار ہو' یا پھر شاید کہ یہ فرمایا: ''تم تمام اہلِ ایمان کی خواتین کی سردار ہو۔''

بخاری و مسلم وغیرہ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسی تکلیف کے دوران ان کی روح قبض کر لی جائے گی تو میں رو دی، مگر جب دوسری مرتبہ فرمایا:

«اِنِّیْ اَوَّلُ اَهْلِ بَیْتِهٖ اَتْبَعُهٗ فَضَحِکْتُ»[2]

''میں آپ ﷺ کے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم میں سے سب سے پہلے آپ ﷺ سے جا ملوں گی تو میں ہنس دی۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٢٣) صحيح مسلم (٤/ ١٩٠٥، رقم الحديث: ٢٤٥٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٨١) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨١١٣) مسند أحمد، رقم الحديث (١١٦٣٦) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٥٩) مصنف ابن أبي شيبة (٩٦/١٢)

[2] **متفق عليه**. صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٥٠) مشكاة المصابيح (٣/ ٢٣ـ ٧١٣١) شرح السنة للبغوي (١٤/ ١٦٠ـ ١٤١) الفتح الرباني (٢٢/ ٩٢ـ ٩٣) تخريج المسند (٣٢/٤١)

صحیح بخاری و مسلم شریف میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّی، فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِی»[1]

''فاطمہ میرے جسم کا ایک حصہ (جگر گوشہ) ہے۔ جس نے اسے ناراض کیا، اس نے مجھے ناراض کیا۔''

بخاری و مسلم کی ایک اور متفق علیہ حدیث میں ہے:

«یُرِیبُنِی مَا أَرَابَهَا وَ یُؤْذِینِی مَا آذَاهَا»[2]

''جو چیز فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو بری لگے وہی مجھے بھی بری لگتی ہے، اور جس چیز سے اسے اذیت پہنچتی ہو اس سے خود مجھ کو بھی اذیت پہنچتی ہے۔''

یاد رہے کہ صحیح بخاری شریف کے سات مقامات اور صحیح مسلم، ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں اس حدیث شریف میں آپ ﷺ کے ان الفاظ کا سبب بھی مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی ہی میں ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے اور اسے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سوتن بنانے کا ارادہ کیا تو نبی ﷺ غم و غصے کے عالم میں منبر پر رونق افروز ہوئے اور تین مرتبہ فرمایا کہ میں اس بات کی اجازت نہیں دیتا سوائے اس کے کہ اگر ابن ابی طالب ضرور ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنا ہی چاہتا ہے تو پہلے میری بیٹی کو طلاق دے دے، پھر جا کر اس سے نکاح کر لے۔[3]

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ شیعہ لوگ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نبی ﷺ کے ارشاد کے اتنے حصے کو تو بہت اٹھاتے ہیں کہ ''جس نے میری بیٹی کو اذیت دی، غضبناک کیا، اس نے مجھے اذیت دی، غضبناک کیا۔'' لیکن اسی حدیث کا اصل سببِ ورود شِیر مادر کی طرح ہضم کر جاتے ہیں، کیوں کہ اس کے بیان کرنے سے تو ان کے اپنے ہی چراغ سے اپنے ہی گھر کو آگ لگ جاتی ہے۔

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (٧/ ١٠٥: ٣٧١٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٤٩)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٢٣٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٤٩) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٠٧١) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٨٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٩٩٨) مشکاة المصابیح (٣/ ١٧٣٢) شرح السنة (١٤/ ١٥٨ ١٥٩) الفتح الرباني (٢٢/ ٩٥) تخریج المسند (١٨٩٢٦)

[3] حوالہ جاتِ سابقہ و شرح السنة و تحقیقه (١٤/ ١٥٩)

بخاری و مسلم شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے (حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر) حضرت ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کا نام لے کر فرمایا کہ میں نے اسے اپنی بیٹی دی تو اس نے مجھ سے جو بات کہی، سچ کہا اور جو وعدہ کیا پورا کیا۔ اس طرح حضرت ابو العاص رضی اللہ عنہ کے ایک اچھا داماد ہونے کی تعریفیں کیں اور اسی خطبے میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام تو قرار نہیں دے سکتا، لیکن:

«وَاللّٰهِ لَا تَجْتَمِعُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ بِنْتُ عَدُوِّ اللّٰهِ مَكَاناً وَّاحِداً اَبَداً»[1]

''اللہ کی قسم! اللہ کے رسول ﷺ کی بیٹی اور اللہ کے دشمن (ابوجہل) کی بیٹی ایک جگہ پر اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔''

دوسری روایت میں ہے:

«عِنْدَ (تَحْتَ) رَجُلٍ وَاحِدٍ اَبَداً»[2]

''ایک آدمی کے نکاح میں کبھی اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔''

اس عتابِ نبوی ﷺ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔[3]

فضائل و مناقب حضرت فاطمہ و علی اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے فضائل و مناقب کے بارے میں نبی ﷺ کے چند ارشادات آپ کے سامنے رکھے جاچکے ہیں جبکہ بعض احادیث ایسی بھی ہیں جن میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہی حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے فضائل بھی مذکور ہیں۔ مثلاً: سورت آلِ عمران (آیت: ۵۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

---

[1] صحيح البخاري (٧/ ٨٥، رقم الحديث: ٣٧٢٩) صحيح مسلم (٤/ ١٩٠٢، رقم الحديث: ٢٤٤٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٣٨) تخريج المسند، رقم الحديث (١٨٩١٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٥٧)

[2] أيضاً

[3] صحيح مسلم، سنن ابن ماجه، صحيح ابن حبان أيضاً و الفتح الرباني (٢٢/ ٩٤) تخريج المسند أيضاً.

''بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسے ہے جیسے آدم کی (بلکہ اس سے بھی کم) اللہ نے آدم کا پتلہ مٹی سے بنایا پھر اس سے کہا آدم ہو جا وہ (آدم) بن گیا۔''

اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے اس عقیدے کی کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی سی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مٹی سے پیدا کیا اور فرمایا: ہوجا، اور وہ ہوگئے، یعنی اگر بالفرض محض بے باپ پیدا ہونا ہی کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا بنانے کے لیے کافی دلیل ہو تو پھر عیسائیوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق بدرجۂ اولیٰ ایسا عقیدہ تجویز کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو صرف بے باپ ہی پیدا ہوئے تھے، مگر حضرت آدم علیہ السلام تو ماں اور باپ دونوں ہی کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔[1]

آگے آیت نمبر (۶۰) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴾

''یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جارہی ہے۔ اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جاؤ جو اس میں شک کرتے ہیں۔''

اس سے اگلی آیت (۶۱) آیتِ مباہلہ میں اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہوکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴾

''یہ علم آجانے کے بعد جو کوئی اس معاملے میں آپ سے جھگڑا کرے تو (اے نبی!) اس سے کہیں کہ آؤ، ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں۔ پھر (سب مل کر) مباہلہ یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔''

صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت: ﴿ نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ ﴾ نازل ہوئی تو نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو اپنے پاس بلا کر فرمایا:

---

[1] تفھیم القرآن (۱/ ۴۵۹) مختصر حواشی ترجمۂ قرآن (ص: ۱۶۱)

«اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَآءِ اَھْلِیْ» [1] ''اے اللہ! یہ سب میرے اہلِ بیت ہیں۔''

اس حدیثِ شریف کی رو سے ان چاروں حضرات کو بھی نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے اہلِ بیت یا اہلِ خانہ ہونے کے شرف سے نوازا۔ اسی طرح صحیح مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''نبیِ اکرم ﷺ ایک دن صبح کے وقت کالی اون کی بنی ہوئی یمنی چادر اوڑھے نکلے تو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما آ گئے۔ آپ ﷺ نے انھیں اپنی چادر میں داخل کر لیا۔ پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے تو انھیں بھی داخل کر لیا۔ پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو انھیں بھی اس چادر میں داخل کر لیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو بھی اس چادر میں داخل کر لیا۔ پھر سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۳) تلاوت فرمائی۔ (جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:)

﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ﴾

[الأحزاب: ۳۳]

''اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتِ نبی سے ہر قسم کی لغویات و گندگی کو دور کر دے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔'' [2]

اِس حدیثِ نبوی ﷺ میں ان چاروں حضرات کی نبی ﷺ سے قرابت داری، ان کا مقام و مرتبہ اور فضیلت بیان ہوئی ہے۔

صحیح مسلم شریف کی ان سابقہ دونوں حدیثوں کے ساتھ ہی صحیح مسلم وغیرہ کی ہی ایک اور حدیث بھی شامل کر لی جائے تو نہ صرف اہلِ بیت کے مقام و مرتبہ اور فضیلت کا پتا چل جاتا ہے، بلکہ ساتھ ہی افرادِ اہلِ بیت کی تعیین بھی ہو جاتی ہے اور واضح طور پر یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ اہلِ بیت میں کون کون شامل ہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان غدیرِ خُم نامی مقام پر نبیِ اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا جس میں حمد و ثنا اور وعظ و تذکیر کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے لوگو! میں بھی ایک بشر ہوں اور قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیامِ اجل

---

[1] صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٥/ ١٧٦، رقم الحديث: ٢٤٠٤) مشكاة المصابيح (٣ / ١٧٣١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٢٤) شرح السنة (١٤ / ١١٦) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣١) .

لانے والا (ملک الموت علیہ السلام) آئے اور میں اسے قبول کرلوں۔ لیکن میں تمھارے مابین دوعظیم الشان چیزیں چھوڑ کر جانے والا ہوں۔ ان میں پہلی چیز اللہ کی کتاب (قرآنِ کریم) ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ پس اللہ کی کتاب کو پکڑ لو اور اس (کے احکام) کو اچھی طرح اپنا لو۔''

آپ ﷺ نے کتاب اللہ کے بارے میں خوب ترغیب دلائی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''کتاب اللہ ہی اللہ کی رسی ہے۔ جس نے اس پر عمل کیا وہ ہدایت پر ہے اور جس نے اسے ترک کر دیا وہ گمراہی پر ہے۔''

پھر فرمایا: ''اور (دوسری چیز) میرے اہلِ بیت ہیں۔ اور پھر تین مرتبہ فرمایا:

«اُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِیُ اَهُلِ بَیُتِیُ»

''میں تمھیں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں اللہ کے خوف سے کام لینے کی تلقین کرتا ہوں۔''

رواتِ حدیث میں سے حضرت حصین بن سبرہ رحمہ اللہ نے پوچھا: اے زید! نبی ﷺ کے اہلِ بیت کون کون ہیں؟ کیا آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آپ ﷺ کے اہلِ بیت سے نہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: ''نِسَآءُهُ مِنُ اَهُلِ بَیُتِهٖ''

''آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن تو آپ ﷺ کے اہلِ بیت سے ہی ہیں۔''

لیکن وہ بھی آپ ﷺ کے اہلِ بیت ہیں جن پر آپ ﷺ کے بعد صدقہ حرام ہے۔

حضرت حصین رحمہ اللہ نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''وہ آلِ علی، آلِ عقیل، آلِ جعفر اور آلِ عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔''

حضرت حصین رحمہ اللہ نے پوچھا: کیا ان سب پر صدقہ و زکات حرام ہے؟ تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں۔[1]

---

[1] صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٥ / ١٧٩۔ ١٨٠، رقم الحديث: ٢٤٠٨) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٢٣) الفتح الرباني (٢٢/ ١٠٣۔ ١٠٤) شرح السنة للبغوي (١٤ / ١١٧۔ ١١٨) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٢)

امام نووی رحمہ اللہ نے مسلم شریف کی اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں مذکور لفظ ''صدقہ'' سے مراد زکات ہے اور وہ ہمارے نزدیک بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب پر حرام ہے۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک زکات صرف بنو ہاشم پر حرام ہے، اور کسی پر نہیں۔

صحیح مسلم میں اس حدیث سے آگے تیسری حدیث میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے اہلِ بیت سے ہونے کی نفی کی گئی ہے جس سے یہ دونوں روایتیں بظاہر متناقض اور متضاد معلوم ہوتی ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی بہترین توجیہ اور جمع و تطبیق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پہلی روایت سے مراد یہ ہے کہ وہ سب آپ ﷺ کے اہلِ بیت سے ہیں کہ جن کی رہائش وخوراک اور کفالت بھی نبی ﷺ کے ذمے تھی، آپ ﷺ نے ان کے احترام و اکرام کا حکم فرمایا اور انھیں ثقل (عظیم الشان) قرار دیا۔ آپ ﷺ نے ان کے حقوق کے سلسلے میں وعظ و تذکیر فرمائی اور آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ان سب امور میں داخل ہیں لیکن ان لوگوں میں داخل نہیں ہیں جن پر صدقہ زکات حرام ہے۔

پہلی روایت میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آپ ﷺ کے اہلِ بیت سے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کے اہلِ بیت وہ بھی ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ اس طرح دونوں روایتوں کا ظاہری اختلاف ختم ہوا اور دونوں کا مفہوم متفق ہو گیا۔''[1]

فضائل و مناقبِ حضرت حسن رضی اللہ عنہ

نبیِ اکرم ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نواسے، حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کے لختِ جگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ اور فضائل و محاسن بھی کتبِ حدیث میں بکثرت وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ وَالْحَسَنُ ابْنُ عَلِيٍّ عَلَیٰ عَاتِقِهِ یَقُوْلُ: «اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ»[2]

[1] شرح مسلم للنووي (٨/ ١٥/ ١٧٩۔ ١٨٠)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ٩٤، رقم الحديث: ٣٧٤٩) صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٥ / ١٩٣، رقم الحديث: ٢٤٢٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٨٣) السنن الكبرىٰ للنسائي (٨١٦٣) مسند أحمد (١٨٥٠١) صحيح ابن حبان (٦٩٦٣) شرح السنة للبغوي (١٤ / ١٣٤) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٣)

میں نے نبی ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کے کندھے پر تھے اور آپ ﷺ فرما رہے تھے: ''اے اللہ! میں اس سے محبت رکھتا ہوں، پس تو بھی اس سے محبت کر۔''

بخاری ومسلم وغیرہ میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''میں نبی ﷺ کے ساتھ دن کے کسی حصے میں باہر نکلا، آپ ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر تشریف لائے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو آوازیں دیں (جبکہ وہ ابھی بچے تھے) تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھاگتے ہوئے آئے اور آپ ﷺ نے آتے ہی انھیں گلے لگا لیا۔ دونوں نے باہم معانقہ کیا، تب نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ وَاَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهٗ»[1]

''اے اللہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں، تو بھی اس سے محبت کر، اور اس سے بھی محبت کر جو اس سے محبت رکھتا ہے۔''

صحیح بخاری، ابو داود، ترمذی اور نسائی میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو منبر پر دیکھا، جبکہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما بھی آپ ﷺ کے ایک پہلو میں تھے۔ آپ ﷺ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی حسن کی طرف، اسی عالم میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّ هَذَا اِبْنِیْ سَيِّدٌ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيْمَتَيْنِ»[2]

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ میرے اس بیٹے کے ہاتھوں مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے مابین صلح کرائے گا۔''

تاریخ شاہد ہے کہ نبی ﷺ کی یہ بشارت پوری ہوئی۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے ''شرح السنة''

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨٤) شرح السنة للبغوي (١٤ / ١٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٢١) مشكاة المصابيح حواله سابقه، تخريج المسند (١٠٩١۔ ٧٣٩٨) صحيح ابن حبان (٦٩٦٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٠٤۔ ٣٦٢٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٧٣) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤١٠) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٠٣٩٢)

میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوئی جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت ہاتھ آنے پر فتنہ وفساد کے خدشے اور مسلمانوں میں خون خرابے کو نا پسند کرتے ہوئے امرِ خلافت کو ترک کر دیا اور نبی ﷺ کے کاتبِ وحی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی[1] اور ان کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے عراق و شام کے مابین صلح کرا دی اور وہ سال تاریخِ اسلام میں عام الجماعۃ کہلایا۔''

اس حدیثِ صحیح میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ اس صلح میں شریک دونوں جماعتیں ہی مسلمان تھیں۔ طرفین میں کوئی ایک بھی قولاً یا فعلاً اسلام سے خارج نہیں ہوا۔ کیوں کہ صحیح بخاری وغیرہ کے اس ارشادِ نبوی ﷺ میں آپ ﷺ نے دونوں جماعتوں کو مسلمانوں کی جماعتیں قرار دیا ہے۔[2]

بخاری شریف میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے بیٹے تھے اور سورۃ الاحزاب کی آیت چار اور پانچ، خصوصاً آیت پانچ کے الفاظ ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''لوگوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو۔'' کے نزول سے پہلے زید بن محمد ﷺ کہلواتے تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور زید رضی اللہ عنہ دونوں باپ بیٹے ہی نبی ﷺ سے انتہائی محبت رکھتے تھے جیسا کہ بخاری و مسلم میں مذکور احادیث سے پتا چلتا ہے، اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو تو آپ ﷺ اتنا مقام دیتے تھے کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ مجھے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ، ہم دونوں کو پکڑ کر (اپنے ساتھ چمٹا لیتے اور) فرماتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهُمَا فَاَحِبَّهُمَا»[3]

''اے اللہ! میں ان (دونوں) سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔''

---

[1] کاتبینِ وحی کی تفصیل: البداية والنهاية (٥/٣/ ٣٣٩ تا ٣٥٦ آخر جلد)

[2] صحیح البخاري، رقم الحديث (٣٧٤٦) سنن أبي داود، ترمذی، نسائی، مسند أحمد أيضاً و شرح السنة للبغوي (٤/ ١٣٦ـ ١٣٧) تحفة الأحوذي (٩/ ٢٧٧ـ٢٧٨)

[3] صحیح البخاري مع الفتح (٩٤/٧، رقم الحديث: ٣٧٤٧) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨١٧١) مسند أحمد، رقم الحديث (٢١٨٢٨) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٤)

بخاری شریف ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ مجھے اپنی ایک رانِ مبارک پر اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دوسری پر بٹھا لیتے اور فرماتے:

«اَللّٰھُمَّ ارْحَمْھُمَا فَاِنِّیْ اَرْحَمُھُمَا»[1]

''اے اللہ !ان دونوں پر رحم فرما، میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔''

ان دونوں حدیثوں میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی دعائے خیر میں شریک فرمایا، جبکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما اور خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے بارے صحیح مسلم وغیرہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«وَ أَیْمُ اللّٰهِ اِنْ کَانَ لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ وَ اِنَّ ھَذَا لَمِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَیَّ بَعْدَهٗ، فَاُوْصِیْکُمْ بِهٖ فَاِنَّهٗ مِنْ صَالِحِیْکُمْ»[2]

''اللہ کی قسم! (زید رضی اللہ عنہ) مجھے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب تھا اور اس کے بعد یہ (اسامہ رضی اللہ عنہ) مجھے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہے۔ میں تمھیں اس (پر اعتماد کرنے) کی وصیت کرتا ہوں، یہ تمھارے صالحین میں سے ہے''

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے حبِ رسول ﷺ کا اندازہ ترمذی شریف وغیرہ کی اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ناک صاف کرنا چاہی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ کام مجھے کرنے دیں۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«یَا عَائِشَةُ! اَحِبِّیْهِ فَاِنِّیْ اُحِبُّهٗ»[3]

''اے عائشہ! اس سے محبت رکھو، میں اس سے محبت رکھتا ہوں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٠٣) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٤)

[2] صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٥/ ١٩٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨١٨) ترمذى مع التحفة ٩/ ٣٢٣) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٠) وحسّنه الالباني، تخريج سير أعلام النبلاء (٥٠٠/٢) و حسنه الأرناؤوط، صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٠٥٨) الصحيح المسند للوادعي (١٦١٧)

فضائل ومناقبِ حسنین رضی اللہ عنہما

سبطِ رسول ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں چند ارشاداتِ نبوی ﷺ ذکر کیے جا چکے ہیں، جبکہ بعض احادیث میں نبی ﷺ کے دونوں نواسوں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کا ذکر ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری شریف وغیرہ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی عراقی نے پوچھا کہ کیا محرم (احرام کی حالت میں) مکھی مار سکتا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: اہلِ عراق مکھی مارنے کے بارے میں پوچھتے ہیں جبکہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے نواسے (حضرت حسین رضی اللہ عنہ) کو قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ آپ ﷺ کے نواسوں کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«هُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا»[1]

''حضرت حسن اور حسین (رضی اللہ عنہما) دونوں میرے پھول ہیں۔''

ترمذی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اقدس ﷺ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو اپنے پاس بلا کر سونگھتے اور اپنے ساتھ چمٹا لیتے تھے۔[2] تاہم صرف چمٹا لینے یا معانقہ کرنے کا ذکر تو صحیح بخاری کے ''باب مناقب الحسن والحسین رضی اللہ عنہما'' کے ترجمہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''عَانَقَ النَّبِيُّ ﷺ الْحَسَنَ''[3] ''نبی ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے معانقہ کیا۔''

طبرانی اوسط میں حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے ایک متکلم فیہ حدیث میں مروی ہے:

''میں نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت حسن اور حسین (رضی اللہ عنہما) دونوں آپ ﷺ کے سامنے کھیل رہے ہیں۔ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ ﷺ ان سے محبت رکھتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَكَيْفَ لَا، هُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا أَشُمُّهُمَا»[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ٩٥ و برقم: ٣٧٥٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٧٠) شرح السنة للبغوي (١٤ / ١٣٠٠) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٣)

[2] فتح الباري في شرح الحديث المذكور و لم يتكلم فيه.

[3] علقه هنا و وصله في كتاب البيوع.

[4] فتح الباري (٧/ ٩٩) و لم يتكلم عليه، مجمع الزوائد (١٨٤/٩) و ضعّفه، معجم الكبير للطبراني (١٥٦/٤، رقم الحديث (٣٩٩٠) در السحابة للشوكاني (٢٤٣ و ضعّفه)

’’کیوں نہیں، یہ دونوں تو میرے پھول ہیں، جنھیں میں سونگھتا ہوں۔‘‘

بخاری شریف وغیرہ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«لَمْ يَكُنْ اَحَدٌ اَشْبَهَ بِالنَّبِيِّ ﷺ مِنَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ »[1]

’’حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما، سے بڑھ کر نبی ﷺ سے ملتی جلتی شکل و شباہت والا کوئی نہ تھا۔‘‘

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی مروی ہے:

«كَانَ اَشْبَهَهُمْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ »[2]

’’حضرت حسین رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی شکل و شباہت والے ہونے کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر تھے۔‘‘

حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما میں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ زیادہ قریبی شباہت والے تھے۔ خصوصاً چہرے کی حد تک، جیسا کہ مسند احمد مذکور ہے۔[3] بلکہ ترمذی، ابن حبان اور مسند احمد کی ایک حدیث میں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سر سے لے کر سینے تک رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سینے سے نچلے حصے میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔[4]

ان حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے علاوہ پندرہ دیگر حضرات رضی اللہ عنہم بھی نبی ﷺ سے قریبی شباہت رکھنے والے تھے۔[5]

ترمذی شریف، صحیح ابن حبان، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ٩٥: ٣٧٥٢) شرح السنة للبغوي (١٤/ ١٣٣) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ٩٤: ٣٧٤٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٧٨) تخريج المسند، رقم الحديث (١٣٠٥٤ـ ١٣٧٤٨) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٧٢) و شرح السنة و المشكاة أيضاً)

[3] تخريج المسند، رقم الحديث (١٣٥٤) و صححه الأرناؤوط.

[4] مسند أحمد (١١٨/٢) و صححه أحمد شاكر، تخريج صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٧٤) و تكلم عليه، شرح السنة للبغوي (١٣٣/١٤) و قال الارناؤوط: لا بأس باسناده، ضعيف سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٧٩) و ضعّفه.

[5] تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري (٧/ ٩٧ـ ٩٨)

«اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ»[1]

''حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما نوجوان اہلِ جنت کے سردار ہوں گے۔''

علامہ طیبی، مظہر اور مبارک پوری رحمہ اللہ شارحینِ ترمذی نے یہ وضاحت کی ہے کہ اہلِ جنت کی عمر تو ایک ہی ہو گی، سبھی نوجوان ہوں گے۔ اس حدیث کے صحیح مفہوم کی تعیین تبھی ممکن ہے کہ وہ اہلِ جنت مراد لیے جائیں جو جوانی کے عالم میں راہِ للہ فوت یا شہید ہوئے ہوں یا پھر یہ کہ انبیائے کرام علیہم السلام اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے سوا تمام اہلِ جنّت کے سردار ہوں گے۔[2]

ترمذی شریف میں ایک حسن وجید سند سے مروی حدیث ہے:

''نبی ﷺ حضرت حذیفہ اور ان کی والدہ رضی اللہ عنہما کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ فرشتہ نازل ہوا ہے جو آج کی رات سے قبل کبھی زمین پر نہیں آیا، اس نے اپنے رب سے اجازت طلب کی ہے کہ وہ (میرے پاس آکر) مجھے سلام کرے اور مجھے یہ بشارت و خوش خبری دے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اہلِ جنت خواتین کی سردار ''خاتونِ جنت'' ہیں۔ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما نوجوانان اہلِ جنت کے سردار ہیں۔''[3]

ابو داود، صحیح ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''نبی ﷺ ہمیں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما آ گئے۔ وہ دونوں سرخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھے اور (بچپنے کی وجہ سے افتاں خیزاں) گرتے پڑتے چل رہے تھے۔ نبی ﷺ منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ ان دونوں کو اٹھا لیا اور (منبر پر) اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پھر ارشاد فرمایا:

«صَدَقَ اللّٰهُ ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ نَظَرْتُ اِلٰى هٰذَيْنِ الصَّبِيَّيْنِ

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ٢٧٢ـ ٢٨٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٨١) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨٤٧٢) تخريج المسند، رقم الحديث (٢٣٣٢٩) شرح السنة و تحقيقه (١٤ / ١٣٨) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٧ـ ١٧٣٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٩٥٩) صحيح الجامع (٧٩)

[2] بحواله تحفة الأحوذي (٩/ ٢٧٣)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ٢٨٤) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٣٨) صحيح الجامع الصغير (٢٢٥٧)

يَمْشِيَانِ وَيَعْثُرَانِ فَلَمْ اَصْبِرْ حَتّٰى قَطَعْتُ حَدِيْثِيْ وَرَفَعْتُهُمَا »[1]

''اللہ تعالیٰ نے سچ ہی فرمایا ہے کہ ''تمھارے مال اور اولاد فتنہ و آزمایش ہیں۔'' (سورۃ التغابن، آیت: ۱۵) میں نے ان دونوں کو چلتے ہوئے گرتے پڑتے آتے دیکھا تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ یہاں تک میں نے وعظ و گفتگو کو روک کر ان دونوں کو اٹھا لیا۔''

نبیِ اکرم ﷺ کے دل میں ان دونوں نواسوں کی کس قدر محبت تھی؟ اس کا اندازہ اس حدیث میں مذکور صرف اسی ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ان نونہالوں کو جب اُفتاں وخیزاں، گرتے پڑتے، اٹھتے اور پھر چلتے دیکھا، تو فوراً منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ خطبہ اور وعظ وارشاد کا وہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا اور آ کر انھیں اٹھا لیا۔ ساتھ ہی سورۃ التغابن میں نازل ہونے والے ارشادِ الٰہی کی تصدیق بھی فرما دی کہ مال اور اولاد انسان کے لیے امتحان وآزمایش ہیں، بھلا کوئی مال میں مگن اور اولاد میں کھو کر اپنے خالق و مالک کو تو نہیں بھول جاتا؟

ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا

صحیح مسلم کے حوالے سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب تک نبیِ اکرم ﷺ کی پہلی زوجۂ محترمہ حضرت ام المومنین خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں، آپ ﷺ نے دوسری کسی زوجۂ محترمہ سے نکاح نہیں کیا۔ جب نبیِ اکرم ﷺ کے حرمِ زوجیت میں پچیس سالہ ازدواجی زندگی گزار کر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے انتقال فرمایا تو ان کے دو سال بعد نبیِ اکرم ﷺ نے متعدد خواتین کو اپنے نکاح میں لے کر انھیں ام المومنین ہونے کے شرف سے نوازا۔ ان میں نکاح کے اعتبار سے تو سب سے پہلی خاتون حضرت عائشہ صدیقہ بنت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہا ہیں، لیکن ان کے نکاح کے تین چار سال بعد ان کی رخصتی ہوئی تھی، جبکہ اسی دوران میں نبی ﷺ نے ایک اور خاتون حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا۔ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا اور نبی ﷺ کے دادا، عبد المطلب کے ننھیال ایک

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٧٤) سنن النسائي (٣/ ١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٠٠) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٠٣٩) تخريج المسند، رقم الحديث (٢٢٩٩٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٥٧) و صححه.

ہی تھے۔ ان کا نسب نامہ نبیِ اکرم ﷺ کی آٹھویں پشت کے دادا کعب بن لوی میں جا کر نبی ﷺ سے مل جاتا ہے۔

ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا پہلے حضرت سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، وہ پہلے ایمان لائیں اور پھر انہی کی ترغیب وتحریص سے ان کے شوہر بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی سنت بھی پوری کی۔ حضرت سکران (رضی اللہ عنہ) کا وہیں انتقال ہوا اور نبوت کے دسویں سال ان کا نکاحِ ثانی نبیِ کریم ﷺ سے ہوا۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا مکارمِ اخلاق اور محاسنِ اعمال میں معروف تھیں۔ ان کے درجۂ ام المومنین پر فائز ہونے کا اصل سبب ان کا اور ان کے خاندان کا قدیم الاسلام ہونا، اور اسلام کی خاطر حبشہ کی طرف ہجرت کرنا تھا۔ انھوں نے نبی ﷺ سے نکاح کے چند سال بعد نبی ﷺ کی تقسیم کے مطابق انھیں دیا گیا وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا تھا۔[1]

کتبِ حدیث میں ان سے پانچ احادیث مروی ہیں۔ ایک بخاری شریف میں اور چار سننِ اربعہ میں۔ انھوں نے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری زمانے میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ (رحمۃ للعالمین)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں جن کا مختصر تذکرہ و فضائل گزر چکے ہیں۔ ان کا شجرۂ نسب نبی ﷺ کی ساتویں پشت کے دادا مُرہ میں جا کر نبی ﷺ سے مل جاتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نبیِ اکرم ﷺ سے نکاح تو مکہ مکرمہ میں نبوت کے دسویں سال ماہِ شوال میں ہوا تھا، مگر رخصتی ہجرت کے پہلے سال ماہِ شوال میں جا کر مدینہ منورہ میں ہوئی۔ نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے صرف یہی ایک خاتون ایسی ہیں کہ جن کا پہلا نکاح نبی ﷺ سے ہی

[1] مختصر از رحمة للعالمين (٢/ ١٤٧ـ ١٤٨) الفتح الرباني (٢٠/ ٢٣٦، ٢٢/ ١٠٨)

ہوا، جبکہ دیگر تمام امہات المومنین وزوجاتِ رسول ﷺ بیوہ ہو کر آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ اسی مناسبت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ ایک عظیم شرف بھی حاصل ہوا کہ نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے یہ واحد زوجۂ محترمہ تھیں کہ نبی ﷺ پر ان کے بستر میں ہونے کے باوجود بھی وحی کے نزول میں تاخیر نہیں ہوتی تھی، چنانچہ صحیح بخاری شریف میں ایک واقعہ کے ضمن میں مذکور ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُؤْذِيْنِيْ فِي عَائِشَةَ فَإِنَّهُ وَاللّٰهِ مَا نَزَلَ عَلَيَّ الْوَحْيُ وَأَنَا فِيْ لِحَافِ امْرَأَةٍ مِنْكُنَّ غَيْرَهَا»[1]

”مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں (کچھ کہہ کر) اذیت و تکلیف مت پہنچاؤ، اللہ کی قسم! یہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہی ہے کہ میں اس کے لحاف میں ہوتا ہوں تو اس وقت بھی مجھ پر وحی کا نزول ہو جاتا ہے، مگر دیگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بستروں پر کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

اسی واقعے کے ضمن میں یہ بھی مذکور ہے کہ پھر اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا: «يَا بُنَيَّةُ! أَلَا تُحِبِّيْنَ مَا أُحِبُّ»

”اے میری بیٹی! (فاطمہ رضی اللہ عنہا) کیا تم اس سے محبت نہیں رکھتی ہو جس سے میں محبت رکھتا ہوں۔“

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیوں نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَأَحِبِّيْ هٰذِهٖ»[2] ”تب پھر اس (عائشہ رضی اللہ عنہا) سے محبت رکھ۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بستر میں حضرت امام الانبیاء والرسل ﷺ پر وحی نازل ہونے والی حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے شارحین نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہت بڑی سعادت وفضیلت

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١٠٧، رقم الحديث: ٢٥٨١ـ٣٧٧٥) سنن النسائي الصغرىٰ، رقم الحديث (٣٩٦٠) و والكبرىٰ (٨٨٤٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٨٧٩) سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ٣٣٧) الفتح الرباني (٢٢/ ١١٤ـ ١١٥) تخريج المسند، رقم الحديث (٢٦٥١٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧١٠٩) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٤)

[2] حواله جاتِ سابقه، صحيح مسلم مع النووي (١٥/٨/ ٢٠٥)

ہے اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بستر مردوں میں سے صرف نبیِ اکرم ﷺ ہی کے لیے خاص تھا، کیوں کہ وہ واحد کنواری خاتون تھیں جن کا نبیِ اکرم ﷺ سے پہلا نکاح ہوا تھا۔ جبکہ دیگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں یہ چیز نہیں تھی، بلکہ ان سب میں ہر ایک کی زندگی میں نبی ﷺ سے قبل بھی مرد (شوہر) آ چکے تھے۔ اس اعتبار سے اور من کل الوجوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جو یہ شرف حاصل ہوا، وہ اس کی بجا طور پر مستحق تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بستر میں نزولِ وحی کے اختصاص کی حکمت کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے کی وجہ سے تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کپڑوں کو انتہائی صاف ستھرا رکھتی تھیں جن میں وہ نبی ﷺ کے ساتھ ہوتی تھیں۔[1] وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰی

کتاب ''مدارج النبوۃ'' (جلد دوم) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جود و سخا کے بارے میں حضرت عُروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک ہی دن میں ستر ہزار درہم راہِ للہ صرف کیے۔ جبکہ خود پیوند لگا کر کرتہ پہنے ہوئے تھیں۔ ایک دن حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کی خدمت میں ایک لاکھ درہم بھیجے جو سب انھوں نے اسی روز صدقہ کر دیے۔ خود روزے سے تھیں۔ شام کو کنیز نے سوکھی روٹی سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ اگر سالن کے لیے کچھ بچا لیا ہوتا تو تیار کر لیتی۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''مجھے تو خیال ہی نہ رہا تو نے ہی یاد دلایا ہوتا۔'' رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا وَاَرْضَاهَا.[2]

فضائل و مناقب:

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے بڑا مقام و مرتبہ عطا کیا تھا۔ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے فضائل کے ضمن میں ایک ارشادِ نبوی ﷺ گزر چکا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے سلام بھیجا اور خود حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بھی انھیں سلام کہا، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، ابوداؤد و ترمذی اور مسند احمد

[1] فتح الباري (٧/ ١٠٩)

[2] بحواله رحمة للعالمين (٢/ ٥٥ـ ١٥٤)

میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«يَا عَائِشُ هَذَا جِبْرِيلُ يُقْرِئُكِ السَّلَامَ»[1]

''اے عائشہ! یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں جو تمھیں سلام کہہ رہے ہیں۔''

مسلم شریف کے الفاظ ہیں: «يَقْرَأُ عَلَيْكِ السَّلَامَ»[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے جواب میں کہا: ''وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ''۔ اور فرمایا: نبی ﷺ جو کچھ دیکھ رہے تھے، وہ میں نہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کی مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے۔ بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''اے عائشہ رضی اللہ عنہا! مجھے تین راتیں مسلسل تم دکھائی گئی ہو، ایک فرشتہ تمہیں ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر لاتا اور مجھے کہتا کہ یہ آپ ﷺ کی بیوی ہے۔ جب میں تمھارے چہرے سے کپڑ اٹھاتا تو وہ تم ہی ہوتیں۔'' تب میں نے کہا:

«اِنْ يَّكُنْ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ يُمْضِهٖ»[3]

''یہ خواب اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو وہ خود ہی اسے پورا کردے گا۔''

اس خواب کی تعبیر حقیقت کا روپ دھار گئی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبیِ اکرم ﷺ کے حرمِ زوجیت میں داخل ہوگئیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شادی کا اہتمام حظیرۃ القدس میں کیا گیا تھا اور نبی ﷺ نے اس شادی کو من جانبِ اللہ قرار دیا تھا۔ صحیح بخاری شریف میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اِنِّيْ لَأَعْلَمُ اَنَّهَا زَوْجَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ»[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١٠٦/٧، رقم الحديث: ٣٧٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤٧)

[2] صحيح مسلم مع النووي (٢١١/٥/٨-٢١٢) انظر أيضاً سنن الترمذي مع التحفة (٣٧٩/٩) الفتح الرّباني (١٢٥/٢٢) شرح السنّة (١٦٢/١٤) مشكاة المصابيح (١٧٤٣/٣)

[3] **متفق عليه.** صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٣٨) مشكاة المصابيح (١٧٤٤/٣) صحيح مسلم مع النووي (١٥/٨/ ٢٠٢) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٠٩٤)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١٠٦)

''میں جانتا ہوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ کی دنیا وآخرت دونوں جہانوں کی بیوی ہیں۔''

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس ارشادِ نبوی ﷺ سے ماخوذ ہے جو صحیح ابن حبان میں ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:

《اَمَا تَرْضَيْنَ اَنْ تَكُوْنِيْ زَوْجَتِيْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ》[1]

''کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں ہی میری بیوی ہو۔''

ترمذی شریف میں ایک صحیح حدیث ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد بھی خاص اشارۂ الٰہی تھا۔ چنانچہ ترمذی شریف میں ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام سبز رنگ کے ریشم میں لپیٹ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر نبی ﷺ کی خدمت میں لائے اور فرمایا:

《هٰذِهٖ زَوْجَتُكَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ》[2]

''یہ آپ کی دنیا وآخرت دونوں جہانوں کی بیوی ہیں۔''

ان تینوں حدیثوں پر معمولی سا غور کرنے سے کتنے ہی مسائل واضح ہو جاتے ہیں، مثلاً:

پہلا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نبی ﷺ سے نکاح، منشائے الٰہی اور خاص اہتمامِ الٰہی سے ہوا۔

دوسرا: یہ نکاح دنیا وآخرت دونوں جہانوں کے لیے دائمی تھا۔

تیسرا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اہلِ جنت میں سے ہیں اور وہاں بھی نبی ﷺ کی بیوی اور آپ ﷺ کے ساتھ ہوں گی۔

بخاری ومسلم، ترمذی اور مسند احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ مردوں میں سے تو بہت درجۂ کمال کو پہنچے ہیں، مگر عورتوں میں سے صرف حضرت مریم بنت عمران اور آسیہ زوجہ فرعون ہی درجۂ کمال کو پہنچی ہیں۔ پھر ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

《وَفَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَآءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ》[3]

''عائشہ رضی اللہ عنہا کو تو سب عورتوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے ثرید کو سب کھانوں پر۔''

---

[1] بحواله فتح الباري (٧/ ١٠٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٥٥)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ٣٧٩) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٥) و صححه الألباني

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٧/ ١٠٦، رقم الحديث: ٣٤٣٣) صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٥/ ٢١١: ٢٤٣١) سنن الترمذي مع التحفة (٩/ ٣٨٣) شرح السنة للبغوي (١٤/ ١٦٣)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ذکر میں بخاری و مسلم اور ترمذی وغیرہ کی حدیث بھی گزر چکی ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''عائشہ رضی اللہ عنہا۔'' اور پوچھا کہ مردوں میں سے کون؟ تو فرمایا: اس کا باپ یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔''

حضرت خدیجہ، فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہن میں بہت سے فضائل مشترک ہیں اور بعض متفاوت، مجموعی طور پر افضلیت کسے حاصل ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خیر و برکت کا پیکر تھیں اور اس امر کی گواہی بخاری شریف میں حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی زبانی منقول ہے کہ ایک سفر کے دوران میں ان کا ہار گم ہو گیا، تلاش کرنے والوں نے نماز کا وقت ہو جانے اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے بلا وضو ہی نماز ادا کر لی۔ نبی ﷺ سے جب اس بات کا ذکر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے سورۃ المائدہ، (آیت: ۶) اور سورۃ النساء (آیت: ۴۳) آیاتِ تیمّم نازل فرمائیں۔ اس وقت حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«جَزَاكِ اللّٰهُ خَيْراً فَوَاللّٰهِ مَا نَزَلَ بِكِ اَمْرٌ قَطُّ اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ لَكِ مِنْهُ مَخْرَجًا وَ جَعَلَ لِلْمُسْلِمِيْنَ فِيْه بَرَكَةً»[2]

''اے عائشہ رضی اللہ عنہا! اللہ تمھیں جزائے خیر دے، اللہ کی قسم! جب بھی کبھی آپ کا کوئی کام اٹکا تو آپ کے لیے خود اللہ نے بہتر راہ نکال لی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے بھی برکت نازل فرمائی (اس سے ان کی مراد رخصتِ تیمّم کا نزول ہے)۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علم و فضل کا اندازہ ترمذی شریف میں مذکور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے اُس ارشاد سے لگایا جا سکتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

''ہم اصحابِ رسول ﷺ کو جب بھی کوئی دینی مسئلہ مشکل نظر آیا تو ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

---

[1] تفصیلاً دیکھیں: فتح الباري (۷/ ۱۰۷۔ ۱۰۹) جلاء الأفهام لابن القيم، رحمة للعالمين (۲/ ۱۵۵)

[2] صحيح البخاري (۷/ ۱۰۷۔ ۱۰۸، رقم الحديث: ۳۳۶۔۵۱٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (۳٦۷) الفتح الرباني (۲۲/ ۱۲۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٦٦) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (۱۷۰۹)

سے پوچھا اور ہمیشہ اس مسئلے کے بارے میں ان کے پاس علم پایا۔“[1]

ترمذی شریف میں ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فصاحت و بلاغت کی گواہی حضرت موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر فصیح اللسان کسی کو نہیں دیکھا۔[2]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دو ہزار دو سو دس حدیثوں کی راوی ہیں جن میں سے ۱۷۴ متفق علیہ، ۵۴ بخاری، ۶۷ مسلم اور ۱۷ ۲۰ دیگر کتبِ معتبرہ میں ہیں۔ فتاویٰ شرعیہ، حل مشکلاتِ علمیہ، بیان روایاتِ عربیہ، واقعاتِ تاریخیہ اس پر مستزاد ہیں اور ان کے خطبات الگ ہیں۔[3]

ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما

نبیِ اکرم ﷺ کی چوتھی زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کے والدِ گرامی خلیفۂ ثانی امیر المومنین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ، جن کے سگے بھائی دو ہزار دو سو دس حدیثوں کے راوی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، جن کی والدہ نہایت قدیم الاسلام اور جن کے ماموں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ تھے، جو قبولِ اسلام کے لحاظ سے چودھویں مسلمان تھے، وہ ذوالہجرتین اور مدینہ منورہ میں مہاجرین میں سے سب سے پہلے انتقال کرنے والے ہیں۔ جن کی پیشانی پر تکفین کے وقت نبی ﷺ نے بوسہ دیا۔ اور اپنے لختِ جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی قبر ان کے پاس بنائی اور تدفین کے وقت فرمایا تھا:

«اِلْحَقْ بِالسَّلَفِ الصَّالِحِ مِنَّا»[4]

”ہم سے پہلے رخصت ہو جانے والے نیک شخص سے مل جا۔“

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٨٣) شرح السنة للبغوي (١٤ / ١٦٦) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٨٤) المستدرك للحاكم، رقم الحديث (٦٧٣٥) المعجم الكبير للطبراني (١٨٢/٢٣) شرح السنة للبغوي (١٤/ ١٦٦) و حواله جاتِ سابقه أيضاً.

[3] الفتح الرباني (١٢٨/٢٢، ٢٣) أيضاً أبواب خلافه أبي بكر رضی اللہ عنہ و مناقبه من كتاب الخلافه و الامارة (١/ ١٦٨۔ ١٧٦) رحمة للعالمين (٢ /١٥٥)

[4] مجمع الزوائد (٩/ ٣٠٥) و قال: رجاله ثقات، بحواله رحمة للعالمين (٢/ ١٦٣)

نبی اکرم ﷺ کا اسی طرح کے کلمات حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنتِ رسول ﷺ کے لیے کہنا۔[1] اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسول ﷺ کے لیے بھی وارد ہیں۔[2]

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نسب نامہ نبی ﷺ کی آٹھویں پشت کے دادا کعب میں جا کر مل جاتا ہے۔ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ سے قبل حضرت خُنَیس بن حُذافہ السّلمی رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھیں، وہ بھی قدیم الاسلام (السابقون الاوّلون میں سے) تھے اور انھوں نے حبشہ اور پھر مدینہ طیبہ کو ہجرت کی تھی۔ غزوۂ بدر و احد میں شریک ہوئے۔ میدانِ اُحد میں زخمی ہو کر مدینہ آئے اور وہیں شہادت پائی۔ بخاری شریف، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''جب حفصہ بنت عمر (رضی اللہ عنہا) بیوہ ہو گئیں تو حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کیا، کیوں کہ ان کی بیوی اور نبی ﷺ کی بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا ابھی نکاح کرنے کا کوئی ارادہ نہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بات کی تو انھوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی، کوئی جواب نہ دیا۔ چند دن ہی گزرے تھے کہ نبی ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے اپنا نکاح کر لیا۔ یہ نکاح ہو چکنے کے بعد حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم شاید میری خاموشی پر ناراض ہوئے ہوگے، مگر مجھے نکاح سے صرف اس بات نے روکے رکھا کہ میں نے نبی ﷺ کو حفصہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کرتے سنا تھا اور اس وقت میں آپ ﷺ کا یہ راز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں اگر آپ ﷺ نکاح نہ کرتے تو پھر میں کر لیتا۔''[3]

مسند ابی یعلیٰ کی ایک حسن درجہ کی روایت میں اس واقعہ کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جواب کی نبی ﷺ سے شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«تَزَوَّجَ حَفْصَةَ خَيْرٌ مِّنْ عُثْمَانَ وَتَزَوَّجَ عُثْمَانُ خَيْراً مِّنْ حَفْصَةَ»

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٤) و قال: صحيح، إسناده ثابت.

[2] مجمع الزوائد (٩/ ٣٠٥) و قال: رجاله ثقات وفي بعضهم خلاف، ورد السحابة (ص: ٣٠٨) وقال الشوكاني: إسناده رجاله ثقات.

[3] الفتح الرباني (١٤٨/١٦، ٢٢ /١٢٩ـ١٣٠)

''حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اس شخص سے شادی کرے گی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہتر ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس خاتون سے شادی کرے گا جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بہتر ہے۔''[1]

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح کر دیا (اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے خود نکاح کر لیا۔) اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ''ذو النورین'' ہونے کا شرف اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد اور دارمی میں حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت عاصم بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے (ایک مرتبہ) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو (کسی وجہ سے) طلاق دے دی تھی، پھر اللہ کے حکم سے رجوع کر لیا تھا۔[2]

یہی بات حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے:

''طَلَّقَ حَفْصَةَ ثُمَّ رَاجَعَهَا''[3]

''آپ ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی، پھر رجوع کر لیا۔''

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے ''مجمع الزوائد'' میں طبرانی کی ایک صحیح کے رواۃ کی سند والی حدیث نقل کی ہے جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَتَانِیُ جِبُرِیُلُ علیہ السلام فَقَالَ: رَاجِعُ حَفُصَةَ، فَإِنَّهَا صَوَّامَةٌ قَوَّامَةٌ وَهِیَ زَوُجَتُكَ فِی الُجَنَّةِ»[4]

---

[1] بلوغ الأماني ترتيب و شرح الفتح الرباني (١٦/ ١٤٩) و فتح الباري (٧/ ١٠٩) و الإصابة لابن حجر (٢٧٣/٤) و قال: أصله في الصحيح.

[2] الفتح الرباني (١٧ / ٢، ٢٢/ ١٣١) و عن عمر، سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٨٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠١٦) سنن الدارمي (٢١٤) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٤٢٧٥)

[3] التلخيص الحبير (١٢٦٢/٤) و قال: له شواهد، فتح الباري (١٩٧/٩) و قال: إسناده حسن، وحوالہ جاتِ سابقہ.

[4] بحواله بلوغ الأماني (٢٢/ ١٣١) المجمع (٢٤٨/٩) السلسلة الصحيحة (١٧/٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣٥١) تخريج المسند، رقم الحديث (٢٧١٢٥) تخريج سير أعلام النبلاء (٢٢٨/٢) و فيه الفقره الأخيره و صححه الأرناؤوط.

''میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کرلو، (اور ساتھ ہی فرما دیا:) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بڑی روزہ دار اور راتوں کو بکثرت قیام کرنے والی شب زندہ دار خاتون ہیں اور (دنیا میں ہی نہیں) وہ تو جنت میں بھی آپ ﷺ کی بیوی ہوں گی۔''

یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے نبی ﷺ کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے فضائل بتائے، تعریف کی اور بتایا کہ وہ جنت میں بھی آپ ﷺ کی بیوی ہوں گی۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا وَاَرْضَاھَا.

اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی ولادت بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل ہوئی اور ساٹھ سال کی عمر میں ۴۱ھ جمادیٰ الاولیٰ میں انتقال کیا۔ آپ رضی اللہ عنہا ساٹھ احادیث کی راوی ہیں جن میں سے چار متفق علیہ، پانچ صرف بخاری میں، چھ صرف مسلم میں اور پینتالیس دیگر کتب میں ہیں۔ جبکہ التقریب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی وفات ۴۵ھ ماہ شعبان لکھی ہے اور اکثر اہلِ علم کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ وفات کے وقت ان کی کل عمر تریسٹھ سال تھی۔[1]

امّ المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا

نبی ﷺ کی پانچویں زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ''الإصابة في تمييز الصحابه'' میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ امّ المساکین کے لقب سے پکاری جاتی تھیں، کیوں کہ آپ بکثرت فقراء و مساکین کو کھانا کھلاتیں اور ان پر صدقہ کیا کرتی تھیں، ان کے شوہر عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ تھے۔

علامہ منصور پوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان کے پہلے شوہر طفیل اور دوسرے عبیدہ تھے۔ یہ دونوں سگے بھائی اور نبی ﷺ کے چچا زاد یعنی حارث بن عبد المطلب کے فرزند تھے۔ ان کا تیسرا نکاح حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا۔[2]

---

[1] الفتح الرباني (٢٢/ ١٣١) رحمة للعالمين (٢/ ١٦٢۔ ١٦٣)

[2] رحمة للعالمين (٢/ ١٦٣۔ ١٦٤)

اس سے معلوم ہوا کہ نبیِ اکرم ﷺ ان کے چوتھے شوہر تھے اور آپ ﷺ ہی کی زوجیت میں ان کا انتقال ہوا۔ غرض حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پھوپھی زاد اور امّ المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے سگے بھائی تھے، جب وہ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تو اس کے بعد نبی ﷺ نے حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔

ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا اور امّ المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ایک ہی تھیں، البتہ باپ الگ الگ تھے تو گویا وہ ماں کی طرف سے بہنیں تھیں، یہ صرف دو یا تین ماہ تک نبی ﷺ کے حرمِ زوجیت میں رہیں اور وفات پا گئیں، جبکہ ان کی کل عمر تیس سال تھی۔ نبی ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور بقیع میں انھیں دفن کیا۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا وَاَرْضَاهَا

امُّ المومنین حضرت امِّ سلمہ رضی اللہ عنہا

نبی ﷺ کی چھٹی زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کا اسمِ گرامی ہند بنت ابوامیہ رضی اللہ عنہا تھا، جبکہ مستدرک حاکم کی ایک روایت میں ان کا نام ہند اور دوسری میں رملہ مذکور ہے۔ علامہ مبا کپوری و منصور پوری رحمہما اللہ نے ہند ہی ذکر کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ جبکہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھی دونوں ہی نام یعنی رملہ اور ہند مذکور ہوئے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کے دونوں نام (ہند و رملہ) ذکر کرنے کے بعد رملہ کو ہی زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔[1]

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہر کا نام ابوسلمہ عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) بن عبد الاسد تھا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نہایت قدیم الاسلام تھیں اور ان کے شوہر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ تو اسلام لانے کے اعتبار سے غالباً گیارھویں مسلمان تھے۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی والدہ برّہ بنت عبد المطلب نبی ﷺ کی حقیقی پھوپھی تھیں۔ اس کے علاوہ نبی ﷺ، سید الشہداء حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ تینوں رضاعی یعنی دودھ شریک بھائی تھے۔

حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے پہلے شوہر کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر مکہ مکرّمہ آ گئے۔ جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے ان کے گھر والوں نے ان کا

---

[1] الفتح الرباني (٢١/ ٦٩) ٢٢/ ١٣٢) رحمة للعالمين (٢/ ١٦٤ـ ١٧٦).

بچہ ''سلمہ'' چھین لیا اور کہا کہ تم جا سکتے ہو، ہمارا یہ بچہ نہیں لے جا سکتے، کیوں کہ یہ ہمارے خاندان کا فرد ہے۔ ادھر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر والوں نے انھیں روک لیا کہ یہ ہمارے خاندان کی لڑکی ہے، ہم اسے نہیں جانے دیں گے۔ اس کے باوجود بھی حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے ایمان وعزم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ اکیلے ہی ہجرت کر گئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ میں روک لی گئی تھیں۔ وہ ہر روز شام کو اس مقام پر آ بیٹھا کرتیں جہاں سے وہ اپنے شوہر سے الگ کی گئی تھیں۔ ایک سال تک برابر روتی رہیں۔ حتیٰ کہ سنگ دل رشتہ داروں پر ان کی آہ و بکا اور گریہ وزاری اثر کر گئی، تب جا کر انھوں نے بچہ بھی دے دیا اور ہجرت کی اجازت بھی دے دی اور انھوں نے اکیلے ہی مدینہ منورہ کا رخ کر لیا۔ حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ جو بیت اللہ شریف کے کلید (چابی) بردار تھے، گو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی بے بسی پر رحم کھا کر ان کے ساتھ ہو لیے۔ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو اونٹ پر سوار کراتے اور خود پیدل چلتے۔ یوں عزّت واحترام کے ساتھ مدینہ طیبہ کے قریب پہنچا کر واپس چلے گئے۔

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر و اُحد میں شریک ہوئے۔ میدانِ اُحد میں زخمی ہو گئے اور انہی زخموں کے نتیجے میں (جمادی الاخریٰ ۳ھ میں) شہادت پائی۔ کتبِ تاریخ وسیرت کے علاوہ صرف صحیح بخاری شریف کے سوا صحاح یا اصولِ ستہ، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کے نکاح کا واقعہ متعدد احادیث میں مذکور ہے۔ مختصر یہ کہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص کسی مشکل یا مصیبت کے وقت یہ دعا پڑھے:

«اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ اُجُرْنِیْ فِیْ مُصِيْبَتِیْ وَاخْلِفْ لِیْ خَيْراً مِّنْهَا»[1]

''ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اے اللہ! مجھے میری مصیبت کا اجر دے اور مجھے اس کا بہترین بدل عطا فرما۔''

تو اللہ تعالیٰ اسے مصیبت سے نجات دیتا ہے اور پہلے سے بہتر نگہداشت کا ذریعہ عطا کرتا

[1] صحيح مسلم (٦٣٣/٢)

ہے۔ اس دعا پر مبنی یہ ارشادِ نبوی ﷺ بیان کرنے کے بعد خود اپنا عمل بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

''جب (میرے شوہر) حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو میں نے وہی دعا کی جس کا حکم نبی ﷺ نے فرمایا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بدرجہا بہتر شوہر عطا فرمایا، اور وہ تھے رسول اللہ ﷺ۔''

الغرض جب حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایامِ عدت (چار ماہ دس دن) پورے کر لیے تو ان سے نبی ﷺ نے نکاح کر کے انھیں ام المومنین ہونے کے شرف سے نوازا اور ان کے دو لڑکوں عمر اور سلمہ، اور دو لڑکیوں زینب اور درّہ نے نبی ﷺ کے گھر میں ہی تربیت و پرورش پائی۔ صحیح مسلم کے باب فضائل اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا میں مذکور ہے:

انھوں نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو نبی ﷺ سے باتیں کرتے دیکھا جبکہ وہ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں نبی ﷺ کے پاس آئے تھے۔ نبی ﷺ نے حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد پوچھا: معلوم ہے یہ کون تھا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر نبیِ اکرم ﷺ سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت جبرائیل رضی اللہ عنہ تھے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں بعض دیگر امور کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت و منقبت ہے کہ انھوں نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔[2]

مسند احمد و مستدرک حاکم اور ابن جریر میں ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بیت سے متعلق سورۃ الاحزاب (آیت: ۳۳) حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں نبی ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔[3]

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کی تو کوئی اولاد نہیں تھی، مگر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے ان کے جو بچے تھے وہ نبی ﷺ کے دستِ شفقت پر پروان چڑھے۔ ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جوان ہو کر

---

1. صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٣٧۔ ٣٨، رقم الحديث (٩١٨) الفتح الرباني (٢١/ ٦٧۔ ٦٩ و ٢٢/ ١٣١/ ١٣٢) تخريج المسند، رقم الحديث (١٦٣٨٨) الكلم الطيب لابن تيميه بتحقق الألباني (ص: ٨١، ٨٢)
2. صحيح مسلم مع النووي (٨/١٦/ ٧۔٨)
3. الفتح الرباني (١٨/ ٢٣٧۔ ٢٣٨۔ ٢٢/ ١٠٢۔ ١٠٣۔ ١٣٢) شرح السنة للبغوي (١٤/ ١١٧) وقال المحقق الأرناؤوط: لا بأس بإسناده .

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے فارس و بحرین کے حاکم رہے۔ بخاری و مسلم وغیرہ میں انہی حضرت عمر بن سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«كُنْتُ غُلَاماً فِي حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَ كَانَتْ يَدِيْ تَطِيْشُ فِي الصَّحْفَةِ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ»[1]

''میں رسول اللہ ﷺ کی پرورش میں لڑکا (بچہ) تھا اور میرا ہاتھ رکابی (پلیٹ) میں گھومتا پھر رہا تھا تو مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بسم اللہ کہہ، اور اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی متصل جانب سے کھا، یعنی اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے آگے سے کھا۔''

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبی اکرم ﷺ نے اپنی چچا زاد امامہ بنتِ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہما کا نکاح کیا۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہما کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے زمانے میں تمام عورتوں سے بڑی فقیہ تھیں۔ درّہ بنت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر صحیح بخاری میں ہے کہ ام المومنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا کہ کیا نبی ﷺ درّہ سے نکاح کرنے والے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اگر وہ میری ربیبہ نہ بھی ہوتی، تب بھی وہ میرے لیے حلال نہ تھی۔ کیوں کہ اس کا باپ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ تو میرا دودھ شریک بھائی ہے۔''[2]

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا ۳۷۸ احادیث کی راوی ہیں جن میں سے ۱۳ متفق علیہ، ۳ صرف بخاری اور ۱۳ صرف مسلم، اور ۳۴۹ دیگر کتبِ حدیث میں ہیں۔[3]

المواہب اللدنیہ کے مؤلف نے حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی عمر بوقتِ وفات ۸۴ سال لکھی ہے اور شرح المواہب میں زرقانی نے اس کی تصویب و تصحیح کی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٧٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٥٧) سنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٦٧٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٦٧) مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٣٣٢) مشكاة المصابيح، تحقيق الألباني (٢/ ١٢١٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٨٥، رحمة للعالمين (٢/ ١٦٥)

[3] المرعاة (١/ ٢١٦) رحمةٌ اللعالمين (٢/ ١٦٦)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "الإصابة في تمييز الصحابة" میں لکھا ہے کہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سب امّہات المومنین رضی اللہ عنہن کے آخر میں فوت ہوئیں۔ ان کی وفات ۵۹ھ اور بعض روایات کے مطابق ۶۰۔ ۶۱ھ میں ہوئی۔ ان کا نسب نامہ بھی بعض دیگر امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی طرح نبی ﷺ کی آٹھویں پشت کے دادا کعب میں جا کر نبی ﷺ سے مل جاتا ہے۔[1]

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا

نبیِ اکرم ﷺ کی ساتویں زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب نبیِ اکرم ﷺ کی سگی پھوپھی تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا جن کا آبائی نسب قضاعہ تک پہنچتا ہے اور ماں کا نسب بھی معن بن طی سے ملتا ہے۔ اس اعتبار سے تو دراصل وہ شریف النفس اور نجیب الطرفین یا معزز حسب و نسب والے تھے، مگر لڑکپن میں کسی گروہ نے انھیں اغوا کیا اور مکہ مکرّمہ کے قریب منعقد ہونے والے ایک سالانہ میلہ ''سوق حباشہ'' میں لا کر بیچ دیا۔ یوں وہ بظاہر غلامی کی زد میں آ گئے، مگر اس وقت تک کسے معلوم تھا کہ اس بچے کی تو ایک مرتبہ اغوا ہونے اور بک جانے سے قسمت ہی سنور گئی ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ، حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کے لیے خرید لائے۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبیِ اکرم ﷺ سے ہوا تو انھوں نے انھیں نبی ﷺ کو بطورِ ہدیہ ہبہ کر دیا۔ اس طرح حضرت زید رضی اللہ عنہ، نبی ﷺ کے سایۂ رحمت وشفقت میں آ گئے۔

نبی ﷺ کے پیار و محبت اور شفقت و رافت کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے آباء واجداد کو بھول کر انھیں زید بن محمد ﷺ کا خطاب دے دیا۔ مگر چونکہ بچپن میں وہ ایک مرتبہ سرِ بازار بک چکے تھے، لہٰذا وہ بات ابھی دلوں میں باقی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے جوان ہونے پر نبی ﷺ نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کرنا چاہا تو دار قطنی (ص ۱۴۶ مطبع فاروقی دہلی) کی ایک روایت کے مطابق حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے گھر والے

---

[1] الفتح الرباني (۲۲/ ۱۳۲) رحمة للعالمين (۲/ ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۶۶)

شروع میں اس پر رضا مند نہ ہوئے، مگر نبی ﷺ کا تقاضا جاری رہا، یہاں تک کہ سورۃ الاحزاب (آیت:۳۶) بھی نازل ہوگئی جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾

''جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ فرما دیں تو کسی مومن مرد یا عورت کے لیے اس کام میں اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔''

یہ حکم نازل ہو جانے کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر والے بھی اپنے ذاتی اور قومی خیالات کو چھوڑ کر حضرت زید رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کرنے پر رضا مند ہو گئے اور نکاح ہو گیا۔ یہ نکاح انسانیت کے لیے احسانِ عظیم ثابت ہوا، کیوں کہ اسی دن سے غلامی کے خاتمے کا آغاز ہو گیا تھا۔

اب اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ ایک اور رسمِ جاہلیت یعنی متبنّیٰ بنانے کا خاتمہ ہو، تا کہ جس کی کوئی اصل اولاد اور خون ہو، اسے اسی کی طرف منسوب کیا جائے۔ اس رسم کی اصلاح کا آغاز یوں ہوا کہ حضرت زید اور زینب رضی اللہ عنہما کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ رہی۔ میاں بیوی میں کشیدگی رہنے لگی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے شکایت کی اور آپ ﷺ نے انھیں صبر وہمت اور برداشت سے کام لینے کی نصیحت فرمائی۔ لیکن میاں بیوی کا عجب ہی رشتہ ہے کہ جب آئینۂ دل میں بال آجائے تو کوئی نصیحت بھی کارگر ثابت نہیں ہوتی اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ بالآخر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔[1]

جب طلاق کی عدت ختم ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم فرمایا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ہم نے آپ ﷺ سے کر دیا ہے۔ آپ ﷺ انھیں اپنی زوجیت میں لے لیں۔ لہٰذا امرِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے نبی ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اپنے حرمِ زوجیت میں لے لیا۔ یہ واقعہ خود قرآنِ کریم کی سورۃ الاحزاب (آیت:۳۷) میں مذکور ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] مختصر از رحمة للعالمين (٢/ ١٦٧۔١٧٠)

﴿وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا﴾

''اور (اے میرے نبی !وہ وقت یاد کریں) جب آپ اس شخص سے جس پر اللہ تعالیٰ نے (توفیقِ اسلام جیسا) انعام کیا۔ اور آپ نے (آزاد کرنے، متبنّٰی بنانے اور اپنی پھوپھی زاد سے نکاح کرانے جیسا) احسان کیا (آپ اس سے) کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور اللہ سے ڈر، اور آپ اپنے دل میں ایک بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور آپ لوگوں سے (اس بات کے کھلنے سے) ڈرتے تھے۔ حالانکہ آپ کو اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہیے تھا۔ اور جب زید اس عورت (زینب) سے اپنی خواہش (طلاق) پوری کر چکا تو ہم نے اس کا نکاح آپ کے ساتھ کردیا۔ یہ اس لیے تاکہ مسلمانوں کو اپنے لے پالک لڑکوں کی بیویوں سے نکاح کر لینے میں جبکہ وہ اپنی خواہش (طلاق) پوری کر چکیں، کوئی تنگی نہ رہے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہو کر رہے گا۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح سے متعلقہ آیت کی وضاحت:

اس مذکورہ آیت میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے نکاح اور پھر طلاق اور پھر ان سے نبی ﷺ کے نکاح کا تذکرہ ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت زینب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کا نکاح تقریباً ایک سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ باقی رہا تھا اور ابن ابی حاتم کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس عرصے کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اس بات کی اطلاع کر دی تھی کہ زینب رضی اللہ عنہا تیری بیویوں میں سے ایک ہوگی۔ اس کے باوجود جب حضرت زینب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کے باہمی تعلقات میں کشیدگی اور ناخوشگواری پیدا ہوئی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ شکایت لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نبی ﷺ نے انھیں برداشت سے کام لینے کی جو نصیحت فرمائی، اس کے الفاظ قرآنِ کریم کی اس آیت میں یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

﴿ اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ ﴾

''اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے اور اللہ سے ڈر۔''

(یعنی) اسے طلاق دینے میں جلد بازی سے کام نہ لے اور اس کے معاملے میں اللہ سے ڈر۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی اس نصیحت کے الفاظ قرآنِ کریم میں نازل کرنے کے ساتھ ہی فرما دیا:

﴿ وَتُخۡفِيۡ فِيۡ نَفۡسِكَ مَا اللّٰهُ مُبۡدِيۡهِ وَتَخۡشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰهُ ﴾

''اور (اے میرے نبی! اس وقت) آپ اپنے دل میں ایک بات چھپا رہے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ اور آپ (اس بات کے ظاہر ہونے سے) لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ آپ کو اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہیے تھا۔''[1]

یہ بات کیا تھی جسے نبی ﷺ چھپا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا اور جس کے ظاہر ہونے میں آپ ﷺ لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنا چاہیے تھا؟ اس بات کے بارے میں کتبِ تفسیر میں مختلف اقوال مذکور ہیں جن میں سے بعض تو ایسے ہیں جو شانِ نبوت کے سراسر منافی ہیں۔ اس لیے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے: ''اُن اقوال کا بیان کرنا بھی مناسب نہیں۔''

صاحبِ تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی ان کے بیان کرنے سے پہلو تہی کی ہے۔ مثلاً یہ کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حسن کو دیکھ کر نبی ﷺ دل سے ان کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ (نعوذ باللہ) حالانکہ جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح نبی ﷺ سے ہوا تو اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال تھی اور اس وقت تک ابھی آیت الحجاب (پردے والی) نازل نہیں ہوئی تھی۔ صرف ان دو نقطوں کو پیشِ نظر رکھنے والا کوئی شخص بھی مذکورہ لغو داستان کو باور نہیں کر سکتا، کیوں کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تو نبی ﷺ کی حقیقی پھوپھی کی بیٹی ہیں، وہ آپ ﷺ کے سامنے پلیں بڑھیں، اس عرصے میں ان کی شکل و صورت آپ ﷺ سے کیوں کر پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ خصوصاً جبکہ ابھی پردے کا حکم بھی نازل نہیں ہوا تھا۔ پھر چھتیس سالہ عورت کا حسن اور وہ بھی عرب جیسے گرم ملک کی عورت جہاں عورتوں کا شباب جلد ڈھل

---

[1] الأحزاب [آیت: ۳۷] مختصر تفسیر ابن کثیر للعلامة محمد نسيب الرفاعي (۳/ ۳۷۰۔ ۳۷۱)

جاتا ہے، ایسا کیوں کر مانا جاسکتا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ (ایک آزاد کردہ غلام) تو ان سے بیزار ہو جائیں اور امام الانبیاء وسید الاتقیاء ﷺ ان پر شیفتگی کا اظہار کریں۔ عقل و عادت ایسی واہی باتوں کی تکذیب کے لیے کافی ہیں۔[1]

وہ بات دراصل یہ ہے کہ نبی ﷺ کو بذریعۂ وحی پہلے سے مطلع کر دیا گیا تھا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی بیوی بننے والی ہے، مگر آپ ﷺ اس بات کے اظہار سے شرماتے تھے کہ مخالفین الزام لگائیں گے کہ دیکھیے اپنی بہو سے نکاح کر لیا ہے۔ اس لیے جب حضرت زید رضی اللہ عنہ نے آکر شکایت کی تو انھیں فرمایا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رہنے دو اور اس کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے عِتاب آمیز لہجے میں فرمایا کہ جب میں نے آپ ﷺ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ ﷺ سے ہونے والا ہے تو پھر آپ ﷺ زید رضی اللہ عنہ کو یہ بات کیوں کہہ رہے ہیں؟ یعنی یہ آپ ﷺ کی شان کے لائق نہیں تھا، بلکہ بہتر یہ تھا کہ آپ خاموش رہتے یا زید رضی اللہ عنہ کو کہہ دیتے کہ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرلو۔ تفسیر روح المعانی کے مؤلف علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ یہ عِتاب وغصہ ترکِ اولیٰ پر ہے۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے کوئی بات چھپانے والے ہوتے تو آپ ﷺ اس آیت کو چھپاتے۔[3] مختصر یہ کہ اس عِتاب آمیز خطاب کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡہَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَہَا﴾

”پھر جب زید اس عورت سے اپنی خواہش پوری کر چکے (یعنی طلاق دے چکے اور عدّت بھی پوری ہوگئی) تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کر دیا۔“

قرآنِ کریم کا یہ مقام حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی سعادت وفضیلت کا واضح ثبوت ہے، کیوں کہ ﴿زَوَّجۡنٰکَہَا﴾ سے پتا چلتا ہے کہ نبی ﷺ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح خود اللہ نے کیا، اس معنیٰ

---

[1] رحمةٌ للعالمین (۳/ ۱۷۱۔ ۱۷۲)

[2] فتح الباري و روح المعاني بحواله فوائد سلفيه المسمّٰى به اشرف الحواشى (ص: ٥٠٦) از استاذي مولانا محمد عبدهٗ الفلاح.

[3] أشرف الحواشی ومختصر تفسير ابن كثير للرفاعي (۳/ ۳۷۱)

میں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر وحی نازل فرمائی کہ آپ ﷺ بغیر ایجاب وقبول اور مہر وغیرہ کے اسے اپنی زوجیت میں لے لیں۔[1]

یہی وجہ ہے کہ تفسیر ابن کثیر میں بخاری کے حوالے سے منقول ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا دوسری ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے سامنے فخر یہ کہا کرتی تھیں:

"زَوَّجَكُنَّ اَهَالِيُكُنَّ وَزَوَّجَنِي اللّٰهُ مِنُ فَوُقِ سَبُعِ سَمٰوٰتٍ، اَنَا الَّتِیُ نَزَلَ تَزُوِيُجِيُ مِنَ السَّمَآءِ"[2]

"تمھارا نکاح تو تمھارے گھر والوں نے پڑھایا، جبکہ میں وہ خوش قسمت زوجۂ رسول (ﷺ) ہوں کہ میرا نکاح سات آسمانوں کے اوپر خود اللہ تعالیٰ نے کیا۔ میں ہی ہوں کہ جس کی تزویج آسمان سے نازل ہوئی۔"

ایک روایت میں ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نبی ﷺ سے کہا کرتی تھیں کہ تین امور میں مجھے آپ ﷺ کی دیگر بیویوں میں انفرادیت حاصل ہے:

1. یہ کہ میرا اور آپ ﷺ کا دادا ایک ہے۔
2. یہ کہ میرا نکاح آپ ﷺ کے ساتھ آسمان سے خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔
3. یہ کہ میرے اور آپ ﷺ کے نکاح میں پیغام رسانی کرنے والا (کوئی انسان نہیں بلکہ) حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔[3]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح میں اہتمامِ الٰہی اور اس کی وجہ:

نبی ﷺ کے ساتھ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح اور انھیں نبی ﷺ کی زوجیت میں دینے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو یہ خاص اہتمام فرمایا، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب کی اسی آیت (۳۷) کے آخر میں دے دیا

---

[1] أشرف الحواشي.

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٤٢٠) مختصر ابن كثير للرفاعي (٣/ ١٤٠) وحواله سابقه، و تفسير ابن كثير اردو (٤/ ٢٩٠) عمدة التفسير احمد شاكر (١/ ٤٤١)

[3] مختصر ابن كثير للرفاعي (٣/٣٧١۔ ٣٧٢)

ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِيٓ أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا﴾

''یہ اس لیے تا کہ مسلمانوں کو اپنے لے پالک لڑکوں کی بیویوں سے نکاح کر لینے میں کوئی تنگی وحرج نہ رہے، جبکہ وہ اپنی خواہش (طلاق) پوری کر چکے ہوں۔''

تو گویا اس نکاح میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص اہتمام کا مقصد ایک رسمِ جاہلیت کو ختم کرنا تھا اور وہ رسم یہ تھی کہ عام طور پر مختلف ممالک میں رواج چلا آرہا تھا کہ جب کسی کے یہاں اولاد نہ ہوتی تو وہ کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لیتے، جسے متبنّٰی کہا جاتا اور وہ متبنّٰی اپنے آپ کو اپنے حقیقی والد کی طرف منسوب کرنے کی بجائے فرزندی میں لینے والے کی طرف نسبت کرتا۔

علّامہ منصور پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ رسم درحقیقت قدرتِ الٰہی کا ایک گستاخانہ جواب تھی۔ متبنّٰی بنانے والا شخص گویا اللہ تعالیٰ سے یہ کہا کرتا کہ تو نے مجھے فرزند عطا نہیں کیا تو کیا ہوا؟ یہ دیکھا میں نے بھی آخر یہ بیٹا حاصل کر ہی لیا ہے۔

اس کے علاوہ اس رسم کی وجہ سے افرادِ خاندان کے حقوق پر بڑا برا اثر پڑتا تھا کہ اصل وارث تو محروم رہ جاتے اور ایک غیر متعلق شخص جو مصنوعی طور پر گھر میں لایا گیا تھا وہ ناحق سارا مال لے جاتا جو دوسروں کے دلوں میں بُغض وعداوت اور دشمنی پیدا کرنے کا سبب بنتا، اور خصوصاً جب املاک و جائیداد جدّی پیدا کردہ ہوتیں تو ایسے موقع پر متبنّٰی کے وراثت لینے سے تمام خاندان میں کبھی ختم نہ ہونے والے جھگڑے برپا ہو جاتے تھے۔

''اسی طرح یہ متبنّٰی اگر کبھی غریب رہ جاتا اور اس کے حقیقی بھائی اچھی حالت میں ہوتے تو یہ حسد کی آگ میں جلنے لگتا۔ اور اگر متبنّٰی مالدار ہو گیا اور حقیقی بھائیوں کی حالت پتلی رہی تو وہ سب انگاروں پر لوٹتے اور اس کا حسد کرتے۔ یوں یہ رسم کتنے ہی افرادِ معاشرہ کے دلوں میں کدورتوں اور نفرتوں کے بیج بو دیتی۔ اس رسمِ تبنّیت میں ایسی ہی کئی دیگر

قباحتیں بھی تھیں۔[1]

لہٰذا اس رسمِ زبوں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۔ ۵) میں فرمایا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ﴾

''اللہ تعالیٰ نے تمھارے منہ بولے شخصوں کو تمھارے واقعی بیٹے نہیں بنایا ہے، یہ تو تمھارے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ اور اللہ حق بات کہتا ہے اور سیدھی راہ سمجھاتا ہے۔ لے پالکوں کو اپنے حقیقی باپوں کی طرف نسبت کر کے ہی بلاؤ، اللہ کے نزدیک یہی صحیح انصاف کی بات ہے۔ ہاں اگر تمھیں ان کے حقیقی باپوں کا علم ہی نہ ہو تو پھر وہ تمھارے دینی بھائی اور دوست ہیں (یعنی بیٹے پھر بھی نہیں)''

کتبِ تفسیر میں مذکور ہے کہ یہ کلامِ الٰہی حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوا تھا، کیوں کہ نبی اقدس ﷺ نے انھیں نبوت سے پہلے آزاد کر کے اپنا متبنّٰی بنا لیا ہوا تھا اور وہ زید بن محمد ﷺ کہلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اس نسبت کی ممانعت فرما دی۔[1] لیکن یہ رسمِ جاہلیت اتنی قدیم اور مستحکم تھی کہ اسے ختم کرنے کے لیے کسی زبردست عملی نمونے کی ضرورت تھی، اور نبی ﷺ سے بڑھ کر کوئی نمونہ کہاں ہوگا کہ جنھیں خود اللہ تعالیٰ نے ہی سورۃ الاحزاب (آیت: ۲۱) میں ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ فرما کر ساری دنیا کے لیے زندگی کا ''بہترین نمونہ'' قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس رسم کے خاتمے اور اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے نبی ﷺ کو ہی بطورِ نمونہ منتخب فرمایا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کی طلاق یافتہ بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نبی ﷺ کی زوجیّت میں دے دیا، تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ منہ بولے لوگ حقیقی ہرگز نہیں ہو سکتے اور

[1] رحمة للعالمين (۲/ ۱٦۸۔ ۱٦۹)

اگر حقیقی کا درجہ لے سکتے تو پھر نبی ﷺ کا بامرِ الٰہی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح نہ ہوتا، کیوں کہ وہ بھی تو آپ ﷺ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ اس طرح مسلمان ایک مشکل سے چھوٹ گئے اور ایک باطل رسم کی جڑ کٹ گئی۔ اسی بات کا لحاظ رکھتے ہوئے سورۃ النساء (آیت: ۲۲۔ ۲۴) میں جہاں ان عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے، وہاں فرمایا:

﴿ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ﴾

''اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری اپنی صلب سے (یعنی تمھارا اپنا خون) ہیں۔''[1]

یہاں بھی واضح طور پر منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کو محرّمات سے خارج کردیا، ہاں البتہ رضاعی لڑکا نسبی و صلبی بیٹے کے حکم میں ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»[2]

''رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔''

بخاری شریف وغیرہ میں یوں بھی آیا ہے:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ»[3]

''رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت (نکاح کرنے) سے حرام ہوجاتے ہیں۔''

مسلم شریف وغیرہ میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا حَرَّمَ مِنَ النَّسَبِ»[4]

''اللہ تعالیٰ نے رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام قرار دیے ہیں جو نسب سے حرام قرار دیے ہیں۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر اردو (٤/ ٢٥٣_ ٢٩٠)

[2] **متفق عليه**. صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٥٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٢) صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٨٧) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٤١٠٩) مسند أحمد، رقم الحديث (٢٤٧١٢) بلوغ المرام مع حاشيه الدهلوي (٢/ ٢٠٠)

[3] أيضاً.

[4] أيضاً و مشكاة المصابيح (٢/ ٩٤٥) تحقيق الألباني.

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ پیار سے کسی کو بیٹا کہہ دینا، یہ اور چیز ہے اور یہ ممنوع نہیں، جیسا کہ بخاری و مسلم، سنن اربعہ، مسند احمد اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو "یَا بُنَيَّ"، ''اے میرے بیٹے!'' کہا تھا۔[1]

بخاری و مسلم، ابو داود اور ابن ماجہ کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر اپنی نسبت اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف کرتا ہے، اس پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے اور وہ اپنا ٹھکانا جہنم بنالے۔[2] اس سخت وعید سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے اصل نسب سے ہٹ کر اپنے آپ کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کرنا کبیرہ گناہ ہے۔[3]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کے نکاح پر کفار و منافقین کے اعتراضات اور ان کا جواب

نبیِ اکرم ﷺ نے جب اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اپنی زوجیت میں لے لیا تو منافقین و کفار نے ایک طوفانِ بدتمیزی بپا کرنے کی کوشش کی اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ دیکھو! اپنے آزاد کردہ اور متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے، جو ان کی نظر میں بہو تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ان باطل نظریات کی تردید کے لیے قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر مختلف انداز اختیار فرمایا:

1. سورۃ الأحزاب (آیت: ۴) کے نصفِ ثانی میں فرمایا کہ تمھارے متبنّٰی لڑکوں کو اللہ تعالیٰ نے تمھارے حقیقی بیٹے ہرگز نہیں بنایا۔ یہ تو تمھارے اپنے منہ کی باتیں ہیں اور تمھارے کہنے سے کسی چیز کی حقیقت تو نہیں بدل سکتی، بلکہ حقیقت تو وہی ہے جو اللہ کہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ④﴾

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢٢)

[2] صحيح الجامع الصغير، رقم الحديث (٥٩٨٧۔ ٥٩٩٠)

[3] تفسير ابن كثير (٤/ ٢٥٤۔ ٢٥٥) و المرجع السابق وأشرف الحواشي.

''اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں رکھے اور نہ تمھاری ان بی بیوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمھاری ماں بنایا اور نہ تمھارے لے پالکوں کو تمھارا بیٹا بنایا، یہ باتیں تم اپنے منہ سے بکتے ہو اور اللہ تعالیٰ سچ فرماتا ہے اور (لوگوں کو) سیدھی راہ بتلاتا ہے۔''

2 آیت (۵) کے آغاز میں فرمایا کہ اپنے منہ بولے، لے پالکوں کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف ہی نسبت کر کے بلاؤ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی بات مبنی بر انصاف ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کسی کے دو حقیقی باپ ہوں، بلکہ اصل باپ صرف ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ ہی ہوتا ہے جس کی صلب اور خون سے کسی نے جنم لیا ہو، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

''لے پالکوں کو ان کے (اصلی) باپوں کے نام سے پکارو، اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ انصاف کی ہے پھر اگر تم ان کے (اصل) باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو وہ دینی بھائی اور رفیق ہیں اور بھول چوک اگر تم سے ہو جائے تو تم پر کچھ گناہ نہیں، البتہ اگر قصداً ایسا کرو (تو گناہگار ہوگے) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

3 اس بات کو لوگوں کے لیے اقرب الی الفہم کرنے اور آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرانے کے لیے آیت (۴) کے آغاز میں تمہید کے طور پر دو باتیں فرمائیں:

1- ﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ﴾

''کسی آدمی کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے دو دل نہیں رکھے۔''

2- ﴿ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾

''اور جن بیویوں کو تم ماں کہہ بیٹھتے ہو، انھیں اللہ تعالیٰ نے تمھاری سچ کی مائیں نہیں بنا دیا۔''

آگے فرمایا: تمھارے متبنّٰی کو بھی اللہ تعالیٰ نے تمھارے حقیقی بیٹے نہیں بنایا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرما دی کہ جس طرح ایک سینے میں دو دل نہیں ہوسکتے، ویسے ہی کسی شخص کے

دو باپ بھی نہیں ہو سکتے، اور جس طرح محض زبانی کہہ دینے سے کسی کی اپنی بیوی اس کی ماں نہیں بن جاتی، بلکہ اصل ماں تو صرف وہی ہوتی ہے جس نے جنم دیا ہو، جیسا کہ سورۃ المجادلہ (آیت:۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ﴾

''(یعنی ایسا کہہ دینے سے) کہ تم میری ماں جیسی ہو، ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں بن جاتیں، ان کی مائیں تو وہ ہیں جنھوں نے انھیں جنم دیا۔''

اسی سورۃ المجادلہ (آیت ۳۔۴) میں اس ظِہار کا کفّارہ یہ مذکور ہے کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے قبل غلام آزاد کرے۔ یہ نہ ہو پائے تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے (دو ماہ کے روزے نہ رکھ سکے تو) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔[1]

ایسے ہی کسی کے بیٹے کو اپنا بیٹا کہہ دینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی اور نہ ہی وہ بیٹا بن جاتا ہے۔ اسی سورۃ الاحزاب میں آگے چل کر آیت (۳۷) جس میں ﴿ زَوَّجْنٰكَهَا ﴾ فرما کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نبی ﷺ کی زوجیت میں دینے کا ذکر فرمایا ہے تو اس سے اگلی ہی آیت (۳۸) میں فرمایا:

﴿ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ﴾

''نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ و حرج نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر کر دیا ہو، یہی دستورِ الٰہی ان انبیاء میں بھی رہا جو پہلے گزرے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے نزدیک لے پالک کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنا حلال و جائز ہے تو اس میں نبی ﷺ پر کیا حرج ہے جیسا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام پر جو حکمِ الٰہی ہوتا اس پر عمل کرنے میں ان پر کوئی حرج نہ تھا۔ آگے لکھتے ہیں کہ اس آیت سے منافقین

---

[1] اس موضوع کی تفصیل ایک مستقل عنوان کے تحت آگے آ رہی ہے۔

کے اس اعتراض کا رد کرنا مقصود ہے کہ دیکھو، اپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے جو ان کے خیال میں آپ ﷺ کی بہو تھی۔[1]

سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۰) میں فرمایا ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾

''(لوگو!) محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مگر آپ اللہ کے رسول اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے (آخری نبی) ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی۔ بہو سے نکاح کا اعتراض تھا تو فرمایا کہ بیٹا تھا ہی کب کہ بہو ہوتی۔

آپ ﷺ کے بیٹے قاسم، عبد اللہ الملقّب بہ طیب وطاہر اور ابراہیم رضی اللہ عنہم سب بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔ آپ ﷺ کی کوئی نرینہ اولاد اس عمر کو پہنچی ہی نہیں کہ مردوں کے زمرے میں آئے، شادی کے لائق ہو اور طلاق کا موقع آئے۔ لہٰذا فرمایا کہ آپ ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حقیقی بیٹا نہ سہی، تب بھی منہ بولے بیٹے کی چھوڑی ہوئی عورت سے نکاح کر لینا کچھ ضروری نہ تھا۔ اس کے جواب میں فرمایا: مگر وہ اللہ کے رسول ہیں یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمھاری رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے، اس کے بارے میں تمام تعصّبات کا خاتمہ کر دیں اور اس کی حِلّت کے بارے میں کسی شک و شبہے کی گنجایش باقی نہ رہنے دیں۔ پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی رسول تو درکنار کوئی نبی تک آنے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی اصلاح آپ ﷺ کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا نبی علیہ السلام یہ کسر پوری کر دے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس رسمِ جاہلیت کا خاتمہ آپ ﷺ خود ہی کر کے جائیں۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/ ٢٩٠)

اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس وقت آپ ﷺ کے ہاتھوں اس رسمِ جاہلیت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی؟[1]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نبی اقدس ﷺ کے نکاح پر عیسائیوں کو تکلیف

ہم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کے نکاح پر منافقین و کفار کے اعتراضات کا جائزہ پیش کیا ہے اور اس میں کچھ تعجب نہیں کہ اس زمانے کے کفار و منافقین اپنی ایک پرانی رسم کا خاتمہ ہوتے دیکھ کر چیخے چلائے ہوں اور انھوں نے ایک جھوٹی رسم کا رونا روتے ہوئے نبی ﷺ یا قرآنِ کریم کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہے ہوں، لیکن تعجب تو اس بات پر ہے کہ اب ہمارے زمانے میں اس نکاح پر اپنی ناراضی کا اظہار کرنے میں عیسائی لوگ اور ان کے پادری سب سے پیش پیش ہیں۔ ہمارے لیے قابلِ غور امر یہ ہے کہ عیسائیوں کو اس نکاح سے رنجیدہ وملولِ خاطر ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ کیا تورات نے تبنّیت، لے پالک بنانے کی رسم کو حق ٹھہرایا ہے؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کوئی لفظ بھی اس کے جواز میں کہا ہے؟ اگر نہیں (اور ہرگز نہیں) تو پھر عیسائی لوگوں کو کیوں رنج ہے؟ ہاں ان کے رنجیدہ وملولِ خاطر ہونے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ نبی ﷺ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس مبارک نکاح سے نہ صرف کفار کی رسمِ تبنّیت ہی کا بطلان و خاتمہ ہوا، بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث بھی باطل ٹھہرا، کیوں کہ جب اسلام نے یہ ثابت کر دیا کہ صلبی وخونی رشتہ نہ ہونے کی شکل میں محض زبانی کلامی ایک انسان کو دوسرے شخص کا بیٹا کہنا بالکل جھوٹ، باطل، کامل افترا اور بہتان ہے، تب یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ایک انسان کو اللہ کا بیٹا کہنا قطعاً وحتماً باطل، کھلم کھلا کذب و افتراء اور صریح بہتان ہے، کیوں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی مشابہت ہی نہیں۔

جسم وروح سے مرکب انسان سیکڑوں حوائج وضروریاتِ زندگی کا محتاج ہے جو ایک دن پیدا ہوا

---

[1] حاشیہ قرآن مجید مترجم مولانا مودودي (ص: ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۳) بتصرف يسير.

اور اس سے پہلے موجود نہ تھا، جیسا کہ قرآن کریم کی سورۃ الدہر کا آغاز ہی اس ارشادِ الٰہی سے ہوتا ہے:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا﴾

''کیا انسان پر لا متناہی زمانے کا ایک وقت وہ بھی نہیں گزرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا؟''

اس سے مقصود سوال نہیں بلکہ تحقیق ہے اور انسان سے اس بات کا اقرار کرانا مطلوب ہے کہ واقعی اس پر ایک ایسا وقت گزر چکا ہے کہ اس کا نام ونشان تک نہ تھا اور اس کے ساتھ ہی فرما دیا:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا، تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا، ہم نے اسے راستہ دکھایا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔''

یعنی شکر اور کفر کا اختیار اسے دیتے ہوئے بتا دیا کہ شکر کا راستہ کونسا ہے اور کفر کا کونسا؟ پھر جسم وروح سے مرکب انسانی مخلوق کے ہر فرد کو بلکہ ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن لقمۂ اجل بننا اور موت کے منہ میں چلے جانا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم کے تین مقامات یعنی سورت آل عمران (آیت: ۱۸۵) سورۃ الانبیآء (آیت: ۳۵) اور سورۃ العنکبوت (آیت: ۵۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔''

بھلا ایسا کوئی انسان اس اللہ کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جس کی ذاتِ سرمدی ازل سے بھی اوّل اور ابد سے بھی آخر ہے۔ جب نبی ﷺ نے بامرِ الٰہی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اپنے نکاح میں لے لیا تو ہر صاحبِ عقل وفکر کے لیے عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث باطل ٹھہرا اور ان کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنا جھوٹ ثابت ہوا۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے پڑھے لکھے عیسائی اس قصے سے ناراض رہا کرتے ہیں۔

(1) رحمۃللعالمین (۲/ ۱۷۰۔ ۱۷۱) بہ ترمیم و اضافہ.

الغرض حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا وجودِ مسعود تعلیمِ اسلام کے اظہار اور رسومِ جاہلیت کے ابطال میں بہت بڑی برکت ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ان کی تعریف کیا کرتی تھیں، جیسا کہ صحیح بخاری و مسند احمد وغیرہ میں مذکور ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا کرتی تھیں:

«هِيَ الَّتِيْ كَانَتْ تُسَامِيْنِيْ مِنْ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ »[1]

''ایک زینب (رضی اللہ عنہا) ہی ہے جو بارگاہِ رسالت میں میری ہمسر تھی۔''

بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''(اے میری بیویو!) تم میں سے میرے پیچھے سب سے پہلے آنے والی وہ ہوگی جو تم میں سے لمبے ہاتھ والی ہوگی۔''

لمبے ہاتھ سے نبی ﷺ کا اشارہ زیادہ صدیقہ وخیرات کرنے کی طرف تھا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے:

''اپنے ہاتھ سے کام کرنے اور صدقہ وخیرات کرنے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہی سب سے آگے تھیں۔''[2]

نبی ﷺ کے بعد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سب سے پہلے انھوں نے ہی ۲۰ھ میں ۵۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَاَرْضَاهَا.

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے فضائل و مناقب کے بارے میں علامہ احمد عبدالرحمٰن البنّا نے متعدد روایات جمع کر دی ہیں۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٤٦) الفتح الرباني (١٨/ ٢٢١، ٢٢/ ١٢١، ١٣٥، ١٣٦، رقم الحديث: ٢٥٢١٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢٠) صحيح مسلم مع النووي (٨/ ١٦/ ٨ رقم الحديث: ٢٤٥٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٤٠) الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٤ـ ١٣٥) مسند احمد بتخريج الأرناؤوط (٣٨٧/٤١)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٤، ١٣٥) قصۂ زواج اور نزولِ آیتِ حجاب کے لیے دیکھیں: (٢١/ ٨٦ـ ٨٨، ٨ / ٢٤١ـ ٣٤٠)

ظِہار اور اس کا حکم و کفّارہ

پچھلے اوراق میں اپنی بیوی کو ماں کہہ بیٹھنے کا متعدد بار ذکر آیا ہے۔ یہ مسئلہ قرآنِ کریم، حدیثِ رسول ﷺ اور فقہِ اسلامی میں ''ظِہار'' کہلاتا ہے۔ اس مسئلے کی تفصیلات کا اصل مقام تو شخصی مسائل و معاملات کا باب ہے، لیکن اب چونکہ بار بار اس کا ذکر آچکا ہے لہٰذا یہاں ہم اس کا مختصر سا تذکرہ کیے دیتے ہیں۔

ظِہار دراصل ظَہر سے مشتق ہے اور عربی میں ظَہر پشت یا پیٹھ کو کہتے ہیں۔ ظِہار کسی شوہر کا غصے سے اپنی بیوی کو ''اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّيْ''، ''تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ'' کہنا ہے۔

عربوں میں بسا اوقات ایسی صورت پیش آتی تھی کہ میاں بیوی میں لڑائی ہوتی تو یہ کلمات استعمال کیے جاتے جن سے ان کی مراد یہ ہوتی کہ تجھ سے وظیفۂ زوجیت میرے لیے ایسا ہے جیسے کہ میں اپنی ماں سے کروں۔ آج بھی بعض نادان لوگ بیوی سے لڑ جھگڑ کر اسے ماں سے تشبیہ دے بیٹھتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی گویا اب اسے بیوی نہیں بلکہ ماں کی طرح سمجھتا ہے جو اس کے لیے حرام ہے۔ اسی کا نام ظِہار ہے۔

عہدِ جاہلیت میں یہ طلاق بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید قطعِ تعلق کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اسلام نے اس حکم کو باطل قرار دیا ہے۔ البتہ ظِہار کی وجہ سے عورت اپنے شوہر پر اس وقت تک حرام ہو جاتی ہے جب تک کفارہ ادا نہ کرے۔ ظِہار سے اگر چہ طلاق تو واقع نہیں ہوتی، لیکن تمام ائمہ و فقہاء کا ظِہار کے حرام ہونے پر اجماع ہے۔

نبیِ اکرم ﷺ کے عہدِ مسعود میں بھی بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ظِہار کا ارتکاب ہوا، جیسا کہ ابو داود، ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت سلمہ بن صخر رضی اللہ عنہ کے ظِہار کا ذکر ہے۔[1]

ایسے ہی ابو داود اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت اوس بن صامت رضی اللہ عنہ کے ظِہار کا تذکرہ ہے اور انہی حضرت اوس رضی اللہ عنہ کی بیوی خولہ بنت مالک بن ثعلبہ رضی اللہ عنہا، اپنے شوہر کے ظِہار کی شکایت لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس سلسلے میں اسلام کا حکم دریافت کیا۔ مگر اس وقت تک ابھی

---

[1] زاد المعاد لابن القیم (۲۹٤/٥) البدر المنير لابن الملقن (۱٥۱/۸) الدراري المضيئة للشوكاني (۲۳۰)

اس کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اسی گفتگو کے دوران ہی میں اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اس کا حل نازل فرما دیا جو سورۃ المجادلہ کی پہلی چار آیتوں میں مذکور ہے۔ ظِہار کا کفّارہ وغیرہ بھی چونکہ انہی آیات میں آ گیا ہے لہٰذا نصوصِ احادیث اور ائمہ وفقہاء کی تصریحات کے بجائے ہم صرف قرآنی آیات اور ان کے مفہوم ومطالب کے بیان پر ہی اکتفا کرتے ہیں، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

﴿ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۭ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَاۗسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۭ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾

''اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے''

''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ کی طرف شکایت کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ وہ لوگ جو تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں ان کے سوا کوئی نہیں جنھوں نے انھیں جنم دیا اور بلاشبہ وہ یقیناً ایک بری بات اور جھوٹ کہتے ہیں اور بلاشبہ اللہ یقیناً بے حد معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اس سے رجوع کر لیتے ہیں جو انھوں نے کہا، تو ایک گردن آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، یہ ہے وہ (کفارہ) جس کے ساتھ تم نصیحت کیے جاؤ گے، اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔ پھر جو شخص

نہ پائے تو دو پے در پے مہینوں کا روزہ رکھنا ہے، اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

ان آیات میں جو کفارہ بتایا گیا ہے، وہ بالترتیب یوں ہے کہ ایک غلام آزاد کرے اور غلام نہ ملنے کی شکل میں دو ماہ کے بلاناغہ روزے رکھے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ کفارہ ادا کرنے کے بعد میاں کے لیے بیوی دوبارہ حلال ہو جاتی ہے۔[1]

ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا

نبیِ اکرم ﷺ کی آٹھویں زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا تھیں جن کی پہلی شادی مسافح بن صفوان مصطلقی سے ہوئی تھی۔ ۵ھ میں غزوۂ مریسیع (بنی مصطلق) کے موقع پر قیدی ہو کر آئیں۔ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصے میں آگئیں تو انھوں نے ان کو ایک طے شدہ رقم ادا کرنے کی شرط پر آزاد کر دیا جسے ''مکاتبت'' کہا جاتا ہے۔ ابو داود، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا زرِ تعاون مانگنے کے لیے نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں آئیں تو نبی ﷺ نے انھیں فرمایا:

«فَهَلْ لَكِ خَيْرٌ مِنْ ذٰلِكَ؟»

''کیا تمھارے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہ کیا جائے؟''

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ کیسے؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اَقْضِيْ كِتَابَكِ وَاَتَزَوَّجُكِ»

''میں تمھاری کتابت بھی ادا کر دوں (جس سے تم آزاد ہو جاؤ) اور پھر تم سے شادی بھی کر لوں۔''

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر ابن کثیر اردو (٥/ ٣٤١۔ ٣٤٧) الفتح الرباني (١٧/ ٢١۔ ٢٣) نيل الأوطار (٣/ ٦/ ٢٥٨۔ ٦٢٣) الروضة الندية شرح الدرر البهية (٢/ ٦٥۔ ٦٧) سبل السلام (٣/٢/ ١٨٦۔ ١٩٠) فقه السنة ٢/ ٣٠٩۔ ٣١٣)

تو حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا خوشی سے یہ پیش کش مان گئیں اور جب یہ خبر لوگوں تک پہنچی تو انھوں نے بھی بنی مصطلق کے تمام قیدی آزاد کر دیے۔ اس طرح حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے نبی ﷺ سے نکاح کی بدولت بنی مصطلق کے ایک سو گھروں کو آزادی ملی (جن کی مجموعی تعداد ایک روایت کے مطابق سات سو افراد تھی) چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمائی ہیں:

«فَمَا اَعْلَمُ اِمْرَأَةً كَانَتْ اَعْظَمَ بَرَكَةً عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا»[1]

''میں کسی ایسی عورت کو نہیں جانتی جو اپنی قوم کے لیے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ باعثِ برکت ثابت ہوئی ہو۔''

''مدارج النبوۃ'' میں ہے کہ وہ جب نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انھوں نے زرِ کتابت سے پہلے کہا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ میں اپنی قوم کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی ہوں۔[2] طبقات ابن سعد میں صحیح سند سے مروی ہے کہ جب وہ قیدیوں کے ساتھ لائی گئیں تو ان کے والد نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میری بیٹی جیسی لڑکیوں کو تو قیدی نہیں بنایا جاتا تو اس پر نبی ﷺ نے انھیں آزاد کر دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ میں اسے اختیار دیتا ہوں (چاہے تو تمھارے ساتھ چلی جائے اور چاہے تو ہمارے یہاں رہ جائے) ان کے والد نے کہا، بیٹی! دیکھو! اس شخص نے تمھیں اختیار دیا ہے، اب ہمیں رسوا نہ کرنا، لیکن حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

«فَاِنِّیْ اَخْتَارُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ»[3]

''میں تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ہی اختیار کرتی ہوں۔''

اس وقت حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی عمر بیس سال تھی کہ اللہ نے انھیں راہِ ہدایت نصیب فرمائی اور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٣١) و حسّنه الألباني، مسند أحمد، رقم الحديث (٢٦٣٦٥) السنن الكبرىٰ للبيهقي (٧٤/٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٤٠٥٥) و قوّاه الارناؤوط، فتاوىٰ ابن تيميه (٣١/ ٣٧٩) وقال: هذه الأحاديث مشهورة بل متواترة، نيل الأوطار (٨/ ١٥٠) وقال: أصله في الصحيحين، وقال البنا: سنده جيد و أصله في الصحيحين من حديث ابن عمر، الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٩)

[2] بحواله رحمة للعالمين (٢/ ١٧٥)

[3] الفتح الر باني: أيضاً.

دنیا وآخرت میں نبی ﷺ کا ساتھ اور ام المومنین ہونے کے شرف سے نوازا۔[1]

ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بڑی عابدہ و زاہدہ تھیں، اس کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جاسکتا ہے جو صحیح مسلم، سنن اربعہ اور مسند احمد میں ہے جس میں نبی ﷺ نے طویل وقت کے اذکار سے بھی وزنی مگر مختصر ذکرِ الٰہی بتایا ہے کہ نماز فجر و مغرب کے بعد صرف تین مرتبہ کہہ لیا جائے:

«سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهِ، عَدَدَ خَلْقِهِ وَرِضَا نَفْسِهِ وَ زِنَةَ عَرْشِهِ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ»[2]

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے کل سات حدیثیں مروی ہیں جن میں سے دو صحیح بخاری میں، دو صحیح مسلم میں اور تین دیگر معتبر کتبِ حدیث میں ہیں۔[3]

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے ۵۰ھ اور ایک روایت کے مطابق ۵۶ھ میں ۶۵ یا ۷۰ برس کی عمر میں وفات پائی اور بقیع میں دفن ہوئیں۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا وَأَرْضَاهَا.

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

نبیِ اکرم ﷺ کی نویں زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کا نام رملہ بنت ابوسفیان تھا۔ نبی اقدس ﷺ کے کاتبِ وحی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ماں کی طرف سے تو نہیں مگر والد کی طرف سے بھائی تھے۔ اسی مناسبت سے انھیں ”خال المؤمنين“ ”مومنوں کے ماموں“ بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نہایت قدیم الاسلام تھیں۔ ان کے پہلے شوہر کا نام عبیداللہ بن جحش ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی اکٹھے مسلمان ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی، مگر عبید اللہ وہاں جا کر مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا، لیکن ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اسلام پر قائم رہیں۔ اسی پہلے شوہر سے ایک بیٹی حبیبہ بھی تھیں جن کے نام کی نسبت ہی سے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کہلاتی تھیں۔ یہ بچی نبی ﷺ کی ربیبہ تھی جو حبشہ سے اپنی والدہ کے ساتھ ہی مدینہ طیبہ آئیں اور نبی ﷺ کے گھر میں رہیں۔

---

[1] المرجع السابق.
[2] صحيح الأدب المفرد (٥٠٣) الفتح الرباني (١٤/ ٢٢١، ٢٢/ ١٤٠) و صحيح الجامع الصغير (٥١٣٩)
[3] مدارج النبوه، رحمة للعالمين (٢/ ١٧٦)

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے دین کی خاطر باپ، بھائی، رشتہ دار وقبیلہ اور قوم و ملک کو چھوڑ کر ہجرت کی تھی، پردیس میں صرف شوہر کا سہارا تھا، وہ بھی اُس کے مرتد ہونے سے نہ رہا نبی ﷺ کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے شاہِ حبشہ کو لکھوا بھیجا تھا کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو میرا پیغامِ نکاح پہنچا دیں۔

ابو داود نسائی میں ہے کہ شاہِ حبشہ نجاشی نے خطبۂ نکاح پڑھا اور نبی ﷺ کی طرف سے چار ہزار دینار حق مہر ادا کیا۔[1] پھر شرحبیل بن حسنہ کے ساتھ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچا دیا۔[2]

الا ستیعاب وغیرہ کی ایک روایت میں ہے کہ نجاشی کے بعد (جو نبی ﷺ کے وکیل تھے) حضرت خالد بن سعد رضی اللہ عنہ نے بھی خطبۂ نکاح پڑھا جو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے باپ کے چچا کے بیٹے اور ان کے وکیل بھی تھے۔[3]

مناقبِ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ضمن میں ”جلاء الأفهام“ میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور ”الإصابة“ میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے والد حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے کہ مدینہ میں اپنی بیٹی کے گھر آئے۔ بستر پر بیٹھنے لگے تو انھوں نے بستر لپیٹ لیا، کہنے لگے: بیٹی! میں سمجھا نہیں کہ تو اس بستر کو مجھ سے دور رکھنا چاہتی ہے یا مجھ کو اس بستر سے؟ تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

«بَلْ هُوَ فِرَاشُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاَنْتَ اِمْرَأٌ نَجِسٌ مُشْرِكٌ»

”یہ نبی ﷺ کا پاک بستر ہے جبکہ تو ناپاک ومشرک ہے۔“

اس پر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کھسیانا سا ہو کر کہا:

---

[1] كما في المستدرك للحاكم (٦٧٧١) مشكل الآثار (٥٠٦١) و صححه الأرناؤوط، سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٠٨) و سكت عنه.

[2] صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٦٠٢٧) و قال الأرناؤوط: صحيح على شرط البخاري، سنن أبي داود (٣/ ٤٤٥) و قال الأرناؤوط: روي من طريق صحيح، محلّىٰ ابن حزم (٨/ ٢٤٤) و احتج به.

[3] الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٣) رحمة للعالمين (٢/ ١٧٧)

«لَقَدْ اَصَابَكِ بَعْدِيْ شَرٌّ»[1] ''بیٹی !تو ہم سے بچھڑ کر بگڑ سی گئی ہے۔''

اللہ اکبر! یہ تھیں ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جنھوں نے ۴۴ ہجری میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهَا وَاَرْضَاهَا.

جب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نکاح بر سالت مآب ﷺ کی خبر حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو اس وقت تک اگر چہ وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے پھر بھی رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

«ذٰلِكَ الْفَحْلُ لَا يُجْدَعُ اَنْفُهٗ»[2]

''آپ ﷺ ایسا بَر ہیں کہ جن کا ہم پلہ کوئی نہیں ہوسکتا، یعنی جنھیں ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔''

یاد رہے کہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا پینسٹھ حدیثوں کی راوی ہیں جن میں سے دو متفق علیہ، ایک صحیح مسلم میں اور ۶۲ دیگر کتبِ حدیث میں ہیں۔ ان کے نام کے بارے میں بھی رملہ اور ہند دو روایتیں ہیں، مگر بقول حافظ ابن حجر رملہ ہی زیادہ صحیح ہے۔[3]

ام المومنین حضرت صفیہ بنت حییّ رضی اللہ عنہا

نبیِ اکرم ﷺ کی دسویں زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت صفیہ بنت حییّ بن اخطب رضی اللہ عنہا تھیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام کی نسل سے تھیں۔ زرقانی رحمہ اللہ نے ''شرح المواهب اللدنية'' میں لکھا ہے:

''وَلَدَ صَفِيَّةُ مِائَةَ نَبِيٍّ وَمِائَةَ مَلِكٍ، ثُمَّ صَيَّرَهَا اللّٰهُ اَمَةً لِنَبِيِّهٖ ﷺ''[4]

''حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے آباء واجداد میں سے ایک سو نبی اور ایک سو بادشاہ تھے، پھر انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی کنیز بنا دیا۔''

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا والد یہود بنونضیر کا سردار تھا، وہ بنو قریظہ کے ساتھ ہی قتل ہوا۔ حضرت

---

[1] الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٤) رحمة للعالمين (٢/ ١٧٨)

[2] رواه في الإصابة كما في الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٤)

[3] رحمة للعالمين (٢/ ٧٧ـ ١٧٨) الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٢)

[4] شرح المواهب للزرقاني (٤/٤٢٨)

صفیہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح سلام بن مشکم سے اور دوسرا کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا۔ یہ غزوۂ خیبر میں مارا گیا اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اس جنگ کے قیدیوں میں سے تھیں۔

بخاری و مسلم، نسائی اور مسند احمد میں مذکور ہے کہ جنگ کے قیدیوں کی تقسیم کے وقت حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئیں اور ان سے نبی ﷺ نے انھیں قیمتاً حاصل کر لیا۔[1]

بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے حاصل کر لینے کے وقت اختلاف ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنو قریظہ اور بنو نضیر کی سیدہ یعنی سردار کی بیٹی ہے اور ایسی عورت بہتر ہے کہ نبی ﷺ اپنے لیے خاص فرمائیں۔ گویا ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک شاہِ دو عالم کا گھر ہی خیبر کی اس شہزادی کے شایانِ شان تھا، نبی ﷺ نے انھیں آزاد کر کے خود ان سے نکاح کر لیا۔[2]

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف انھیں دولتِ ایمان سے مالا مال کیا، بلکہ ام المومنین ہونے کے شرفِ عالی سے بھی نواز دیا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے مقام و مرتبے اور فضیلت کا اندازہ ترمذی و نسائی اور مسند احمد میں مذکور اس حدیثِ شریف سے ہی لگایا جاسکتا ہے جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو یہ خبر ملی کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے انھیں یہودی کی بیٹی کہا ہے تو یہ سن کر وہ رونے لگیں۔ نبی ﷺ تشریف لائے اور ان کے رونے کا سبب پوچھا تو انھوں نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ دہرائے کہ وہ مجھے یہودی کی بیٹی کہتی ہیں تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَنْتِ اِبْنَةُ نَبِيٍّ، وَاِنَّ عَمَّكِ لَنَبِيٌّ وَاَنْتِ لَتَحْتَ نَبِيٍّ فَفِيمَ تَفْخَرُ عَلَيْكِ»

''تم ایک نبی (حضرت ہارون علیہ السلام) کی بیٹی ہو۔ ایک نبی (حضرت موسیٰ علیہ السلام) تمھارے چچا ہیں اور تم ایک نبی (نبیِ رحمت ﷺ) کے گھر میں ہو تو پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تم پر کس طرح فخر کر سکتی ہے؟''

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے جا کر فرمایا:

---

[1] الفتح الرباني (٢٢/ ١٤٠۔ ١٤١)

[2] رحمة للعالمین (٢/ ١٧٩)

«اِتَّقِ اللّٰهَ يَا حَفْصَةُ!»[1] ''اے حفصہ (رضی اللہ عنہا)! کچھ تو اللہ کے خوف سے کام لو۔''

مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ حضرت حفصہ وعائشہ (رضی اللہ عنہا) دونوں میری تحقیر کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم اس سے بہتر ہیں، کیوں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی چچازاد یعنی ہم نسب اور آپ ﷺ کی بیویاں ہیں۔ یہ سن کر نبی ﷺ نے فرمایا:

''کیا تم نے انھیں یہ نہیں کہا کہ تم مجھ سے بہتر کیسے ہوسکتی ہو؟ جبکہ میرے باپ حضرت ہارون علیہ السلام، میرے چچا حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور میرے شوہر حضرت محمد ﷺ ہیں۔''[2]

حضرت عطاء بن یسار رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے خیبر سے مدینہ طیبہ پہنچنے پر پہلے ہی دن انھیں یہود یہ کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَقُولِي ذٰلِكَ، فَإِنَّهَا اَسْلَمَتْ وَحَسُنَ اِسْلَامُهَا»[3]

''ایسا مت کہو، وہ مسلمان ہوگئی ہے اور بڑا اچھا اسلام لائی ہے۔''

مسند احمد کی ایک حدیث سے پتا چلتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے بھی نبی ﷺ کے سامنے اس قسم کے الفاظ کہے تھے جن پر آپ ﷺ اس قدر ناراض ہوئے کہ تین ماہ تک کلام نہیں کیا۔[4]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا دس حدیثوں کی راوی ہیں۔ ایک متفق علیہ اور نو دیگر کتبِ حدیث میں مروی ہیں۔ انھوں نے رمضان المبارک ۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔[5] رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَاَرْضَاهَا.

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٩٤) السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨٩١٩) صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٧٢١١) تخريج مسند أحمد للأرناؤوط (١٢٣٩٢) الفتح الرباني (٢٢/ ١٤٣) مشكاة المصابيح (٣/ ١٧٤٥) وصححه الألباني.

[2] صححه الحاكم و أقرّه الذهبي كما في الفتح الرباني (٢٢/ ١٤٣)

[3] الفتح الرباني (٢٢/ ١٤٥)

[4] الفتح الرباني (٢٣/ ١٤٣) وقال، سنده جيد.

[5] مدارج النبوة والاستيعاب بحواله رحمة للعالمين (٢/ ١٨٠)

ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا

نبی اکرم ﷺ کی گیارھویں زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کا پہلا نکاح حویطب بن عبد العزیٰ سے اور دوسرا ابو رہم بن عبد العزیٰ سے ہوا تھا۔ ۷ھ میں جب نبی ﷺ نے عمرۃ القضاء ادا فرمایا تو اس وقت تک یہ بیوہ ہوچکی تھیں۔ نبی ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں نبی ﷺ سے ذکر کیا۔ اور آپ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا۔[1]

ترمذی و بیہقی میں نبی اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس نکاح کے سلسلہ میں نبی ﷺ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے وکیل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ما بین پیام رسانی میں نے کی۔[2]

یاد رہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی ایک بہن ام فضل لبابہ کبریٰ نبی ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھیں، کیوں کہ صحیح مسلم اور ابن ماجہ میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ایک بھانجے حضرت یزید بن اصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« وَكَانَتْ خَالَتِي وَخَالَةُ ابْنِ عَبَّاسٍ »[3] ''وہ میری اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ تھیں۔''

ان کی ایک بہن لبابہ صغریٰ حضرت خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھیں اور ماں کی جانب سے ایک بہن ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا تھیں جو نبی ﷺ کے نکاح میں آئیں اور صرف دو یا تین ماہ بعد انتقال کر گئیں۔ اسی طرح ماں کی جانب سے ایک بہن سلمیٰ بنت عمیس رضی اللہ عنہا تھیں جو نبی ﷺ کے چچا سید الشہداء حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھیں، اور ماں کی طرف سے ہی ایک بہن حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا تھیں جو پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر طیّار رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھیں، پھر ان کا نکاحِ ثانی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہوا اور ان کی وفات کے بعد ان (حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا) کا تیسرا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا۔[4]

---

[1] رحمة للعالمين (٢/ ١٨٠)

[2] الفتح الرباني (١١/ ٢٢٩، ٢١ / ١٣٣، ٢٢/ ١٣٧)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١١)

[4] رحمة للعالمين (٢/ ١٨٠ـ ١٨١)

طبقات ابن سعد میں ہے کہ نبی ﷺ نے جن عورتوں سے نکاح کیا اور رخصتی بھی ہوئی، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ان میں سے آخری زوجۂ محترمہ تھیں۔[1]

سنن نسائی، مستدرک حاکم، ابن عساکر اور طبقات ابن سعد میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَلْاَخَوَاتُ الْاَرْبَعَةُ مُؤْمِنَاتٌ مَيْمُوْنَةُ وَاُمُّ الْفَضْلِ وَ سَلْمٰى وَ اَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ، اُخْتُهُنَّ لِأُمِّهِنَّ»[2]

''میمونہ، ام الفضل، سلمٰی اور اسماء بنت عمیس جو ان کی ماں کی طرف سے بہن ہے۔ چاروں بہنیں مومن ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے ان کے مومن وایماندار ہونے کی گواہی وشہادت دی۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے:

«اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ اَتْقَانَا لِلّٰهِ وَ اَوْصَلِنَا لِلرَّحِمِ»[3]

''وہ (حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا) ہم سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار تھیں اور صلہ رحمی کرنے (قرابت داروں کا خیال رکھنے) والی تھیں۔''

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ۷٦ احادیث کی راوی ہیں، جن میں سے سات متفق علیہ، ایک صرف بخاری اور ایک صرف مسلم میں اور باقی ٦۷ دیگر کتبِ حدیث میں ہیں۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے ۵۱ھ میں وفات پائی۔[4] رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا وَاَرْضَاهَا.

---

[1] الفتح الرباني (١١/ ٢٢٩)

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٦٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٦٤) سنن الكبرىٰ للنسائي، رقم الحديث (٨٣٨٧) معجم الكبير للطبراني (٤١٥/١١، رقم الحديث: ١٢١٧٨) تخريج مشكل الآثار طحاوي (٤٨٦٨) و حسّنه الأرناؤوط.

[3] الموسوعة العقدية، الكتاب العاشر، كتاب الدرر السنية، قال الحافظ: و هذا سند صحيح.

[4] الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٧۔ ١٣٨) رحمةٌ للعالمين (٢/ ١٨١)

نقشہ

متعلق حالات تاریخی امہات المومنین رضی اللہ عنہن

تتمّہ باب امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن

مشمولہ کتاب رحمۃ للعالمین (۲/ ۱۸۰)

نمبر شمار	نام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن	سنہ نکاح	امّ المؤمنین رضی اللہ عنہا کی عمر بوقتِ نکاح	کُل عُمر
۱	حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا	۲۵ میلاد النبی ﷺ	۴۰ سال	۶۵ سال
۲	حضرت سودۃ رضی اللہ عنہا	۱۰ نبوت	۵۰سال	۷۲سال
۳	حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا	نکاح ۱۱ نبوت رخصتی شوال ۱ھ	۹ سال	۶۳سال
۴	حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا	شعبان ۳ھ	۲۲سال	۵۹ سال
۵	حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا	۳ھ	تقریباً ۳۰ سال	۳۰سال
۶	حضرت امِّ سلمہ رضی اللہ عنہا	۴ھ	۲۴ سال	۸۰سال
۷	حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا	۵ ھ	۳۶ سال	۵۱سال
۸	حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا	شعبان ۵ھ	۲۰ سال	۷۱سال
۹	حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا	۶ھ	۳۶ سال	۷۲سال
۱۰	حضرت صفیّہ رضی اللہ عنہا	جمادیٰ الآخریٰ ۷ھ	۱۷ سال	۵۰سال
۱۱	حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا	ذوالقعدہ ۷ھ	۳۶ سال	۸۰سال

سنہ وفات	مقبرہ	نبی ﷺ کی خدمت میں رہنے کی مدّت	نبی ﷺ کی عمر بوقتِ نکاح
۱۰ نبوّت	مکہ معظّمہ	تقریباً ۲۵ سال	۲۵ سال
۱۹ھ ہجرت	مدینہ منورّہ	۱۴ سال	۵۰ سال
۵۷ھ ۱۷/ رمضان المبارک	مدینہ منورّہ	۹ سال	۵۴ سال
جمادی الاولیٰ ۴۱ھ	مدینہ منورّہ	۸ سال	۵۵ سال
۳ھ	مدینہ منورّہ	۳ ماہ	۵۵ سال
۶۰ھ	مدینہ منورّہ	۷ سال	۵۶ سال
۲۰ھ	مدینہ منورّہ	۶ سال	۵۷ سال
ربیع الاول ۵۶ھ	مدینہ منورّہ	۶ سال	۵۷ سال
۴۴ھ	مدینہ منورّہ	۶ سال	۵۸ سال
رمضان ۵۰ھ	مدینہ منورّہ	تقریباً ۴ سال	۵۹ سال
۵۱ھ	سَرِف قربِ مکہ	تقریباً ۳ سال	۵۹ سال

تعددِ زوجات کے سلسلے میں عام مسلمانوں اور نبیِ اسلام ﷺ میں فرق

نبیِ اکرم ﷺ کی جن گیارہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا ذکر گزرا ہے، ان میں سے سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے وفات پائی۔ بلکہ جب تک وہ زندہ رہیں، وہ صرف اکیلی ہی تھیں۔ آپ ﷺ نے کسی دوسری زوجۂ محترمہ سے ان کی زندگی میں نکاح نہیں کیا۔ ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا صرف دو یا تین ماہ ہی آپ ﷺ کے نکاح میں زندہ رہیں اور وفات پا گئیں۔ ان دونوں کا انتقال تو نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ہو گیا۔ اور جب خود سرورِ کونین ﷺ نے انتقال فرمایا تو اس وقت نو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آپ ﷺ کے حرمِ اقدس میں تھیں اور ان سب میں سے سب سے آخر میں بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (في الإصابة) ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بعمر ۸۴ سال وفات پائی۔[1]

وہ عورتیں جن سے آپ ﷺ نے نکاح کیا مگر رخصتی نہیں ہوئی، وہ دس تھیں۔ اور جنھیں پیغامِ نکاح دیا مگر نکاح نہیں کیا، وہ بھی دس تھیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کے بقول آپ ﷺ کی دو کنیزیں تھیں: حضرت ماریہ قبطیہ ام ابراہیم ابن الرسول ﷺ، اور ریحانہ (رضی اللہ عنہا)۔ بعض نے اور بھی ذکر کی ہیں۔[2]

یہاں چند امور کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے کے سلسلے میں عام مسلمانوں اور نبیِ اسلام ﷺ کے مابین ربِ کائنات کی طرف سے ہی فرق رکھا گیا ہے۔

عام مسلمانوں کی نسبت حکمِ الٰہی یہ ہے کہ چار عورتوں تک سے شادی کی جا سکتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ جیسا کہ سورۃ النسآء (آیت: ۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ

[1] الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٢) كما في المواهب و شرحه الزرقاني.

[2] تفسير القرطبي (٧/ ١٤/ ١٦٤۔ ١٦٩) الفتح الرباني (٢٢/ ١٤٧۔ ١٤٨) وغيرهما من كتب السيرة)

وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾

''اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ (نکاح کر کے) انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمھیں پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لے لو جو تمھارے قبضہ میں آئی ہوں۔ بے انصافی سے بچنے کے لیے یہی زیادہ قرینِ صواب ہے۔''

اس آیت کی رو سے ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جمہور اہلِ علم اور جمیع فقہائے امت کے نزدیک چار سے زیادہ بیویاں جمع کرنا منع ہے۔ نیز ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی شکل میں سب کے ساتھ عدل و انصاف اور برابری کو شرط قرار دیا گیا ہے اور جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا، مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دغابازی کرتا ہے۔[1]

کتبِ حدیث میں نبی ﷺ کے ارشادات سے بھی پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے چار سے زیادہ بیویوں کو جمع کرنے کی ممانعت کر دی۔ جیسا کہ ترمذی، ابن ماجہ، اور مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ حضرت غیلان بن سلمہ رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے پاس دس بیویاں تھیں، نبی ﷺ نے انھیں حکم فرمایا:

«اِخْتَرْ مِنْهُنَّ اَرْبَعاً»[2] ''ان میں سے صرف چار کو رکھ لو۔''

ایسے ہی ابو داود، ابن ماجہ اور مسند شافعی وغیرہ میں دیگر مثلاً حارث بن قیس رضی اللہ عنہ وغیرہ کے واقعات بھی مذکور ہیں۔[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر اردو (۱/ ۵۳۷) حاشیہ قرآن مجید مترجم از مولانا مودودي.

[2] مسند أحمد (٦/ ٢٨٨) و صححه احمد شاکر، محلّیٰ (۹/ ٤٤١) شرح البخاري (٢٧٦/٢٤) و صححه ابن الملقن، مصنف ابن أبي شيبة (٣٧٤٣٩) مجمع الزوائد (٢٢٦/٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢٢) ابن کثیر اردو (۱/ ۵۳۸۔ ۵۳۹)

البتہ نبیِ اکرم ﷺ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور چار سے زیادہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ نکاح خصائصِ مصطفیٰ ﷺ میں سے ہے۔ آپ ﷺ کی یہ خصوصیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ تھی، جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ﴾

''اے نبی! ہم نے آپ کے لیے حلال کردیں آپ کی وہ بیویاں جن کے مہر آپ نے ادا کیے ہیں۔ اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپ کی ملکیت میں آئیں، اور آپ کی چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد، اور خالہ زاد، جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے۔ اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبی کے لیے ہبہ کیا ہو، اگر نبی اسے نکاح میں لینا چاہے۔''

آگے فرمایا: ﴿ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

''یہ رعایت خالصتاً آپ کے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے۔''

آگے فرمایا:

﴿ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

''ہمیں معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کیں ہیں (لیکن آپ کو ان حدود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے) تاکہ آپ پر کوئی تنگی نہ رہے۔ اور اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جن حدود کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ سورۃ النسآء (آیت: ۳) میں مذکور ہیں۔ یعنی زیادہ سے زیادہ چار عورتوں سے شادی کی اجازت۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا﴾

''اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اُن کے سوا جو عورتیں تمھیں پسند ہیں دو دو یا تین تین یا چار چار اُن سے نکاح کر لو اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو، اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔''

جب سورۃ الاحزاب کی آیات (۲۸ اور ۲۹) نازل ہوگئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو اللہ و رسول ﷺ اور دارِ آخرت پسند کر لینے یا پھر دنیا اور اس کی زینت کو چن لینے کا اختیار دے دیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب: ۲۸۔۲۹]

''اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اُس کی زینت و آرائش کی طلبگار ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اُس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر (یعنی جنت) کی طلبگار ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی ہیں اُن کے لیے اللہ نے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

اُس وقت بھی نبی ﷺ کی نو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن تھیں اور جب ان سب نے اللہ و رسول ﷺ اور دارِ آخرت کو پسند کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس حسنِ اختیار کا صلہ عطا کرنے اور نبی ﷺ کی دائمی رفاقت بخشنے کے لیے اپنے نبی ﷺ کو سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۲) ہی میں حکم فرما دیا تھا:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا﴾

''اس کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ اس کی ہی اجازت ہے

کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ ان کا حسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو، البتہ کنیزوں کی آپ کو اجازت ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے۔‘‘[1]

چنانچہ آپ ﷺ کی وفات کے وقت تک اگر چہ یہ حکم منسوخ ہو گیا تھا، لیکن آپ ﷺ کے حرمِ اقدس میں وہی نو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن موجود رہیں۔

تعدّدِ زوجات اور قانون

شادی کے اغراض و مقاصد تو معروف ہیں اور اس سلسلے میں ہر شخص اگر مکمل گہرائی میں جا کر ان تمام مقاصد کو نہیں سمجھ سکتا تو کم از کم جو امور بالکل ظاہر و باہر اور واضح و روشن ہیں انھیں تو ہر شخص جانتا ہی ہے۔ ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ شادیاں کرنا چاہے تو اسلام نے بعض شروط و قیود کے ساتھ دو، تین اور چار شادیاں کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔ اس تعدّدِ زوجات میں کیا مصلحتیں اور حکمتیں پوشیدہ ہیں؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے جو ہم بعد میں مختصراً ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ!

لیکن سرِدست دیکھنا یہ ہے کہ عام مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی اجازت دی گئی ہے جبکہ نبیِ اکرم ﷺ کو اس تحدید سے اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور آپ ﷺ نے واقعتاً چار سے زیادہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے نکاح کیا تو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس میں کیا حکمتیں اور مصلحتیں تھیں اور کیا اس سلسلے میں نبی ﷺ پہلے پیغمبر ہیں کہ آپ ﷺ نے ایسا کیا؟ کیا اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں بھی اس کی کوئی مثال موجود ہے؟ ایک سے زیادہ بیویوں کے مسئلے پر بعض مغربی اقوام اور خصوصاً عیسائی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟

نبیِ اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی پر جو زبانِ طعن دراز کی جاتی ہے اور بعض ایسے فقرے چُست کیے جاتے ہیں جنھیں ’’نقلِ کفر، کفر نہ باشد‘‘ کا قاعدہ موجود ہونے کے باوجود کوئی مسلمان اپنی زبان سے ادا کرنا گوارا نہیں کرتا۔ اور اگر کبھی ان غیر مرغوب و ناخوشگوار جملوں کو اصل مسئلے کی حقیقت واضح

---

[1] للتفصيل تفسير القرطبي (٧/ ١٤/ ٢٠٦۔ ٢١٩ ومابعد) وغيره من كتب التفسير.

کرنے کے لیے زبان سے کہنا ہی پڑے تو ان کے اوّل یا آخر میں معاذ اللہ یا نعوذ باللہ کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسے فقروں کی اخلاقی حیثیت کیا ہے؟ آیندہ چند صفحات میں ہم انہی امور کا جائزہ لیں گے۔ وبید اللّٰه التوفیق.

ایک سے زیادہ بیویوں کے جواز یا عدمِ جواز کی بحث صرف دو ہی پہلوؤں سے کی جا سکتی ہے:

اوّلاً: دستور و قانون کی رو سے۔

ثانیاً: مذہبی نقطۂ نظر سے۔

دستور و قانون کی رو سے تو ایک سے زیادہ بیویوں کے مسئلے پر کوئی مسلّمہ اعتراض موجود نہیں ہے، چنانچہ ایک قانون دان، ہندوستان کی ریاست پٹیالہ کے سابق سیشن جج اور معروف سیرت نگار و عالمِ دین قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''قانون اس مسئلے کا فیصلہ یورپ کے لیے اور طرح کرتا ہے، اور ایشیا کے لیے اور طرح۔ ہندوستان کی تمام ہائی کورٹیں ایک سے زیادہ بیویوں کی شخصیت کو دیوانی و فوجداری قوانین میں صحیح تسلیم کرتی ہیں۔ یہ اعلیٰ عدالتیں ان مقدمات میں جو جائیداد سے متعلق ہوں دو یا دو سے زیادہ بیویوں کے حقوق کو (بمقابلہ ان کے شوہر کے ورثاء قانونی کے) تسلیم کرتی ہیں اور ڈگریاں جاری کرتی ہیں۔ یہ اعلیٰ عدالتیں ہمیشہ مقدمات زیرِ دفعہ ۴۹۴ تعزیراتِ ہند میں ایسی عورت کو جو اپنے شوہر کی دوسری یا تیسری یا چوتھی بیوی تھی (مطلقہ یا بیوہ ہوئے بغیر) کسی دوسری جگہ شادی کر لینے پر مجرم قرار دیتی ہیں اور اس شخص کو بھی مجرم ٹھہراتی ہیں جو ایسی عورت کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔ ہندوستان کی ہائی کورٹوں کا یہ متفقہ اور مسلّمہ رویہ انگلستان کے قانون بائی گیمی کے بالکل خلاف ہے، تو گویا ہندوستان کی عدالتوں کا یہ قانونی دستور ایشیا کو یورپ سے متمیّز کرتا ہے۔ اس لیے ثابت ہو گیا محض قانونی پہلو سے اس مسئلہ پر کوئی مسلّمہ اعتراض موجود نہیں ہے۔''[1]

متحدہ ہندوستان کے قانون کی دفعات ۳۶۳ اور ۳۶۶ کو بھی جب شادی شدہ عورت کے متعلق

---

[1] رحمة للعالمين (٢/ ١٢٤)

ہوں، نیز دفعہ ۴۹۸ کو بھی اس نظیر میں شامل کر لینا چاہیے۔ تب ایک سے زیادہ بیویوں کا قانون کی رو سے جائز ہونا بالکل ہی واضح ہو جاتا ہے:

''اب اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ ہندوستان کی عدالتوں نے اس بارے میں خالصتاً ہندوستانی رسم و رواج کی پیروی کی ہے تو ان کی یہ بات درست نہ ہوگی، کیوں کہ اگر قانون وضع کرنے والے اس مسئلہ کو قطعاً مخرّبِ اخلاق سمجھتے تو اس کا ضرور کلی انسداد کر دیتے خواہ رسم و رواج اس کی تائید میں پائے ہی جاتے۔ رسمِ ستی کے انسداد کے متعلق حکومت نے ایسا ہی کیا۔ اگرچہ بعض لوگ اس کی بنیاد مذہب پر بھی بتاتے تھے۔''[1]

الغرض مسلم ممالک میں مروج وضعی قانون سے قطعِ نظر خاص متحدہ ہندوستان کے قانون کی دفعات شاہد ہیں کہ ایک سے زیادہ بیویاں غیر قانونی نہیں بلکہ دیوانی وفوجداری قوانین ان کے وجود کو جائز وصحیح تسلیم کرتے ہیں۔

یہ تو تھا مسئلہ تعدّدِ زوجات کا قانونی پہلو اور جواز، رہا اس بارے میں مذہبی نقطۂ نظر تو یہ آگے آنے والے اوراق میں بیان کیا جاتا ہے۔ اِن شاء اللہ

تعدّدِ زوجات ہندوؤں اور اہلِ کتاب میں

ایک سے زیادہ بیویوں کے جواز پر قانونی دلائل پیش کیے جاچکے ہیں۔ اب آیئے اس مسئلے پر اسلام کے علاوہ دیگر مختلف مذاہب کی تعلیمات اور ان کے پیشواؤں کے ذاتی عمل کو بھی دیکھیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں عرض ہے کہ مذہب کا اصل سرچشمہ ایشیائی ممالک ہیں حتیٰ کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی شام میں پیدا ہوئے اور ایشیائی ہی ہیں۔ ایشیا کے تقریباً سبھی مشہور مذہب ایک سے زیادہ بیویوں کے جواز کی تائید کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر قدیم ہندوستان کو ہی لے لیجیے، ہندو مذہب کے پیشواؤں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شری رام چندر جی کے والد مہاراجہ وسرت کی تین بیویاں تھیں۔ ایک رام چندر جی کی والدہ پٹ رانی کوشلیا۔ دوسری لچھمن جی کی والدہ رانی سمترہ اور تیسری

---

[1] حاشیہ رحمة للعالمین (۲/ ۱۲٤۔ ۱۲۷ بتصرف)

بھرت جی کی والدہ رانی کیکئی۔

شری کرشن (جو اوتاروں میں سولہ کلاں سپورن تھے) ان کی سینکڑوں بیویاں ہونے کا پتا چلتا ہے۔ البتہ ان کے سوانح نگار آنجہانی لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب ''کرشن چرتر'' میں کرشن کی اٹھارہ رانیاں تسلیم کی ہیں اور ہمارے مدعا کے لیے یہ تعداد بھی بہت کافی ہے۔ راجہ پانڈو جو مشہور پانڈووَں کا جدِّ اعلیٰ ہے، اس کی دو بیویاں تھیں، ایک کنتی اور دوسری مادھری۔ اسی طرح راجہ شنتن کی بھی دو بیویاں گنگا اور ستیہ وتی تھیں۔ ایسے ہی بچھتر ایرج کی دو بیویاں امیکا اور امبالکا کے علاوہ ایک کنیز کا بھی پتا چلتا ہے۔[1]

ان تصریحات اور تاریخی حقائق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو کم ازکم ان پیشواؤں کے مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ اسلام میں متعدد بیویوں کے جواز پر اعتراض کریں۔ شری کرشن جی کی زیادہ نہیں تو کم ازکم اٹھارہ رانیاں تو خود ان کے پیروکارِ خاص اور سوانح نگار نے تسلیم کی ہیں۔ اگر یہ کوئی عجوبہ نہیں تو نبیِ اسلام ﷺ کے گھر میں بیک وقت نو بیویوں کا وجود بھی کوئی انوکھی بات نہیں سمجھی جانی چاہیے۔

ہندو مذہب کی طرح یہودی اور عیسائی مذہب کی اصل کتابوں میں بھی متعدد بیویوں کے بارے میں اسلام کے موقف کی تائید موجود ہے اور نبیِ آخر الزمان ﷺ سے پہلے گزرے ہوئے کئی انبیاء علیہم السلام کے یہاں بھی متعدد بیویاں تھیں۔ مثلاً:

''جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جنھیں انجیل باب: ۲۳، فقرہ: ۲ کی رو سے عیسائی لوگ بھی صاحبِ عظمت اور خلیل الرحمٰن تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی تین بیویاں تھیں۔ ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کا ذکر کتابِ پیدائش باب: ۴، فقرہ: ۱۶ میں موجود ہے۔ دوسری بیوی حضرت اسحاق علیہ السلام کی والدہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا تھیں جن کا ذکر کتابِ پیدائش باب: ۱۵، فقرہ: ۱۸ میں ہے۔ حضرت خلیل علیہ السلام کی تیسری بیوی قتورہ خاتون تھیں جو زمران کی والدہ تھیں، جن کا ذکر کتابِ پیدائش باب اوّل فقرہ: ۲۵ میں موجود ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: رحمة للعالمین (۲/ ۱۲۵)

''بنی اسرائیل کے جد اعلیٰ حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں جنھیں کتابِ تواریخ باب: ۱۰، فقرہ: ۲۲، اور کتابِ خروج باب: ۴ فقرہ: ۱۱ کی رو سے عیسائی حضرات بھی نہایت برگزیدہ پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ ان حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں، ایک یہودہ کی والدہ لیاہ تھیں۔ دوسری زلفہ، تیسری حضرت یوسف علیہ السلام و بنیا مین کی والدہ داخل تھیں اور چوتھی بلہہ تھیں۔ ان چاروں کا ذکر بھی کتابِ پیدائش بالترتیب باب: ۲۳، ۳۴، ۲ اور ۲۹ میں موجود ہے۔
''اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ہیں جنھیں کتابِ استثناء باب: ۱۰، فقرہ: ۳۴ کی رو سے عیسائی بھی ایسا عظیم الشان نبی مانتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ کے شرفِ ہمکلامی بخشنے کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ ان کی بھی چار بیویاں تھیں جن میں سے ایک کا نام کتابِ خروج کے باب: ۳۱، فقرہ: ۲ میں صفورہ خاتون ملتا ہے۔ دوسری حبشیر تھیں جبکہ قینی اور حباب کا ذکر کتاب قاضیون کے باب: ۱۶ میں ملتا ہے۔ کتابِ استثناء کے باب: ۲۱، فقرہ: ۱۰ تا ۱۳ کے مطالعہ سے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے لاتعداد بیویوں کے جواز کا پتا چلتا ہے۔''

اسی طرح حضرت داود علیہ السلام کی نو بیویوں کے نام کتاب سموئیل کے باب: ۳، ۱۱، ۲۳ اور ۲۷ میں اور دس حرموں کا تذکرہ باب: ۳۰ میں موجود ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بکثرت بیویاں ہونے کا ذکر سلاطین باب: ۳، فقرہ: ۱۱ میں موجود ہے اور چار، دس، بیس نہیں بلکہ ایک ہزار عورتوں کا ذکر ہے جن میں سات سو بیگمات اور تین سو حرم میں تھیں۔ [1]

ان کتب میں مذکور یہ حوالے تو معترضین کی اپنی کتابوں کے ہیں جبکہ قرآن کے بعد مسلمانوں کی معتبر اور صحیح ترین کتاب بخاری شریف، کتاب الجہاد (۶/ ۳۴ مع الفتح) میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک سو بیویوں کا ذکر ہے۔ یہ کتاب النکاح میں ہے۔ اور کتاب الانبیاء (ص: ۴۵۸) میں ۷۰ کا ذکر ہے۔ کتاب الایمان (۱۱/ ۵۲۴ مع الفتح) میں نوے (۹۰) مذکور ہیں، کتاب التوحید (۱۳/ ۴۴۶ مع الفتح)،

---

[1] للتفصيل رحمة للعالمين (٢/ ١٢٦ـ ١٢٨) تعدد زوجات از ڈاکٹر عبد الناصر توفيق العطار (ص: ٨١ـ ٨٦) حكمة إباحة تعدد الزوجات، شيخ عبد الله بن زيد آل محمود (ص: ١٣ـ١٤) مجموعة الرسائل (٢/ ٢٧٩ـ ٢٨٠) تعدد الزوجات في الإسلام (ص: ٥ـ ١٦) للشيخ عبد الله ناصح علوان.

اور کتاب النکاح میں مطلق ''عورتیں'' مذکور ہے۔ نیز صحیح مسلم، کتاب الایمان (مختصر مسلم بتحقیق الالبانی: ۱/۲/۲۷) ترمذی، کتاب النذور، سنن نسائی، کتاب الایمان اور مسند احمد (رقم الحدیث: ۲۲۹۔ ۲۷۵۔ ۵۰۶) بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ادیان وامم سابقہ میں تعددِ ازواج کے عنوان کے تحت ڈاکٹر محمد یوسف عبد نے بھی مختصر مگر جامع بحث کی ہے۔[1]

ان سب حوالوں سے یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ اللہ کے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں علیہم السلام کے گھروں میں ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی تھیں۔ عیسائی لوگوں سے پوچھا جائے کہ ان لوگوں نے کثرتِ زوجات کو بنیاد بنا کر ان انبیاء علیہم السلام کی تقدیس وعظمت پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تو پھر نبیِ اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی پر کیوں؟

معاملہ انبیاء علیہم السلام کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہے۔ اگر کسی ہما شما کے بارے میں یوں دو پیمانے استعمال کرنے کا کھیل رچایا جاتا تو پھر کہا جا سکتا تھا کہ ؎

تیری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائی اکابرین سے تعددِ زوجات کی تائید

ہندوستان کے اکثریتی مذہب کے پیشواؤں کے ذاتی فعل اور سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کے عمل سے اور اہلِ مذہب کی اپنی مقدس ومعتبر کتابوں کے حوالہ سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ ان کے یہاں بھی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے بعض ارشادات سے بھی متعدد بیویوں کے جواز کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً انجیلِ متّیٰ کے باب (۲۵) میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی آمد کی خبر میں دس کنواریوں کا ذکر فرمایا ہے کہ پانچ نے دولہا کے ساتھ شادی کی، گھر میں گئیں اور پانچ جو پیچھے رہ گئی تھیں ان کے لیے دروازہ نہ کھولا گیا۔ یہ الفاظ بڑے واضح ہیں کہ پانچ عورتوں نے ایک شخص سے شادی کی۔

---

[1] دیکھیں ان کا ایم۔اے [جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ] کا مطبوعہ مقالہ: ''قضایا المراۃ في سورۃ النسآء'' (ص: ۵۱۔ ۵۴)

اب عیسائی لوگ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ کلام تمثیلی ہے۔ حالانکہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناپسندیدہ ہوتا تو وہ اس تمثیلی بیان کو کبھی زبان پر نہ لاتے۔ مغرب کے بعض معروف اہلِ نظر نے بھی اس کلام سے یہی مطلب سمجھا ہے۔ چنانچہ انگلستان کا مشہور شاعر ملٹن اسی تمثیل کی بنیاد پر ایک سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں لینے کے جواز کا قائل تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس کلام اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام سے متعلق سابقہ کتب کے حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہزاروں سال سے کثیر انبیاء علیہم السلام نے جو منہاجِ نبوت اپنے محکم و مستقیم عمل سے قائم کیا وہ یہ تھا کہ نبی کے گھر میں ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی ہیں اور اگر اس کے باوجود بھی کوئی شخص اس نتیجے سے اتفاق کرنے پر تیار نہیں تو پھر اسے عبرانیوں کے باب: ۴ کا فقرہ: ۱۳ پڑھ لینا چاہیے جو کچھ یوں ہے:

''بیاہ کرنا سب میں بھلا ہے اور بستر ناپاک نہیں۔ یہ خدا حرام کاروں اور زانیوں کی عدالت کرے گا۔''

اس فقرہ میں صرف دو ہی صورتیں مذکور ہیں: پہلی بیاہ اور دوسری زنا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں ناپاک بستر ہے تو کیا وہ یہ اقرار کرنے کو بھی تیار و آمادہ ہے کہ وہ سب مقدس لوگ جن کے یہاں متعدد بیویاں ہونے کا ذکر سابقہ آسمانی کتب میں پایا جاتا ہے وہ سب (معاذ اللہ) اس فقرے کے مصداق تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی عیسائی ایسا نہیں پایا جائے گا۔ لہٰذا جس طرح وہ حضرت ابراہیم و یعقوب، سلیمان و داود اور موسیٰ علیہم السلام کے معاملے میں خاموش ہیں اسی طرح انھیں پیغمبرِ آخر الزمان، نبیِ اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے سے بھی باز رہنا چاہیے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب کے پیروکاروں میں جہاں کچھ مذہبی جنونی، متعصب مزاج اور نبی ﷺ کی نسبت خواہ مخواہ بغض وعداوت اور معاندانہ رویہ رکھنے والے پائے جاتے ہیں، وہاں کچھ احترامِ باہمی کا قاعدہ جاننے والے اہلِ فکر و نظر، متشدّدانہ رویے سے بالا رہنے والے منصف مزاج و معتدل

---

[1] رحمة للعالمين (٢/ ١٢٩ بتصرف)

خیال لوگ بھی پائے جاتے ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ نبیِ اسلام ﷺ کی شان میں کبھی گستاخی نہیں کی، بلکہ آپ ﷺ کی پاک زندگی کے پاک چال چلن اور مقدس کردار کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ کئی اہلِ علم نے صرف اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں تقریباً تمام مذاہب کے غیرمسلم اکابرین، پیشواؤں، فلاسفروں، ڈاکٹروں، پروفیسروں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، زعمائے حکومت حتیٰ کہ ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے نبی ﷺ کی نسبت تعریفی اقوال جمع کیے ہیں۔ ''نبی ﷺ: اغیار کی نظر میں'' یا ان الفاظ سے ملتے جلتے نام کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھی جاسکتی ہے۔

مجموعی تعریف و توصیف کے علاوہ خاص تعدّدِ زوجات کے موضوع پر بھی مغربی مفکرین اور مصنّفین نے نبی ﷺ کی تائید کی ہے۔ چنانچہ علی احمد الجرجاوی نے اپنی کتاب ''حكمة التشريع و فلسفته'' (۲/ ۱٦) پر معروف کرسچن عالم، گوسٹاف لبون کا بیان نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے:

''تعدّدِ زوجات کا نظام حقیقت میں ایک مستقل نظام ہے جو محمد (ﷺ) سے بھی پہلے مشرقی اقوام وعوام میں موجود تھا۔ یہ نظام عہدِ قدیم سے فارس میں مشروع، یہود میں مسنون اور عربوں میں مروّج تھا۔ ادیانِ عالَم میں سے کسی دین میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس نظام کو منسوخ کر سکے۔ جسے قرآنی دین (اسلام) نے برقرار رکھا ہے۔''

پھر تعدّد کے اسباب ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''میں نہیں سمجھتا کہ اہلِ مشرق کا یہ شرعی نظامِ تعدّد اہلِ مغرب کے فحش نظامِ تعدد سے گرا ہوا کیسے ہوسکتا ہے؟ جبکہ مغربی نظام میں محض قانون کی حد تک تو صرف ایک ہی بیوی ہو سکتی ہے، جبکہ عادتاً کوئی شاذ و نادر شخص ہی ہوگا جو صرف ایک عورت پر قناعت کرتا ہو۔''[1]

ان الفاظ کا مفہوم بڑا واضح ہے کہ نصاریٰ مغرب کے یہاں حلال طریقے سے متعدد بیویاں کرنا تو ناپسندیدہ فعل ہے، مگر حرام طریقے سے لا تعداد عورتوں کے ساتھ خفیہ تعلقات اور آشنائی رکھنا عام ہے۔ لا حول ولا قوة إلا باللّٰه.

ایسے ہی تعدّدِ زوجات کے موضوع پر تائیدی بیانات انگریز فلاسفر سپنسر اور ٹومس کارلائل کے

[1] بحواله حكمة تعدد الزوجات (ص: ۸) شيخ عبد اللّٰه آل محمود قطر يا مجموعة الرسائل لهٗ (۲/ ۲۷۳۔ ۲۷٤)

بھی ہیں جن میں سے سپنسر کا بیان اس کی اپنی کتاب ''اصولِ علمِ معاشرہ'' کے حوالے سے شیخ عبد اللہ نے اپنے رسالہ (ص: ۱۱ ومجموعہ ۲/ ۲۷۷) میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر عبد الناصر العطار نے اپنی کتاب "تعدد الزوجات من النواحي الدينية والاجتماعية والقانونية" (ص: ۱۰۸) پر (جو ۳۳۲ صفحات کی اپنے موضوع پر بڑی جامع کتاب ہے) دونوں کا ذکر کیا ہے۔

وسٹر مارک کی کتاب جس کا عربی ترجمہ عبد المنعم الزیادی نے ''قصۃ الزواج'' کے نام سے کیا ہے، اس کے ص: ۳۵۶ سے نقل کیا ہے کہ ۱۵۳۱ء میں مونسٹر میں عیسائی پادریوں نے صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ جو شخص حقیقی مسیحی بننا اور رہنا چاہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ متعدد بیویوں سے شادی کر لے۔[1]

اسی طرح ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی کتاب "المرأة بين الفقه والقانون" اور عباس محمود عقاد کی کتاب "المرأة في القرآن الكريم" کے ابواب متعلقۂ تعدّد اور عبد اللہ ناصح علوان کی تعدّد الزوجات (ص: ۱۵۔ ۲۵، ۵۸۔ ۶۰) میں بھی عیسائی مفکرین، مصنّفین اور پادریوں کی اس تعدّدِ ازواج کی تائید میں دی جانے والی آرا دیکھی جاسکتی ہیں۔ سورۃ الرعد (آیت: ۳۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ﴾

''تم سے پہلے بھی (اے میرے نبی!) ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیویوں اور اولاد والا بنایا تھا۔''

تین اہم نقاط

مختلف ادیان کی مقدّس کتب اور ان پیشواؤں کے ذاتی فعل کے حوالے سے اور منہاجِ نبوت کی رو سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ایک سے زیادہ شادیاں صرف اسلام میں ہی روا نہیں، بلکہ دیگر ادیان میں بھی رہی ہیں اور متعدد بیویوں کو بیک وقت اپنی زوجیت میں رکھنا صرف نبی ﷺ پر ہی بس نہیں، بلکہ پہلے انبیاء اور کئی مذاہب کے پیشوا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے متعدد عورتوں کو اپنے نکاح

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: قصة الزواج (ص: ۱۰۷۔ ۱۰۸)

میں لیا۔ لہٰذا جب معترضین کے اپنے گھر سے اس فعل کے جواز کی شہادت مل گئی تو ان کا اعتراض اپنی وقعت کھو بیٹھا۔ لہٰذا اصل بات تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والوں کے مزید اطمینان کی خاطر ہم یہ بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے متعدد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے نکاح کر لینے میں محض ذاتی اغراض اور شخصی طلبات کارفرما نہیں تھیں، بلکہ آپ ﷺ کے پیشِ نظر بے شمار تعلیمی، تشریعی، معاشرتی اور سیاسی فوائد تھے اور آپ ﷺ کے ہر نکاح میں لا تعداد حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی تھیں۔ ان سب دینی فوائد و مصالح اور معاشرتی مقاصد کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے تین اہم نقطے اپنے ذہن میں بٹھالیں:

1. نبی ﷺ نے اپنی تریسٹھ سالہ حیاتِ مبارکہ میں سب سے پہلے پچیس سال کوئی شادی کیے بغیر کمالِ تجرّد سے گزارے۔ آپ ﷺ نے عنفوانِ شباب اور جوشِ جوانی کا زمانہ کمالِ تقویٰ اور پرہیزگاری سے گزارا اور پھر پہلی شادی کی۔ پچیس سال سے پچاس سال کی عمر کا زمانہ صرف ایک اس خاتون کے ساتھ بسر کیا جو پہلے ہی دو شوہروں کی بیوہ، کئی بچوں کی ماں اور عمر میں آپ ﷺ سے کئی سال بڑی تھیں۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کی پچیس سالہ ازدواجی زندگی میں اپنی اس زوجۂ محترمہ سے محبت و دلبستگی میں ذرا کمی نہ آئی اور ان کے جیتے جی آپ ﷺ نے دوسرا کوئی نکاح نہ کیا۔ کیا ایسی مقدّس شخصیت کے بارے میں اعلیٰ رائے قائم نہیں ہوتی؟ کیا کوئی منصف مزاج شخص یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی اس شادی کی وجہ وہی تھی جو عام پرستارانِ حسن کی شادیوں میں پائی جایا کرتی ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔
2. دوسرا نقطہ یہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ پچاس سال کی عمر تک آپ ﷺ نے دوسری شادی نہیں کی، بلکہ اس کے بعد عمر کے ۵۵ سے ۵۹ سال تک پنج سالہ زمانے میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے حجرات آباد ہوئے جبکہ آپ ﷺ بڑھاپے میں قدم رکھ چکے تھے۔ اگر آپ ﷺ کے پیشِ نظر بھی (معاذ اللہ) وہ اغراض و مقاصد ہوتے جو شہوت پرست، حسن کے پرستار اور عیش کوش لوگوں کے ہوتے ہیں تو آپ ﷺ عہدِ شباب میں متعدّد نکاح کرتے، نہ کہ عمر رسیدہ ہو کر۔
3. تیسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ صرف ایک ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا آپ ﷺ کی تمام

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ایک ایک دو دو شوہروں سے بیوہ اور ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا مطلقہ تھیں۔ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا پچاس سالہ معمر خاتون تھیں اور ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کی عمر بوقتِ نکاح قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق تقریباً تیس سال اور علامہ محمد محمود الصوّاف کے بقول ساٹھ سال تھی۔[1]

اگر نبی ﷺ (نعوذ باللہ) ایسے خیالات وجذبات کے مالک ہوتے جیسا کہ یہ مستشرقین آپ ﷺ کے خلاف ناحق زبان درازی کرتے ہیں تو پھر آپ ﷺ کنواری دوشیزاؤں کا انتخاب فرماتے، نہ کہ عمر رسیدہ، بیوہ اور مطلقہ خواتین کا۔

اگر ان تینوں نقاط کو پیشِ نظر رکھا جائے تو حاقدین و معاندین کا اعتراض پادر ہوا ثابت ہوتا ہے اور معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا ہر شخص نبیِ اسلام ﷺ کے تقدّس وطہارت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔[2]

عیسائی لوگ اور خصوصاً نصارائے یورپ جو ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرنے کا بڑی شدّ و مدّ سے پرچار کرتے ہیں، ان کی اپنی مقدّس کتب کے حوالے سے جو امور ذکر کیے جا چکے ہیں ان کے علاوہ ان کی مذہبی تاریخ میں بعض ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ ان لوگوں کے تعدّدِ زوجات کے خلاف ہونے کے باوجود بعض لوگوں نے اپنے مذہبی راہنماؤں کی موجودگی میں اور پورے مذہبی آداب کے ساتھ دوسرا نکاح کیا۔ مثلاً: مشہورِ عالم شخص نپولین بونا پارٹ نے دوسری شادی کی جو خاص پورے یورپ کی موجودگی میں سرانجام پائی اور اس کی دوسری شادی کو پورے یورپ نے تسلیم بھی کیا۔ اس دوسری شادی کے جواز کے لیے ان کے پاس صرف ایک ہی عذر تھا کہ نپولین کا پہلی بیوی سے کوئی بچہ نہیں تھا جبکہ وہ چاہتے تھے کہ بونا پارٹ کی نسل باقی رہے۔ محض اس بنا پر اسے نہ صرف دوسری شادی کی اجازت دی گئی بلکہ وہ خاص پوپ کی موجودگی میں ہوئی۔ اب ذرا اس واقعہ

---

[1] رحمة للعالمين (٢/ ١٨٢) زوجات النبي الطاهرات وحكمة تعددهن للصوّاف (ص: ٤٦) دار الاعتصام، مصر.

[2] رحمة للعالمين (٢/ ١٣١) تعدد الزوجات فى الاسلام والحكمة من تعدد أزواج النبى (ﷺ) ص: ٦٢۔ ٦٤ عبد الله ناصح علوان۔ شبهات وأباطيل حول تعدّد زوجات الرسول ﷺ، محمد على الصابونى ص: ٩۔ ١٢ طبع سعوديه ١٩٨٠ ء)

پر غور فرمائیں کہ یہ ضرورت، ان عظیم مقاصد و مصالح کے مقابلے میں جو انبیائے کرام علیہم السلام کی تزویج میں ہوتے ہیں، کیا حیثیت رکھتی ہے؟[1]

نبی ﷺ کے تعدّدِ ازواج کی حکمتیں، مصلحتیں اور فوائد

نبیِ اکرم ﷺ نے جو متعدد نکاح کیے تھے، ان میں بے شمار علمی و دینی، تبلیغی و تشریعی، اور معاشرتی و سیاسی حکمتیں اور مصلحتیں پنہاں تھیں۔ نبیِ اکرم ﷺ کا متعدد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو اپنے نکاح میں لینا لا تعداد منافع و فوائد پر مشتمل تھا۔ چنانچہ معروف اسلامی مفکّر ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اپنی کتاب "المرأة بين الفقه والقانون" میں، پروفیسر عبد اللہ ناصح علوان نے اپنی کتاب "تعدّد الزوجات في الإسلام والحكمة من تعدّد أزواجِ النبي ﷺ" میں، ڈاکٹر عبدالناصر توفیق العطّار نے "تعدّد الزوجات من النواحي الدينية والاجتماعية و القانونية" میں، شیخ محمود الصوّاف نے اپنی کتاب "زوجاتُ النبي ﷺ الطاهرت و حكمة تعددهِنّ" میں، شیخ محمد علی الصابونی نے اپنے رسالہ "شبهات و أباطيل حول تعدّدِ زوجاتِ الرسول ﷺ" میں اور قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے "رحمة لّلعالمين" میں اس موضوع پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کا خلاصہ ہم آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

نبی ﷺ نے اپنی مقدّس جوانی کا عہد گزار لینے کے بعد اپنی عمرِ شریف کے ۵۵ سے ۵۹ سال کے درمیانی پانچ سالہ عرصے میں یا پھر اس عرصے کی مکمل احتیاط سے حد بندی کی جائے تو ۲ھ سے ۸ھ تک کے سالوں میں متعدّد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے نکاح کیا اور یہ عرصہ وہ دور ہے جس میں مسلمانوں اور مشرکین وکفار کے مابین یکے بعد دیگرے کتنی ہی جنگیں لڑی گئی تھیں اور اس عرصے میں کیے گئے نبی ﷺ کے ہر نکاح میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں تھیں۔ مثلاً:

1. ام المومنین حضرت عائشہ وحفصہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہن کے نکاح نے تعلیماتِ قرآن و سنت کی حفاظت، نشر و اشاعت، تعلیمِ نسواں اور تہذیب النساء کے میدانوں میں بہت کام کیا۔

[1] حاشیه رحمة للعالمين (۲/ ۱۳۰)

یہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن تین ہزار سے زیادہ احادیث کی راوی ہیں اور صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دو ہزار دو سو دس احادیث کی راوی ہیں۔ ان کے علاوہ شرعی فتوے، علمی مشکلات کا حل، عربی روایات اور تاریخی واقعات کا بیان اس پر مستزاد، اور خواتین کے متعلقہ مسائل کی وضاحت کا فریضہ امہات المومنین خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خوب ادا کیا۔

صحیح بخاری و مسلم میں غسلِ حیض و جنابت کے بارے میں بعض صحابیات رضی اللہ عنہن کا نبی ﷺ سے سوال کرنا اور آپ ﷺ کا مجسمۂ حیا ہونے پر ایسے سوالات کا اشارے کنائے میں جواب دینا، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا سائل خاتون کو الگ لے جا کر تفصیل سمجھانا اس بات کا شاہدِ عدل ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ کے پاس کوئی انصاری عورت آئی اور اس نے غسلِ حیض کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''مسک (کستوری) لگا روئی کا ٹکڑا لے کر اس کے ساتھ طہارت حاصل کرو۔''

اس نے کہا: کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے طہارت حاصل کرو۔''

اس نے کہا: کیسے؟ فرمایا: ''سبحان اللہ! طہارت حاصل کرو۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اس عورت کو الگ کھینچ لیا اور اسے بتایا کہ جہاں خونِ حیض لگتا ہے، وہاں وہ کستوری والی روئی لگائیں (تاکہ بدبو کا اثر زائل ہو جائے) نبی ﷺ نے خون نکلنے اور لگنے کی جگہ کی صراحت کرنے میں حیا محسوس کی، تو اس عورت کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وضاحت سے بتایا کہ آپ ﷺ کی مراد کیا ہے؟ کیوں کہ عورت کو عورت کے ساتھ ایسی صراحت کرنے میں کوئی جھجک مانع نہیں ہوتی۔''[1]

(۱) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح نے رسمِ تبنّیت کے قدیم بت کو توڑا اور نصاریٰ کے عقیدۂ تثلیث پر کاری ضرب لگائی اور اسے باطل ثابت کیا۔

(۲) ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنو مصطلق سے تھیں۔ ان کے والد اس طاقت ور قبیلے کے سردار

---

[1] شبهات و أباطيل للصابوني (ص: ١٥) تعدد الزوجات عبد الله ناصح (ص: ٦٥) مع المفسرين والمستشرقين في زواج النبي ﷺ بزينب بنت جحش رضي الله عنها، ڈاکٹر زاهر عواض الألمعي.

تھے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے نبی ﷺ سے نکاح تک کفر واسلام کی ہر جنگ میں یہ قبیلہ مسلمانوں کے خلاف لڑنے والوں میں شامل ہوتا۔مگر یہ نکاح ایسا بابرکت ثابت ہوا کہ اس کے بعد نہ صرف اس قبیلے نے مسلمانوں کے خلاف لڑنا بند کر دیا، بلکہ اپنے آبائی پیشہ قذّاقی و رہزنی کو بھی چھوڑا اور متمدّن زندگی اختیار کر لی۔ اس نکاح کی وجہ سے ایک سو گھروں کے سات سو افراد کو قید سے رہائی ملی اور مسلمانوں کا یہ حسنِ سلوک دیکھ کر وہ سب بھی مسلمان ہو گئے۔ اسی نکاح کی برکت کا نتیجہ دیکھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا:

"... مَا رَأَيْنَا امْرَأَةً كَانَتْ أَعْظَمَ بَرَكَةً عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا..."[1]

''ہم نے جویریہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ اپنی قوم کے لیے باعثِ برکت کوئی عورت نہیں دیکھی۔''

کیا یہ کوئی معمولی فائدہ ہے؟

(۳) ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے والد حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ قریش کے سرداروں میں سے تھے اور قوم کا نشانِ جنگ انھیں کے گھر میں رکھا رہتا تھا۔ جب وہ نشانی یا جھنڈا گھر سے باہر کھڑا کیا جاتا تو پوری قوم فوراً اس کے گرد جمع ہو جاتی اور حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے اشارۂ ابرو کی منتظر رہتی۔ غزوۂ اُحد، حمراء الاسد، بدر الاخریٰ اور غزوۂ احزاب میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ ہی اس نشان کو لیے ہوئے قائدِ قریش نظر آتے رہے، لیکن حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کے نکاح کر لینے کے بعد حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کسی بھی جنگ میں مسلمانوں کے خلاف فوج کشی کرتے نظر نہیں آئے، بلکہ اس نکاح کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصے بعد اگلے ہی سال خود حضرت ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) بھی اسلام کے جھنڈے تلے پناہ لے لیتے اور مسلمان ہو جاتے ہیں۔

اسلام لانے سے قبل بھی جب انھیں اس نکاح کی خبر ملی تو انھوں نے نبی ﷺ کے بارے میں بڑی عمدہ شہادت دی اور فرمایا:

«هُوَ ذٰلِكَ الْفَحْلُ لَا يُجْدَعُ [لَا يُقْدَعُ] أَنْفُهُ»[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٣١) تخريج مسند أحمد للأرناؤوط (٢٦٣٦٥) نيل الأوطار للشوكاني (١٥٠/٨) و قال: أصله في الصحيحين.

[2] الفتح الرباني (٢٢/ ١٣٤) تفسير القرطبي (١٨/ ٥٨) سورة الممتحنة، آيت: ٧، تعدّد زوجات عبد الله ناصح (ص: ٦٩)

''آپ ﷺ ایک ایسا بَر ہیں کہ جن کا ہم پلہ کوئی نہیں ہوسکتا، یعنی جنھیں ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔''

ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے قبل کفار نے مسلمانوں کے خلاف جتنی محاذ آرئیاں کیں، ان میں سے ہر ایک میں یہود کا پوشیدہ یا ظاہری تعلق ضرور ہوتا تھا، مگر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بعد یہود مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شامل نہ ہوئے۔

④ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی ایک بہن سردارِ نجد کے گھر میں تھیں اور نبی ﷺ کے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح نے ملکِ نجد میں امن وآشتی، صلح وسلامتی اور اسلام کی نشر و اشاعت میں بہترین نتائج پیدا کیے۔ حالانکہ قبل ازیں اہلِ نجد ہی وہ لوگ تھے جنھوں نے ستر واعظین وقاری صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دھوکے سے اپنے ملک لے جاکر قتل کر دیا تھا اور کئی بار ان کی طرف سے نقضِ امن اور فساد انگیزی کے واقعات ظہور میں آچکے تھے۔ امنِ عامہ اور اصلاحِ معاشرہ کے فوائد کو جاننے والا شخص اس نکاح کو مفید اور باعثِ برکت قرار دینے پر مجبور ہے۔

⑤ اسی طرح ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا جن کی عمر نکاحِ نبوی ﷺ میں آنے کے وقت مختلف روایات کے مطابق ۵۰ اور ۶۰ سال کے مابین تھی، انھوں نے اسلام کی خاطر پہلے حبشہ اور پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔ پھر جب وہ بیوہ ہوئیں تو آپ ﷺ نے نکاح کر لیا کیوں کہ ان کے اہلِ خاندان میں سے کوئی بھی مسلمان نہیں تھا اور آپ ﷺ انھیں ان قربانیوں کے بعد ان کے غیر مسلم رشتہ داروں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ انھیں ام المومنین ہونے کی سعادت بخشنے میں ان کے ایثار وقربانی کا صلہ دینا بھی مقصود تھا۔ پھر آپ ﷺ کے اس حسنِ سلوک اور دعوتِ اسلامی کے محاسن کو دیکھتے ہوئے ان کے کثیر اہلِ قوم مسلمان ہو گئے۔

الغرض نبی ﷺ نے عمرِ شریف کے آخری پہر میں جو متعدّد نکاح کیے، ان میں ایسی ہی بے شمار و لاتعداد حکمتیں، مصلحتیں، دینی ودنیاوی فوائد اور معاشرتی وسیاسی منافع موجود تھے۔

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آپ ﷺ کے بعد حصولِ فتویٰ، حلِ مسائل اور استفساراتِ دینیہ کے

میدان میں مرجع خلائق رہیں۔خصوصاً عورت جو معاشرے کا نصف ہے، اس کے متعلقہ مسائل اور نبی ﷺ کے از دواجی تعلقات کی مسنون کیفیت وغیرہ امور میں ان کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ، مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّاتِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ.

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید وارِ شفاعتِ مصطفیٰ ﷺ

ابوعدنان محمد منیر قمر نواب الدین

ترجمان شرعی کورٹ۔الخبر

وداعیہ متعاون جمعیاتِ دعوت وارشاد

الدمام، الظہران، الراکہ، الخبر

(سعودی عرب)

مولف کی دیگر تصانیف اور علمی کاوشیں

مطبوعہ کتب:

نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	شائع کردہ	تاریخ طباعت
1	آئینہ نبوت (سیرت النبیؐ: ایک اچھوتے انداز میں)	51	مکتبہ کتاب وسنت۔بزمِ الهلال	طبع دوم 2000ء
2	رمضان المبارک روحانی تربیت کا مہینہ	40	مکتبہ کتاب وسنت۔بزمِ الهلال	طبع دوم 2000ء
3	توحید: شکوک وشبہات کا ازالہ	12	مکتبہ کتاب وسنت، ریحان چیمہ، علی الباقرین شارجہ۔توحید پبلیکیشنز بنگلور	طبع دوم 2004ء
4	مسنون ذکرِ الٰہی (مختصر)	50	مکتبہ کتاب وسنت۔عامر الباقرین شارجہ	طبع چہارم 2004ء
5	مسنونِ ذکرِ الٰہی (مفصّل)	463	مکتبہ کتاب وسنت، ریحان چیمہ، سیالکوٹ	طبع چہارم 2004ء
6	مناسک الحج والعمرہ (پاکٹ سائز)	300	مکتبہ کتاب وسنت۔عامر الباقرین شارجہ	طبع اول 1981ء
7	درآمدہ گوشت کی شرعی حیثیت	80	مکتبہ کتاب وسنت۔شیخ الکندی شارجہ	طبع دوم 2004ء
8	خنزیر کی چربی پر مشتمل اشیاء (اردو)	32	صدیقی ٹرسٹ کراچی	طبع اول 1980ء
9	خنزیر کی چربی پر مشتمل اشیاء (اردو۔انگلش)	32	ابیرڈین یونیورسٹی (برطانیہ) مکتبہ کتاب وسنت، ریحان چیمہ، سیالکوٹ	طبع اول 1981ء طبع چہارم 2004ء
10	انسانی تاریخ کی خفیہ ترین تحریک	32	مکتبہ کتاب وسنت۔صدیقی ٹرسٹ	طبع دوم 2004ء
11	مقام سنت اور فتنۂ انکار حدیث	96	مکتبہ کتاب وسنت۔الادارۃ الاسلامیہ۔توحید پبلیکیشنز	طبع دوم 2004ء
12	تین اہم اصولِ دین مع مختصر نماز		مکتبہ کتاب وسنت۔الادارۃ الاسلامیہ۔توحید پبلیکیشنز	طبع اول 1983ء
13	تین اہم اصولِ دین	64	دارالافتاء والمکاتب التعاونیہ وغیرہ	2004ء تک دس ایڈیشن
14	قبولیّتِ عمل کی شرائط	408	مکتبہ کتاب وسنت وجامعہ سلفیہ بنارس	طبع چہارم 2003ء

15	دعوت الیٰ اللہ اور داعی کے اوصاف	96	مکتبہ کتاب وسنت۔الادارۃ الاسلامیہ۔توحید پبلیکیشنز	طبع دوم 2004ء
16	سیرتِ امام الانبیاء ﷺ	614	مکتبہ کتاب وسنت۔مکتبہ ابن تیمیہ،قطر	طبع سوم 2004ء
17	شراب اور دیگر منشّیات	399	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع دوم 2004ء
18	مختصر مسائل واحکامِ طہارت ونماز	28	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1423ھ ۔ 2002ء
19	فقہ الصلوٰۃ (جلد اول)	728	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع اول 1990ء
20	فقہ الصلوٰۃ (جلد دوم)	827	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع اول 1999ء
21	سوئے حرم (حج وعمرہ اور قربانی)	366	مکتبہ کتاب وسنت،مرکزی جمعیّت اہلحدیث	طبع سوم 2003ء دہلی انڈیا
22	زیارتِ مدینہ منورہ (آداب واحکام)	31	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور وصدر دفتر امورِ مسجد نبوی ﷺ	طبع دوم 2002ء
23	صحیح تاریخِ ولادتِ مصطفیٰ ﷺ اور عیدِ میلاد ،یومِ وفات پر؟	31	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	طبع دوم 2004ء
24	نماز وروزہ کی نیّت (مراجعہ وتہذیب)	47	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1423ھ ۔ 2002ء
25	جہادِ اسلامی کی حقیقت (مراجعہ وتہذیب)	188	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1421ھ ۔ 2000ء
26	سود ورشوت (مراجعہ وتہذیب)	128	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1421ھ ۔ 2001ء
27	زنا کاری وفحاشی (مراجعہ وتہذیب)	208	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1421ھ ۔ 2001ء
28	مختصر مسائل واحکام رمضان وروزہ	40	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1423ھ ۔ 2002ء
29	مختصر مسائل حج وعمرہ اور قربانی وعیدین		مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1423ھ ۔ 2002ء
30	گلدستہ نصیحت سے پچاس (50) پُھول	44	الشیخ عبدالعزیز المقبل	طبع دوم 2003ء
31	مساجد ومقابر اور مقاماتِ نماز 168		مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع اول 2004ء
32	احکام وآدابِ مساجد	286	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع اول 2004ء

33	نماز کیلئے مردوزن کا لباس	146	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع اول2003ء
34	لواطت واغلام بازی	120	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1421ھ ۔ 2000ء
35	انسدادِ زنا ولواطت کے لیے اسلام کی تدابیر	169	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1421ھ ۔ 2001ء
36	حج مسنون (شارجہ ٹیلیویژن پروگرام)	144	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1423ھ ۔ 2002ء
37	آمین۔معنیٰ ومفہوم مقتدی کے لیے حکم	104	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1421ھ ۔ 2001ء
38	رفع الیدین قائلین و فاعلین کے دلائل	116	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1425ھ ۔ 2004ء
39	درودشریف ۔فضائل واحکام	192	نورِاسلام اکیڈمی لاہور	طبع دوم2003ء
40	ظہورِامام مہدی	21	مکتبہ کتاب وسنت،توحید پبلیکیشنز	طبع دوم 2002ء
41	مسائلِ قربانی وعیدین	283	مکتبہ کتاب وسنت ،مرکزی جمعیت اہل حدیث	طبع دوم 2003ء انڈیا
42	شراب سے علاج ؟	59	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع دوم 2004ء
43	تعویذ گنڈوں اور جنّات و جادو کا علاج	86	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1425ھ ۔ 2004ء
44	نماز پنج گانہ کی رکعتیں مع وتر وتہجد و جمعہ	125	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	طبع دوم 2002ء
45	تمباکونوشی	104	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع دوم 2004ء
46	دخولِ جنت کے تیس اسباب وذرائع	34	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع دوم 2002ء
47	امر بالمعروف ونہی عن المنکر اورضرورتِ جہاد	123	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1421ھ ۔ 2001ء
48	اسیرانِ جہاد اور مسئلہ غلامی	128	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	طبع اول 2002ء
49	انسانی جان کی قیمت اور فلسفۂ جہاد	95	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	2001ء
50	وجوبِ نقاب (چہرے کا پردہ)	164	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	2002ء
51	مصنوعی اعضاء کی صورت میں غسل و وضو	97	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	2003ء
52	نماز کے مفسدات ومکروہات ومباحات	77	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	2003ء
53	ٹوپی و پگڑی سے یا ننگے سر نماز؟	47	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور، مکتبہ ابن حجر بھٹکل	2003ء
54	غیر مسلموں سے تعلقات اور جھوٹے کھانے پینے کا حکم	112	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	2004ء

55	رکوع والے کی رکعت؟ 30	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1423ھ ۔ 2002ء
56	رُکُوع سے سجدے میں جانے کی کیفیّت 32	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1423ھ ۔ 2002ء
57	جمعۃ المبارک: فضائل ومسائل 99	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1425ھ ۔ 2004ء
58	گانا وموسیقی۔قرآن وسنّت کی نظر میں 96	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور مدرسہ اصلاح المسلمین ، بہار،انڈیا	1425ھ ۔ 2004ء
59	... اور سگریٹ چُھوٹ گئی 32	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1425ھ ۔ 2004ء
60	تارکین ومانعین رفع یدین کے دلائل کا جائزہ 150	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1425ھ ۔ 2004ء
61	بدعاتِ رجب وشعبان 80	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1425ھ ۔ 2004ء
62	تارک نماز کا انجام 156	صراط مستقیم ۔ برمنگھم	1430ھ ۔ 2009ء
63	آدابِ دعاء (مقامات ،اوقات وغیرہ) 104 (اشتراک)	مکتبہ کتاب وسنّت	1425ھ ۔ 2004ء
64	نماز نبوی ﷺ (کتاب+VCD)	تالیف الشیخ محمد صالح المنجد،الخبر	1430ھ ۔ 2009ء
65	محرّمات (حرام امور)	تالیف الشیخ محمد صالح المنجد،الخبر	1425ھ ۔ 2004ء
66	سال نو اور تذکرہ چند بدعات کا 57	مکتبہ کتاب وسنت،ریحان چیمہ،سیالکوٹ	1429ھ ۔ 2008ء
67	نمازِ تراویح 126	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1425ھ ۔ 2004ء
68	عمل صالح کی پہچان ،قبولیت عمل کی شرائط (مختصر) 110	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1427ھ ۔ 2006ء
69	مچھلی کے پیٹ میں 144	مکتبہ کتاب وسنّت	
70	نمازِ جنازہ (مختصر مسائل واحکام) 96	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1427ھ ۔ 2006ء
71	بدعات اور ان کا تعارف (تہذیب) 128	توحید پبلیکیشنز بنگلور	
72	مسائلِ اذان واقامت اور جماعت وامامت 159	مکتبہ کتاب وسنّت	1430ھ ۔ 2009ء

73	فقہ الصلوٰۃ بنام نمازِ نبوی (جلد سوم) 773	مکتبہ کتاب وسنّت	1430ھ ۔ 2009ء
74	مسائل و احکامِ طہارت	مکتبہ کتاب وسنّت	1430ھ ۔ 2009ء
75	رمضان المبارک اور احکامِ روزہ (مفصّل)	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1430ھ ۔ 2009ء
76	سورۃ فاتحہ، فضیلت ،مقتدی کے لیے حکم 249	مکتبہ کتاب وسنّت	
77	اوقاتِ نمازِ پنج گانہ 126	مکتبہ کتاب وسنّت	
78	نماز میں عدمِ پابندی اور تارکِ نماز کا حکم	مکتبہ کتاب وسنّت	1430ھ ۔ 2009ء
79	نماز میں ہاتھ ..کب؟ کہاں؟ کیسے؟ 126	مکتبہ کتاب وسنّت	1429ھ ۔ 2008ء
80	اندھی تقلید وتعصّب میں تحریفِ کتاب وسنت 79	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1429ھ ۔ 2008ء
81	حقوقِ مصطفیٰ اور گستاخِ رسول کی سزا 337		
82	الامام العلّامہ ابنِ باز 224	مکتبہ کتاب وسنّت ،ومکتبہ ام القریٰ	
83	خطباتِ مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) جلد اول	مکتبہ کتاب وسنّت ، ومکتبہ ام القریٰ	1434ھ ۔ 2013ء
84	خطباتِ مسجدِ نبوی (مدینہ منورہ) جلد اول	مکتبہ کتاب وسنّت ، ومکتبہ ام القریٰ	1434ھ ۔ 2013ء
85	اسلامی تربیت اولاد 222	مکتبہ کتاب وسنّت ،ومکتبہ ام القریٰ وتوحید پبلیکیشنز	1434ھ ۔ 2013ء
86	دنیوی مصائب ومشکلات 43 (تہذیب ومراجعہ)	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	2003ء
87	نماز میں کی جانے والی غلطیاں 63 (تہذیب ومراجعہ)	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	2004ء
88	مرد وزن کی نماز میں فرق 40 (تہذیب ومراجعہ)	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	2004ء
89	استقامت: راہِ دین پر ثابت قدمی 64 (تہذیب ومراجعہ)	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	2004ء
90	امامت کا اہل کون؟ (اعداد وتقدیم) 76	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1429ھ ۔ 2008ء
91	ارکانِ ایمان (مراجعہ وتقدیم) 104	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1429ھ ۔ 2008ء
92	ارکانِ اسلام (مراجعہ وتقدیم) 122	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1429ھ ۔ 2008ء

93	دوہرے اجر کے مستحق لوگ (تہذیب)	مکتبہ کتاب وسنّت	1430ھ - 2009ء
94	احکام القرآن (اوامر ونواہی) (تہذیب و اضافہ) 560	ہند	1430ھ - 2009ء
95	جہیز و جوڑے کی رسم (تہذیب) 63	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1429ھ - 2008ء
96	انسان کا سب سے بڑا دشمن (تہذیب)	ہند	1429ھ - 2008ء
97	تلاشِ حق کا سفر ،تالیف محمد رحمت اللہ خان (تہذیب)	ابوحنیفہ اکیڈمی	1428ھ - 2007ء
98	خوشگوار زندگی کے بارہ اصول (تقدیم) 40	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1429ھ - 2008ء
99	معوذتین؛ فضائل وتفسیر (مراجعہ وتہذیب) 72	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1429ھ - 2008ء
100	جنتی عورت (تہذیب وتقدیم) 97	مکتبہ کتاب وسنّت ،توحید پبلیکیشنز بنگلور	1428ھ - 2007ء
101	قرآنی گرامر کی مختصر ،ضروری اور آسان ورک بک (تہذیب)		1430ھ - 2009ء
102	گھریلو ماحول کی اصلاح کیلئے 40 نصیحتیں (مراجعہ وتقدیم)	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1432ھ - 2011ء
103	سفرِ آخرت ،حسنِ خاتمہ وسوءِ خاتمہ (مراجعہ وتقدیم)	توحید پبلیکیشنز بنگلور	1432ھ - 2011ء
104	گلدستہ دروس خواتین (جلد اول) ام عدنان قمر (مراجعہ وتہذیب)	مکتبہ کتاب وسنت ،ام القریٰ پبلیکیشنز	1434ھ - 2013ء
105	گلدستہ دروس خواتین (جلد دوم) ام عدنان قمر (مراجعہ وتہذیب)	مکتبہ کتاب وسنت ،ام القریٰ پبلیکیشنز	1434ھ - 2013ء
106	زاد المبلغات (مراجعہ وتہذیب)	مکتبہ کتاب وسنت ،ام القریٰ پبلیکیشنز	1441ھ - 2020ء
107	سفینہ نجات (تہذیب واضافہ)	مکتبہ کتاب وسنت ،ام القریٰ پبلیکیشنز	1441ھ - 2020ء
108	انسان کا سب سے بڑا دشمن کون؟ (مراجعہ وتہذیب)	مکتبہ کتاب وسنت ،ام القریٰ پبلیکیشنز	1441ھ - 2019ء
109	بیماریوں کا علاج (قرآن وسنت کی دعاؤں سے) (تہذیب واضافہ)	مکتبہ کتاب وسنت ،ام القریٰ پبلیکیشنز	1441ھ - 2020ء

مسوّدات:

1	پچاس(50)سوال وفتاویٰ احکامِ حیض .	تالیف الشیخ محمد بن صالح العثیمین	مسوّدہ
2	ممنوعات (ناجائز امور)	تالیف الشیخ محمد صالح المنجد،الخبر	مسوّدہ
3	فقہ الصلوٰۃ (جلد چہارم)		مسوّدہ
4	احکامِ زکوٰۃ وصدقات		مسوّدہ
5	چند اختلافی مسائل میں راہِ اعتدال		مسوّدہ
6	مقالاتِ قمر (جلد اول)		مسوّدہ
7	مقالاتِ قمر (جلد دوم)		مسوّدہ
8	الا مام المحدّث الالبانی		مسوّدہ
9	تفسیر سورۂ حجرات		مسوّدہ
10	حرمین شریفین (حدود،آداب،فضائل،تاریخ)		مسوّدہ
11	خطباتِ مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) جلد دوم		مسوّدہ
12	خطباتِ مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) جلد سوم		مسوّدہ
13	خطباتِ مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) جلد چہارم		مسوّدہ
14	خطباتِ مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ) جلد پنجم		مسوّدہ
15	خطباتِ مسجدِ نبوی (مدینہ منورہ) جلد دوم		مسوّدہ
16	خطباتِ مسجدِ نبوی (مدینہ منورہ) جلد سوم		مسوّدہ
17	خطباتِ مسجدِ نبوی (مدینہ منورہ) جلد چہارم		مسوّدہ
18	خطباتِ مسجدِ نبوی (مدینہ منورہ) جلد پنجم		مسوّدہ
19	چند نفلی نمازیں اور سجدے		مسوّدہ
20	تفسیر آیات الاحکام (دو جلدیں)		مسوّدہ
21	الادعیہ والاذکار فی اللیل والنہار (عربی)		مسوّدہ
22	صحیح فضائلِ اعمال (قرآن کریم اور صحیح		مسوّدہ
	بخاری ومسلم کی روشنی میں)		
23	اسلام : ناتواں علماء اور نادان عوام کے مابین		مسوّدہ

مسوّدہ		تبلیغی نصاب کے ناشر اور دیوبندیت کے مؤلّف کی توبہ	24
مسوّدہ		فضائل اعمال پر ایک نظر، مہندس فصیح الدین قریشی 56	25
مسوّدہ		ایک کھلا خط۔ تحریر: محمد رحمت اللہ خان	26
مسوّدہ		(کھلا خط تمام مسلمانوں کے نام) سید محمد صبغت اللہ امجد	27
مسوّدہ		تبلیغی نصاب: تجزیہ وتبصرہ	28
مسوّدہ		گلدستہ آداب کے چند پھول	29